غبارِ خاطر
مولانا ابو الکلام آزاد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا ابُوالکلام آزادؔ

مکتبۂ جمال
تیسری منزل، حسن مارکیٹ اُردو بازار لاہور

نام کتاب: .... غبار خاطر

مصنف .... مولانا ابوالکلام آزاد

اہتمام: .... میاں وقار احمد کھٹانہ

ناشر: .... مکتبہ جمال' لاہور

مطبع: .... گنج شکر پرنٹرز، لاہور

سن اشاعت: 2006ء

قیمت: .... 240 روپے
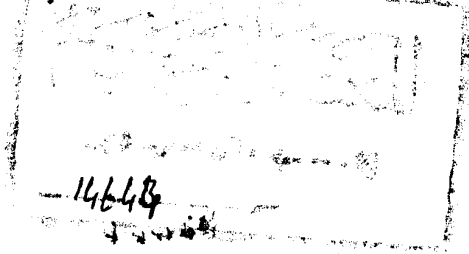
مکتبۂ جمال

تھرڈ فلور' حسن مارکیٹ' اردو بازار' لاہور

فون: 7232731 Mob: 0300-8834610

Email maktaba_jamal@email.com
maktabajamal@yahoo.co.uk

فہرست

مقدمہ

طبع جدید

غبار خاطر کے میرے اس مرتبہ نسخے کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا؛ یہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد اسے جوں کا توں دو مرتبہ چھاپا گیا۔ بعض ذاتی مجبوریوں کے باعث مجھے موقع نہ ملا کہ اس کے حواشی پر نظر ثانی کرتا، حالانکہ کہ اس کی ضرورت تھی اور مزید معلومات مہیا بھی ہو گئی تھیں۔ بعض حواشی میں تبدیل شدہ حالات کے تحت ترمیم یا اضافہ کرنا تھا۔ بہر حال چند مہینے ادھر مجھے معلوم ہوا کہ کتاب پھر سے شائع ہونے والی ہے، تو میں نے فیصلہ کیا کہ اب کے اسے آخری شکل دے دی جائے۔

جب میں نے اسے پہلی مرتبہ مرتب کیا ہے، تو متعدد اشعار کی تخریج نہیں ہو سکی تھی۔ اس دوران میں یہ کام بھی ہوتا رہا۔ اس میں مجھے سب سے زیادہ تعاون محب مکرم نواب رحمت اللہ خان شیروانی، علی گڑھ کا حاصل رہا۔ بفضلہٖ تعالیٰ وہ ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں اور ان کے پاس بہت قیمتی اور وسیع کتاب خانہ ہے؛ وہ مولانا آزاد مرحوم کے مکتوب الیہ نواب صدر یار جنگ مرحوم کے قریبی عزیز بھی ہوتے ہیں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے ذاتی شوق سے اشعار کی تخریج کا کام اپنے ذمے لیا۔ یوں گویا وہ اس کام میں میرے شریک غالب ہو گئے ہیں۔ دنیا میں کسی کام کو حرف آخر نہیں کہا جا سکتا۔ اب بھی کئی جگہ پر کمی محسوس کرتا ہوں۔ لیکن موجودہ حالات میں اپنے میں اس سے زیادہ کی ہمت نہیں پاتا۔ البتہ ایک بات کا اطمینان ہے کہ جتنا کام ہو گیا ہے وہ بھی کچھ کم نہیں۔ جو جتنے کے لائق ہوتا ہے وہ اس کے مطابق اس سے کام لیتا ہے۔ فالحمد اللہ۔

نئی دلی　　　　　　　　　　مالک رام

یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء

مقدمہ

اس ملک پر انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے خلاف ہماری پچاس سالہ جدوجہد کا نقطۂ عروج وہ تھا، جسے "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کہا گیا ہے۔ ۸/اگست ۱۹۴۲ء کو انڈین نیشنل کانگریس کا خاص اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا، جہاں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ انگریز اس ملک کے نظم ونسق سے فوراً دست بردار ہو کر یہاں سے سدھاریں اور ہمیں اپنے حال پر چھوڑیں۔ اس لیے اس کے بعد جو تحریک شروع ہوئی اُس کا نام ہندوستان چھوڑ دو تحریک پڑ گیا۔

اس وقت دوسری عالمی جنگ اپنے پورے شباب پر تھی۔ انگریز بھلا ایسی قرارداد اور ایسی تحریک سے کیونکر صرف نظر کر سکتا تھا! اخباروں میں اس طرح کی افواہیں پہلے سے چھپ رہی تھیں کہ کانگریس اس مفاد کی قرارداد منظور کرنے والی ہے۔ اس لیے حکومت نے حفظ ماتقدم کے طور پر سب انتظام کر رکھے تھے۔ اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس کے صدر تھے۔ ۸/اگست کی شب کو دیر تک یہ جلسہ ہوتا رہا جس میں یہ قرارداد منظور کی گئی تھی۔ اسی رات کے آخری حصے میں یعنی ۹/اگست کو علی الصبح حکومت وقت نے تمام سرکردہ رہنماؤں کو سوتے میں بستروں سے اٹھا کر حراست میں لے لیا اور ملک کے مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا۔ مولانا آزاد اور ان کے بعض دوسرے رفقاء احمد نگر کے قلعے میں رکھے گئے تھے۔ مولانا آزاد کا یہ سلسلہ قید و بند کوئی تین برس تک رہا۔ اوائل اپریل ۱۹۴۵ء میں وہ احمد نگر سے بانکوڑا جیل میں منتقل کر دیے گئے۔ اور یہیں سے بالآخر ۱۵/جون ۱۹۴۵ء کو رہا ہوئے۔ اسی نظر بندی کے زمانے کا ثمرہ یہ کتاب "غبار خاطر" ہے غبار خاطر مولانا آزاد مرحوم کی سب سے آخری تصنیف ہے، جو ان کی زندگی میں شائع ہوئی۔ کہنے کو تو یہ خطوط کا مجموعہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو ایک کو چھوڑ کر ان میں سے مکتوب کی صفت کسی میں نہیں پائی جاتی۔ یہ دراصل چند متفرق مضامین ہیں جنھیں خطوط کی شکل دے دی گئی

ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کچھ ایسی باتیں لکھنا چاہتے تھے جن کا آپس میں کوئی تعلق یا مربوط سلسلہ نہیں تھا۔

عین ممکن ہے کہ اس طرح کے مضامین لکھنے کا خیال ان کے دل میں شہرہ آفاق فرانسیسی مصنف اور فلسفی چارلیس لوئی مونٹسکیو کی مشہور کتاب "فارسی خطوط" (۱۷۲۱) سے آیا ہو۔ اس کتاب میں دو فرضی ایرانی سیاح.........اوزبک اور جا.....فرانس پر عموماً اور پیرس کی تہذیب وتمدن پر خصوصاً بے لاگ اور طنزیہ تنقید کرتے ہیں' اسلام اور عیسائیت کا موازنہ کرتے اور عیسائیت پر آزادانہ اظہار خیال کرتے ہیں، جو اس عہد کی خصوصیت تھی۔ اس میں اور متعدد سیاسی اور مذہبی مسائل پر بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ اس کتاب کا دوسری زبانوں کے علاوہ عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

لیکن وہ ان باتوں کو الگ الگ مضامین کی شکل میں بھی قلمبند نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ اس صورت میں باہمی تعلق کے فقدان کے باعث بعد کو انھیں ایک شیرازے میں یکجا کرنا آسان نہ ہوتا۔ اس مشکل کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ انھیں کسی شخص واحد کے نام خطوں کی شکل میں مرتب کر دیا جائے۔ اُن کے حلقۂ احباب میں صرف ایک ہستی ایسی تھی جو علم کی مختلف اصناف میں یکساں طور پر دلچسپی لے سکتی تھی۔ یہ نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم کی ذات تھی۔ انھوں نے عالم خیال میں انھیں کو مخاطب تصور کر لیا؛ اور پھر جب کبھی، جو کچھ بھی ان کے خیال میں آتا گیا، اسے بے تکلف حوالہ قلم کرتے گئے۔ انہی مضامین یا خطوط کا مجموعہ یہ کتاب ہے۔

شروانی خاندان بہت مشہور ہے اور اس کی تاریخ بہت قدیم۔ ہندوستان کے اسلامی عہد میں اس خاندان کے متعدد افراد بڑے صاحب اثر ونفوذ گذرے ہیں، یہاں تک کہ کئی مرتبہ حکومت وقت کے ردو بدل میں ان کی حیثیت بادشاہ گر کی ہوگئی۔ ان کے اس عہد کے کارنامے ہماری تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

لیکن ان کا یہ دور دورہ یہاں سلطنت مغلیہ کے قیام سے پہلے ہی تک رہا۔ چونکہ ہمایوں کے مقابلہ میں شروانیوں نے شیر شاہ سوری کا ساتھ دیا تھا اس لیے جب ایرانیوں کی مدد سے ہمایوں نے دوبارہ اس ملک پر اپنا تسلط جما لیا، تو اب قدرتی طور پر، شروانیوں کا ستارہ زوال میں آگیا۔ ان کی جمعیت شمالی ہند میں منتشر ہوگئی؛ ان میں سے بیشتر نے کمریں کھول دیں اور

سپاہ گری کی جگہ کشاورزی کو اپنا پیشہ بنالیا۔ ان کے زیادہ تر افراد پنجاب کے اطراف اور علی گڑھ اور لیٹہ کے اضلاع میں بس گئے؛ یہاں انھوں نے بڑی بڑی جاگیریں اور زمینداریاں پیدا کرلیں۔

پہلے ان کے ہاتھ میں تلوار تھی تو اب ہل تھا؛ اس لیے مدتوں ان لوگوں نے قلم سے بہت کم سروکار رکھا۔ زیادہ سے زیادہ کسی نے ہمت کی تو دینی پہلو سے اتنی استعداد پیدا کرلی کہ روز مرہ کے مسائل میں شد بد ہو جائے۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ دن تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ سیاسی انقلاب کی جو آندھی مغرب سے اٹھی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سیاسی استحکام واقتدار حاصل ہو جانے کے بعد انگریزوں نے یہاں نئے طور طریقے، نئے انتظام، نئی زبان، نئی تعلیم جاری کردی۔ قدرتی طور پر اس کا بہت وسیع اثر ہوا۔ اب ناممکن تھا کہ آبادی کا کوئی طبقہ اس سے مستغنی رہ سکے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ شروانیوں کا رجحان بھی پڑھنے لکھنے کی طرف ہوا، اور انگریزی عہد میں انھوں نے جدید تعلیم سے متمتع ہو کر ملکی معاملات میں برادران وطن کے دوش بدوش کام کرنا شروع کیا۔ انگریزی استیلا واقتدار کے خلاف ہماری جنگ آزادی میں بھی اس خاندان کے بعض افراد کی خدمات بہت نمایاں اور قابل قدر رہی ہیں۔

اسی شروانی خاندان کے گلِ سرسید نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم تھے۔ وہ ۵/ جنوری ۱۸۶۷ء (۲۸ شعبان ۱۲۸۳ھ) کو بھیکم پور میں پیدا ہوئے ان کا خاندان یہاں انیسویں صدی کے اوائل میں آکر آباد ہوا تھا، اور ان کے آبا واجداد یہاں کے رئیس تھے۔ ان کے والد محمد تقی خان صاحب (ف ۱۹۰۵ء ۱۳۲۳ھ) نے اپنے بڑے بھائی عبدالشکور خان کی حین حیات خاندانی جاداد اور زمینداری کے نظم ونسق میں کوئی حصہ نہیں لیا؛ بلکہ خود مولانا حبیب الرحمٰن خان کی تعلیم وتربیت بھی اپنے تایا صاحب کی نگرانی میں ہوئی۔ ان کی علوم عربیہ وفارسیہ کی متعدد شاخوں میں تعلیم خاص اہتمام سے مختلف اساتذہ کی رہنمائی میں مکمل ہوئی اس کے بعد انھوں نے انگریزی کی طرف توجہ کی اور اس میں بھی بقدر ضرورت خاصی استعداد پیدا کرلی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات' شروع ہی سے ان کی ذہانت وفطانت اتنی نمایاں تھی کہ ان کے والد نے موروثی صدر مقام بھیکم پور سے متصل ایک نئی گڑھی تعمیر کی، اس کے اندر دلکش باغات اور عالی شان مکان بنوائے اور اس کا نام اپنے بیٹے کے نام پر حبیب گنج رکھا۔ عبدالشکور خان صاحب کا سفر حج سے واپس آتے ہوئے ۱۹۰۷ء (۱۳۲۵ھ) میں جدہ میں انتقال ہوگیا۔

چونکہ چھوٹے بھائی محمد تقی خان صاحب ان سے دو برس پہلے رحلت کر چکے تھے اب ریاست کے انتظام کی ذمہ داری مولانا حبیب الرحمٰن خان کے کندھوں پر آ پڑی اسے انھوں نے اپنی خداداد فراست اور دور اندیشی سے ایسی عمدگی سے انجام دیا کہ نہ صرف پانچ لاکھ کی مقروض ریاست اس بار گراں سے سبکدوش ہوگئی بلکہ اس میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی؛ اس کی تفصیل میں جانے کا نہ یہ موقع و محل ہے نہ اس کی ضرورت لیکن اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ صرف صاحب علم اور علم دوست ہی نہیں تھے بلکہ ان میں انتظامی قابلیت اور دنیوی سوجھ بوجھ بھی بلا کی تھی، دو چیزیں جو بہت کم کسی ایک شخصیت میں جمع ہوتی ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن خان کی تعلیم و تربیت جس نہج اور معیار پر ہوئی تھی اس نے بہت جلد انھیں ملک کے علمی حلقوں میں متعارف کرا دیا۔ ان کا مزاج خالص علمی تھا۔ انھوں نے اپنے ذاتی شوق سے زر کثیر خرچ کر کے حبیب گنج میں ایسا نادر اور قیمتی کتاب خانہ جمع کیا اس کی شہرت ملک سے باہر پہنچی۔ ان کے علم و فضل کو دیکھتے ہوئے اصحاب مجاز نے انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کا صدر مقرر کر دیا۔ یہیں سے ان کی شہرت دکن پہنچی، جس پر آصف جاہ ہفتم میر عثمان علی خان بہادر نظام دکن نے انھیں اپنی ریاست کے امور مذہبی کا صدر الصدور بنا کر جون ۱۹۱۸ء میں حیدر آباد بلوا لیا۔ دکن میں ان کی علمی اور تعلیمی اور دینی خدمات ایسی وسیع اور گوناگوں ہیں کہ ان کے لیے الگ دفتر درکار ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، حیدر آباد میں دار الترجمہ اگست ۱۹۱۷ء میں قائم ہوا تا کہ کتابوں وغیرہ کے ترجمے اور اصلاحات کے وضع کرنے کا کام کیا جا سکے، لیکن عثمانیہ یونیورسٹی اس سے دو سال بعد ۲۸ راگست ۱۹۱۹ء کو قائم ہوئی۔ اپنی عمارت نہ ہونے کے باعث اس کی افتتاحی تقریب آغا منزل میں ہوئی تھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی اس کے پہلے ''شیخ'' (وائس چانسلر) مقرر ہوئے۔ اسی سال اپنے عہدے کی مناسبت سے انھیں اعلیٰ حضرت نظام کی طرف سے 'صدر یار جنگ' خطاب عطا ہوا۔ حیدر آباد میں ان کا قیام اپریل ۱۹۳۰ء تک رہا۔

ملک جس سیاسی بحران اور کشمکش سے گزر رہا تھا، اس کے پیش نظر کسی شخص کا سیاسیات سے بالکل بے تعلق رہنا ناممکن تھا؛ تاہم نواب صدر یار جنگ نے اس میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ حیدر آباد سے واپسی پر انھوں نے اپنی تمام توجہ ملک کے متعدد تعلیمی اور علمی اداروں کے فروغ و ترقی

پر مبذول کردی۔ ملک کی شاید ہی کوئی ایسی قابل ذکر علمی انجمن ہو گی جس سے ان کا تعلق نہ رہا ہو۔

مرحوم شاعر اور مصنف بھی تھے۔ حسرت تخلص تھا۔ اردو میں منشی امیر مینائی کے شاگرد تھے فارسی کلام آغا سنجر ایرانی کو دکھاتے تھے؛ کچھ مشورہ خواجہ عزیز لکھنوی اور مولانا شبلی سے بھی رہا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں دیوان مطبوعہ موجود ہیں.............اردو میں کاروان حسرت اور فارسی میں بوستان حسرت اور بھی متعدد کتابیں ان سے یادگر ہیں؛ سیرۃ الصدیق؛ تذکرہ بابر؛ حالات حزیں، علمائے سلف، نابینا علماء ان میں سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے متفرق مضامین کا مجموعہ بھی "مقالات شروانی" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

ان کا بروز جمعہ ۱۱ راگست ۱۹۵۰ء (۸ ذی قعدہ ۱۳۷۰ھ) کو علی گڑھ میں انتقال ہوا۔ علی گڑھ سے تقریباً ۲۵ میل کے فاصلے پر بھموری میں اپنے موروثی قبرستان میں آسودہ خواب ابدی ہیں یہ جگہ حبیب گنج سے کوئی میل بھر دور ہو گی۔

نواب صدر یار جنگ سے مولانا آزاد کے تعلقات ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں مولانا شبلی مرحوم واسطۃ العقد ثابت ہوئے جن سے مولانا آزاد کی پہلی ملاقات ۱۹۰۵ء کے وسط میں بمبئی میں ہوئی تھی۔ جب یہ مولانا شبلی سے ملے ہیں، تو وہ ان کی وسعت مطالعہ، ذہن کی براقی اور حافظے سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ خود ان دنوں حیدر آباد میں ملازم تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کو دعوت دی کہ یہاں آ جاؤ اور الندوہ کی ترتیب و تدوین اپنے ہاتھ میں لے لو۔ لیکن مولانا آزاد کسی وجہ سے یہ دعوت قبول نہ کر سکے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا شبلی کی عمر اس وقت ۴۸ سال کی تھی اور مولانا آزاد کی ۱۷ کے لگ بھگ۔ اس وقت ملک کے علمی حلقوں میں شبلی عالم اور ادیب اور مصنف کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے؛ اور الندوہ بھی یکسر علمی پرچہ تھا۔ ایسی صورت میں ان کا اس نوجوان کو اپنا ہمکار بننے اور اس علمی رسالے کی باگ ڈور سنبھالنے کی دعوت دینا، جہاں ایک طرف ان کی اپنی وسعت قلب اور علم دوستی، قدر شناسی اور خرد نوازی کا بین ثبوت ہے وہیں مولانا آزاد کے غیر معمولی علم و فضل اور صلاحیتوں کا بھی بہت بڑا اعتراف ہے۔

اس کے تھوڑے دن بعد مولانا شبلی حیدر آباد سے مستعفی ہو کر اگست ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ چلے آئے اور یہاں دار العلوم ندوۃ العلماء کے معاملات کے گویا کرتا دھرتا بن گئے۔ لکھنؤ پہنچ کر

انھوں نے تجدید دعوت کی۔ اب کی مولانا آزاد نے اسے قبول کر لیا چنانچہ یہ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک سات مہینے الندوہ (لکھنؤ) کے ادارہ تحریر سے منسلک رہے۔ نواب صدر یار جنگ سے ملاقات اسی ۱۹۰۶ء کی پہلی سہ ماہی میں ہوئی تھی۔ مولانا شبلی اور نواب صاحب مرحوم کے باہمی تعلقات کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔ مولانا آزاد بھی لکھنؤ کے دوران قیام میں دارالعلوم میں مولانا شبلی ہی کے ساتھ مقیم تھے اسی لیے میرا گمان ہے کہ جب نواب صاحب اس زمانے میں لکھنؤ گئے تو مولانا شبلی کے مکان پر ان دونوں کی ملاقات ہوئی ہوگی۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، ان تعلقات میں خلوص اور پختگی اور ایک دوسرے کی مقام شناسی کا جذبہ پیدا ہوتا گیا۔ انہی تعلقات کا ایک باب یہ کتاب ہے۔

(۲)

غبار خاطر کئی لحاظ سے بہت اہم کتاب ہے:

مولانا مرحوم کے حالات بالخصوص ابتدائی زمانے کے اتنی شرح وبسط سے کسی اور جگہ نہیں ملتے جتنے اس کتاب میں۔ ان کے خاندان، ان کی تعلیم اور اس کی تفصیلات، عادات، نفسیات، کردار، امیال وعواطف، ان کے کردار کی تشکیل کے محرکات ان سب باتوں پر جتنی تفصیل سے انھوں نے ان خطوں میں لکھا ہے اور کہیں نہیں لکھا؛ اور ان کے سوانح نگار کے لیے اس سے بہتر اور موثق تر اور کوئی ماخذ نہیں۔

اس کتاب کی دوسری اہمیت اس کا اسلوب تحریر ہے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے وہ بارہ تیرہ برس کی عمر ہی میں نظم ونثر لکھنے لگے تھے اور اسی زمانے میں ان کی تحریریں رسائل وجرائد میں چھپنے لگی تھی۔ ظاہر ہے کہ ابتدائی تحریروں میں وہ پختگی نہیں تھی جو بھی نہیں سکتی تھی، جو مشق اور مرور زمانہ ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ اگر ہم اس پورے مجموعے پر تنقیدی نظر ڈالیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ زبان وبیان کے لحاظ سے ان کے اسلوب نگارش کا نقطہ عروج غبار خاطر ہے۔ اس کی نثر ایسی نپی تلی ہے اور یہاں الفاظ کا استعمال اس حد تک افراط وتفریط سے بری ہے کہ اس سے زیادہ خیال میں نہیں آ سکتا۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں ناہمواری تھی۔ مثلاً الہلال اور البلاغ کے دور میں ان کے ہاں عربی اور فارسی کے

ثقیل اور عسیر الفہم جملوں اور ترکیبوں کی بھرمار ہے۔ بیشک ان پرچوں کا خاص مقصد تھا اور ان کے مخاطب بھی تعلیم یافتہ لوگ بلکہ بہت حد تک طبقہ علماء کے افراد تھے۔ ان اصحاب سے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ نہ صرف ان تحریروں کو سمجھ سکیں گے، بلکہ ان سے لطف اندوز بھی ہو نگے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مطالب اس سے آسان تر زبان میں بیان نہیں ہو سکتے تھے پس ظاہر ہے کہ عوام تو درکنار، متوسط طبقہ بھی ان سے پورے طور پر مستفید نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے برعکس غبار خاطر کو دیکھئے تو یہاں ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔ اس میں عربی فارسی کی مشکل ترکیبیں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اس کی نثر ایسی شگفتہ اور دل نشین ہے کہ یہ نہ صرف ہر کسی کے لیے قریب الفہم ہے بلکہ اس سے لطف لیا جاسکتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ اس کی وجہ یہ کہ یہاں موضع سہل ہے بیشک یہ توجیہہ ایک حد تک درست ہے؛ لیکن بس ایک حد ہی تک۔ اسی مجموعے میں انھوں نے دو خطوں میں خدا کی ہستی سے تفصیلی گفتگو کی ہے (خط ۱۲ اور ۱۳) یہ موضوع آسان نہیں، بلکہ واقع یہ ہے کہ دنیا کا سب سے اہم اور مشکل اور پیچیدہ موضوع ہے ہی یہ ابتداء سے دنیا بھر کے فلسفی اور عالم اور عاقل اس سے متعلق لکھتے آئے ہیں؛ اور تمام مذاہب کی علت غائی اور بنیاد ہی یہ مسئلہ ہے۔ اگر اسی مسئلے پر انھوں نے اس سے تیس برس پہلے لکھا ہوتا تو اس زمانے میں ان کی جو افتاد تھی، اُسے مدنظر رکھتے ہوئے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کا انداز اور اُسلوب کیا ہوتا۔ لیکن یہاں انھوں نے جس طرح سے اس سے متعلق بحث کی ہے اس سے جہاں ان کے طرز استدلال کی دل نشینی نمایاں ہے وہیں اُسلوب تحریر کی دلکشی بھی لفظ لفظ سے پھوٹی پڑتی ہے ایک ایک لفظ احتیاط سے کانٹے کی تول لکھا ہے .... کہیں تکرار نہیں ہے، کہیں الجھاؤ نہیں ہے، نگاہ اور زبان کسی جگہ نہیں اٹکتے ہیں۔

اسی طرح ایک دوسرے خط (نمبر ۱۷) میں 'انانیت' کا مسئلہ زیر بحث آگیا ہے۔ یہ موضوع بھی آسان نہیں اور ذرا سی بے احتیاطی سے یہ نفسیات کی بھول بھلیوں اور علمی اصطلاحات کا مجموعہ بن سکتا ہے لیکن یہاں بھی انھوں نے نہایت احتیاط سے کام لیا ہے بحث کو عام سطح پر رکھا ہے تاکہ پڑھنے والا اسے سمجھے اور لطف اندوز ہو۔ اس سے معلوم ہوگا کہ واقعی اب نہایت مشکل مسئلوں اور موضوعوں سے متعلق بھی وہ ایسے انداز میں گفتگو کر سکتے تھے کہ یہ نہ صرف علمی پہلو سے دقیع ہو۔ بلکہ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی وہ ایسی دلکشی کا حامل ہو کہ ہماری تاریخ

ادب کا حصہ بن سکے۔

اس مجموعے کے بعض خطوط بادی النظر میں بہت معمولی باتوں سے متعلق ہیں، مثلاً حکایت زاغ و بلبل (خط ۱۸) یا چڑیا چڑے کی کہانی (خط ۱۹، ۲۰) بظاہر یہ ایسے عنوان ہیں جن سے متعلق خیال نہیں ہوتا کہ کچھ زیادہ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن مولانا آزاد کی جولانی قلم کا یہ کرشمہ ہے کہ ان پر ۴۵ صفحے قلم بند کر دیے ہیں۔ ان کی دقت نگاہ، جزئیات کا احاطہ غیر عادی اور غیر معمولی چیزوں سے دلچسپی اور ان کی تفصیلات کا علم غرض کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ اور پھر یہ سب کچھ ایسی سہل ممتنع زبان میں بیان ہوا ہے کہ اس کا جواب نہیں۔ یا مثلاً خط ۱۵ لیجیے جس میں اپنے چائے کے شوق کا ذکر کیا ہے۔ یہاں پھر ان کی باریک بینی اور مسئلے کے مالہ وما علیہ کا تفصیلی ذکر نمایاں ہے۔ چائے کی پتی اس کی کاشت کی تاریخ اس کے دوسرے لوازمات .... ان سب باتوں کا ذکر ایسے چٹخارے لے لے کر کیا ہے کہ خیال ہوتا ہے یہ چائے نہیں بلکہ شراب طہور یا آب کوثر و تسنیم کا ذکر ہو رہا ہے۔ پینے کو چائے سب ہی پیتے ہیں، لیکن مولانا آزاد کا یہ خط پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ہم نے آج تک چائے کبھی پی ہی نہیں، بلکہ کوئی نقلی چیز ہمیں دے دی گئی تھی، جسے ہم لاعلمی میں اصلی سمجھتے رہے۔ یہ ان کے حسن انشا اور قوت بیان کا معجزہ ہے۔

پھر ان خطوں کا ایک اور مابہ الامتیاز ان کا ہلکا سا فکاہی رنگ ہے جو جا بجا الفاظ کا پردہ چاک کر کے جھانکنے لگتا ہے۔ انھوں نے الہلال میں بھی بعض مقالے ایسے لکھے تھے جن میں مزاح کا رنگ چوکھا تھا۔ وہاں موضوع سیاسی تھا، یہاں موضوع سخن سیاسی چھوڑ ادبی بھی نہیں، لیکن اس میں بھی وہ وہ گل افشانیاں کی ہیں کہ صفحہ کاغذ کو کشت زعفران بنا کے رکھ دیا ہے۔ مثلاً احمد نگر کے قلعے میں باورچی رکھنے کا قصہ پڑھیے (خط ۸) یا ڈاکٹر سید محمود کا گوریاؤں کی ضیافت کا سامان کرنا (خط ۱۸) یا چڑیا چڑے کی کہانی (خط ۲۰) میں قلندر اور ملا کا حال .... ان سب مقامات پر بین السطور مزاح کی کارفرمائیوں نے پوری تحریر کو اتنا شگفتہ اور دلکش بنا دیا ہے کہ یہی جی چاہتا ہے وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

اسی سے ایک اور بات کا خیال کیجیے۔ یہ ان کی مختلف جانوروں کی شکل و صورت اور عادات و اطوار کی جزئیات کی تصویر کشی ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنے حلقہ احباب میں سے کم و بیش روز کے ملنے والوں کے متعلق بھی اتنی تفصیل سے جانتے اور اپنی معلومات اور تاثرات کو

قلم بند کرسکتے ہیں یہ مولانا آزاد کا کمال ہے یہ کہ انھوں نے ان پرندوں کو حیات جاوداں بخش دی ہے۔ موتی اور قلندر اور مُلّا جیتے جاگتے کردار ہیں، اور ان کی شخصیت عام گوریاؤں اور چڑوں کی بھیڑ سے کئی گنا نمایاں ہوگئی ہے اور یہ بات صرف پرندوں سے متعلق ہی نہیں ہے یہ تصویر کشی اور مواقع پر بھی ملتی ہے مثلاً باغ میں پھول لگائے ہیں۔ ان زندانیوں نے دن رات کی محنت سے چمن تیار کیا کچھ دن بعد اس میں رنگا رنگ کے پھول اپنی بہار دکھانے لگے۔ یہ ہم میں سے ہر ایک کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ لیکن مولانا مرحوم کے لیے یہ اس سے بھی بڑھ کر کچھ چیز ہے وہ ان پھولوں کی ابتدا اور نشو و نما ان کی خاصیتوں ان کی شکل وصورت، حسن و جمال دلفریبی اور دلکشی وغیرہ سے متعلق ایسی تفصیل سے لکھتے ہیں کہ چشم تصور کے سامنے ایک ہرا بھرا باغ لہلہانے لگتا ہے۔

اور پھر ان سب سے بڑھ کر قابل ذکر بات یہ ہے کہ معمولی سفر کا بیان ہو کہ پرندوں کا، کسی جنگ کا ذکر ہو کہ علم موسیقی کا، وہ اسے پند و موعظت اور دائمی صداقتوں اور ابدی اقدار سے الگ کر کے دیکھ نہیں سکتے وہ اسے فوراً کسی کلیے کی شکل دے دیتے اور فطرت کے عالمگیر قوانین کے بالمقابل دیکھنے لگتے ہیں۔ مثلاً جب ان لوگوں کو بمبئی سے گرفتار کر کے احمد نگر لے گئے ہیں تو یہ وہاں کے ریلوے اسٹیشن سے قلعے تک موٹر کاروں میں گئے تھے۔ لکھتے ہیں: "اسٹیشن سے قلعے تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے راہ میں کوئی موڑ نہیں"۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے: جب قدم اٹھا دیا تو پھر کوئی موڑ نہیں۔ (ص ۵۸-۵۹) اسی سفر کا بیان ہو رہا ہے۔ سڑک پر موٹر کار پوری تیزی کے ساتھ مسافت طے کر رہی ہے۔ قلعہ جو پہلے فاصلے پر دکھائی دے رہا تھا۔ اب قریب نظر آنے لگا چشم زدن میں یہ چند قدم کا فاصلہ بھی پورا ہو گیا اور موٹر کاریں صدر پھاٹک کے اندر داخل ہوگئیں۔ فرماتے ہیں "غور کیجیے تو زندگی کی تمام مسافتوں کا یہی حال ہے خود زندگی اور موت کا باہمی فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا۔" (ص ۵۹) بالآخر زندانیوں کا یہ قافلہ قلعے کے اندر داخل ہو گیا اور پھاٹک بند کر دیا گیا۔ یہ روزمرہ کا معمولی وقوعہ ہے اور کوئی اس پر دھیان بھی نہیں دیتا۔ لیکن پھاٹک کے بند ہونے کی آواز سنتے ہی ان کا ذہن کہیں اور پہنچ گیا اور یہ سوچنے لگے اس کارخانہ ہزار شیوہ و رنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں، تاکہ بند ہوں اور کتنے ہی بند کیے جاتے ہیں، تاکہ کھلیں۔ (ص ۵۱)

جب پچھلی صدی کے شروع میں روسیوں نے بخارا پر حملہ کیا، تو امیر بخارا نے حکم دیا تھا

کہ مدرسوں اور مسجدوں میں ختم خواجگان کا ورد کیا جائے۔ اُدھر روسیوں نے قلعہ شکن توپوں سے گولے برسانا شروع کر دیے اور آخر کار بخارا فتح ہو گیا لکھتے ہیں۔" بالآخر وہی نتیجہ نکلا جو ایک ایسے مقابلے کا نکلنا تھا جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو دوسری طرف ختم خواجگان دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں مگر انھیں کو فائدہ پہنچاتی ہیں جو عزم وہمت رکھتے ہیں بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترک عمل کا حیلہ بن جاتی ہیں۔" (ص ۱۶۲)۔

چڑیا کا بچہ جو ابھی گھونسلے سے نکلا ہے ہنوز اڑنا نہیں جانتا اور ڈرتا ہے ماں کی متواتر اکساہٹ کے باوجود اسے اڑنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک دن اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے اُڑتا اور فضائے ناپیدا کنار میں غائب ہو جاتا ہے۔ پہلی ہچکچاہٹ اور بے بسی کے مقابلے میں اس کی یہ چستی اور آسمان پیمائی حیرت ناک ہے اسی طرح کا ایک منظر دیکھ کر لکھتے ہیں" جونہی اس کی سوئی ہوئی خود شناسی جاگ اٹھی اور اسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ" میں اُڑنے والا پرند ہوں۔" اچانک قالب ہیجان کی ہر چیز از سر نو جاندار بن گئی۔" پھر اسی سے یہ حکیمانہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔" بے طاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری، بے پروبالی سے بلند پروازی اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن کے اندر ہو گیا۔ غور کیجیے تو یہی ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانے کا خلاصہ ہے۔" (ص ۲۳۲)

غرض پوری کتاب میں اس طرح کے جواہر ریزے منتشر پڑے ہیں، اور یہ ان کی عام روش ہے بات دراصل یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر مفکر ہیں جیسا کہ انھوں نے خود کسی جگہ لکھا ہے، جو کچھ اسلاف چھوڑ گئے تھے، وہ انھوں نے ورثے میں پایا اور اس کے حصول اور محفوظ رکھنے میں انھوں نے کوتاہی نہیں کی؛ اور جدید کی تلاش اور جستجو کے لیے انھوں نے اپنی راہ خود بنالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ذات علوم قدیمہ وجدیدہ کا سنگم بن گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ ان پر غور و فکر کے دروازے کھل جاتے اور وہ ان راہوں سے ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتے؛ اور یہی ہوا۔ یہ اقوال جو گویا ضرب الامثال کی حیثیت رکھتے اور انسانی تاریخ اور تجربے کا نچوڑ ہیں، اسی قران السعدین کا نتیجہ ہیں۔

(۴)

مولانا آزاد مکّہ (حجاز) میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ ایک عرب خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ ظاہر ہے کہ گھر میں بات چیت عربی میں ہوتی ہوگی جو گویا ان کی مادری زبان تھی جب تک خاندان حجاز میں مقیم رہا وہاں اُردو کی باقاعدہ تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ گھر میں والد سے گفتگو اردو میں ہوتی تھی اور جو ہندوستانی استادان کے پڑھانے کو مقرر کیے گئے تھے ان سے بھی لیکن قدرتی طور پر ابتدا میں ان کے اردو سیکھنے کا کوئی اطمینان بخش انتظام نہ ہو سکا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کے والد خاندان سمیت آخری مرتبہ ۱۸۹۸ء میں حجاز سے ہندوستان آئے تو اس وقت مولانا آزاد کو جن کی عمر کم و بیش دس سال کی تھی، اردو کی بہت کم واقفیت تھی۔ مزید برآں اردو کے غلط الفاظ اور غلط مخارج جو مکہ میں عرب میں بولتے ہیں ان کی زبان پر بھی رائج تھے، جنھیں انھوں نے بتدریج کوشش کر کے دور کیا، چونکہ حجاز سے واپسی پر ہندوستان میں بھی خاندان کا قیام کلکتہ میں رہا جو اردو کا علاقہ نہیں اور اردو مراکز سے بھی دور ہے؛ اس پر تعلیم بھی سراسر عربی اور فارسی کی رہی، اس لیے اس دوران میں بھی اردو میں ترقی کے امکانات کم تھے۔ اس کے بعد اگرچہ مشق اور مزاولت اور محنت سے انھیں زبان پر پوری قدرت حاصل ہو گئی لیکن ان کے تلفظ میں کہیں کہیں غرابت اور قدامت کے اثرات آخر تک قائم رہے۔ مثلاً وہ سوچنا کی جگہ سونچنا (باضافہ نون غنہ) لکھتے ہیں۔ (بولتے بھی اسی طرح تھے)؛ تمام مشتقات میں بھی وہ اس نون کا اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً سونچنا (ص ۵۲، ۶۴، ۶، ۷، ۱۰۷، ۲۳۶) 'سونچنے (۵۸، ۲۴۳) سونچتا ہوں (ص ۲۴۴) سونچا (ص ۱۲۶) سونچیں (ص ۱۳۳) سونچ (ص ۱۲۹، ۱۹۳) اسی طرح ایک اور مصدر ڈھونڈنا ہے۔ اس کی قدیم شکل ایک ہائے ہوز کے اضافے کے ساتھ ڈھونڈھنا تھی۔ مرحوم اسی طرح لکھتے تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں آپ کو قدم قدم پر اس کی مثالیں ملے گی؛ ڈھونڈھنا (ص ۱۱۶، ۱۳۶، ۱۴۵) ڈھونڈھنے (ص ۱۱۱) ڈھونڈھا (۱۰۷) ڈھونڈھی (ص ۲۶۲) ڈھونڈھیں (ص ۹۵) ڈھونڈھتے (ص ۹۴، ۹۵، ۱۰۷، ۲۶۶) ڈھونڈھتی (ص ۱۰۵) ڈھونڈھوایا (ص ۱۱۱) ڈھونڈھ (ص ۱۰۲، ۱۰۷، ۱۱۵، ۱۸۵، ۱۹۴) یہ سب شکلیں ملتی ہیں۔ گھاس کو بھی پہلے گھانس بولتے اور لکھتے تھے۔ اب گھانس متروک ہے اور گھاس ہی فصیح ہے لیکن اس کتاب میں ایک جگہ گھانس بھی آیا ہے (ص ۲۴۵) بعض لفظوں کے دو دو املا بھی ملتے ہیں مثلاً پاؤں اور پانوں (۱۰۶، ۱۰۷،

۱۱۸) اگرچہ میرا گمان ہے کہ انھوں نے پانوں ہی لکھا ہوگا' پاؤں کاتب کا تصرف ہے۔

ابتداء میں اعراب بالحروف کا رواج عام تھا؛ الفاظ میں پیش کی جگہ واؤ زبر کی جگہ الف اور زیر کی جگہ یائے لکھتے تھے۔ یہ دراصل ترکی زبان کی تقلید کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۲۲ء تک جب اتاترک نے ترکی کے لیے رومن رسم الخط اختیار کیا۔ یہ زبان بھی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اور اس میں اعراب کی جگہ حروف ہی استعمال ہوتے تھے۔ بتدریج یہ رواج کم ہوتا گیا اور بالاخر بالکل ترک ہوگیا۔ مولانا نے ان خطوں میں کم از کم تین لفظوں میں پرانے رواج کا متبع کیا ہے۔ انڈیل کی جگہ اونڈیل (۹۳' ۱۲۷) اونڈیلی (ص ۱۲۶) اور پرانی کی جگہ پورانی (ص ۲۴۰) اگرچہ ایک جگہ پرانی بھی لکھا ہے (ص ۶۰)؛ اور اولجھن (ص ۲۵۱) زندہ زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ نہ صرف خود اس میں تخلیق اور تشکیل کا عمل جاری رہتا ہے بلکہ وہ ہمیشہ طوعاً بھی دوسری زبانوں سے الفاظ لے کر اپنا خزانہ معمور کرتی رہتی ہے؛ اسے ضرورت کے مطابق غیر زبانوں سے الفاظ لینے میں عار نہیں ہوتی۔ اردو تو اس معاملے میں ہے بھی معذور اور حق بجانب کیونکہ اس کا خمیر ہی متعدد ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے اختلاط سے اٹھا تھا۔ ہم نے بیرونی زبانوں میں فارسی اور فارسی ہی کے واسطے سے عربی اور ترکی اور سب سے آخر انگریزی سے سب سے زیادہ استفادہ کیا۔ انگریزی الفاظ اس دور کی یادگار ہیں جب انگلستان کا سیاسی غلبہ اس ملک پر مستقل ہوگیا۔ اکا دکا لفظ تو ہمیشہ آتا ہی رہتا ہے اور اسے آنا بھی چاہیے لیکن چونکہ انگریزی کے ساتھ غیر ملکی اقتدار بھی وابستہ تھا' اس لیے غیر شعوری طور پر انگریزی لفظوں کا آنا ناگریز تھا۔ یہ الفاظ دو حصوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ اوّل ان چیزوں کے نام جو انگریزوں کے ساتھ آئیں اور پہلے سے ہمارے ہاں موجود نہیں تھیں' یا ان نئے علوم کی اصطلاحات جو مغرب میں وجود میں آئے اور یہاں ان کی تعلیم انگریزی زمانے میں شروع ہوئی۔ ہم علمی اصطلاحات کو جوں کا توں لینے پر کسی حد تک مجبور تھے۔ لیکن یہ بات پہلی قسم سے متعلق نہیں کہی جاسکتی۔ ان سے ملتی جلتی چیزیں ہمارے یہاں موجود تھیں ان کا آسانی سے عام فہم ترجمہ کیا جاسکتا تھا۔ ستم یہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے اپنی تحریروں میں اندھا دھند انگریزی کے لفظ استعمال کرنا شروع کردیے حالانکہ اس کی کسی عنوان ضرورت نہیں تھی اور لطیفہ یہ ہے کہ اس کی ابتدا سرسید اور ان کے دوستوں سے ہوئی جو یا تو انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے یا بہت تھوڑی جانتے تھے۔ سرسید کی اپنی تحریروں میں انگریزی کے بہت لفظ ہیں؛ رہی سہی کمی ان

کے مقلدین میں ڈپٹی نذیر احمد اور حالی اور شبلی نے پوری کردی۔ انھوں نے غیر ضروری طور پر انگریزی کے ایسے لفظ بھی اپنی تحریروں میں استعمال کیے ہیں۔ جن کے لیے ان کے پاس کوئی عذر نہیں تھا۔ مولانا آزاد نے ان خطوط میں انگریزی کے بہت لفظ لکھے ہیں۔ ان میں بہت سے پہلی قسم میں شامل ہیں مثلاً موٹر کار (۴۳) اسٹیشن (۴۶) ٹرین (۴۵) ٹائم پیس (۴۶) سگرٹ کیس (۴۹) وارنٹ (۴۹) سول سرجن (۸۰) وغیرہ۔ یہ تمام الفاظ اب عام طور پر اردو میں بولے اور سمجھے جاتے ہیں اور انھیں زبان سے خارج کر کے ہم کوئی دانشمندی کا ثبوت نہیں دیں گے لیکن بعض جگہ ان کے قلم سے کچھ ایسے لفظ بھی نکل گئے ہیں جن کے مترادف ہمارے ہاں ملتے ہیں مثلاً پریس (۴۳) آفس (۸۵) پریسیڈنٹ (۵۳) میس (۱۱۰، ۲۰۱) ہیٹر (۱۸۱) ٹیبل (۴۶، ۴۹) وغیرہ ان کا مفہوم آسانی سے ہم اپنے موجودہ ذخیرہ الفاظ سے ادا کر سکتے ہیں اور ہمیں قطعی ضرورت نہیں کہ ہم خواہی نخواہی ان سے اپنی تحریروں کو بوجھل بنائیں۔

زبان کی طرح مصنف کا اسلوب بیان بھی بدلتا رہتا ہے۔ اور بعض حالتوں میں تو یہ اس کے کردار کا آئینہ بن جاتا ہے۔ مولانا کی تعلیم خالص مشرقی انداز پر ہوئی۔ قدرتی طور پر مدتوں ان کا مطالعہ بھی زیادہ تر دینی علوم کا یا عربی فارسی کا رہا۔ لیکن جب انھوں نے انگریزی میں کافی مہارت پیدا کر لی تو اس کے بعد انھوں نے مغربی علوم سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے انگریزی کتابیں بھی کثرت سے پڑھیں۔ اس کا اثر ان کی طرز تحریر پر پڑنا ہی چاہیے تھا۔ اب وہ غیر شعوری طور پر انگریزی روزمرہ کا تتبع کرتے ہیں بلکہ کہیں کہیں تو یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ وہ انگریزی میں سوچ رہے اور اس کے محاوروں، جملوں کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ غبار خاطر میں بھی اس کی مثالیں کچھ کم نہیں۔ مثلاً صبح مسکرا رہی تھی (۵۴، ۹۵)؛ یہ دور صبوحی کا آخری جام ہوتا ہے (۸۱) مشغولیوں میں گم ہو جاتا ہوں (۹۷) آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی (۹۷) یہ خیال بس کرتا ہے (۱۰۲) میرے اختیار کی پسند نہیں تھی (۱۰۷) حالات کی مخلوق (۱۱۶) گردوپیش کے موثرات (۱۱۶) یہ سب جملے اور ترکیبیں اپنی ساخت میں بنیادی طور پر انگریزی کی ہیں۔ چونکہ قلعہ احمد نگر کی نظر بندی کے ایام میں عام طور پر انگریزی کتابیں ان کے مطالعے میں رہیں وہی ترکیبیں ان کے ذہن میں بسی ہوئی تھیں اور جب وہ یہ خطوط لکھ رہے تھے، لامحالہ تحت الشعور سے ابھر کر انھوں نے اردو کا جامہ پہن لیا۔

(۴)

غبار خاطر پہلی مرتبہ مئی ۱۹۴۶ء میں چھپی تھی۔ اسے جناب محمد اجمل خان نے مرتب کیا تھا؛ اور اس کے شروع میں ان کا مقدمہ بھی شامل تھا۔ چونکہ ایک زمانے کے بعد لوگوں نے مولانا آزاد کی کوئی تحریر دیکھی تھی، یہ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ تین مہینے کے بعد کتاب دوسری مرتبہ اسی سال اگست میں چھپی؛ اور یہ اشاعت بھی سال بھر میں ختم ہو گئی۔ ان دونوں اشاعتوں کے ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی تھے۔ بدقسمتی سے دونوں مرتبہ کتابت کا معیاری انتظام نہیں ہو سکا تھا اور اسی لیے مولانا اس سے مطمئن نہیں تھے۔ تیسری مرتبہ اسے ان کے ایک دیرینہ مداح لالہ پنڈی داس[1] نے ۱۹۴۷ء کے فروری میں لاہور سے شائع کیا۔ اس مرتبہ اس میں ایک خط بھی زائد تھا جو پہلی دونوں اشاعتوں میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا؛ یہ سب سے آخری خط موسیقی سے متعلق ہے اب بازار میں اسی تیسری اشاعت کے چوری چھپے کے نقلی نسخے ملتے ہیں؛ اور یہ کتابت کی اغلاط سے پر ہیں۔

مولانا آزاد مرحوم کی وفات (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) کے بعد ساہتیہ اکادمی نے فیصلہ کیا کہ ان کی تمام تحریروں کو جمع کر کے جدید طریقے پر مرتب کیا جائے۔ کام کا آغاز ان کی شاہکار تصنیف ترجمان القرآن سے کیا گیا [اس کے دو حصے شائع ہو چکے ہیں۔ بقیہ دو جلدیں بھی غالباً اگلے سال ایک میں شائع ہو جائے گی۔]

---

[1] لالہ پنڈی داس پنجاب کے پرانے انقلابیوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ لاہور کی اولین انقلابی انجمن "بھارت ماتا سبھا" کے ممبر، بلکہ اس کے بانیوں میں سے تھے۔ اس انجمن میں سردار اجیت سنگھ (بھگت سنگھ کے چچا)، صوفی انبا پرشاد (ایڈیٹر روزنامہ پیشوا) ایشری پرشاد (نیم سوپ والے) منشی منور خان ساغر اکبرآبادی، دینا ناتھ حافظ آبادی (ایڈیٹر اخبار ہندوستان)، لال چند فلک، مہتہ نند کشور وغیرہ ان کے شریک کار تھے۔ انجمن کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ بھی نکلتا تھا۔ (پنڈی داس خود بھی ایک پرچہ "انڈیا" گوجرانوالہ سے نکالتے تھے) اس سبھا کے جلسے باقاعدہ ہوتے جن میں جوشیلے اراکین حکومت کے خلاف غم وغصہ کا اعلان کرتے اور لوگوں کو ابھارنے کے لیے نظم ونثر میں آگ اگلتے تھے

جب مئی ۱۹۰۷ء میں حکومت نے لالہ لاجپت رائے کو گرفتار کر کے مانڈلے (برما) میں نظر بند کر دیا، تو اسی زمانے میں پنڈی داس اور نند کشور کو بھی پانچ سال کے لیے کسی نامعلوم مقام پر بھیج دیا گیا تھا۔ ۱۴ر جولائی ۱۹۶۹ء کو دلی میں انتقال ہوا۔

غبار خاطر کی ترتیب میں مجھے سب سے زیادہ دقت مختلف کتابوں اور اشعار کے حوالوں کی تلاش میں ہوئی ہے۔ مرحوم لکھتے وقت اپنے حافظے سے بے تکلف کتابوں کی عبارتیں اور شعر لکھتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں تک معروف شعرا اور مطبوعہ دواوین کا تعلق ہے، ان سے رجوع کرنا چنداں دشوار نہیں تھا لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے شعر کسی تذکرے میں دیکھا تھا یا کہیں اور میں نے حوالے دواوین سے دیے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ بہت جگہ لفظی تفاوت ہے۔ بعض اوقات وہ موقع کی ضرورت سے دانستہ بھی ردوبدل کر لیتے ہیں لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انھوں نے جہاں اسے دیکھا تھا، وہاں یہ اسی طرح چھپا ہو۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ ان کے حافظے نے اسے جوں کا توں محفوظ نہ رکھا ہو۔ اس صورت میں انھوں نے اس میں ایک آدھ لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر کے لکھ دیا۔ چونکہ خود موزوں طبع تھے، شعر ساقط الوزن تو ہو نہیں سکتا تھا، البتہ اصل متن قائم نہ رہا۔

پوری کتاب میں کوئی سات سو شعر ہیں۔ پوری کوشش کے باوجود ان میں سے ستر اسی اشعار کی تخریج نہیں ہو سکی۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے کئی احباب سے بھی مدد لی ہے اور میں ان سب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے حتی الامکان اس سے دریغ نہیں کیا۔ دلی میں اب کتابوں کا کال ہے اور یہاں کوئی اچھا کتابخانہ نہیں ہے۔ میں نے بہت جگہ سے کتابیں مستعار لیں اور اس کے لیے مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی آزاد لائبریری اور ادارہ علوم اسلامیہ کے کتاب خانے سے بھی رجوع کرنا پڑا۔ اس کے باوجود بعض حوالوں کی تکمیل نہیں ہو سکی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ کتابیں مہیا نہ ہو سکیں۔ اگر کتاب کے پھر چھپنے کی نوبت آئی اور اس اثنا میں مزید معلومات مہیا ہو گئیں۔ تو اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس ایڈیشن کا متن ۱۹۴۷ء کی طبع ثالث پر مبنی ہے۔ البتہ طبع اول کا نسخہ مقابلے کے لیے پیش نظر رہا ہے۔ اصلی کتاب کے حواشی میں مداخلت نہیں کی گئی، حالانکہ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض خود مولانا مرحوم کے قلم سے نہ ہوں۔ میں نے امتیاز کے لیے اپنے حواشی کتاب کے آخر میں شامل کر دیے ہیں۔

(۵)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کتاب سے متعلق بعض باتوں کی وضاحت کر دی جائے۔ اردو میں متعدد لفظوں کے لکھنے میں بہت بے احتیاطی کا رواج سا ہو گیا ہے۔ مثلاً عام طور

پر فارسی کے حاصل مصدر ہمزہ سے لکھے جاتے ہیں۔ جیسے آزمائش ستائش' افزائش وغیرہ یہاں ہمزہ غلط ہے؛ یہ تمام الفاظ یاے سے ہونا چاہیں یعنی آزمایش' ستایش' افزایش وغیرہ۔ اسی طرح فارسی مرکبات توصیفی و اضافی میں اگر موصوف یا مضاف کے آخر میں یاے ہو تو اس پر ہمزہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر صلاے عام پاے خوۂ جاے مہمان میں کسی جگہ بھی یاے پر ہمزہ لکھنا درست نہیں۔ ہاں اگر یہ یاے معروف ہو تو اس صورت میں اس کے نیچے زیر زیر لگنا چاہیے مثلاً رعنائی خیال بیماری دل وغیرہ۔

اردو کے وہ لفظ جو امر تعظیمی کی ذیل میں آتے ہیں جیسے کیجیے، پیجیے، ڈریے یا جمع ماضی کے صیغے مثلاً دیئے لیے وغیرہ ان میں بھی ہمزہ نہیں' بلکہ آخر میں یاے ہے؛ یہی حال چاہیے کا ہے۔

آپ کو اس مرتبہ پچھلی اشاعتوں سے دو جگہ املا کا تفاوت ملے گا۔ پہلا لفظ 'طیار' ہے؛ یہ سب جگہ تیار کر دیا گیا ہے۔ دوسرے علماء کرام اور اسی قبیل کی ترکیبیں ہیں' ان میں ہر جگہ ہمزہ کی جگہ یاے لکھ دی گئی ہے یعنی علماے کرام وغیرہ (اگرچہ ممکن ہے کہ کسی جگہ سہو سے یہ تبدیلی نہ کی جا سکی ہو) اس تبدیلی کا جواز ''تذکرہ'' کا وہ نسخہ ہے' جو مولانا کے ذاتی ہمارے ہاں تحریر میں رموز اوقاف کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ بعض اوقات اس سے بہت الجھن پیدا ہو جاتی ہے اور عبارت کے معنی تک بدل جاتے ہیں۔ آپ کو انگریزی کی کوئی معیاری کتاب رموز اوقاف کے بغیر نہیں ملے گی۔ یہ قابل تقلید روش ہے ہمارے لکھنے والوں اور ناشروں کو اس پر کاربند ہونے کی ضرورت ہے۔ اردو میں چونکہ اس کا رواج نہیں ہے اس لیے یہ فیصلہ کرنا بھی دشوار ہے کہ کہاں کونسا نشان رکھنا چاہیے۔ اگر یہ استعمال عام ہو جائے' تو رفتہ رفتہ یہ تعیین بھی ہو جائے گی۔ ....

اس نسخے کی کتابت میں حتی الوسع ان اصولوں کی پابندی کی گئی ہے۔

نئی دلی

فروری ۱۹۶۷ء

مالک رام

مقدمہ

تاریخ واقعاتِ شہاں نانوشتہ ماند[1]
افسانہ کہ لفتِ نظیری کتاب شد

اِس مجموعے میں جس قدر مکتوبات ہیں، وہ تمام تر نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ کے نام لکھے گئے تھے۔ چونکہ قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں دوستوں سے خط وکتابت کی اجازت نہ تھی اور حضرت مولانا کی کوئی تحریر باہر نہیں جا سکتی تھی اس لیے یہ مکاتیب وقتاً فوقتاً لکھے گئے اور ایک فائل میں جمع ہوتے رہے۔ ۱۵ر جون ۱۹۴۵ء کو جب مولانا رہا ہوئے تو ان مکاتیب کے مکتوب الیہ تک پہنچنے کی راہ باز ہوئی۔

نواب صاحب سے حضرت مولانا کا دوستانہ علاقہ بہت قدیم ہے۔ مولانا نے خود ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ پہلے پہل ان سے ملاقات ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی۔ گویا ایک کم چالیس برس اس رشتۂ اخلاص ومحبت پر گزر چکے اور ایک قرن سے بھی زیادہ وقت کا اِمتداد اس کی تازگی اور شگفتگی کو افسردہ نہ کر سکا۔ دوستی ویگانگت کے ایسے ہی علاقے ہیں، جن کی نسبت کہا گیا تھا۔

تزول جبال الراسیات وقلبهم
عن الحبّ لا یخلو ولا یتزلزل[2]

البتہ یہ علاقہ محبت واخلاص صرف علمی اور ادبی ذوق کے رشتہ اشتراک میں محدود ہے۔ سیاسی عقائد واعمال سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سیاسی میدان میں مولانا کی راہ دوسری ہے اور نواب صاحب اس سے رسم وراہ نہیں رکھتے۔

حضرت مولانا کی زندگی مختلف اور متضاد حیثیتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ وہ ایک ہی زندگی اور ایک ہی وقت میں مصنّف بھی ہیں، مقرّر بھی ہیں، مفکّر بھی ہیں، فلسفی بھی ہیں، ادیب بھی ہیں، مدبّر بھی ہیں اور ساتھ ہی سیاسی جدوجہد کے میدان کے سپہ سالار بھی ہیں۔ دینی علوم کے تبحّر کے ساتھ عقلیات اور فلسفے کا ذوق بہت کم جمع ہوتا ہے اور علم اور ادب کے ذوق نے ایک ہی دماغ میں بہت کم آشیانہ بنایا ہے۔ پھر علمی اور فکری زندگی کا میدان عملی سیاست کی جدوجہد سے اتنا دور واقع ہوا ہے کہ ایک ہی قدم دونوں میدانوں میں بہت کم اُٹھ سکتے ہیں مگر مولانا آزاد کی زندگی ان تمام مختلف اور متضاد حیثیتوں کی جامع ہے گویا ان کی ایک زندگی میں بہت سی زندگیاں جمع ہوگئی ہیں۔

وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں

اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ علائق کا دائرہ کسی ایک گوشے ہی میں محدود نہیں رہا، علوم دینیہ کے حجروں کے زاویہ نشیں، ادب وشعر کی محفلوں کے بزم طراز، علم اور فلسفے کی کاوشوں کے دقیقہ سنج اور میدان سیاست کے مدبّر اور معرکہ آرائیوں کے شہ سوار سب کے لیے ان کی شخصیت یکساں طور پر کشش رکھتی ہے اور سب اس مجمع فضل وکمال کے افادات سے بقدر طلب وحوصلہ مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

(۳)
تو نخلِ خوش ثمر کیستی کہ باغ وچمن
ہمہ ز خویش بریدند و در تو پیوستند[۳]

البتہ ان کے ارادت مندوں کا حلقہ جس قدر وسیع اور بین القومی ہے، اتنا ہی دوستوں کا دائرہ تنگ ہے۔

(۴) کسے کہ زود گسل نیست، دیر پیوندست[۴]

ایسے خوش قسمت اصحاب جنہیں مولانا اپنے ''دوستوں'' میں تصوّر کرتے ہوں خال خال ہیں اور صرف وہی ہیں جن سے علم وذوق کے اشتراک اور رجحانِ طبیعت کی مناسبت

نے انہیں وابستہ کر دیا ہے۔ ایسے ہی خال خال حضرات میں ایک شخصیت نواب صدر یار جنگ کی ہے۔

نواب صاحب مسلمانانِ ہند کے گذشتہ دورِ علم ومجالس کی یادگار ہیں۔ آج سے تیس چالیس ۴۰ برس پیشتر کا زمانہ، مولانا آزاد کی ابتدائی علمی زندگی کا زمانہ تھا۔ وہ اس وقت کے تمام اکابر وافاضل سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ یعنی ان کی عمر سترہ اٹھارہ برس سے زیادہ نہ تھی لیکن اپنی غیر معمولی ذہانت اور محیر العقول علمی قابلیت کی وجہ سے سب کی نظروں میں محترم ہو گئے تھے اور معاصرانہ اور دوستانہ حیثیت سے ملتے تھے۔ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، خلیفہ محمد حسین (پٹیالہ) خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ، حکیم محمد اجمل خاں وغیرہم، سب سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور علمی اور ادبی صحبتیں رہا کرتی تھیں۔ اسی عہد کی صحبتوں میں نواب صدر یار جنگ سے بھی ان کی شناسائی ہوئی اور پھر شناسائی نے عمر بھر کی دوستی کی نوعیت پیدا کر لی۔ مولانا اس رشتے کو خصوصیت کے ساتھ عزیز رکھتے ہیں کیونکہ یہ اس عہد کی یادگار ہے جو بہت تیزی کے ساتھ گزر گیا اور ملک کی مجلسیں قدیم صورتوں اور صحبتوں سے یک قلم خالی ہو گئیں۔

مولانا کی سیاسی زندگی کے طوفانی حوادث ان کی تمام دوسری حیثیتوں پر چھا گئے ہیں لیکن خود مولانا نے اپنی سیاسی زندگی کو اپنے علمی اور ادبی علائق سے بالکل الگ تھلگ رکھا ہے۔ جن دوستوں سے ان کا علاقہ محض علم وادب کے ذوق کا علاقہ ہے، وہ ان کے علائق کو سیاسی زندگی سے ہمیشہ الگ رکھتے ہیں اور اس طرح الگ رکھتے ہیں کہ سیاسی زندگی کی پرچھائیں بھی اُس پر نہیں پڑ سکتی۔ وہ جب کبھی ان دوستوں سے ملیں گے یا خط وکتابت کریں گے تو اس میں سیاسی افکار واعمال کا کوئی ذکر نہ ہوگا۔ ایک بے خبر آدمی اگر اس وقت کی باتوں کو سنے تو خیال کرے، اس شخص کو سیاسی دُنیا سے دُور کا علاقہ بھی نہیں ہے اور علم وادب کے سوا اور کسی ذوق سے آشنا نہیں۔ ایک مرتبہ اس معاملے کا خود مولانا سے ذکر ہوا تو فرمانے لگے جس شخص سے میرا تعلق جس حیثیت سے ہے، میں ہمیشہ اسے اسی حیثیت میں محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ دوسری حیثیتوں سے اسے آلودہ کروں۔ چنانچہ نہ تو کبھی وہ اِن دوستوں سے اس کی توقع رکھتے ہیں کہ ان کی سیاسی زندگی کے آلام ومصائب میں شریک

ہوں۔ نہ کبھی اس کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ ان کے سیاسی افکار واعمال سے اتفاق کریں۔ سیاسی معاملے میں وہ ہر شخص کو خود اس کی پسند اور خواہش پر چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ ان سے کسی علمی مذہبی اور ادبی تعلق سے برسوں ملتے رہیے۔ وہ کبھی بھولے سے بھی سیاسی معاملات کا آپ سے ذکر نہیں کریں گے۔ ایسا معلوم ہوگا، جیسے اس عالم کی انہیں کوئی خبر ہی نہیں۔

بسا اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی سیاسی میدانوں کے طوفانی حوادث سے گھری ہوتی ہے۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ایک دن یا ایک گھنٹے کے بعد کیا حوادث پیش آئیں گے۔ ممکن ہے کہ قید و بند کا مرحلہ پیش آ جائے۔ بہت ممکن ہے کہ جلاوطنی یا اس سے بھی زیادہ کوئی خطرناک صورت حال ہو لیکن اچانک، عین اسی عالم میں کسی ہم ذوق دوست کی یاد ان کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے سارے گرد وپیش سے یک قلم کنارہ کش ہو کر اس کی جانب ہمہ تن متوجہ ہو جاتے ہیں اور اس استغراق اور انہماک کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں گویا ان کی زندگی پر کسی خطرناک سے خطرناک حادثے کا سایہ بھی نہیں پڑا ہے۔ وہ اس وقت اپنی یکساں اور بے کیف سیاسی مشغولیت کا مزہ بدلنے کے لیے کوئی ایسا موضوع چھیڑ دیں گے جو سیاسی زندگی کے میدانوں سے ہزاروں کوس دُور ہوگا۔ علم وفن کا کوئی مبحث، فلسفیانہ غور وفکر کی کوئی کاوش، طبیعات کا کوئی نیا نظریہ، تصوف واشراق کا کوئی واردہ یا پھر ادب وانشاء کی سخن طرازی اور شعر وسخن کی بزم آرائی، غرض کہ سیاست کے سوا ہر ذوق کی وہاں گنجائش ہوگی، ہر وادی کی وہاں پیمائش کی جا سکے گی۔ اس وقت کوئی انہیں دیکھے تو صاف دکھائی دے کہ زبان حال سے خواجہ حافظ کا یہ شعر دُہرا رہے ہیں:

کمندِ صیدِ بہرامی بیفگن، جامِ مے بردار
کہ من پیمودم ایں صحرا، نہ بہرام ست نے گورش [5]

مولانا اس صورت حال کو "تحمیض" سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ "تحمیض" عربی میں مُنہ کا مزہ بدلنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ "حمّضوا مجالسکم" یعنی اپنی مجلسوں کا مزہ بدلتے رہو وہ کہتے ہیں اگر گاہ گاہ میں اس تحمیض کا موقع نہ نکالتا رہوں تو میرا دماغ بے کیف اور خشک مشغولیتوں کے بارِ مسلسل سے تھک کر معطل ہو جائے۔ اس طرح کی "تحمیض" میرے لیے ذہنی عیش ونشاط کا سامان بہم کر دیا کرتی ہے اور دماغ از سر نو تازہ دم

ہو جاتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عین سیاسی طوفانوں کے موسم میں کوئی ہم ذوق دوست آ نکلتا ہے اور انہیں موقع مل جاتا ہے کہ قلم و تخیل کی جگہ صحبت و مجالست کے ذریعہ اپنی مشغولیت کا ذائقہ بدلیں۔ وہ معاً اپنے گرد و پیش کی دنیا سے باہر نکل آئیں گے اور ایک انقلابی تحول کے ساتھ اپنے آپ کو ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیں گے۔ وہ فوراً اپنے خادمِ خاص عبداللہ کو پکاریں گے کہ چائے لاؤ۔ یہ گویا اس کا اعلان ہوگا کہ ان کے ذوق و کیف کا خاص وقت آ گیا۔ پھر شعر و سخن کی صحبت شروع ہو جائے گی، علم و ادب کا مذاکرہ ہونے لگے گا اور اعلیٰ درجہ کی چینی چائے "وہائٹ جسامن" کے چھوٹے چھوٹے فنجانوں کا دور چلنے لگے گا کہ:

حاصلِ کارگہِ کون و مکاں ایں ہمہ نیست
بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں ایں ہمہ نیست[۶]

انہیں اپنی طبیعت کے انفعالات پر غالب آنے اور اپنے آپ کو اچانک بدل لینے کی جو غیر معمولی قدرت حاصل ہو گئی ہے وہ فی الحقیقت ایک حیرت انگیز بات ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں خود اپنی آنکھوں سے اس انقلابی تحول کو دیکھنے کا موقع ملا ہو۔ مجھے آٹھ برس سے یہ موقع حاصل ہے۔

نواب صدر یار جنگ ایک خاندانی رئیس ہیں۔ ملک کے سیاسی معاملات میں ان کا طرزِ عمل وہی رہتا آیا ہے جو عموماً ملک کے طبقۂ رؤسا کا ہے۔ یعنی سیاسی کش مکش کے میدانوں سے علیحدگی اور اپنے گوشۂ سکون و جمعیت پر قناعت۔ برخلاف اس کے مولانا کی پوری زندگی سیاسی جد و جہد کی جنگ آزمائی اور معرکہ آرائی کی زندگی ہے لیکن صورتِ حال کا یہ اختلاف بلکہ تضاد، ایک لمحے کے لیے بھی ان کے باہمی علائق کی یگانگت و یک جہتی پر اثر نہیں ڈال سکتا۔ نہ کبھی مولانا سیاسی معاملات کی طرف کوئی اشارہ کریں گے، نہ کبھی نواب صاحب کی جانب سے کوئی ایسا تذکرہ درمیان آئے گا۔ دونوں کا علاقہ ذاتی محبت و اخلاص اور ذوق علم و ادب کے اشتراک کا علاقہ ہے اور ہمیشہ اسی دائرے میں محدود رہتا ہے۔ چنانچہ قلعہ احمد نگر کے ایک مکتوب مورخہ ۲۹/ اگست ۱۹۴۲ء میں وہ سیاسی حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "مجھے یہ قصہ یہاں نہیں چھیڑنا چاہیے۔ میری آپ کی مجلس

آرائی افسانہ سرائی کے لیے نہیں ہوا کرتی:

(۷) از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس ؎

"میری دکان سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی لیکن آپ کے لیے کچھ نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے۔"

۱۵ ر جون ۱۹۴۵ء کو مولانا تین برس کی قید و بند کے بعد رہا ہوئے اور اس حالت میں رہا ہوئے کہ چوالیس پونڈ وزن کم ہو چکا تھا اور تندرستی جواب دے چکی تھی لیکن رہائی کے بعد ہی انہیں فوراً شملہ پہنچنا اور شملہ کانفرنس کی مشغولیتوں میں گم ہو جانا پڑا۔ اب وہ قلعہ احمد نگر اور بانکوڑا کے قید خانے کی جگہ وائسرائے گل لاج شملہ کے مہمان تھے لیکن یہاں بھی صبح چار بجے کی سحر خیزی اور خود مشغولی کے معمولات برابر جاری رہے۔ ایک دن صبح اچانک نواب صاحب کی یاد سامنے آ جاتی ہے اور وہ ایک شعر لکھ کر تین برس پیشتر کی خط و کتابت کا سلسلہ از سر نو تازہ کر دیتے ہیں۔ پھر تبدیلی آب و ہوا کے لیے کشمیر جاتے ہیں اور تین ہفتے گلمرگ میں مقیم رہتے ہیں۔ گلمرگ سے سرینگر آتے ہیں اور ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم ہو جاتے ہیں۔ یہ ہاؤس بوٹ نسیم باغ کے کنارے لگا دیا گیا تھا اور مولانا کی صُبحیں اسی کے ڈرائنگ روم میں بسر ہونے لگیں تھیں۔ یہاں پھر خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوتا ہے اور ۳ ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو مولانا اپنے ایک مکتوب میں قلعہ احمد نگر کے حالات کی حکایت چھیڑ دیتے ہیں اور ان مکاتیب کی نگارش کے اسباب و محرکات کی تفصیلات لکھتے ہیں جو اس مجموعے میں جمع کیے گئے ہیں۔ چونکہ رہائی کے بعد کے مکاتیب کا یہ حصہ بھی ان مکاتیب سے مربوط ہو گیا ہے، اس لیے مولانا سے اجازت لے کر، میں نے انہیں بھی اس مجموعہ کی ابتداء میں شامل کر دیا ہے۔ رہائی کے بعد کے یہ مکاتیب اس مجموعے کے لیے دیباچے کا کام دیں گے۔

مولانا کو سینکڑوں خطوط لکھنے اور لکھوانے پڑتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کی نقول نہیں رکھی جا سکتیں لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے اپنے خاص علمی و ادبی مکاتیب کی نقول رکھنے کی بھی کبھی کوشش نہیں کی اور اس طرح سینکڑوں مکاتیب ضائع ہو گئے۔

۱۹۴۰ء میں، میں نے مولانا سے درخواست کی کہ جو خاص مکاتیب وہ دوستانِ خاص

کو لکھا کرتے ہیں ان کی نقول رکھنے کی مجھے اجازت ملے۔ چنانچہ مولانا نے اجازت دے دی اور اب ایسا ہونے لگا کہ جب کبھی مولانا کوئی مکتوب خاص اپنے ذوق و کیف میں لکھتے، میں پہلے اس کی نقل کر لیتا، پھر ڈاک میں ڈالتا۔ نواب صاحب کے نام ۱۹۴۰ء، ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء میں جس قدر خطوط لکھے گئے، سب کی نقول میں نے رکھ لی تھیں اور میرے پاس موجود ہیں۔ چنانچہ اسی بناء پر رہائی کے بعد مولانا نے قلعہ احمد نگر کے مکاتیب میرے حوالے کیے کہ حسب معمول ان کی نقول رکھ لوں اور اصل نواب صاحب کی خدمت میں بیک دفعہ بھیج دوں لیکن میں نے جب ان کا مطالعہ کیا تو خیال ہوا کہ ان تحریرات کا محض نجی کے خطوط کی شکل میں رہنا اور شائع نہ ہونا اردو ادب کی بہت بڑی محرومی اور ارباب ذوق کی نا قابلِ تلافی حرمانی ہوگی۔ مولانا اس وقت شملہ میں تھے۔ میں نے بہ اصرار ان سے درخواست کی کہ ان مکاتیب کو ایک مجموعے کی شکل میں شائع کرنے کی اجازت دے دیں۔ مجھے یقین ہے کہ ملک کے تمام ارباب ذوق ونظر اس واقعے کے شکر گزار ہوں گے کہ مولانا نے اشاعت کی اجازت دے دی اور اس طرح میں اس قابل ہو گیا کہ یہ مجموعہ دیدہ ورانِ علم وادب کی ضیافت ذوق کے لیے پیش کروں۔

۱۹۴۲ء میں گرفتاری سے پہلے مولانا لاہور گئے تھے۔ وہاں انفلوئنزا کی شکایت لاحق ہو گئی تھی۔ اسی حالت میں کلکتہ آئے اور صرف تین دن ٹھہر کر ۲ راگست کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی صدارت کرنے کے لیے بمبئی روانہ ہو گئے۔ بمبئی جاتے ہوئے ریل میں انہوں نے ایک مکتوب نواب صاحب کے نام لکھ کر رکھ لیا تھا کہ بمبئی پہنچ کر مجھے دے دیں گے۔ میں حسب معمول اس کی نقل رکھ کر اصل ڈاک میں ڈال دوں گا لیکن بمبئی پہنچنے کے بعد وہ اپنی مصروفیتوں میں غرق ہو گئے اور مکتوب سفر ان کے اٹاچی کیس میں پڑا رہ گیا۔ یہاں تک کہ ۹ راگست کی صبح کو وہ گرفتار ہو گئے۔ چونکہ قلعہ احمد نگر کے پہلے مکتوب میں اس خط کا ذکر آیا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اسے بھی ابتدا میں شامل کر دیا جائے چنانچہ وہ شامل کر دیا گیا ہے۔

میں نے ارادہ کیا تھا کہ مولانا کے اسلوب نگارش (سٹائل) کی نسبت اپنے تاثرات کے اظہار کی جرات کروں گا لیکن جب اس ارادے کو عمل میں لانے کے لیے تیار ہوا تو

معلوم ہوا کہ خاموشی کے سوا چارہ کار نہیں کیونکہ جتنا کچھ اور جیسا کچھ لکھنا چاہیے، اس کی یہاں گنجائش نہیں اور جس قدر لکھنے کی گنجائش ہے، وہ اظہار تاثرات کے لیے کافی نہیں۔ صرف اتنا اشارہ کر دینا چاہتا ہوں کہ فرانسیسی ادبیات میں ادب کی جس نوعیت کو "ادبِ اعلیٰ" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر اردو ادب میں اس کی کوئی مثال ہمیں مل سکتی ہے تو وہ صرف مولانا کی ادبیات ہیں۔

مولانا نے اپنے اسلوب نگارش کے مختلف ڈھنگ رکھے ہیں۔ کیونکہ ہر موضوع ایک خاص طرح کا اسلوب چاہتا ہے اور اسی اسلوب میں اس کا رنگ ابھر سکتا ہے۔ دینی مباحث کے لیے جو اسلوب تحریر موزوں ہوگا، تاریخ کے لیے موزوں نہ ہوگا۔ تاریخی مباحث جس طرزِ کتابت کے متقاضی ہوتے ہیں ضروری نہیں کہ ادبی نگارشات کے لیے بھی وہ موزوں ہو۔ عام حالت یہ ہے کہ ہر شخص ایک خاص طرح کا اسلوب تحریر اختیار کر لیتا ہے اور پھر جو کچھ لکھتا ہے، اسی رنگ میں لکھتا ہے لیکن مولانا کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے علم وذوق کے تنوع کی طرح اپنا اسلوب تحریر بھی مختلف قسموں کا رکھا ہے۔ عام دینی اور علمی مطالب کو وہ ایک خاص طرح کے اسلوب میں لکھتے ہیں۔ صحافت نگاری کے لیے انہوں نے ایک دوسرا اسلوب اختیار کیا ہے اور خالص ادبی انشاء پردازی کے لیے ان دونوں سے الگ طریق نگارش ہے۔

جس زمانے میں "الہلال" نکلا کرتا تھا تو اس میں کبھی کبھی وہ خالص ادبی قسم کی چیزیں بھی لکھا کرتے تھے۔ ان تحریروں میں انہوں نے ایک ایسا مجتہدانہ اسلوب اختیار کیا تھا جس کی کوئی دوسری مثال لوگوں کے سامنے موجود نہ تھی۔ اس اسلوب کے لیے اگر کوئی تعبیر اختیار کی جا سکتی ہے تو وہ صرف "شعرِ منثور" کی ہے یعنی وہ نثر میں شاعری کیا کرتے تھے۔ ان کی تحریر از سرتاپا شعر ہوتی تھی۔ صرف ایک چیز اس میں نہیں ہوتی تھی یعنی وزن اور اس لیے اسے نظم کی جگہ نثر کہنا پڑتا تھا۔

اس طرزِ تحریر کا ایک خاص طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی نثر کی شاعری کو شعرا کی نظم کی شاعری سے مخلوط ومربوط کر کے ترتیب دیتے تھے اور یہ اختلاط اور ارتباط اس طرح وجود میں آتا تھا کہ اشعار صرف مطالب کی مناسبت ہی سے نہیں آتے بلکہ بجائے خود مطالب کا ایک جز بن جاتے تھے۔ ایسا جز کہ اگر اسے الگ کر دیجیے تو خود نفسِ مطلب کا ایک ضروری اور لاینفک جز الگ ہو

جائے۔ اکثر حالتوں میں مطالب کا سلسلہ اس طرح پھیلتا تھا کہ پورا مضمون نثر کے چھوٹے چھوٹے پیراگرافوں سے مرکب ہوتا اور ہر پیراگراف کسی ایک شعر پر ختم ہوتا۔ یہ شعر نثر کے مطلب سے ٹھیک اسی طرح جڑا اور بندھا ہوا ہوتا جس طرح ایک ترکیب بند کا ہر بند ٹیپ کے کسی شعر سے وابستہ ہوتا ہے اور وہ شعر بند کا ایک ضروری جز بن جاتا ہے۔

لوگ نثر میں اشعار لاتے ہیں تو عموماً اس طرح لاتے ہیں کہ کسی جزئی مناسبت سے کوئی شعر یاد آ گیا اور کسی خاص محل میں درج کر دیا گیا لیکن مولانا اس قسم کی تحریرات میں جو شعر درج کریں گے، اس کی مناسبت محض جزئی مناسبت نہ ہو گی، بلکہ مضمون کا ایک ٹکڑا بن جائے گی۔ گویا خاص اسی محل کے لیے شاعر نے یہ شعر کہا ہے اور مطلب کا تقاضا پورا کرنے اور ادھوری بات کو مکمل کر دینے کے لیے اس کے بغیر چارہ نہیں ___ اس طرزِ تحریر پر وہی شخص قادر ہو سکتا ہے جو کامل درجے کا شاعرانہ فکر رکھنے کے ساتھ ساتھ، اساتذہ کے بے شمار اشعار بھی اپنے حافظہ میں محفوظ رکھتا ہو اور مطالب کی ہر قسم اور ہر نوعیت کے لیے جس طرح کے اشعار بھی مطلوب ہوں، فوراً حافظہ سے نکال لے سکتا ہو۔ پھر ساتھ ہی اس کا ذوق بھی اس درجہ سلیم اور بے داغ ہو کہ صرف اعلیٰ درجے کے اشعار ہی حافظہ قبول کرے اور حسنِ انتخاب کا معیار کسی حال میں بھی درجہ سے نہ گرے۔ اس اعتبار سے مولانا کے حافظے کا جو حال ہے، وہ ہم سب کو معلوم ہے۔ قدرت نے انہیں جو خصائص بخشے ہیں، شاید ان سب میں حافظے کی نعمتِ لازوال سب سے بڑی نعمت ہے۔ عربی، فارسی اور اردو کے کتنے اشعار ان کے حافظے میں محفوظ ہوں گے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔ غالباً خود انہیں بھی معلوم نہیں لیکن جوں ہی وہ قلم اٹھاتے ہیں اور مطالب کی مناسبتیں ابھرنے لگتی ہیں معاً ان کے حافظے کے بند کواڑ کھلنے شروع ہو جاتے ہیں اور پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم اور ہر نوعیت کے سینکڑوں شعر پرّا باندھے سامنے کھڑے ہیں۔ جس شعر کی جس جگہ ضرورت ہوئی، فوراً اسے نکالا اور انگوٹھی کے نگینے کی طرح مضمون میں جڑ دیا۔

عام علمی اور دینی مباحث کی تحریرات میں مولانا بہت کم اشعار لایا کرتے ہیں۔ صفحوں کے صفحے لکھ جائیں گے اور ایک شعر بھی نہیں آئے گا لیکن اس خاص اسلوبِ تحریر میں وہ اس کثرت کے ساتھ اشعار سے کام لیتے ہیں کہ ہر دوسری تیسری سطر کے بعد ایک شعر ضرور آ

جاتا ہے اور مطلب کے حسن و دل آویزی کا ایک نیا پیکر نمایاں کر دیتا ہے۔

قلعہ احمد نگر کے اکثر مکاتیب اسی طرز تحریر میں لکھے گئے ہیں۔ انہوں نے نثر میں شاعری کی ہے اور جس مطلب کو ادا کیا ہے، اس طرح کیا ہے کہ جدّتِ فکر، نقش آرائی کر رہی ہے اور وسعتِ تخیل رنگ و روغن بھر رہی ہے۔ اجتہادِ فکر اور تجدیدِ اسلوب مولانا کی عام اور ہمہ گیر خصوصیت ہے۔ قلم اور زبان کے ہر گوشے میں، وہ طرز عام سے اپنی روش الگ رکھیں گے اور الفاظ و تراکیب سے لے کر مطالب اور ادائے مطالب کے طرز تک ہر بات میں تقلید عام سے گریزاں اور اپنے مجتہدانہ انداز میں بے میل اور بے لچک نظر آئیں گے انہوں نے جس وقت سے قلم ہاتھ میں سنبھالا ہمیشہ پیش رو اور صاحب اسلوب رہے ہیں کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ کسی دوسرے پیش رو کے نقشِ قدم پر چلیں چنانچہ ان مکاتیب میں بھی ان کا مجتہدانہ انداز ہر جگہ نمایاں ہے۔ بغیر کسی اہتمام اور کاوش کے قلم برداشتہ لکھتے گئے ہیں لیکن قدرتِ بیان ہے جو بے ساختگی میں بھی ابھری چلی آتی ہے اور کاوش فکر ہے جو آمد میں بھی آورد سے زیادہ بنتی اور سنورتی رہتی ہے۔

ظرافت ہے تو وہ اپنی بے داغ لطافت رکھتی ہے، واقعہ نگاری ہے تو اس کی نقش آرائی کا جواب نہیں۔ فکر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند ہے۔

ان مکاتیب پر نظر ڈالتے ہوئے سب سے زیادہ اہم چیز جو سامنے آتی ہے، وہ مولانا کا دماغی پس منظر (بیک گراؤنڈ) ہے۔ اسی پس منظر پر افکار واحساسات کی تمام جلوہ طرازیوں نے اپنی جگہ بنائی ہے۔ ایک شخص ۹ راگست کی صبح کو بستر سے اٹھا تو اچانک اسے معلوم ہوا کہ وہ گرفتار شدہ قیدی ہے اور کسی لامعلوم مقام پر لے جایا جا رہا ہے۔ پھر ایک ایسی شدید فوجی نگرانی کے اندر جس کی کوئی پچھلی مثال ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ میں موجود نہیں اسے قلعہ احمد نگر کی ایک عمارت میں بند کر دیا جاتا ہے اور دنیا سے تمام علائق یک قلم منقطع ہو جاتے ہیں۔ وہ اس حادثہ کے چوبیس گھنٹے بعد دوسری صبح کو اٹھتا ہے اور قلم اٹھا کر خامہ فرسائی شروع کر دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن حالات کی تحریک، خیالات میں جنبش پیدا کرتی رہتی ہے اور جو کچھ دماغ میں ابھرتا ہے، بے روک نوکِ قلم کے حوالے ہو جاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایسے حوصلہ فرسا حالات میں ان کا دماغی پس

منظر کیا تھا اور وقت کے تمام مخالفانہ حالات کو کس نظر اور کس مقام سے دیکھ رہا تھا؟ یہی دماغی پس منظر ہے جس کی نوعیت سے ہر عظیم شخصیت کی عظمت کا اصل مقام دنیا کے آگے نمایاں ہوتا ہے، یہی کسوٹی ہے جس پر ہر انسانی عظمت کسی جا سکتی ہے اور یہی معیار ہے جو ہر انسان کی عظمت و پستی کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

ان مکاتیب میں مولانا نے خود کوشش کی ہے کہ اپنا دماغی پس منظر دنیا کے آگے رکھ دیں اور اسی لیے یہ غیر ضروری ہو گیا ہے کہ اس بارے میں بحث و نظر سے کام لیا جائے۔ میں صرف معاملے کے اس پہلو پر اہلِ نظر کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، خود کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

گزشتہ جولائی میں جونہی ان مکاتیب کی اشاعت کا اعلان ہوا، ملک کے ہر گوشے سے تقاضے ہونے لگے کہ ان کے ترجمے کا بھی سروسامان ہونا چاہیے۔ کلکتہ، بمبئی، دہلی، الہ آباد، کانپور اور پٹنہ کے پبلشروں کا تقاضا تھا کہ انگریزی، ہندی، گجراتی، بنگالی، تامل وغیرہ زبانوں میں ان کے ترجمے کی اجازت دے دی جائے۔ میں نے یہ تمام درخواستیں مولانا کی خدمت میں پیش کر دیں لیکن انہوں نے ترجمے کی اجازت نہیں دی۔ انہوں نے فرمایا کہ چند مکاتیب کے سوا یہ تمام مکاتیب ایک ایسے اسلوب میں لکھے گئے ہیں کہ ان کا کسی دوسری زبان میں صحت ذوق و معیار کے ساتھ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کیا جائے گا تو اصل کی ساری خصوصیات مٹ جائیں گی۔ چنانچہ اس وقت تک ترجمے کی اجازت کسی فرم کو نہیں دی گئی ہے۔ مولانا نے جس خیال سے ترجمے کو روکا ہے مجھے یقین ہے کہ اس سے ہر صاحبِ نظر اتفاق کرے گا۔ یہ نثر میں شاعری ہے اور شاعری ترجمے کی چیز نہیں ہوتی۔ البتہ دو چار مکتوب جو بعض فلسفیانہ اور تاریخی مباحث پر لکھے گئے ہیں، ترجمہ کیے جا سکتے ہیں انہیں مستثنیٰ کر دینا چاہیے۔

یہ تمام مکاتیب "صدیق مکرم" کے خطاب سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ "صدیق" تشدید کے ساتھ "صدّیق" نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض اشخاص پڑھنا چاہیں گے بلکہ بغیر تشدید کے ہے۔ "صداقۃ" عربی میں دوستی کو کہتے ہیں۔ "صَدِیْق" یعنی دوست۔

۱۱۔ اپریل ۱۹۴۳ء کے مکتوب کے آخر میں متمم بن نویرہ کے مرثیے کے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔

یہ مرثیہ اس نے اپنے بھائی مالک کی یاد میں لکھا تھا:

لقد لا منی عند القبور علی البکا   رفیقی لتذراف اللموع السّوا فک
فقال اتبکی کل قبر رایتہ   لقبر ثوی بین اللوی فالد کادک
فقلت لہٗ ان الشجایبعث الشجا   فدعنی، فھٰذا کلہ قبر مالک

ان اشعار کے مطلب کا خلاصہ یہ ہے:

''میرے رفیق نے جب دیکھا کہ قبروں کو دیکھ کر میرے آنسو بہنے لگتے ہیں تو اس نے مجھے ملامت کی۔ اس نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ اس ایک قبر کی وجہ سے جو ایک خاص مقام پر واقع ہے تو ہر قبر کو دیکھ کر رونے لگتا ہے؟ میں نے کہا، بات یہ ہے کہ ایک غم کا منظر دوسرے غم کی یاد تازہ کر دیا کرتا ہے، لہٰذا مجھے رونے دے، میرے لیے تو یہ تمام قبریں مالک کی قبریں بن گئی ہیں!''

''حکایت بے ستون وکوہ کن'' ایران کے قدیم آثار میں ایک اثر ''بے ستون'' کے نام سے مشہور ہے اور داستان سراؤں نے اسے فرہاد کوہ کن کی طرف منسوب کر دیا ہے مگر دراصل یہ ''بے ستون'' ہے۔ ''بہ ستون'' (بہستان یا باغستاں) ہے۔ فارسی قدیم میں ''باغ'' خدایا دیوتا کو کہتے ہیں یعنی یہ مقام ''خداؤں کی جگہ'' ہے۔

محمد اجمل خاں
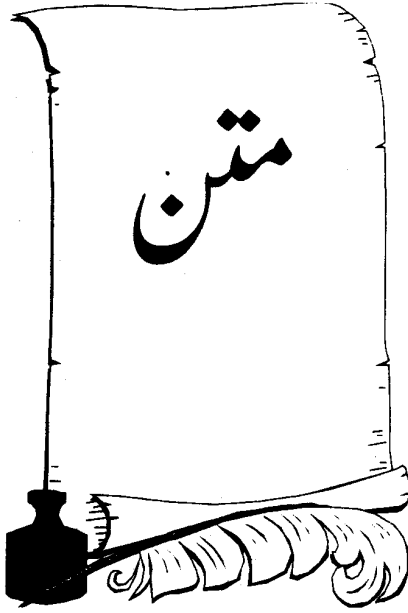
از

مولانا ابوالکلام آزاد

دیباچہ

میر عظمت اللہ بیخبر بلگرامی،[1] مولوی غلام علی آزاد بلگرامی[2] کے معاصر اور ہم وطن تھے اور جدّی رشتہ سے قرابت بھی رکھتے تھے۔ آزاد بلگرامی نے اپنے تذکروں میں جا بجا ان کا ترجمہ لکھا ہے اور سراج الدین علی خاں آرزو[3] اور آنند رام مخلص[4] کی تحریرات میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے۔ انہوں نے ایک مختصر سا رسالہ "غبار خاطر" کے نام سے لکھا تھا۔ میں یہ نام ان سے مستعار لیتا ہوں:

مُپرس تا چہ نوشت ست کلک قاصرِ ما
خطِ غبارِ من ست ایں غُبارِ خاطرِ ما!

یہ تمام مکاتیب نج کے خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کیے جائیں گے لیکن رہائی کے بعد جب مولوی محمد اجمل خاں صاحب[5] کو ان کا علم ہوا تو مُصر ہوئے کہ انہیں ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ چونکہ ان کی طرح ان کی خاطر بھی مجھے عزیز ہے اس لیے ان مکاتیب کی اشاعت کا سروسامان کر رہا ہوں۔ جس حالت میں یہ قلم برداشتہ لکھے ہوئے موجود تھے، اسی حالت میں طباعت کے لیے دے دیئے گئے ہیں۔ نظرِ ثانی کا موقع نہیں ملا۔

نسخہ ٔ شوق بہ شیرازہ نہ گنجد زنہار
بگوارید کہ ایں نسخہ ٔ مجزا ماند![6]

نیشنل ایئر لائن
(مابین کراچی۔ جودھپور)
۲ رفروری، ۱۹۴۶ء

ابوالکلام

رہائی کے بعد کے بعض مکاتیب نواب صدر یار جنگ کے نام

شملہ

۲۷/ جون ۱۹۴۵ء

(۱۰)

اے غائب از نظر کہ شُدی ہم نشینِ دل
می بینمت عیان و دعا می فرستمت[۱]

دل حکایتوں سے لبریز ہے مگر زبان درماندۂ فرصت کو یارائے سخن نہیں۔ مہلت کا منتظر ہوں[۲]۔

ابوالکلام

مولانا کا مکتوب سرینگر

ہاؤس بوٹ۔ سرینگر
۲۴؍اگست ۱۹۴۵ء

گہے از دست، گاہے از دل، وگاہے زپا مانم
بہ سُرعت می روی اے عمر! می ترسم کہ وا مانم[1]

(۱۱)

صدیق مکرم
زندگی کے بازار میں جنس مقاصد کی بہت سی جستجوئیں کی تھیں، لیکن اب ایک نئی متاع کی جستجو میں مبتلا ہو گیا ہوں یعنی اپنی کھوئی ہوئی تندرستی ڈھونڈ رہا ہوں۔ معالجوں نے وادیٔ کشمیر کی گل گشتوں میں سراغ رسانی کا مشورہ دیا تھا چنانچہ گزشتہ ماہ کے اواخر میں گلمرگ پہنچا اور تین ہفتہ تک مقیم رہا۔ خیال تھا کہ یہاں کوئی سراغ پا سکوں گا، مگر ہر چند جستجو کی، متاع گم گشتہ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

نکل گئی ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے —

آپ کو معلوم ہے کہ یہاں فیضی نے کبھی بارِ عیش کھولا تھا:

ہزار قافلۂ شوق می کشد شبگیر،
کہ بارِ عیش کشاید بخطہ کشمیر[2]

(۱۲)

لیکن میرے حصے میں ناخوشی و علالت کا بار آیا۔ یہ بوجھ جس طرح کاندھوں پر اُٹھائے آیا تھا، اُسی طرح اُٹھائے واپس جا رہا ہوں۔ خود زندگی بھی سرتاسر ایک بوجھ ہی ہے۔ خوشی سے اٹھائیں یا ناخوشی سے، مگر جب تک بوجھ سر پر پڑا ہے، اُٹھانا ہی پڑتا ہے:

(۱۳) مازندہ ازانیم کہ آرام نہ گیریم![3]

گلمرگ سے سرینگر آ گیا ہوں اور ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں۔ کل گلمرگ سے روانہ ہو رہا تھا کہ ڈاک آئی اور اجمل خاں صاحب نے آپ کا مکتوبِ منظوم حوالہ کیا۔ کہہ نہیں سکتا کہ اس پیامِ محبت کو دلِ دردمند نے کن آنکھوں سے پڑھا اور کن کانوں سے سنا۔ میرا اور آپ کا معاملہ تو وہ ہو گیا ہے جو غالب نے کہا تھا:[4]

(۱۴) باچوں توئی معاملہ، برخویش منت ست
از شکوۂ تو شکرگزارِ خودیم ما!

آپ نے اپنے تین شعروں کا پیامِ دلنواز نہیں بھیجا ہے لطف وعنایت کا ایک پورا دفتر کھول دیا ہے:

(۱۵) قلیل منک یکفینی، ولا کن
قلیلک لا یقال لہ، قلیل[5]

ان سطور کو آیندہ خامہ فرسائیوں کی تمہید تصور کیجیے۔ رہائی کے بعد جو کہانی سنانی تھی وہ ابھی تک نوکِ قلم سے آشنا نہ ہو سکی۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابوالکلام

مکتوبِ نسیم باغ

نسیم باغ۔ سرینگر
۳؍ستمبر ۱۹۴۵ء

(۱۶)
ازما مپرس دردِ دل، ما کہ یک زماں
خودرا بحیلہ پیشِ تو خاموش کردہ ایم[1]

صدیق مکرم
وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں۔ داہنی طرف جھیل کی وسعت شالامار اور نشاط باغ تک پھیلی ہوئی ہے[2]۔ بائیں طرف نسیم باغ کے چناروں کی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں۔ چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔

(۱۷)
گرچہ دُوریم، بیادِ تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی[3]

گرفتاری سے پہلے آخری خط جو آپ کے نام لکھ سکا تھا، وہ ۳؍اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کا تھا۔ کلکتہ سے بمبئی جا رہا تھا۔ ریل میں خط لکھ کر رکھ لیا کہ بمبئی پہنچ کر اجمل خاں صاحب کے حوالے کر دوں گا۔ وہ نقل کر کے آپ کو بھیج دیں گے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ انہوں نے خطوط کی نقول رکھنے پر اصرار کیا تھا اور میں نے یہ طریقہ منظور کر لیا تھا لیکن بمبئی پہنچتے ہی کاموں کے ہجوم میں اس طرح کھویا گیا کہ اجمل خاں صاحب کو خط دینا بھول گیا۔
۹؍اگست کی صبح کو جب مجھے گرفتار کر کے احمد نگر لے جا رہے تھے تو بعض کاغذات

رکھنے کے لیے راہ میں اٹاچی کیس کھولا اور یکایک وہ خط سامنے آ گیا۔ اب دنیا سے تمام علاقے منقطع ہو چکے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ کوئی خط ڈاک میں ڈالا جا سکے۔ میں نے اسے اٹاچی کیس سے نکال کر مسودات کی فائل میں رکھ دیا اور فائل کو صندوق میں بند کر دیا۔

دو بجے ہم احمد نگر پہنچے اور پندرہ منٹ کے بعد قلعہ کے اندر محبوس تھے۔ اب اس دنیا میں جو قلعہ سے باہر تھی اور اس دنیا میں جو قلعہ کے اندر تھی، برسوں کی مسافت حائل ہو گئی:

(۱۸)

كيف الوصول الىٰ سعاد و دونها
قلل الجبال وبينهن حتوف

دوسرے دن یعنی ۱۰ راگست کو حسب معمول صبح تین بجے اُٹھا۔ چائے کا سامان، جو سفر میں ساتھ رہتا ہے، وہاں بھی سامان کے ساتھ آ گیا تھا۔ میں نے چائے دم دی۔ فنجان سامنے رکھا اور اپنے خیالات میں ڈوب گیا۔ خیالات مختلف میدانوں میں بھٹکنے لگے تھے، اچانک وہ خط جو ۳ راگست کو ریل میں لکھا تھا اور کاغذات میں پڑا تھا، یاد آ گیا۔ بے اختیار جی چاہا کہ کچھ دیر آپ کی مخاطبت میں بسر کروں اور آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں، مگر روئے سخن آپ ہی کی طرف رہے۔ چنانچہ اس عالم میں ایک مکتوب قلم بند ہو گیا اور اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن مکتوبات قلم بند ہوتے رہے۔ آگے چل کر بعض دیگر احباب واعزّہ کی یاد بھی سامنے آئی اور ان کی مخاطبت میں بھی گاہ گاہ طبع واماندۂ حال درازنفسی کرتی رہی۔ قید خانہ سے باہر کی دنیا سے اب سارے رشتے کٹ چکے تھے اور مستقبل پردۂ غیب میں مستور تھا۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوبات کبھی مکتوب الیہم تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں۔ تاہم ذوق مخاطبت کی طلب گاریاں کچھ اس طرح دلِ مستمند پر چھا گئی تھیں کہ قلم اٹھا لیتا تھا تو پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا، کبھی بال کبوتر سے، میرے حصے میں عنقا آیا:

(۱۹)

ایں رسم وراہِ تازہ زحرمانِ عہدِ ماست
عنقا بروزگار کسے نامہ بر نہ بود [۴]

۱۰ راگست ۱۹۴۲ء سے مئی ۱۹۴۳ء تک ان مکتوبات کی نگارش کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس کے بعد رک گیا کیونکہ ۹ راپریل ۱۹۴۳ء کے حادثہ [۵] کے بعد طبع درماندۂ حال بھی رُک

گئی تھی اور اپنی واماندگیوں میں گم تھی۔ اگرچہ اس کے بعد بھی بعض مصنفات کی تسوید وترتیب کا کام بدستور جاری رہا اور قلعہ احمد نگر کی اور تمام معمولات بھی بغیر کسی تغیر کے جاری رہیں، تاہم یہ حقیقت حال چھپانی نہیں چاہتا کہ قرار و سکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی، جسم وصورت کی تھی، قلب و باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے ہلنے سے بچالیا تھا مگر دل کو نہیں بچاسکا تھا:

(۲۰) دلِ دیوانہ دارم کہ درصحراست پنداری[۱]

اِس کے بعد بھی گاہ گاہ حالات کی تحریک کام کرتی رہی اور رشتہ فکر کی گرہیں کھلتی رہیں، مگر اب سلسلہ کتابت کی وہ تیز رفتاری مفقود ہو چکی تھی جس نے اوائلِ حال میں طبیعت کا ساتھ دیا تھا۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں جب احمد نگر سے بانکوڑا میں قید تبدیل کر دی گئی تو طبیعت کی آمادگیوں نے آخری جواب دے دیا۔ اب صرف بعض مصنفات کی تکمیل کا کام جاری رکھا جاسکا اور کسی تحریر وتسوید کے لیے طبیعت مستعد نہ ہوئی۔ آخری مکتوب جو بعض سیاسی مسائل کی نسبت ایک عزیز کے نام قلم بند ہوا ہے ۳/ مارچ ۱۹۴۵ء کا ہے۔ اس مکتوب پر یہ داستانِ بے ستون وکوہکن ختم ہو جاتی ہے، اگرچہ زندگی کی داستان ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے:

(۲۱) شمہ از داستانِ عشقِ شور انگیز ماست
ایں حکایتہا کہ از فرہاد وشیریں کردہ اند[۲]

غور کیجیے تو انسان کی زندگی اور اس کے احساسات کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ تین برس کی مدّت ہو یا تین دن کی، مگر جب گزرنے پر آتی ہے تو گزر ہی جاتی ہے۔ گزرنے سے پہلے سوچیے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ پہاڑسی مدت کیونکر کٹے گی؟ گذرنے کے بعد سوچیے تو تعجب ہوتا ہے کہ جو کچھ گزر چکا، وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ تھا۔

رہائی کے بعد جب کانگرس ورکنگ کمیٹی کی صدارت کے لیے ۲۱ جون کو کلکتہ سے بمبئی آیا اور اسی مکان اور اُسی کمرہ میں ٹھہرا جہاں تین برس پہلے اگست ۱۹۴۲ء میں ٹھہرا تھا تو یقین کیجیے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے ۹/ اگست اور اس کے بعد کا سارا ماجرا کل کی بات ہے اور یہ پورا زمانہ ایک صبح شام سے زیادہ نہ تھا۔ حیران تھا کہ جو کچھ گزر چکا، وہ خواب تھا، یا جو کچھ گزر رہا ہے یہ خواب ہے:

ہیں خواب ہیں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں [8]

۱۵ر جون کو جب بانکوڑا میں رہا ہوا، تو تمام مکتوبات نکالے اور ایک فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کر دیئے۔ خیال تھا کہ اُنہیں حسب معمول نقل کرنے کے لیے دے دوں گا اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا لیکن جب مولوی اجمل خاں صاحب کو ان کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ بہت مُصر ہوئے کہ انہیں بلا تاخیر اشاعت کے لیے دے دینا چاہیے۔ چنانچہ ایک خوشنویس کو شملہ میں بُلایا گیا اور پورا مجموعہ کتابت کے لیے دے دیا گیا۔ اب کتابت ہو رہی ہے اور اُمید ہے کہ عنقریب طباعت کے لیے پریس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اب میں اُن مکتوبات کو قلمی مکتوبات کی صورت میں نہیں بھیجوں گا۔ مطبوعہ مجموعے کی صورت میں پیش کروں گا۔

شملہ میں اخبار "مدینہ" بجنور کے ایڈیٹر صاحب آئے تھے۔ انہوں نے مولوی اجمل خان صاحب سے اس سلسلہ کے پہلے مکتوب کی نقل لے لی تھی۔ وہ اخبارات میں شائع ہو گیا ہے شاید آپ کی نظر سے گذرا ہو۔ "صدیق مکرّم" کے تخاطب سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ رُوئے سخن آپ ہی کی طرف تھا:

(۲۲) چشم سوئے فلک و روئے سخن سُوئے تو بود [9]

مکتوبات کے دو حصے کر دیئے ہیں: غیر سیاسی اور سیاسی۔ یہ مجموعہ صرف غیر سیاسی مکاتیب پر مشتمل ہے۔ اس کے تمام مکاتیب بلا استثناء آپ کے نام لکھے گئے ہیں۔

پرسوں دہلی کا قصد ہے، چونکہ امریکن فوج کے جنرل مقیم دہلی نے از راہِ عنایت اپنے خاص ہوائی جہاز کے یہاں بھیجنے کا انتظام کر دیا ہے، اس لیے موٹر کار [10] کے تکلیف دہ سفر سے بچ جاؤں گا اور اڑھائی گھنٹے میں دہلی پہنچ جاؤں گا۔ وہاں عید کی نماز پڑھ کر بمبئی کے لیے روانہ ہونا ہے۔ ۱۰ سے ۲۴ تک بمبئی میں قیام رہے گا۔ [11]

ابوالکلام

مکتوب سفر

جو ۹ر اگست کی گرفتاری کی وجہ سے بھیجا نہ جاسکا اور جس کی طرف احمد نگر کے پہلے مکتوب میں اشارہ کیا گیا ہے۔

بمبئی میل (براہِ ناگپور)

۳ر اگست ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم

دہلی اور لاہور میں انفلوئنزا کی شدت نے بہت خستہ کر دیا تھا۔ ابھی تک اس کا اثر باقی ہے۔ سر کی گرانی کسی طرح کم ہونے پر نہیں آتی۔ حیران ہوں اس وبالِ دوش سے کیونکر سُبک دوش ہوں؟ دیکھیے "وبالِ دوش" کی ترکیب نے غالب کی یاد تازہ کر دی:

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں[1]

۲۹ر جولائی کو اِس وبال کے ساتھ کلکتہ واپس ہوا تھا۔ چار دن بھی نہیں گذرے کہ کل ۲ر اگست کو بمبئی کے لیے نکلنا پڑا۔ جو وبال ساتھ لایا تھا اب پھر اپنے ساتھ واپس لیے جا رہا ہوں:

رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں[2]

مگر دیکھیے، صبح چار بجے کے وقتِ گرانمایہ کی کرشمہ سازیوں کا بھی کیا حال ہے؟ قیام

کی حالت ہو یا سفر کی، ناخوشی کی کلفتیں ہوں یا دل آشوبی کی کاہشیں، جسم کی ناتوانیاں ہوں یا دل و دماغ کی افسردگیاں، کوئی حالت ہو لیکن اس وقت کی مسیحائیاں افتادگانِ بسترِ الم سے کبھی تغافل نہیں کرسکتیں:

(۲۳)
فیضے عجبے بیافتم از صبح ببینید،
ایں جادۂ روشن رہِ میخانہ نہ باشد[۳]

مَیں ایک کوپے[۴] میں سفر کر رہا ہوں۔ اِس میں چار کھڑکیاں ہیں؛ دو بند تھیں دو کُھلی تھیں۔ مَیں نے صبح اُٹھتے ہی دو بند بھی کھول دیں۔ اب ریل کی رفتار جتنی گرم ہوتی جاتی ہے اُتنی ہی ہوا کے جھونکوں کی خنکی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ جس بسترِ کرب پر ناخوشی☆ کی کلفتوں نے گرا دیا تھا، اُسی پر نسیمِ صبح گاہی کی چارہ فرمائیوں نے اب اُٹھا کے بٹھا دیا ہے۔ شاید کسی ایسی ہی رات کی صبح ہوگی، جب خواجہ شیراز کی زبان سے بے اختیار نکل گیا تھا:[۵]

(۲۴)
خوشش بادا نسیمِ صبح گاہی
کہ دردِ شب نشینان را دوا کرد

ٹرین آج کل کے معمول کے مطابق بے وقت جا رہی ہے۔ جس منزل سے اس وقت تک گزر جانا تھا، ابھی تک اس کا کوئی سراغ دکھائی نہیں دیتا۔ سوچتا ہوں تو اس معاملۂ خاص میں وقت کے معاملۂ عام کی پوری تصویر نمایاں ہو رہی ہے:

(۲۵)
کس نمی گویدم از منزلِ آخر خبرے
صد بیاباں بگزشت و دگرے در پیش است[۶]

رات ایک ایسی حالت میں کٹی جسے نہ تو اضطراب سے تعبیر کرسکتا ہوں، نہ سکون سے، آنکھ لگ جاتی تھی تو سکون تھا کھل جاتی تھی تو اضطراب تھا۔ گویا ساری رات دو متضاد خوابوں کے دیکھنے میں بسر ہوگئی۔ ایک تعمیر کی نقش آرائی کرتا تھا، دوسرا تخریب کی برہم زنی:

(۲۶)
بیداری میانِ دو خواب ست زندگی،
گردِ تخیل دو سراب ست زندگی
از لطمۂ دو موج حبابے دمیدہ است
یعنی طلسم نقش بر آب ست زندگی[۷]

☆ یہاں ''ناخوشی'' سے محض خوشی کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ فارسی کا ''ناخوشی'' مقصود ہے۔ فارسی میں بیماری کو ناخوشی کہتے ہیں۔

تین بج کر چند منٹ گزرے تھے کہ آنکھ کھل گئی۔ صبح کی چائے کے لیے سفر میں یہ معمول رہتا ہے کہ رات کو عبداللہ اسپرٹ کا چولہا اور پانی کی کیتلی، پانی بمقدارِ مطلوب [8] سے بھری ہوئی ٹیبل پر رکھ دیتا ہے۔ چائے دانی اس کے پہلو میں جگہ پاتی ہے کہ بحکم "وضع الشئی فی محلہ" یہی اس کا محلِ صحیح ہونا چاہیے مگر فنجان اور شکر دانی کے لیے اُس کا قرب ضروری نہ ہوا کہ "وضع الشئی فی غیر محلہ" میں داخل ہو جاتا۔ اگر صبح تین بج سے چار بجے کے اندر کوئی اسٹیشن آ جاتا ہے تو اکثر حالتوں میں عبداللہ آ کر چائے دم دے دیتا ہے نہیں آتا تو پھر خود مجھے ہی اپنے دستِ شوق کی کامجویانہ سرگرمیاں کام میں لانی پڑتی ہیں۔ "اکثر حالتوں" کی قید اس لیے لگانی پڑی کہ تمام کلیوں کی طرح یہ کلیہ بھی مستثنیات سے خالی نہیں ہے۔ بعض حالتوں میں گاڑی اسٹیشن پر رُک بھی جاتی ہے مگر عبداللہ کی صورت نظر نہیں آتی۔ پھر جب نظر آتی ہے تو اس کی معذرتیں میری فکرِ کاوش آشنا کے لیے ایک دوسرا ہی مسئلہ پیدا کر دیتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نسیم صبح گاہی کا ایک ہی عمل دو مختلف طبیعتوں کے لیے دو متضاد نتیجوں کا باعث ہو جاتا ہے۔ اس کی آمد مجھے بیدار کر دیتی ہے عبداللہ کو اور سُلا دیتی ہے۔ آلارم کی ٹائم پیس [9] بھی اس کے سرہانے رہنے لگی پھر بھی نتائج کا اوسط تقریباً یکساں ہی رہا۔ معلوم نہیں آپ اس اشکال کا حل کیا تجویز کریں گے مگر مجھے شیخ شیراز کا بتلایا ہوا حل مل گیا ہے اور اس پر مطمئن ہو چکا ہوں:

﴿۲۷﴾
یاراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شور بوم خس [10]

بہر حال چائے کا سامان حسبِ معمول مُرتب اور آمادہ تھا۔ نہیں معلوم آج اسٹیشن کب آئے؟ اور آئے بھی تو اس کا اطمینان کیونکر ہو کر عبداللہ کی آمد کا قاعدہ کلیہ آج ہی بحالت استثناء نمودار نہ ہو گا؟ میں نے دیا سلائی اٹھائی اور چولہا روشن کر دیا۔ اب چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔ مقصود اس تمام درازنفسی سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ مخاطبت کے لیے تقریبِ سخن ہاتھ آئے:

﴿۲۸﴾
نفسے بیادِ تو می زنم' چہ عبارت و چہ معانیم [11]

چائے بہت لطیف ہے۔ چین کی بہترین قسموں میں سے ہے۔ رنگ اِس قدر ہلکا

کہ واہمہ پر اس کی ہستی مشتبہ ہو جائے۔ گویا ابونواس والی بات ہوئی کہ :[12]

﴿۲۹﴾
رق الزجاج و رقت الخمر
فتشابها، فتشا کل الامر

کیف اس قدر تُند کہ بلا مبالغہ اُس کا ہر فنجان قا آنی کے رطلِ گراں کی یاد تازہ کر دے:

﴿۳۰﴾ ساقی بدہ رطلِ گراں، زاں مے کہ دہقاں پرورد[13]

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ چائے کے باب میں میرے بعض اختیارات ہیں۔ میں نے چائے کی لطافت و شیرینی کو تمبا کو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیفِ مرکّب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مَیں چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی متصلاً ایک سگریٹ بھی سُلگا لیا کرتا ہوں۔ پھر اس ترکیب خاص کا نقش عمل یوں جماتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چائے کا ایک گھونٹ لوں گا اور متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہوں گا۔ علمی اصطلاح میں اس صورت حال کو "علی سبیل التوالی والتعاقب" کہیے۔ اس طرح اس عمل کی ہر کڑی چائے کے ایک گھونٹ اور سگریٹ کے ایک کش کے باہمی امتزاج سے بتدریج ڈھلتی جاتی ہے اور سلسلہ کار دراز ہوتا رہتا ہے۔ مقدار کے حسن تناسب کا انضباط ملاحظہ ہو کہ ادھر فنجان آخری جُرعہ سے خالی ہوا ادھر تمبا کوئے آتش زدہ نے سگریٹ کے آخری خطِ کشید تک پہنچ کر دم لیا۔ کیا کہوں، ان دو اجزائے تند و لطیف کی آمیزش سے کیف و سرور کا کیسا معتدل مزاج ترکیب پذیر ہو گیا ہے۔ جی چاہتا ہے، فیضی کے الفاظ مستعار لُوں:

﴿۳۱﴾
اعتدال معانی از من پرس
کہ مزاجِ سخن شناختہ ام[14]

آپ کہیں گے، چائے کی عادت بجائے خود ایک علت تھی۔ اس پر مزید علت ہائے نافرجام کا اضافہ کیوں کیا جائے؟ اس طرح کے معاملات میں امتزاج و ترکیب کا طریقہ کام میں لانا، علتوں پر علتیں بڑھانا، گویا حکایت بادہ و تریاک کو تازہ کرنا ہے۔ میں تسلیم کروں گا کہ یہ تمام خود ساختہ عادتیں بلاشبہ زندگی کی تلخیوں میں داخل ہیں لیکن کیا کہوں جب کبھی معاملہ کے اس پہلو غور کیا، طبیعت اس پر مطمئن نہ ہو سکی کہ زندگی کو غلطیوں سے یکسر

معصوم بنا دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس روزگارِ خراب میں زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ضرور کرنی چاہییں:

(۳۲)
پیر ما گفت خطا در قلم صنع نہ رفت
آفریں بر نظر پاک خطا پوشش باد[15]

غور کیجیے وہ زندگی ہی کیا ہوئی جس کے دامنِ خشک کو کوئی غلطی تر نہ کر سکے؟ وہ چال ہی کیا جو لڑکھڑاہٹ سے یکسر معصوم ہو؟

(۳۳)
تو و قطعِ منازلہا، من و یک لغزشِ پائے[16]

اور پھر اگر غور و فکر کا ایک قدم اور آگے بڑھایئے تو سارا معاملہ بالآخر وہیں جا کر ختم ہو جائے گا جہاں کبھی عارف شیراز نے اسے دیکھا تھا:

(۳۴)
بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نہ شود
ز زُہد ہم چو توئی یا بفسق ہم چو منی[17]

اور اگر پُوچھیے کہ پھر کامرانئ عمل کا معیار کیا ہوا۔ اگر یہ آلودگیاں راہ میں مخل نہ سمجھی گئیں، تو اس کا جواب وہی ہے جو عرفاءِ طریق نے ہمیشہ دیا ہے:

(۳۵)
ترک ہمہ گیر و آشنائے ہمہ باش[18]

یعنی ترک و اختیار دونوں کا نقش عمل اس طرح ایک ساتھ بٹھایئے کہ آلودگیاں دامن تر کریں مگر دامن پکڑ نہ سکیں۔ اس راہ میں کانٹوں کا دامن سے الجھنا مخل نہیں ہوتا دامن گیر ہونا مخل ہوتا ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ آپ اس ڈر سے ہمیشہ اپنا دامن سمیٹے رہیں کہ کہیں بھیگ نہ جائے۔ بھیگتا ہے تو بھیگنے دیجیے لیکن آپ کے دست و بازو میں یہ طاقت ضرور ہونی چاہیے کہ جب چاہا، اس طرح نچوڑ کے رکھ دیا کہ آلودگی کی ایک بوند بھی باقی نہ رہے۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں[19]

یہاں کامرانی سود و زیاں کی کاوش میں نہیں ہے بلکہ سُود و زیاں سے آسودہ حال رہنے میں ہے۔ نہ تو تر دامنی کی گرانی محسوس کیجیے نہ خشک دامنی کی سُبک سری؛ نہ آلودہ دامنی پر پریشان حالی ہو، نہ پاک دامنی پر سرگرانی:

(۳۶)

ہم سمندر باش وہم ماہی کہ در اقلیم عشق
روئے دریا سلسبیل وقعرِ دریا آتش ست [۲۰]

آپ کو ایک واقعہ سناؤں۔ شاید رشتۂ سخن کی ایک گرہ اس سے کھل جائے۔ ۱۹۲۱ء میں جب مجھے گرفتار کیا گیا تو مجھے معلوم تھا کہ قید خانہ میں تمباکو کے استعمال کی اجازت نہیں۔ مکان سے جب چلنے لگا تو ٹیبل پر سگریٹ کیس دھرا تھا۔ عادت کے زیر اثر پہلے ہاتھ بڑھا کہ اسے جیب میں رکھ لوں، پھر صورتِ حال کا احساس ہوا تو رُک گیا لیکن پولیس کمشنر نے جو گرفتاری کا وارنٹ لے کر آیا تھا، بہ اصرار کہا کہ ضرور جیب میں رکھ لو۔ میں نے رکھ لیا اس میں دس سگریٹ تھے۔ ایک کمشنر پولیس کے آفس میں پیا، دوسرا راستہ میں سلگایا، دو ساتھیوں کو پیش کیے۔ چھ باقی رہ گئے تھے کہ پریسیڈنسی جیل علی پور پہنچا۔ جیل کے دفتر سے جب اندر جانے لگا تو خیال ہوا اس جیب کے وبال سے سبک جیب ہو کر اندر قدم رکھوں تو بہتر ہے۔ میں نے کیس نکالا اور مع سگریٹوں کے جیلر کی نذر کر دیا اور پھر اس دن سے لے کر دو برس تک سگریٹ کے ذائقہ سے کام و دہن آشنا نہیں ہوا۔ ساتھیوں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کے پاس سگریٹ کے ذخیرے موجود رہتے تھے اور قید خانہ کا احتساب عمداً چشم پوشی کرتا تھا۔ بعض شُربِ الیہود ☆ کا طریقہ کام میں لاتے تھے:

شربِ الیہود کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم [۲۱]

بعضوں کی جراتِ رندانہ اس قید و بند کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ:

ولا تسقنی سراً فقد امکن الجہر ☆☆

پر عمل کرتے تھے۔ مجھے یہ حال معلوم تھا مگر اپنی [۲۴] توبۂ اضطرار پر کبھی پشیمان نہیں ہوا۔ کئی مرتبہ گھر سے سگریٹ کے ڈبے آئے اور میں نے دوسروں کے حوالے کر دیئے:

(۳۷)

خوشم کہ توبۂ من نرخِ بادہ ارزاں کرد [۲۵]

سر گزشت کا اصلی واقعہ اب سُنیے۔ جس دن علی الصباح مجھے رہا کیا گیا تو قید خانہ کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ نے اپنا سگریٹ کیس نکالا اور از راہِ تواضع مجھے بھی پیش کیا۔ یقین کیجیے جس درجہ کے عزم کے ساتھ دو سال پہلے سگریٹ ترک کیا تھا اتنے ہی درجہ کی آمادگی

کے ساتھ یہ پیش کش قبول بھی کرلی۔ نہ ترک میں دیر لگی تھی نہ اب اختیار میں جھجک ہوئی۔ نہ محرومی پر ماتم ہوا تھا، نہ حصول پر نشاط[۲۶] ہوا۔ ترک کی تلخ کامی نے جو مزہ دیا تھا وہی اب اختیار کی حلاوت میں محسوس ہونے لگا تھا:

حریف صافی و دُردی نۂ ، خطا ایں جاست
تمیزِ ناخوش و خوش می کنی بلا ایں جاست[۲۷]

۱۹۲۱ کے بعد پھر تین مرتبہ قید و بند کا مرحلہ پیش آیا لیکن ترک کی ضرورت پیش نہ آئی کیونکہ سگریٹ کے ڈبے میرے سامان میں ساتھ گئے۔ وہ دیکھے گئے، مگر روکے نہیں گئے۔ اگر روکے جاتے تو پھر ترک کر دیتا۔

اب قلم کی سیاہی جواب دینے لگی ہے اس لیے رُک جاتا ہوں:

(۳۹) قلم ایں جا رسید و سَر بشکست ![۲۸]

ابوالکلام

☆ اسلامی حکومتوں میں یہودی پوشیدہ شراب بناتے تھے اور بیچتے تھے، اس لیے پوشیدہ شراب پینے کے معنی میں ''شرب الیہود'' کی اصطلاح رائج ہوگئی۔

☆☆ پورا شعر یہ ہے[۲۲]:

الا فاسقنی خمراً ، و قل لی هی الخمر
ولا تسقنی سراً فقد اَ مکن الجهر

''مجھے شراب پلا اور یہ کہہ کر پلا کہ یہ شراب ہے۔ مجھے چھپا کر نہ پلا کیونکہ اب کھل کر پینا ممکن ہوگیا ہے۔[۲۳]

داستان بے ستون وکوہ کن

قلعہ احمد نگر

۱۰ راگست ۱۹۴۲ء

از ساز و برگِ قافلۂ بے خوداں مپرس
بے نالہ می رود جرسِ کاروانِ ما ![1]

صدیق مکرم

کل صبح تک وسعت آباد بمبئی میں فرصتِ تنگ حوصلہ کی بے مایگی کا یہ حال تھا کہ ۳ راگست کا لکھا ہؤا مکتوبِ سفر بھی اجمل خاں صاحب کے حوالہ نہ کرسکا کہ آپ کو بھیج دیں لیکن آج قلعہ احمد نگر کے حصارِ تنگ میں اس کے حوصلۂ فراخ کی آسودگیاں دیکھیے کہ جی چاہتا ہے، دفتر کے دفتر سیاہ کردوں:

وسعتے پیدا کن اے صحرا کہ امشب در غمش
لشکرِ آہِ من از دل خیمہ بیروں می زند[2]

نو مہینے ہوئے، ۴ ردسمبر ۱۹۴۱ء کو نینی کے مرکزی قید خانہ کا دروازہ میرے لیے کھولا گیا تھا۔ کل ۹ راگست ۱۹۴۲ء کو سوا دو بجے قلعہ احمد نگر کے حصارِ کہنہ کا نیا پھاٹک میرے پیچھے بند کردیا گیا۔ اِس کارخانۂ ہزار شیوہ ورنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں تاکہ بند ہوں اور کتنے ہی بند کیے جاتے ہیں تاکہ کھلیں، نو ماہ کی مدت بظاہر کوئی بڑی مدت نہیں معلوم ہوتی:

دو کروٹیں ہیں عالم غفلت میں خواب کی ![3]

لیکن سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تاریخ کی ایک پوری داستان گزر چکی:

(۴۲) چوں صفحہ تمام شد، ورق برگردد [۴]

نئی داستان جو شروع ہو رہی ہے، معلوم نہیں مستقبل اسے کب اور کس طرح ختم کرے گا:

(۴۳) فریب جہاں قصۂ روشن ست
بہ بیں تا چہ زاید، شب آبستن ست [۵]

۴/ اگست کو بمبئی پہنچا تو انفلوئنزا کی حرارت اور سر کی گرانی کا اضمحلال بھی میرے ساتھ تھا۔ تاہم پہنچتے ہی کاموں میں مشغول ہو جانا پڑا۔ طبیعت کتنی ہی بے کیف ہو لیکن گوارا نہیں کرتی کہ اوقات کے مقررہ نظام میں خلل پڑے۔ ۴ سے ۷/ اگست تک ورکنگ کمیٹی [۶] کے اجلاس ہوتے رہے۔ ۷ کی دوپہر سے آل انڈیا کمیٹی شروع ہوئی۔ معاملات کی رفتار ایسی تھی کہ کارروائی تین دن تک پھیل سکتی تھی اور مقامی کمیٹی نے تین ہی دن کا انتظام بھی کیا تھا لیکن میں نے کوشش کی کہ دو دن سے زیادہ بڑھنے نہ پائے۔ ۸ کو دو بجے سے رات کے گیارہ بجے تک بیٹھنا پڑا لیکن کارروائی ختم کر کے اُٹھا:

کام تھے عشق میں بہت، پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے [۷]

تھکا ماندہ قیام گاہ پر پہنچا تو صاحب مکان [۸] کو منتظر اور کسی قدر متفکر پایا۔ یہ صاحب کچھ عرصہ سے بیمار ہیں اور ایک طرح کی دماغی الجھن میں مبتلا رہتے ہیں۔ میں ان سے وقت کے معاملات کا تذکرہ بچا جاتا تھا تاکہ ان کی دماغی الجھن اور زیادہ نہ بڑھ جائے۔ وہ ورکنگ کمیٹی [۹] کی ممبری سے بھی مستعفی ہو چکے ہیں اور اگرچہ میں نے ابھی تک ان کا استعفاء منظور نہیں کیا ہے، لیکن انہیں کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کے لیے کہا بھی نہیں۔ وہ کہنے لگے فلاں شخص شام کو آیا تھا، کئی گھنٹے منتظر رہ کر ابھی گیا ہے اور یہ پیام دے گیا ہے کہ ”گرفتاری کی افواہیں غلط نہ تھیں۔ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ تمام انتظامات کر لیے گئے ہیں۔ آج رات کسی وقت یہ معاملہ ضرور پیش آئے گا۔“ دو ہفتے سے گرفتاری کی افواہیں دہلی سے کلکتہ تک ہر شخص کی زبان پر تھیں۔ میں سنتے سنتے تھک گیا تھا:

(۴۴)
یا وفا، یا خبرِ وصلِ تو، یا مرگِ رقیب
بازی چرخ ازیں یک دوسہ کارے بکند [۱۰]

اور کچھ اس بات کا بھی خیال تھا کہ ان کی ماؤف طبیعت کو اس طرح کی فکروں سے پریشان نہ ہونے دوں۔ میں نے جھنجھلا کر کہا جس طرح کے حالات درپیش ہیں ان میں اس طرح کی افواہیں ہمیشہ اُڑا ہی کرتی ہیں۔ ایسی خبروں کا اِعتبار کیا؟ مجھے جلد کچھ کھا کر سو جانے دیجیے کہ آدھی رات جواب باقی رہ گئی ہے ہاتھ سے نہ جائے اور چند گھنٹے آرام کرلوں :

(۴۵)
گر غم خوریم خوش نہ بود، بہ کہ مے خوریم! [۱۱]

حسب معمول چار بجے اُٹھا، لیکن طبیعت تھکی ہوئی اور سر میں سخت گرانی تھی۔ میں نے جن اسپرین (Gen Aspirin) کی دو گولیاں منہ میں ڈال کر چائے پی اور قلم اٹھایا کہ بعض ضروری خطوں کا مسودہ لکھ لوں جورات کی تجویز کے ساتھ پریسیڈنٹ روز ویلٹ وغیرہ کو بھیجنا طے پایا تھا۔ سامنے سمندر میں بھاٹا ختم ہو چکا تھا اور اس کے ختم ہوتے ہی رات بھر کی امس بھی ختم ہوگئی تھی۔ اب جوار کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں اور ہوا کے ٹھنڈے اور نم آلود جھونکے بھیجنے لگی تھیں۔ کچھ تو جن اسپرین نے کام کیا ہوگا، کچھ نسیم صبح گاہی کے اِن شفا بخش جھونکوں نے چارہ فرمائی کی۔ ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے سر کی گرانی کم ہو رہی ہے پھر افاقہ کیا اس احساس نے اچانک غنودگی کی سی حالت طاری کردی :

نسیم صبح ! تیری مہربانی! [۱۲]

بے اختیار ہو کر قلم رکھ دیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ پھر اچانک ایسا محسوس ہوا، جیسے سڑک پر سے موٹر کاریں گزر رہی ہوں۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ کئی کاریں مکان کے احاطہ میں داخل ہوگئی ہیں اور اُس بنگلے کی طرف جا رہی ہیں جو مکان کے پچھواڑے میں واقع ہے اور جس میں صاحب مکان کا لڑکا دھیرو [۱۳] رہتا ہے۔ پھر خیال ہوا میں خواب دیکھ رہا ہوں اور اس کے بعد گہری نیند میں ڈوب گیا :

(۴۶)
زہے مراتب خوابے کہ بہ زبیداری ست! [۱۴]

شاید اس حالت پر دس بارہ منٹ گزرے ہوں گے کہ کسی نے میرا پیر دبایا۔ آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں دھیرو ایک کاغذ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے، دو فوجی افسر ڈپٹی

کمشنر پولیس کے ساتھ آئے ہیں اور یہ کاغذ لائے ہیں۔ گو اتنی ہی خبر میرے لیے کافی تھی، مگر میں نے کاغذ لے لیا کہ دیکھوں:

کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی؟ [15]

میں نے دھیرو سے کہا، مجھے ڈیڑھ گھنٹہ تیاری میں لگے گا۔ اِن سے کہہ دو کہ انتظار کریں۔ پھر غسل کیا، کپڑے پہنے، چند خطوط لکھے اور باہر نکلا تو پانچ بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے:

(47) کارِ مشکل بود، ما بر خویش آساں کردہ ایم ! [16]

کار باہر نکلی تو صبح مسکرا رہی تھی۔ سامنے دیکھا تو سمندر اچھل اچھل کر ناچ رہا تھا۔ نسیم صبح کے جھونکے احاطہ کی روشنی میں پھرتے ہوئے ملے۔ یہ پھولوں کی خوشبو چن چن کر جمع کر رہے تھے اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلاتا رہے۔ ایک جھونکا کارِ میں سے ہو کر گزرا تو بے اختیار حافظ کی غزل یاد آ گئی [17]:

(48)
صبا وقتِ سحر بوئے ز زلف یارمی آورد
دلِ شوریدۂ ماراز نو در کارمی آورد !

کار وکٹوریہ ٹرمینس [18] اسٹیشن پر پہنچی تو اس کا پچھلا حصّہ ہر طرف سے فوجی پہرہ کے حصار میں تھا اور اگرچہ لوکل ٹرینوں کی روانگی کا وقت گزر رہا تھا لیکن مسافروں کا داخلہ روک دیا گیا تھا۔ صرف ایک پلیٹ فارم پر کچھ ہل چل دکھائی دیتی تھی کیونکہ ایک انجن رسٹورنٹ [19] کار کو دھکیل دھکیل کر ایک ٹرین سے جوڑ رہا تھا۔ معلوم ہوا یہی کاروانِ خاص ہے جو ہم زندانیوں کے لیے طیار کیا گیا ہے۔ گاڑیاں کوریڈور کیریج (Corridor Carriage) قسم کی لگائی گئی تھیں جو آپس میں جڑ جاتی ہیں اور آدمی ایک سرے سے دوسرے سرے تک اندر ہی اندر چلا جا سکتا ہے۔ ٹرین کے اندر گیا تو معلوم ہوا کہ گرفتاریوں کا معاملہ پوری وسعت کے ساتھ عمل میں لایا گیا ہے۔ بہت سے آ چکے ہیں جو نہیں آئے وہ آتے جاتے ہیں:

بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں [20]

بعض احباب مجھ سے پہلے پہنچائے جا چکے تھے ان کے چہروں پر بے خوابی اور ناوقت کی بیداری بول رہی تھی۔ کوئی کہتا تھا رات دو بجے سویا اور چار بجے اٹھا دیا گیا کوئی کہتا

تھا بہ مشکل ایک گھنٹہ نیند کا ملا ہوگا۔ میں نے کہا، معلوم نہیں، سوئی ہوئی قسمت کا کیا حال ہے؟ اُسے بھی کوئی جگانے کے لیے پہنچا یا نہیں؟

﴿۴۹﴾

درازئ شب و بیداریٔ من ایں ہمہ نیست
زبختِ من خبر آرید تا کجا خفتست [۲۱]

بہر حال وقت کی گرمجوشیوں میں یہ شکایتیں مخل نہیں ہو سکتی تھیں چونکہ رسٹورنٹ کار لگ چکی تھی اور چائے کے لیے پوچھا گیا تھا، اس لیے کو پی چکا تھا لیکن پھر منگوائی اور ان نیند کے متوالوں کو دعوت دی کہ اس جام صبح گاہی سے بادۂ دوشینہ کا خمار مٹائیں:

﴿۵۰﴾

بنوش مے چوسبک روحی اے حریف مدام
علی الخصوص دریں دم کہ سرگراں داری! [۲۲]

یہاں "بادۂ دوشینہ" کی ترکیب محض "جام صبح گاہی" کی مناسبت سے زبان قلم پر طاری ہوگئی۔ مگر غور کیجیے کتنی مطابق حال واقع ہوئی ہے؟ صرف ایک شام اور صبح کے اندر صورت حال کیسی منقلب ہوگئی؟ کل شام کو جو بزم کیف و سرور آراستہ ہوئی تھی، اس کی بادہ گساریوں اور سیہ مستیوں نے دوپہر رات تک طول کھینچا تھا لیکن اب صبح کے وقت دیکھیے تو:

نے وہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے [۲۳]

رات کی تردماغیوں کی جگہ صبح کی سرگرانیوں نے لے لی اور مجلس دوشین کی دست افشانیوں اور پاکوبیوں کے بعد جب آنکھ کھلی تو اب صبح خمار کی افسردہ جماہیوں کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا تھا:

﴿۵۱﴾

خمیازہ سنج تہمت عیش رمیدہ ام
مے آں قدر نہ بود کہ رنج خمار بُرد

رات کی کیفیتیں جتنی تندو تیز ہوتی ہیں، صبح کا خمار بھی اتنا ہی سخت ہوتا ہے۔ اگر رات کی سیہ مستیوں کے بعد اب صبح خمار کی تلخ کامیوں سے سابقہ پڑا تھا تو ایسا ہونا ناگزیر تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم شکوہ سنج ہوتے۔ البتہ حسرت اس کی رہ گئی کہ جب ہونا یہی تھا تو کاش، جی کی ہوس تو پوری نکال لی ہوتی اور نیچے تلے پیمانوں کی جگہ شیشوں کے شیشے لنڈھا دیے ہوتے۔ خواجہ میر درد کیا خوب کہہ گئے ہیں: [۲۴]

کبھی خوش بھی کیا ہے جی کسی رند شرابی کا
بھڑا دے منہ سے منہ ساقی! ہمارا اور گلابی کا

ساڑھے سات بج چکے تھے کہ ٹرین نے کوچ کی سیٹی بجائی۔ حافظ کی مشہور غزل کا یہ شعر کم از کم سینکڑوں مرتبہ تو پڑھا اور سنا ہوگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا اصلی لطف اُسی وقت آیا:

(۵۲)
کس نہ دانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے مے آید![۲۵]

بمبئی میں جو افواہیں گرفتاری سے پہلے پھیلی ہوئی تھیں، اُن میں احمد نگر کے قلعہ اور پونا کے آغا خاں پیلس کا نام تعیّن کے ساتھ لیا جا رہا تھا۔ جب کلیان اسٹیشن سے ٹرین آگے بڑھی اور پونا کی راہ اختیار کی تو سب کو خیال ہوا غالباً منزلِ مقصود پونا ہی ہے لیکن جب پونا قریب آیا تو ایک غیر آباد اسٹیشن پر صرف بعض رفقاء اُتار لیے گئے اور بمبئی کے مقامی قافلہ کو بھی اُترنے کے لیے کہا گیا، مگر ہم سے کچھ نہیں کہا گیا اور صدائے جرس نے پھر کوچ کا اعلان کر دیا:

(۵۳)
جرس فریادمی دارد کہ بربندید محملہا[۲۶]

اب احمد نگر ہر شخص کی زبان پر تھا۔ کیونکہ اگر پونا میں ہم نہیں اُتارے گئے تو پھر اس رُخ پر احمد نگر کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ ایک صاحب نے جو انہی اطراف کے رہنے والے ہیں بتلایا کہ پونا اور احمد نگر کا باہمی فاصلہ ستر اسّی میل سے زیادہ نہیں، اس لیے زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے کا سفر اور سمجھنا چاہیے۔ مگر میرا خیال دوسری ہی طرف جا رہا تھا۔ احمد نگر یقیناً دُور نہیں ہے۔ بہت جلد آ جائے گا۔ مگر احمد نگر پر سفر ختم کب ہوتا ہے؟ احمد نگر سے تو شروع ہوگا۔ بے اختیار ابو العلاء معری کا لامیہ یاد آ گیا:[۲۷]

(۵۴)
فیا دارھا بالخیف، اِنّ مزارھا
قریبٌ ولٰکن دون ذٰلک اھوال[۲۸]

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملک کے تقریباً تمام تاریخی مقامات دیکھنے میں آئے مگر قلعہ احمد نگر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ جب بمبئی میں تھا تو قصد بھی کیا تھا مگر پھر

حالات نے مہلت نہ دی۔ یہ شہر بھی ہندوستان کے اُن خاص مقامات میں سے ہے جن کے ناموں کے ساتھ صدیوں کے اِنقلابوں کی داستانیں وابستہ ہوگئی ہیں۔ پہلے یہاں بھینگر نامی ندی کے کنارے ایک اسی نام کا گاؤں [۲۸] آباد تھا۔ پندرھویں صدی مسیحی کے اواخر میں جب دکن کی بہمنی حکومت کمزور پڑگئی تو ملک احمد نظام الملک بھیری [۲۹] نے علم استقلال بلند کیا اور بھینگر کے قریب احمد نگر کی بنیاد ڈال کر جنیر کی جگہ اُسے حاکم نشین شہر بنایا۔ اس وقت سے نظام شاہی مملکت کا دارالحکومت یہی مقام بن گیا۔ فرشتہ، جس کا خاندان مازندران سے آکر یہیں آباد ہوا تھا لکھتا ہے۔ [۳۰] چند برسوں کے اندر اس شہر نے وہ رونق و وسعت پیدا کرلی تھی کہ بغداد اور قاہرہ کا مقابلہ کرنے لگا تھا:

(۵۵)

کس پایمال آفتِ فرسودگی مباد
دیروز ریگ بادیہ آئینہ خانہ بود

ملک احمد نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا، اُس کا حصار مٹی کا تھا۔ اس کے لڑکے برہان نظام شاہ اوّل [۳۱] نے اسے منہدم کر کے ازسرِ نو پتھر کا حِصار تعمیر کیا اور اسے اس درجہ بلند اور مضبوط بنایا کہ مِصر اور ایران تک اس کی مضبوطی کا غلغلہ پہنچا۔ ۱۸۰۳ء کی دوسری جنگ مرہٹہ میں جب جنرل ویلزلی نے (جو آگے چل کر ڈیوک آف ویلنگٹن ہوا) اس کا معائنہ کیا تھا تو اگرچہ تین سو برس کے انقلابات سہہ چکا تھا، پھر بھی اس کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے مراسلہ میں لکھا تھا کہ دکن کے تمام قلعوں میں صرف ویلور کا قلعہ ایسا ہے جسے مضبوطی کے لحاظ سے اس پر ترجیح دی جاسکتی ہے:

(۵۶)

کارواں رفتہ واندازۂ جاہش پیداست
زاں نشان ہا کہ بہ ہر راہگوار افتادست [۳۲]

یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن چاند بی بی [۳۳] نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگار زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں اور جنہیں تاریخ نے پتھر کی سِلوں سے اُتار کر اپنے اوراق و دفاتر میں محفوظ کرلیا ہے:

بیفشاں جرعہ بر خاک و حالِ اہل شوکت بیں
کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارو [۳۴]

اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم[۳۵] خان خاناں کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا تھا جس کی سرگزشت عبدالباقی نہاوندی[۳۶] اور صمصام الدّولہ[۳۷] نے ہمیں سنائی ہے جب احمد نگر کی مدد پر بیجا پور اور گولکنڈہ کی فوجیں بھی آگئیں اور خانخاناں کی قلیل التعداد فوج کو سہیل حبشی کی طاقتور فوج سے ٹکرانا پڑا تو دولت خاں لودی نے پوچھا تھا، ''چنیں انبوہے درپیش [است] وفتح آسمانی۔ اگر [شکست] رود ہد جائے نشاں دہید کہ [ما] شمارا دریا بیم۔'' خانخاناں نے جواب دیا تھا ''زیر لاشہا''۔[۳۸]

(۵۸)

وَنَحْنُ اِناسٌ تَوَسَّطَ بیننا
لنا الصّدرُ دُونَ العالمین اَو القبر[۳۹]

احمد نگر کے نام نے حافظہ کے کتنے ہی بھولے ہوئے نقوش یکا یک تازہ کر دیئے۔ ریل تیزی کے ساتھ دوڑی جا رہی تھی۔ میدان کے بعد میدان گزرتے جاتے تھے۔ ایک منظر پر نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا اور ایسا ہی ماجرا میرے دماغ کے اندر بھی گزر رہا تھا۔ احمد نگر اپنی چھ سو برس کی داستان کہن لیے ورق پر ورق اُلٹتا جاتا۔ ایک صفحہ پر ابھی نظر جمنے نہ پاتی کہ دوسرا سامنے آجاتا:

(۵۹)

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

مجھے خیال ہوا، اگر ہمارے قید و بند کے لیے یہی جگہ چنی گئی ہے تو انتخاب کی موزونیت میں کلام نہیں۔ ہم خراباتیوں کے لیے کوئی ایسا ہی خرابہ ہونا تھا:

(۶۰) با یک جہاں کدورت، باز ایں خرابہ جائیست[۴۰]

دو بجنے والے تھے کہ ٹرین احمد نگر پہنچی۔ اسٹیشن سناٹا تھا۔ صرف چند فوجی افسر ٹہل رہے تھے۔ انہی میں مقامی چھاؤنی کا کمانڈنگ آفیسر بھی تھا، جس سے ہمیں ملایا گیا۔ ہم اُترے اور فوراً اسٹیشن سے روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے۔ راہ میں کوئی موڑ[۴۱] نہیں ملی میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ جب قدم اٹھا دیا، تو پھر کوئی موڑ نہیں ملتی۔ اگر مڑنا چاہیں تو صرف پیچھے ہی کی طرف مڑ سکتے ہیں لیکن پیچھے مڑنے کی راہ یہاں پہلے سے بند ہو جاتی ہے:

٦١

ہاں، رہ عشق ست، کج گشتن نہ دارد بازگشت
جرم را ایں جا عقوبت ہست، استغفار نیست[42]

اسٹیشن سے قلعہ تک کی مسافت زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ کی ہوگی۔ قلعہ کا حصار پہلے کسی قدر فاصلہ پر دکھائی دیا۔ پھر یہ فاصلہ چند لمحوں میں طے ہوگیا۔ اب اس دُنیا میں جو قلعہ سے باہر ہے اور اُس میں جو قلعہ کے اندر ہے صرف ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ چشم زدن میں یہ بھی طے ہوگیا اور ہم قلعہ کی دنیا میں داخل ہوگئے۔ غور کیجیے تو زندگی کی تمام مسافتوں کا یہی حال ہے خود زندگی اور موت کا باہمی فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا۔

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا[43]

قلعہ کی خندق، جس کی نسبت ابوالفضل[44] نے لکھا ہے کہ چالیس گز چوڑی اور چودہ گز گہری تھی اور جسے ۱۸۰۳ء میں جنرل ویلزلی نے ایک سو آٹھ فٹ تک چوڑا پایا تھا مجھے دکھائی نہیں دی۔ غالباً جس رُخ سے ہم داخل ہوئے اس طرف پاٹ دی گئی ہے۔ اس کا بیرونی کنارہ جو کھدائی کی خاک ریز سے اس قدر اونچا کر دیا گیا تھا کہ قلعہ کی دیوار چھپ گئی تھی، وہ بھی اس رخ پر نمایاں نہ تھا۔ ممکن ہے کہ وہ صورت اب باقی نہ رہی ہو۔

قلعہ کے اندر پہلے موٹر لاریوں کی قطار ملی، پھر ٹینکوں[45] کی۔ اس کے بعد ایک احاطہ کے سامنے جو قلعہ کی عام سطح سے چودہ پندرہ فٹ بلند ہوگا اور اس لیے چڑھائی پر واقع ہے، کاریں رُک گئیں اور ہمیں اترنے کے لیے کہا گیا۔ یہاں انسپکٹر جنرل پولیس بمبئی نے جو ہمارے ساتھ آیا تھا، ہمارے ناموں کی فہرست کمانڈنگ آفیسر کے حوالہ کی۔ وہ فہرست لے کر دروازہ کے پاس کھڑا ہوگیا۔ یہ گویا ہماری سپردگی کی باضابطہ رسم تھی۔ اب ہماری حفاظت کا سررشتہ حکومت بمبئی کے ہاتھ سے نکل کر فوجی انتظام کے ہاتھ آگیا اور ہم ایک دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں داخل ہوگئے:

در جستجوئے ما نہ کشی زحمتِ سراغ
جائے رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد[46]

دروازے کے اندر داخل ہوئے تو ایک مستطیل احاطہ سامنے تھا۔ غالباً دو سوفٹ لمبا اور ڈیڑھ سوفٹ چوڑا ہوگا۔ اس کے تینوں طرف بارک کی طرح کمروں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ کمروں کے سامنے برآمدہ ہے اور بیچ میں کھلی جگہ ہے۔ اگرچہ اتنی وسیع نہیں کہ اسے میدان کہا جا سکے، تاہم احاطہ کے زندانیوں کے لیے میدان کا کام دے سکتی ہے۔ آدمی کمرہ سے باہر نکلے گا تو محسوس کرے گا کہ کھلی جگہ میں آ گیا۔ کم از کم اتنی جگہ ضرور ہے کہ جی بھر کے خاک اڑائی جا سکتی ہے:

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے،
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے [۴۷]

صحن کے وسط میں ایک پختہ چبوترہ ہے جس میں جھنڈے کا مستول نصب ہے مگر جھنڈا اتار لیا گیا ہے۔ میں نے مستول کی بلندی دیکھنے کے لیے سر اٹھایا تو وہ اشارہ کر رہا تھا:

یہیں ملیں گے تجھے نالۂ بلند ترے [۴۸]

احاطہ کے شمالی کنارہ میں ایک پرانی ٹوٹی ہوئی قبر ہے۔ نیم کے ایک درخت کی شاخیں اس پر سایہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتیں۔ قبر کے سرہانے ایک چھوٹا سا طاق ہے۔ طاق اب چراغ سے خالی ہے مگر محراب کی رنگت بول رہی ہے کہ یہاں کبھی ایک دیا جلا کرتا تھا:

اسی گھر میں جلایا ہے چراغ آرزو برسوں [۴۹]

معلوم نہیں یہ کس کی قبر ہے؟ چاند بی بی کی ہو نہیں سکتی کیونکہ اس کا مقبرہ قلعہ سے باہر ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ بہر حال کسی کی ہو، مگر کوئی مجہول الحال شخصیت نہ ہوگی ورنہ جہاں قلعہ کی تمام عمارتیں گرائی تھیں، وہاں اسے بھی گرا دیا ہوتا۔ سُبحان اللہ! اس روزگار خراب کی ویرانیاں بھی اپنی آبادیوں کے کرشمے رکھتی ہیں! اس پرانی قبر کو ویران بھی ہونا تھا تو اس لیے کہ کبھی ہم زندانیانِ خراباتی کے شور و ہنگامہ سے آباد ہو:

کشتوں کا تیری چشم سیہ مست کے مزار
ہوگا خراب بھی، تو خرابات ہووے گا

مغربی رُخ کے تمام کمرے کھلے اور چشم براہ تھے۔ قطار کا پہلا کمرہ میرے حصے

میں آیا۔ میں نے اندر قدم رکھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ چار پائی پر، کہ بچھی ہوئی تھی دراز ہو گیا۔ نو مہینے کی نینداور تھکن میرے ساتھ بستر پر گری:

﴿٦٣﴾

ما گوشہ را نہ بہرِ قناعت گرفتہ ایم
تن پروری بہ گوشۂ خاطر رسیدہ است

تقریباً تین بجے سے چھ بجے تک سوتا رہا۔ پھر رات کو نو بجے تکیہ پر سر رکھا تو صبح تین بجے آنکھ کھولی:

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے [50]

تین بجے اُٹھا تو تازہ دم اور چست وچاق تھا۔ نہ سر میں گرانی تھی نہ انفلوئنزا کا نام و نشان تھا۔ فوراً بجلی کا آلۂ حرارت کام میں لایا اور چائے دم دی [51]۔ اب جام وصراحی سامنے دھرے بیٹھا ہوں۔ آپ کو مخاطب تصور کرتا ہوں اور یہ داستانِ بے ستون وکوہکن سنا رہا ہوں:

﴿٦٤﴾

شیریں تراز حکایت مانیست قصہ
تاریخ روزگار سراپا نوشتہ ایم [52]

مہینوں سے ایسی گہری اور آسودہ نیند نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل صبح بمبئی سے چلتے ہُوئے جو دامن جھاڑنا پڑا تھا تو علائق کی گرد کے ساتھ مہینوں کی ساری تھکن بھی نکل گئی تھی۔ یغمائے جندقی کیا خوب کہہ گیا ہے: [53]

﴿٦٥﴾

غلط گفتی "چرا سجادۂ تقویٰ گرو کر دی؟"
بزہد آلودہ بودم، گرنمی کردم چہ می کردم؟

یہ اُسی غزل کا شعر ہے جس کا ایک اور شعر جو مجتہد کاشان کی نسبت کہا تھا، بہت مشہور ہو چکا ہے: [54]

زشیخ شہر جاں بُردم بہ تزویر مسلمانی
مدارا گربایں کافر نمی کردم چہ می کردم ؟

ردیف کا نبھانا آسان نہ تھا مگر دیکھیے کس طرح بول رہی ہے؟ بول نہیں رہی ہے چیخ رہی ہے۔ میں بھی اس وقت چائے کے فنجان پر فنجان لنڈھائے جاتا ہوں اور اس کا مطلع دہرا رہا ہوں:

(۶۷) زساغر گرد ماغے ترنمی کردم، چہ می کردم؟ [۵۵]

خدارا داد دیجیے۔ نظر بہ حالات موجودہ یہاں ''چہ می کردم'' کیا قیامت ڈھا رہا ہے؟ گویا یہ مصرعہ خاص اسی موقع کے لیے کہا گیا تھا۔ مگر یوں پتہ نہیں چلے گا ''چہ می کردم'' پر زیادہ سے زیادہ زور دے کر پڑھیے۔ پھر دیکھیے صورت حال کی پوری تصویر کس طرح سامنے نمودار ہو جاتی ہے۔

یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں، کلپترہ گوئی اور لاطائل نویسی سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم، بحالت موجودہ میری صدائیں آپ تک پہنچ بھی سکیں گی یا نہیں؟ تاہم کیا کروں افسانہ سرائی سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکتا۔ یہ وہی حالت ہوئی جسے مرزا غالب نے ذوق خامہ فرسا کی ستم زدگی سے تعبیر کیا تھا:۔

مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا! [۵۶]

ابوالکلام

قلعہ احمد نگر

۱۱/اگست ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم

قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے۔ پہلا تجربہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا تھا، جب مسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا۔ پھر ۱۹۲۱ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۰ء میں یکے بعد دیگرے یہی منزل پیش آتی رہی اور اب پھر اُسی منزل سے قافلہ باد پیمائے عمر گزر رہا ہے:

بازی خواہم زسر گیرم رہِ پیمُودہ را ![1]

پچھلی پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مدت شمار کی جائے تو سات برس آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی۔☆ عمر کے ترپن برس جو گزر چکے ہیں، اُن سے یہ مدت وضع کرتا ہُوں تو ساتویں حصّے کے قریب پڑتی ہے۔ گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانہ کے اندر گزرا۔ تورات کے احکام عشرہ[2] میں ایک حکم سبت کے لیے بھی تھا یعنی ہفتہ کا ساتواں دن تعطیل کا مقدس دن سمجھا جائے۔ مسیحیت اور اسلام نے بھی یہ تعطیل قائم رکھی۔ سو ہمارے حصّہ میں بھی سبت کا دن آیا مگر ہماری تعطیلیں اس طرح بسر ہوئیں گویا خواجہ شیراز کے دستور العمل پر کار بند رہے:[3]

نہ گویمت کہ ہمہ سال مَے پرستی کُن
سہ ماہ مے خور و نُہ ماہ پارسامی باش

(۶۹)

☆ یہ مکتوب ۱۱/اگست ۱۹۴۲ء کو لکھا تھا۔ اس کے بعد قید کے دو برس گیارہ مہینے اور گذر گئے اور مجموعی مدت سات برس آٹھ مہینے کی جگہ دس برس سات ماہ ہوگئی۔ اس اضافہ کے خلاف کوئی شکوہ کرنا نہیں چاہتا البتہ اس کا افسوس ضرور ہے کہ وہ ساتویں حصہ کی مناسبت کی بات مختل ہوگئی اور سبت کی تعطیل کا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا۔

وقت کے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے اس تناسب پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے۔ اس پر نہیں کہ سات برس آٹھ مہینے قید و بند میں کیوں کٹے؟ اس پر کہ صرف سات برس آٹھ مہینے ہی کیوں کٹے؟

(۷۰)

نالہ از بہر رہائی نہ کند مُرغِ اسیر،
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود[۴]

وقت کے جو حالات ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اُن میں اس ملک کے باشندوں کے لیے زندگی بسر کرنے کی دو ہی راہیں رہ گئی ہیں۔ بے حسی کی زندگی بسر کریں یا احساس حال کی۔ پہلی زندگی ہر حال میں اور ہر جگہ بسر کی جاسکتی ہے مگر دوسری کے لیے قید خانہ کی کوٹھڑی[۵] کے سوا اور کہیں جگہ نہ نکل سکی۔ ہمارے سامنے بھی دونوں راہیں کھلی تھیں۔ پہلی ہم اختیار نہیں کرسکتے تھے، ناچار دوسری اختیار کرنی پڑی:

(۷۱)

رند ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نہ بود
لیک صنم بہ سجدہ درناصیہ مشترک نخواست[۶]

زندگی میں جتنے جُرم کیے اور ان کی سزائیں پائیں، سوچتا ہوں تو ان سے کہیں زیادہ تعداد اُن جرموں کی تھی جو نہ کرسکے اور جن کے کرنے کی حسرت دل میں رہ گئی۔ یہاں کردہ جرموں کی سزائیں تو مل جاتی ہیں لیکن ناکردہ جرموں کی حسرتوں کا صلہ کس سے مانگیں؟

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب، اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے[۷]

۱۹۱۶ء میں جب معاملہ پیش آیا تو مجھے پہلی مرتبہ موقع ملا کہ اپنی طبیعت کے تاثرات کا جائزہ لوں۔ اس وقت عمر کے صرف ستائیس برس گزرے تھے۔ ''الہلال'' ''البلاغ'' کے نام سے جاری تھا۔ دارالارشاد قائم ہو چکا تھا۔ زندگی کی گہری مشغولیتیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ طرح طرح کی سرگرمیوں میں دل اٹکا ہوا اور علاقوں اور رابطوں کی گرانیوں سے بوجھل تھا۔ اچانک ایک دن دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہونا پڑا اور مشغولیت کی ڈوبی ہوئی زندگی کی جگہ قید و بند کی تنہائی اور بے تعلقی اختیار کرلینی پڑی۔

بظاہر اس نا گہانی انقلاب حال میں طبیعت کے لیے بڑی آزمائش ہونی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہیں ہوئی۔ آباد گھر چھوڑا اور ایک ویرانہ میں جا بیٹھ رہا: ☆

نقصاں نہیں جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں [8]

لیکن پھر کچھ عرصے کے بعد جب اس صُورت حال کا ردِ عمل شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ معاملہ اتنا سہل نہ تھا جتنا ابتدائے حال کی سرگرمیوں میں محسوس ہوتا تھا اور اس کی آزمائشیں ابھی گزر نہیں چکیں بلکہ اب پیش آ رہی ہیں۔

جب کبھی اس طرح کا معاملہ یکا یک پیش آ جاتا ہے تو ابتدا میں اس کی سختیاں پوری طرح محسوس نہیں ہوتیں۔ کیونکہ طبیعت میں مقاومت کا ایک سخت جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ صورت حال سے دب جائے۔ وہ اس کا غالبانہ مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک پرجوش نشہ کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ نشہ کی تیزی میں کتنی ہی سخت چوٹ لگے، اُس کی تکلیف محسوس نہیں ہوگی۔ تکلیف اُس وقت محسوس ہوگی جب نشہ اُترنے لگے گا اور جماہیاں آنی شروع ہوں گی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوگا، جیسے سارا جسم درد سے چور چور ہو رہا ہو۔ چنانچہ اس مُعاملہ میں بھی پہلا دور نشۂ جذبات کی خود فراموشیوں کا گزرا۔ علائق کا فوری انقطاع، کاروبار کی نا گہانی برہمی، مشغولیتوں کا یک قلم تعطل، کوئی بات بھی دامن دل کو کھینچ نہ سکی۔ کلکتہ سے بہ اطمینانِ تمام نکلا اور رانچی میں شہر کے باہر ایک غیر آباد حصّہ میں مقیم ہوگیا۔ لیکن پھر جوں جوں دن گزرتے گئے طبیعت کی بے پروائیاں جواب دینے لگیں اور صورت حال کا ایک ایک کانٹا پہلوئے دل میں چبھنے لگا۔ یہی وقت تھا جب مجھے اپنی طبیعت کی اس انفعالی حالت کا مقابلہ کرنا پڑا اور ایک خاص طرح کا سانچا اس

☆ ۷ را پریل ۱۹۱۶ء کو حکومت بنگال نے ڈیفنس آرڈیننس کے ماتحت مجھے بنگال سے خارج کر دیا تھا۔ میں رانچی گیا اور شہر سے باہر مورابادی میں مقیم ہوگیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد مرکزی حکومت نے وہیں قید کر دیا اور اس کا سلسلہ ۱۹۲۰ء تک جاری رہا۔

کے لیے ڈھالنا پڑا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک کہ چھبیس برس گزر چکے، وہی سانچا کام دے رہا ہے اور اب اس قدر پختہ ہو چکا ہے کہ ٹوٹ جا سکتا ہے مگر لچک نہیں کھا سکتا۔

طالب علمی کے زمانے سے فلسفہ میری دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ دلچسپی برابر بڑھتی گئی لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ عملی زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے میں فلسفہ سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ یہ بلاشبہ طبیعت میں ایک طرح رواقی کی (Stoical) بے پروائی پیدا کر دیتا ہے اور ہم زندگی کے حوادث و آلام کو عام سطح سے کچھ بلند ہو کر دیکھنے لگتے ہیں۔ لیکن اس سے زندگی کے طبعی انفعالات کی گتھیاں سلجھ نہیں سکتیں۔ یہ ہمیں ایک طرح کی تسکین ضرور دے دیتا ہے لیکن اس کی تسکین سرتاسر سلبی تسکین ہوتی ہے ایجابی تسکین سے اس کی جھولی ہمیشہ خالی رہی۔ یہ فقدان کا افسوس کم کر دے گا لیکن حاصل کی کوئی امید نہیں دلائے گا۔ اگر ہماری راحتیں ہم سے چھین لی گئی ہیں تو فلسفہ ہمیں کلیلہ و دمنہ[9] (پنچ تنتر) کی دانش آموز چڑیا کی طرح نصیحت کرے گا "لا تاس علی مافات" (جو کچھ کھو چکا، اس پر افسوس نہ کر۔) لیکن کیا اس کھونے کے ساتھ کچھ پانا بھی ہے؟ اس بارے میں وہ ہمیں کچھ نہیں بتلاتا۔ کیونکہ بتلا سکتا ہی نہیں اور اس لیے زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے کے لیے صرف اس کا سہارا کافی نہ ہوا۔

سائنس عالم محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا کرتا ہے اور مادی زندگی کی بے رحم جبریت (Physical Determinism) کی خبر دیتا ہے۔ اس لیے عقیدہ کی تسکین اس کے بازار میں بھی نہیں مل سکتی۔ وہ یقین اور اُمید کے سارے پچھلے چراغ گل کر دے مگر کوئی نیا چراغ روشن نہیں کرے گا۔[10]

پھر اگر ہم زندگی کی ناگواریوں میں سہارے کے لیے نظر اٹھائیں تو کس کی طرف اٹھائیں؟

کون ایسا ہے جسے دست ہو دل سازی میں؟
شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند[11]

ہمیں مذہب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی دیوار ہے جس سے ایک دکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے۔

۷۲

دل شکستہ دراں کوچہ می کنند درست
چنانکہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست [۱۲]

بلاشبہ مذہب کی وہ پُرانی دُنیا جس کی مافوق الفطرت کارفرمائیوں کا یقین ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا، اب ہمارے لیے باقی نہیں رہی۔ اب مذہب بھی ہمارے سامنے آتا ہے تو عقلیت اور منطق کی ایک سادہ اور بے رنگ چادر اوڑھ کر آتا ہے اور ہمارے دلوں سے زیادہ ہمارے دماغوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہے۔ تاہم اب بھی تسکین اور یقین کا سہارا مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے۔

۷۳

دردیگرے بنما کہ یکجا روم چو برانیم؟ [۱۳]

فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اُسے بند نہیں کر سکے گا۔ سائنس ثبوت دے دے گا مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا۔ لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دے دیتا ہے اگرچہ ثبوت نہیں دیتا اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقیدہ کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف انہی باتوں پر قناعت نہیں کر لے سکتے جنہیں ثابت کر سکتے ہیں اور اس لیے مان لیتے ہیں۔ ہمیں کچھ باتیں ایسی بھی چاہییں جنہیں ثابت نہیں کر سکتے، لیکن مان لینا پڑتا ہے۔

By Faith and Faith alone embrace
Believing where we cannot prove [۱۴]

عام حالات میں مذہب اِنسان کو اُس کے خاندانی ورثہ کے ساتھ ملتا ہے اور مجھے بھی ملا لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا۔ میری پیاس اس سے زیادہ نکلی جتنی سیرابی وہ دے سکتے تھے۔ مجھے پُرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی نئی راہیں ڈھونڈھنی پڑیں۔ زندگی کے ابھی پندرہ برس بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ طبیعت نئی خلشوں اور نئی جستجوؤں سے آشنا ہو گئی تھی اور موروثی عقائد جس شکل وصورت میں سامنے آ کھڑے ہوئے تھے، اُن پر مطمئن ہونے سے انکار کرنے لگی تھی۔ پہلے اسلام کے اندرونی مذاہب کے اختلافات سامنے آئے اور اُن کے متعارض دعوؤں اور متصادم فیصلوں نے حیران وسرگشتہ کر دیا۔ پھر جب کچھ قدم آگے بڑھے، تو خودنفسِ مذہب کی عالمگیر نزاعیں سامنے آ گئیں اور انہوں نے حیرانگی کو

شک تک اور شک کو انکار تک پہنچا دیا۔ پھر اس کے بعد مذہب اور علم کی باہمی آویزشوں کا میدان نمودار ہوا اور اُس نے رہا سہا اعتقاد بھی کھو دیا۔ زندگی کے وہ بنیادی سوال جو عام حالات میں بہت کم ہمیں یاد آتے ہیں ایک ایک کرکے اُبھرے اور دل و دماغ پر چھا گئے۔ حقیقت کیا ہے اور کہاں ہے؟ اور ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے اور ایک ہی ہے کیونکہ ایک سے زیادہ حقیقتیں ہو نہیں سکتیں تو پھر راستے مختلف کیوں ہوئے؟ کیوں صرف مختلف ہی نہیں ہوئے بلکہ باہم متعارض اور متصادم ہوئے؟ پھر یہ کیا ہے کہ خلاف و نزاع کی ان تمام لڑتی ہوئی راہوں کے سامنے علم اپنے بے لچک فیصلوں اور ٹھوس حقیقتوں کا چراغ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے اور اس کی بے رحم روشنی میں قدامت اور روایت کی وہ تمام پُراسرار تاریکیاں جنھیں نوعِ انسانی عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھنے کی خوگر ہو گئی تھی، ایک ایک کرکے نابود ہو رہی ہیں۔

یہ راہ ہمیشہ شک سے شروع ہوتی ہے اور انکار پر ختم ہوتی ہے۔ اور اگر قدم اُسی پر رُک جائیں تو پھر مایوسی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا:

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں ![۱۵]

مجھے بھی ان منزلوں سے گزرنا پڑا، مگر میں رُکا نہیں۔ میری پیاس مایوسی پر قانع ہونا نہیں چاہتی تھی۔ بالآخر حیرانگیوں اور سرگشتگیوں کے بہت مرحلے طے کرنے کے بعد جو مقام نمودار ہوا، اُس نے ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا۔ معلوم ہوا کہ اختلاف و نزاع کی انہی متعارض راہوں اور اوہام و خیالات کی انہی گہری تاریکیوں کے اندر ایک روشن اور قطعی راہ بھی موجود ہے جو یقین اور اعتقاد کی منزلِ مقصود تک چلی گئی ہے اور اگر سکون و طمانیت کے سرچشمے کا سراغ مل سکتا ہے تو وہیں مل سکتا ہے۔ میں نے جو اعتقاد حقیقت کی جستجو میں کھو دیا تھا، وہ اسی جستجو کے ہاتھوں پھر واپس مل گیا۔ میری بیماری کی جو علّت تھی، وہی بالآخر داروئے شفا بھی ثابت ہوئی:

تداویت من لیلیٰ بلیلیٰ عن الھویٰ
کما یتداوی شارب الخمر بالخمر [۱۶]

البتہ جو عقیدہ کھویا تھا اور جو عقیدہ پایا، وہ تحقیقی تھا۔

راہے کہ خضر داشت زسر چشمہ دُور بود
لبِ تشنگی زراہِ دگر بردہ ایم ما ![17] (۷۵)

جب تک موروثی عقائد کے جمود اور تقلیدی ایمان کی چشم بندیوں کی پٹیاں ہماری آنکھوں پر بندھی رہتی ہیں ہم اس راہ کا سراغ نہیں پاسکتے۔ لیکن جونہی یہ پٹیاں کھلنے لگتی ہیں، صاف دِکھائی دینے لگتا ہے کہ راہ نہ تو دُور تھی اور نہ کھوئی ہُوئی تھی۔ یہ خود ہماری ہی چشم بندی تھی جس نے عین روشنی میں گم کر دیا تھا:

در دشتِ آرزو نہ بُودبیم دام و دَد
راہے ست ایں کہ ہم زتو خیزد بلائے تو[18] (۷۶)

اب معلوم ہوا کہ آج تک جسے مذہب سمجھتے آئے تھے، وہ مذہب کہاں تھا؟ وہ تو خود ہماری ہی وہم پرستیوں اور غلط اندیشیوں کی ایک صُورت گری تھی:

تا بغایت ما ہنر پنداشتیم
عاشقی ہم ننگ و عارے بودہ ست[19] (۷۷)

ایک مذہب تو موروثی مذہب ہے کہ باپ دادا جو کچھ مانتے آئے ہیں، مانتے رہیے۔ ایک جغرافیائی مذہب ہے کہ زمین کے کسی خاص ٹکڑے میں ایک شاہ راہِ عام بن گئی ہے، سب اُسی پر چلتے ہیں، آپ بھی چلتے رہیے۔ ایک مردم شماری کا مذہب ہے کہ مردم شماری کے کاغذات میں ایک خانہ مذہب کا بھی ہوتا ہے اس میں اسلام درج کرا دیجیے۔ ایک رسمی مذہب ہے کہ رسموں اور تقریبوں کا ایک سانچہ ڈھل گیا ہے اُسے نہ چھیڑیے اور اسی میں ڈھلتے رہیے۔ لیکن ان تمام مذہبوں کے علاوہ بھی مذہب کی ایک حقیقت باقی رہ جاتی ہے۔ تعریف و امتیاز کے لیے اسے حقیقی مذہب کے نام سے پُکارنا پڑتا ہے اور اسی کی راہ گم ہُو جاتی ہے:

ہمیں ورق کہ سیہ گشت، مدعا ایں جاست[20] (۷۸)

اسی مقام پر پہنچ کر یہ حقیقت بھی بے نقاب ہوئی کہ علم اور مذہب کی جتنی نزاع ہے فی الحقیقت علم اور مذہب کی نہیں ہے، مدعیانِ علم کی خامکاریوں، اور مدعیانِ مذہب کی

ظاہر پرستیوں اور قواعد سازیوں کی ہے۔ حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ چلتے ہیں الگ الگ راستوں سے، مگر بالآخر پہنچ جاتے ہیں ایک ہی منزل پر:

(۷۹)

عبارا تنا شتّٰی وحسنک واحد
وکل الٰی ذاک الجمال یشیر

علم عالم محسوسات سے سروکار رکھتا ہے، مذہب ماورائے محسوسات کی خبر دیتا ہے۔ دونوں میں دائروں کا تعدد ہوا، مگر تعارض نہیں ہوا۔ جو کچھ محسوسات سے ماوراء ہے ہم اسے محسوسات سے معارض سمجھ لیتے ہیں اور یہیں سے ہمارے دیدۂ کج اندیش کی ساری درماندگیاں شروع ہو جاتی ہیں:

(۸۰)

بر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ
جرمِ نگاہِ دیدۂ صورت پرستِ ماست [۲۱]

بہرحال زندگی کی ناگواریوں میں مذہب کی تسکین صرف ایک سلبی تسکین ہی نہیں ہوتی بلکہ ایجابی تسکین ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ہمیں اعمال کے اخلاقی اقدار (Moral Values) کا یقین دلاتا ہے اور یہی یقین ہے جس کی روشنی کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتی۔ وہ ہمیں بتلاتا ہے کہ زندگی ایک فریضہ ہے، جسے انجام دینا چاہیے۔ ایک بوجھ ہے جسے اُٹھانا چاہیے:

(۸۱)

جلوۂ کاروانِ مانیست بہ نالۂ جرس
عشقِ تو راہ می برد، شوقِ تو زادمی دہد [۲۲]

لیکن کیا یہ بوجھ کانٹوں پر چلے بغیر نہیں اٹھایا جا سکتا؟

نہیں اٹھایا جا سکتا کیونکہ یہاں خود زندگی کے تقاضے ہُوئے جن کا ہمیں جواب دینا ہے، اور خود زندگی کے مقاصد ہوئے جن کے پیچھے والہانہ دوڑنا ہے۔ جن باتوں کو ہم زندگی کی راحتوں اور لذتوں سے تعبیر کرتے ہیں، وہ ہمارے لیے راحتیں اور لذتیں ہی کب رہیں گی اگر ان تقاضوں اور مقصدوں سے مُنہ موڑ لیں؟ بلاشبہ یہاں زندگی کا بوجھ اٹھا کے کانٹوں کے فرش پر دوڑنا پڑا، لیکن اس لیے دوڑنا پڑا کہ دیبا و مخمل کے فرش پر چل کر ان تقاضوں کا جواب دیا نہیں جا سکتا تھا۔ کانٹے کبھی دامن سے اُلجھیں گے کبھی تلووں میں چبھیں گے لیکن مقصد کی خلش جو پہلوئے دل میں چبھتی رہے گی، نہ دامن تار تار کی خبر لینے دے گی،

نہ زخمی تلوؤں کی:۔

﴿۸۲﴾ معشوق درمیانۂ جاں، مدّعی کجاست
گل دردماغ می دہد، آسیبِ خارچیست؟[۲۳]

اور پھر زندگی کی جن حالتوں کو ہم راحت والم سے تعبیر کرتے ہیں، ان کی حقیقت بھی اس سے زیادہ کیا ہوئی کہ اضافت کے کرشموں کی ایک صُورت گری ہے؟ یہاں نہ مطلق راحت ہے نہ مطلق الم۔ ہمارے تمام احساسات سرتاسر اضافی ہیں:

﴿۸۳﴾ دویدن، رفتن، اِستادن نشستن خفتن مُردن[۲۴]

اضافتیں بدلتے جاؤ؛ راحت والم کی نوعتیں بھی بدلتی جائیں گی۔ یہاں ایک ہی ترازو لے کر ہر طبیعت اور ہر حالت کا احساس نہیں تولا جاسکتا۔ ایک دہقان کی راحت والم تولنے کے لیے جس ترازو سے ہم کام لیتے ہیں، اس سے فنونِ لطیفہ کے ماہر کا معیار راحت و الم نہیں تول سکیں گے۔ ایک ریاضی دان کو ریاضی کا ایک مسئلہ حل کرنے میں جو لذّت ملتی ہے، وہ ایک ہوس پرست کو شبستانِ عشرت کی سیہ مستیوں میں کب مل سکے گی؟ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پھُولوں کی سیج پر لوٹتے ہیں اور راحت نہیں پاتے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کانٹوں پر دوڑتے ہیں اور اس کی ہر چبھن میں راحت سرور کی ایک نئی لذّت پانے لگتے ہیں:۔

﴿۸۴﴾ بہر یک گل، زحمتِ صد خارمی باید کشید[۲۵]

راحت والم کا احساس ہمیں باہر سے لاکر کوئی نہیں دے دیا کرتا؛ یہ خود ہمارا ہی احساس ہے جو کبھی زخم لگاتا ہے کبھی مرہم بن جاتا ہے۔ طلب وسعی کی زندگی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی لذّت ہے بشرطیکہ کسی مطلوب کی راہ میں ہو:

﴿۸۵﴾ رہرواں را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہ ست وہم خود منزل ست[۲۶]

اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں، فلسفہ نہیں ہے زندگی کے عام واردات ہیں۔ عشق ومحبت کے واردات کا میں حوالہ نہیں دوں گا کیونکہ وہ ہر شخص کے حصے میں نہیں آسکتے۔ لیکن رندی اور ہوسناکی کے کوچوں کی خبر رکھنے والے تو بہت نکلیں گے۔ وہ خود اپنے دل سے پوچھ دیکھیں کہ کسی کی راہ میں رنج والم کی تلخیوں نے کبھی خوشگواریوں کے مزے بھی دیئے تھے یا نہیں؟

حریف کاوشِ مژگانِ خونریزش نہء ناصح
بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن [۲۷]

زندگی بغیر کسی مقصد کے بسر نہیں کی جاسکتی۔ کوئی اٹکاؤ، کوئی لگاؤ، کوئی بندھن ہونا چاہیے جس کی خاطر زندگی کے دن کاٹے جاسکیں۔ یہ مقصد مختلف طبیعتوں کے سامنے مختلف شکلوں میں آتا ہے:۔

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد
سرمد بہ مئے و پیالہ ربطے دارد [۲۸]

کوئی زندگی کی کاربرآریوں [۲۹] ہی کو مقصدِ زندگی سمجھ کر ان پر قانع ہو جاتا ہے؛ کوئی ان پر قانع نہیں ہوسکتا۔ جو قانع نہیں ہوسکتے ان کی حالتیں بھی مختلف ہوئیں۔ اکثروں کی پیاس ایسے مقصدوں سے سیراب ہو جاتی ہے جو انہیں مشغول رکھ سکیں لیکن طبیعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے لیے صرف مشغولیت کافی نہیں ہوسکتی؛ وہ زندگی کا اضطراب بھی چاہتی ہیں:

نہ داغِ تازہ می کارد، نہ زخمِ کہنہ می خارد
بدہ یارب؛ دلے کیں صورتِ بے جاں نمی خواہم [۳۰]

پہلوں کے لیے جو دلبستگی اس میں ہوئی کہ مشغول رہیں، دوسروں کے لیے اس میں ہوئی کہ مضطرب رہیں:

(۸۹)
دریں چمن کہ ہوا داغِ شبنم آرائی ست
تسلّیے بہ ہزار اضطراب می بافند! [۳۱]

ایک خنک اور ناآشنائے شورش مقصد سے ان کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ انہیں ایسا مقصد چاہیے جو اضطراب کے انگاروں سے دہک رہا ہو، جو اُن کے اندر شورش و سرمستی کا ایک تہلکہ مچادے، جس کے دامنِ ناز کو پکڑنے کے لیے وہ ہمیشہ اپنا گریبان وحشت چاک کرتے رہیں:

دامن اُس کا تو بھلا دُور ہے، اے دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار، گریباں تو مرا دُور نہیں! [۳۲]

ایک ایسا بلائے جاں مقصد جس کے پیچھے انہیں دیوانہ وار دوڑنا پڑے، جو

دوڑنے والوں کو ہمیشہ نزدیک بھی دکھائی دے اور ہمیشہ دُور بھی ہوتا رہے۔ نزدیک اتنا کہ جب چاہیں ہاتھ بڑھا کر پکڑلیں؛ دُور اِتنا کہ اس کی گردِ راہ کا بھی سُراغ نہ پاسکیں:۔

﴿۹۰﴾

با من آویزشِ او الفت موج ست و کنار
دمبدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من ! [۴۳]

پھر نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھیے تو معاملہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے صرف تہ رس نگاہیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ یکسانی، اگرچہ سکون وراحت کی ہو، یکسانی ہوئی اور یکسانی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی بے نمکی ہے۔ تبدیلی اگرچہ سکون سے اضطراب کی ہو مگر پھر تبدیلی ہے اور تبدیلی بجائے خود زندگی کی ایک بڑی لذّت ہوئی۔ عربی میں کہتے ہیں ''حمضوا مجالسکم'' اپنی مجلسوں کا ذائقہ بدلتے رہو۔ سو یہاں زندگی کا مزہ بھی انہی کو مل سکتا ہے جو اس کی شیرینیوں کے ساتھ اس کی تلخیوں کے بھی گھونٹ لیتے رہتے ہیں اور اس طرح زندگی کا ذائقہ بدلتے رہتے ہیں۔ ورنہ وہ زندگی ہی کیا جو ایک ہی طرح کی صبحوں اور ایک ہی طرح کی شاموں میں بسر ہوتی رہے؟ خواجہ درد کیا خوب کہہ گئے ہیں:

آ جائے ایسے جینے سے اپنا تو جی بتنگ
آخر جیے گا کب تلک، اے خضر! مر کہیں! [۴۴]

یہاں پانے کا مزہ اُنہیں کو مل سکتا ہے جو کھونا جانتے ہیں۔ جنھوں نے کچھ کھویا ہی نہیں، انہیں کیا معلوم کہ پانے کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ نظیری کی نظر اسی حقیقت کی طرف گئی تھی: [۴۵]

﴿۹۱﴾

آنکہ او در کلبۂ احزاں پسر گم کردہ یافت
تو کہ چیزے گم نہ کردی، از کجا پیدا شود!

اور پھر غور وفکر کا ایک قدم اور آگے بڑھائیے تو خود ہماری زندگی کی حقیقت بھی حرکت واضطراب کے ایک تسلسل کے سوا اور کیا ہے؟ جس حالت کو ہم سکون سے تعبیر کرتے ہیں، اگر چاہیں تو اُسی کو موت سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ موج جب تک مضطرب ہے، زندہ ہے؛ آسُودہ ہوئی اور معدُوم ہوئی۔ فارسی کے ایک شاعر نے دو مصرعوں کے اندر سارا فلسفۂ حیات ختم کردیا تھا:

۹۲

موجیم کہ آسودگی ماعدم ماست
مازندہ ازانیم کہ آرام نگیریم[۳۶]

اور پھر یہ راہ اس طرح بھی طے نہیں کی جاسکتی کہ اُس کے اٹکاؤ کے ساتھ دوسرے لگاؤ بھی لگائے رکھیے۔ راہِ مقصد کی خاک بڑی ہی غیور واقع ہوئی ہے۔ وہ رہرو کی جبین نیاز کے سارے سجدے اس طرح کھینچ لیتی ہے کہ پھر کسی دوسری چوکھٹ کے لیے کچھ باقی ہی نہیں رہتا۔ دیکھیے، میں نے یہ تعبیر غالب سے مستعار لی:

۹۳

خاکِ کویش خود پسند افتاد درجذبِ سجود
سجدہ از بہر حرم نہ گزاشت درسیمائے من[۳۷]

مقصود اس تمام درازنفسی سے یہ تھا کہ آج اپنے اوراقِ فکرِ پریشاں کا ایک صفحہ آپ کے سامنے کھول دوں:

۹۴

لختے زحال خویش بہ سیما نوشتہ ایم[۳۸]

اِس میکدۂ ہزار شیوہ و رنگ میں ہر گرفتارِ دامِ تخیّل نے اپنی خود فراموشیوں کے لیے کوئی نہ کوئی جام سرشاری سامنے رکھ لیا ہے اور اسی میں بیخود رہتا ہے:

۹۵

ساقی بہ ہمہ بادہ زیک خم دہد، اما
درمجلس اومستی ہر یک زشرابے ست

کوئی اپنا دامن پھولوں سے بھرنا چاہتا ہے، کوئی کانٹوں سے اور دونوں سے کوئی بھی پسند نہیں کرے گا کہ تہی دامن رہے۔ جب لوگ کامجوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چن رہے تھے تو ہمارے حصّے میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے۔ انہوں نے پھول چن لیے اور کانٹے چھوڑ دیئے؛ ہم نے کانٹے چن لیے اور پھول چھوڑ دیئے:

زخار زارِ محبت دلِ ترا چہ خبر
کہ گل بجیب نہ گنجد قبائے تنگ ترا[۳۹]

ابوالکلام

قلعہ احمد نگر

۱۵ر اگست ۱۹۴۲ء

مارا زبانِ شکوہ ز بیداد چرخ نیست
از ما خطے بہ مہر خموشی گرفتہ اند[1]

صدیق مکرم

وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ صراحی لبریز ہے اور جام آمادہ۔ ایک دور ختم کر چکا ہوں دوسرے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا ہوں:

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست
صراحیِ مے ناب و سفینۂ غزل ست
جریدہ رو کہ گزرگاہِ عافیت تنگ ست
پیالہ گیر، کہ عُمرِ عزیز بے بدل ست[2]

طبیعت وقت کی کشاکش سے یک قلم فارغ اور دل فکر ایں و آں سے بکلی آسودہ ہے۔ اپنی حالت دیکھتا ہوں تو وہ عالم دکھائی دیتا ہے جس کی خبر خواجہ شیراز نے چھ سو سال پہلے دے دی تھی۔ زندگی کے چالیس سال طرح طرح کی کاوشوں میں بسر ہوئے مگر اب دیکھا تو معلوم ہوا کہ ساری کاوشوں کا حل اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ صبح کا جانفزا وقت ہو اور چین کی بہترین چائے کے پے در پے فنجان:

چل سال رنج و غصہ کشیدیم، و عاقبت
تدبیر ما بدستِ شراب دو سالہ بود[3]

آج تین بجے سے کچھ پہلے آنکھ کھل گئی تھی۔ صحن میں نکلا تو ہر طرف سناٹا تھا صرف احاطہ کے باہر سے پہرہ دار کی گشت و بازگشت کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہاں رات کو احاطہ کے اندر وارڈروں کا تین تین گھنٹے کا پہرہ لگا کرتا ہے۔ مگر بہت کم جاگتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اُس وقت بھی سامنے کے برآمدے میں ایک وارڈر[4] کمبل بچھائے لیٹا تھا اور زور زور سے خراٹے لے رہا تھا۔ بے اختیار مومن خان کا شعر یاد آ گیا:

ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لیے[5]

زندانیوں کے اس قافلہ میں کوئی نہیں جو سحر خیزی کے معاملہ میں میرا شریک حال ہو۔ سب بے خبر سو رہے ہیں اور اسی وقت میٹھی نیند کے مزے لیتے ہیں:

(۱۰۰)
دائم کسے بقافلہ بود ست پاسباں
بیدار شو کہ چشمِ رفیقاں بخواب شد[6]

سوچتا ہوں تو زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اِس مُعاملہ میں ساری دُنیا سے اُلٹی ہی چال میرے حصے میں آئی ہے۔ دُنیا کے لیے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہوا، وہی میرے لیے بیداری کی اصلی پونجی ہوئی۔ لوگ ان گھڑیوں کو اس لیے عزیز رکھتے ہیں کہ میٹھی نیند[7] کے مزے لیں۔ میں اس لیے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے لذّت یاب ہوتا رہوں:

(۱۰۱)
خلق را بیدار باید بود ز آب چشمِ من
ویں عجب کاں دم کہ می گریم کسے بیدار نیست[8]

ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا۔ میں نے دنیا کو ایسی جراتوں کا سِرے سے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ جب جاگتی ہے تو میں سو رہتا ہوں جب سو جاتی ہے تو اُٹھ بیٹھتا ہوں:

(۱۰۲)
خوابِ غفلت ہمہ را بردہ و بیدار یکے ست[9]

خلائق کے کتنے ہی ہجوم میں ہوں لیکن اپنا وقت صاف بچا لے جاتا ہوں۔ کیونکہ میری اس خلوت در انجمن پر کوئی ہاتھ ڈال ہی نہیں سکتا۔ میرے عیش و طرب کی بزم اُس

وقت آراستہ ہوتی ہے جب نہ کوئی آنکھ دیکھنے والی ہوتی ہے نہ کوئی کان سننے والا۔ رضی دانش نے میری زبان سے کہا تھا:

(۱۰۳)
خوش زمزمۂ گوشۂ تنہائی خویشم
از جوش و خروش گل و بلبل خبرم نیست

ایک بڑا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ دل کی انگیٹھی ہمیشہ گرم رہنے لگی۔ صبح کی اس مہلت میں تھوڑی سی آگ جو سلگ جاتی ہے، اُس کی چنگاریاں بجھنے نہیں پاتیں؛ راکھ کے تلے دبی دبائی کام کرتی رہتی ہیں:

(۱۰۴)
ازاں بہ دیر مُغانم عزیز می دارند
کہ آتشے کہ نہ میرد، ہمیشہ در دلِ ماست [۱۰]

دن بھر اگر سوز و تپش کا سامان نہ بھی ملے، جب بھی چولہے کے ٹھنڈے پڑ جانے کا اندیشہ نہ رہا۔ عرفی کیا خوب بات کہہ گیا ہے:

(۱۰۵)
سینۂ گرم داری مطلب صحبتِ عشق
آتشے نیست چُو در مجمرہ ات عُود مخر [۱۱]

اس سحر خیزی کی عادت کے لیے والد مرحوم [۱۲] کا منت گزار ہوں۔ ان کا معمول تھا کہ رات کی پچھلی [۱۳] پہر ہمیشہ بیداری میں بسر کرتے۔ بیماری کی حالت بھی اس معمول میں فرق نہیں ڈال سکتی تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ رات کو جلد سونا اور صبح جلد اُٹھنا زندگی کی سعادت کی پہلی علامت ہے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے کے حالات سناتے کہ دہلی میں مفتی صدر الدین [۱۴] مرحوم سے صبح کی سنت و فرض کے درمیان سبق لیا کرتا تھا اور اس امتیاز پر نازاں رہتا تھا۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے، مجھے خصوصیت کے ساتھ اوروں سے علیحدہ سبق دیں، اور اس کے لیے صرف وہی وقت نکل سکتا تھا۔ یہ بھی فرماتے کہ یہ فیض مجھے اپنے نانا رکن المدرسین [۱۵] سے ملا۔ وہ بھی شاہ عبدالعزیزؒ [۱۶] سے علی الصباح سبق لیا کرتے تھے اور پچھلی پہر [۱۷] سے اُٹھ کر اس کی طیاری میں لگ جاتے تھے۔ پھر خواجۂ شیراز کا یہ مقطع ذوق لے لے کر پڑھتے:

(۱۰٦)
مرو بخواب کہ حافظ بہ بارگاہِ قبول
ز وردِ نیم شب و درسِ صبح گاہ رسید [۱۸]

میری ابھی دس گیارہ برس کی عمر ہوگی کہ یہ باتیں کام کر گئی تھیں۔ بچپنے کی نیند سر پر سوار رہتی تھی مگر میں اس سے لڑتا رہتا تھا۔ صبح اندھیرے میں اٹھتا اور شمع دان روشن کر کے اپنا سبق یاد کرتا۔ بہنوں سے منتیں کیا کرتا تھا کہ صبح آنکھ کھلے تو مجھے جگا دینا۔ وہ کہتی تھیں یہ نئی شرارت کیا سوجھی ہے۔ اس خیال سے کہ میری صحت کو نقصان نہ پہنچے، والد مرحوم روکتے لیکن مجھے کچھ ایسا شوق پڑ گیا تھا کہ جس دن دیر سے آنکھ کھلتی دن بھر پشیمان سا رہتا۔ آنے والی زندگی میں جو مُعاملات پیش آنے والے تھے یہ اُن سے میرا پہلا سابقہ تھا:

(۱۰۷)
اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھویٰ
فصادف قلباً فارغاً فتمکنا

دیکھیے، یہاں ''پہلا سابقہ'' لکھتے ہوئے میں نے عربی کی ترکیب ''کان اوّل عھدی بھا'' کا بلا قصد ترجمہ کر دیا کہ دماغ میں بسی ہوئی تھی۔ یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور عالمِ تنہائی کی خلوت اندوزیوں کا پورا پورا لطف اُٹھا رہا ہوں۔ گویا ساری دنیا میں اس وقت میرے سوا کوئی نہیں بستا۔ کہہ نہیں سکتا، تنہائی کا یہ احساس میری طبع خلوت پرست کی جولانیوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا کرتا ہے۔ بیدل کی خیال بندیوں کا غلو بے کیف ہو، لیکن اس کی بحرِ طویل کی بعض غزلیں کیف سے خالی نہیں ہیں:

(۱۰۸)
ستم ست گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدہ، دردل کُشا، بہ چمن درآ
پے نافہ ہائے نجستہ بو، مپسند زحمت جستجو
بخیالِ حلقۂ زلفِ او، گرہے خورد بہ ختن درآ [۱۹]

پانچ بجے سے قلعہ میں ٹینکوں کے چلانے کی مشق شروع ہوتی ہے اور گھڑ گھڑ کی آواز آنے لگتی ہے مگر اس میں ابھی دیر ہے۔ چار بجے دودھ کی لاری آتی ہے اور چند لمحوں کے لیے صبح کا سکون ہنگامہ سے بدل دیتی ہے۔ وہ ابھی چند منٹ ہوئے آئی تھی اور واپس گئی ہے۔ اگر اس وقت کے سناٹے میں کوئی آواز مخل ہو رہی ہے تو وہ صرف جواہر لال کے ہلکے

خراٹوں کی آواز ہے۔ وہ ہمسایہ میں سو رہے ہیں؛ صرف لکڑی کا ایک پردہ حائل ہے۔ خراٹے جب تھمتے ہیں تو حسب معمول نیند میں بڑبڑانے لگتے ہیں۔ یہ بڑبڑانا ہمیشہ انگریزی میں ہوتا ہے:

۱۰۹ یارِ ما ایں دارد وآں نیز ہم [۲۰]

مؤتمن الدولہ اسحاق خان شوستری محمد شاہی امراء میں سے تھا۔ اس کا ایک مطلع آپ نے تذکروں [۲۱] میں دیکھا ہوگا۔ ضلع جگت کی صنعت گری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مگر جب کبھی جواہر لال کو انگریزی میں بڑبڑاتے سنتا ہوں تو بے اختیار یاد آجاتا ہے:

۱۱۰ زبسکہ در دلِ تنگم خیالِ آں گل بود
نفیرِ خواب من امشب صفیرِ بلبل بود

یہ نیند میں بڑبڑانے کی حالت بھی عجیب ہے۔ یہ عموماً انہی طبیعتوں پر طاری ہوتی ہے جن میں دماغ سے زیادہ جذبات کام کیا کرتے ہیں۔ جواہر لال کی طبیعت بھی سرتا سر جذباتی واقع ہوئی ہے۔ اس لیے خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں جذبات کام کرتے رہتے ہیں۔

یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ ہوگیا ہے۔ فوجی صیغہ نے ہمارا چارج لے لیا، داخلہ کے وقت فہرست سے مقابلہ کرلیا۔ ہماری حفاظت کا اور دنیا سے بے تعلقی کا جس قدر بندوبست کیا جاسکتا تھا وہ بھی کرلیا لیکن اس سے زیادہ انہیں ہمارے معاملات سے کوئی سروکار معلوم نہیں ہوتا۔ اندر کا تمام انتظام گورنمنٹ بمبئی کے ہوم ڈیپارٹمنٹ نے براہ راست اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور اصلی رشتۂ کار مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔

ہمیں یہاں رکھنے کے لیے جو ابتدائی انتظام کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ گرفتاری سے ایک دن پہلے یعنی ۸ر اگست کو یرودا سنٹرل جیل پونا سے ایک سینئر جیلر یہاں بھیج دیا گیا۔ دس جیل کے وارڈرز اور پندرہ قیدی کام کاج کے لیے اُس کے ساتھ آئے۔ جیلر کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا صورت حال پیش آنے والی ہے۔ صرف اتنی بات بتلائی گئی تھی کہ ایک ڈیٹنشن کیمپ [۲۲] (Detention Camp) کھل رہا ہے: چند دنوں کے لیے دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ ہم پہنچے تو معاملہ ایک دوسری ہی شکل میں نمایاں ہوا اور بیچارہ سراسیمہ ہوکر رہ گیا۔ چونکہ میں نے یہاں آتے ہی اپنا غصہ اس غریب پر نکالا تھا، اس لیے کئی دن تک مُنہ چھپائے پھرتا رہا۔ جب اور

کچھ نہ بنتی تو ضلع کے کلکٹر کے پاس دوڑا ہوا جاتا۔ وہ اس سے زیادہ بے خبر تھا

(۱۱۱) درِ ہر کس کہ زدم، بے خبرو غافل بود[۲۳]

دوسرے دن کلکٹر اور سول سرجن آئے اور معذرت کر کے چلے گئے۔ سول سرجن ہر شخص کا سینہ ٹھوک بجا کے دیکھتا رہا کہ کیا آواز نکلتی ہے؟ معلوم نہیں پھیپھڑوں کی حالت معلوم کرنی چاہتا تھا یا دلوں کی۔ مجھ سے بھی معائنہ کی درخواست کی۔ میں نے کہا میرا سینہ دیکھنا بے سود ہے۔ اگر دماغ کے دیکھنے کا کوئی آلہ ساتھ ہے تو آسے کام میں لایئے:

(۱۱۲)
بگور مسیح، از سرِ ما کشتگانِ عشق
یک زندہ کردنِ تو بہ صد خوں برابرست[۲۴]

بہر حال چوتھے دن انسپکٹر جنرل آف[۲۵] پریزن آیا، اور گورنمنٹ کے احکام کا پرچہ حوالہ کیا۔ کسی سے ملاقات نہیں کی جا سکتی؛ کسی سے خط و کتابت نہیں کی جا سکتی؛ کوئی اخبار نہیں آ سکتا ان باتوں کے علاوہ اگر کسی اور بات کی شکایت ہو تو حکومت اس پر غور کرنے کے لیے طیار[۲۶] ہے۔ اب ان باتوں کے بعد اور کونسی بات رہ گئی تھی جس کی شکایت کی جاتی اور حکومت از راہ عنایت اسے دُور کر دیتی؟

زبان جلائی، کیے قطع ہاتھ پہنچوں سے
یہ بندوبست ہوئے ہیں مری دُعا کے لیے[۲۷]

انسپکٹر جنرل نے کہا اگر آپ کتابیں یا کوئی اور سامان گھر سے منگوانا چاہیں تو ان کی فہرست لکھ کر مجھے دے دیں۔ گورنمنٹ اپنے طور پر منگوا کر آپ کو پہنچا دے گی۔ چونکہ گرفتاری سفر کی حالت میں ہوئی تھی، اس لیے میرے پاس دو کتابوں کے سوا جو راہ میں دیکھنے کے لیے ساتھ رکھ لی تھیں مطالعہ کا کوئی سامان نہ تھا۔ خیال ہوا اگر مکان سے بعض مسودات اور کچھ کتابیں آ جائیں تو قید و بند کی یہ فرصت کام میں لائی جائے۔ بظاہر اس خواہش میں کوئی بُرائی معلوم نہیں ہوئی۔ دنیا را بہ امید خوردہ اند۔ آرزو عیب ندارد:

(۱۱۳)
نقاب چہرۂ اُمید باشد گرد نومیدی
غبار دیدۂ یعقوب آخر توتیا گردد[۲۸]

میں نے مطلوبہ اشیاء کا ایک پرچہ لکھ کر اُس کے حوالہ کیا اور وہ لے کر چلا گیا لیکن اس

کے جانے کے بعد صورت حال پر زیادہ غور کرنے کا موقعہ ملا تو طبیعت میں ایک خلش سی محسُوس ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی دراصل طبیعت کی ایک کمزوری تھی کہ حکومت کی اس رعایت سے فائدہ اٹھانے پر راضی ہوگئی۔ جب عزیز واقرباء سے بھی ملنے اور خط و کتابت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی جس کا حق مجرموں اور قاتلوں تک سے چھینا نہیں جاتا تو پھر یہ توقع کیوں رکھی جائے کہ وہی حکومت گھر سے سامان منگوا کر فراہم کردے گی؟ ایسی حالت میں عزّت نفس کا تقاضا صرف یہی ہوسکتا ہے کہ نہ تو کوئی آرزو کی جائے نہ کوئی توقع رکھی جائے۔

۱۱۴

زتیغِ بے نیازی ناتوانی قطعِ ہستی کن
فلک تا افگنداز پا ترا، خود پیش دستی کن [۲۹]

میں نے دوسرے ہی دن انسپکٹر جنرل کو خط لکھ دیا کہ فہرست کا پرچہ واپس کردیا جائے۔ جب تک گورنمنٹ کا موجودہ طرز عمل قائم رہتا ہے، میں کوئی چیز مکان سے منگوانی نہیں چاہتا۔ یہاں اور تمام ساتھیوں نے بھی یہی طرز عمل اختیار کیا:

دامن اس کا تو بھلا دُور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار؟ گریباں تو مرا دُور نہیں! [۳۰]

اب چائے کے تیسرے فنجان کے لیے کہ ہمیشہ اس دورِ صبوحی کا آخری جام ہوتا ہے، ہاتھ بڑھاتا ہوں اور یہ افسانہ سرائی ختم کرتا ہوں۔ یادش بخیر، خواجہ شیراز کے پیرے فروش کی موعظت بھی وقت پر کیا کام دے گئی ہے: [۳۱]

دی پیرئے فروش کہ ذکرش بخیر باد
گفتا "شراب نوش و غمِ دل ببرزیاد"
گفتم "ببادمی دہدم بادہ نام و ننگ"
گفتا "قبول کن سخن و ہرچہ باد باد"
"بے خار گل نہ باشد و بے نیش نوش ہم
تدبیر چیست؟ وضع جہاں ایں چنیں فتاد"
"پُرکن زبادہ جام و دما دم بگوشِ ہوش
بشنواز و حکایت جمشید و کیقباد"

۱۱۵

قلعہ احمد نگر

۱۹؍اگست ۱۹۴۲ء

چو تخم اشک بہ کلفت سرشتہ اندمرا
بہ نا امیدیٔ جاوید کشتہ اندمرا
ز آہِ بے اثرم داغِ خام کاریِ خویش
ز آتشے کہ نہ دارم ، برشتہ اندمرا[1]

صدیق مکرم

وہی صبح چار بجے کا وقت ہے۔ چائے سامنے دھری ہے۔ جی چاہتا ہے آپ کو مخاطب تصور کروں اور کچھ لکھوں۔ مگر لکھوں تو کیا لکھوں؟ مرزا غالب نے رنجِ گراں نشین کی حکایتیں لکھی تھیں؛ صبر گریز پا کی شکایتیں کی تھیں:

کبھی حکایتِ رنجِ گراں نشیں لکھیے
کبھی شکایتِ صبرِ گریز پا کہیے[2]

لیکن یہاں نہ رنج کی گراں نشینیاں ہیں کہ لکھوں، نہ صبر کی گریز پائیاں ہیں کہ سناؤں۔ رنج کی جگہ صبر کی گراں نشینیوں کا خوگر ہو چکا ہوں۔ صبر کی جگہ رنج کی گریز پائیوں کا تماشائی رہتا ہوں۔ عرفی کا وہ شعر کیا خوب ہے، جو ناصر علی[3] نے اُس کے تمام کلام سے چنا تھا:

من ازیں رنجِ گر انبار چہ لذت یابم
کہ بہ اندازۂ آں صبر و ثباتم دادند[4]

اگراس شعر کو اپنی حالت پر ڈھالنے کی کوشش کروں تو یہ ایک طرح کی خودستائی اور خویشتن بینی کی بے صرفگی سمجھی جائے گی۔ لیکن یہ کہنے میں کیا عیب ہے کہ اس مقام کی لذّت شناسی سے بے بہرہ نہیں ہوں اور اس کا آرزومند رہتا ہوں۔ اسی عرفی نے یہ بھی تو کہا ہے:

(۱۱۸) منکر نہ تواں گشت اگر دم زنم از عشق
این نشہ بہ من گر نہ بود، بادگرے ہست [5]

یہاں پہنچنے کے بعد چند دنوں تک تو صرف جیلر ہی سے سابقہ رہا۔ ایک دو مرتبہ کلکٹر اور سول سرجن بھی آئے۔ پھر جس دن انسپکٹر جنرل آیا، اُسی دن ایک اور شخص بھی اُس کے ہمراہ آیا۔ معلوم ہوا، آئی، ایم، ایس [6] سے تعلق رکھتا ہے۔ میجر ایم سینڈک (M.Sendak) نام ہے اور یہاں کے لیے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوا ہے۔ میں نے جی میں کہا یہ سینڈک، مینڈک کون کہے؟ کوئی اور نام ہونا چاہیے جو ذرا مانوس اور رواں ہو۔ معاً حافظہ نے یاد دلایا کہیں نظر سے گزرا [7] تھا کہ چاند بی بی کے زمانے میں اس قلعہ کا قلعہ دار چیتہ خاں نامی ایک حبشی تھا۔ میں نے اِن حضرت [8] کا نام چیتہ خاں ہی رکھ دیا کہ اوّل بہ آخر نسبتے دارد:

نام اُس کا آسماں ٹھہرا لیا تحریر میں [9]

ابھی دو چار دن بھی نہیں گذرے تھے کہ یہاں ہر شخص کی زبان پر چیتہ خان تھا۔ قیدی اور وارڈرز بھی اسی نام سے پکارنے لگے۔ کل جیلر کہتا تھا کہ آج چیتہ خاں وقت سے پہلے گھر چلا گیا۔ میں نے کہا چیتہ خان کون؟ کہنے لگا میجر اور کون؟

(۱۱۹) ماہیچ نہ گفتیم و حکایت بدر افتاد [10]

بہر حال غریب جیلر کی جان چھٹی، اب سابقہ چیتہ خاں سے رہتا ہے۔ جب جاپانیوں نے انڈیمین پر قبضہ کیا تھا تو یہ وہیں متعین تھا۔ اس کا تمام سامان غارت گیا۔ اپنی بربادیوں کی کہانیاں یہاں لوگوں کو سُناتا رہتا ہے۔

(۱۲۰) اگر ما دردِ دل داریم ، زاہد دردِ دیں دارد [11]

اِس مرتبہ سب سے زیادہ اہتمام اس بات کا کیا گیا ہے کہ زندانیوں کا کوئی تعلق باہر کی دُنیا سے نہ رہے، حتیٰ کہ باہر کی پرچھائیں بھی یہاں نہ پڑنے پائے۔ غالباً ہمارا محل

قیام بھی پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ اب گویا احمد نگر بھی جنگ کے پُر اسرار مقامات کی طرح ''سم ویران انڈیا''[۱۲] (Somewhere in India) کے حکم میں داخل ہو گیا، دیکھیے ناسخ کا ایک فرسودہ شعر یہاں کیا کام دے گیا ہے:

ہم سا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہوگا
گُم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا[۱۳]

قلعہ کی جس عمارت میں ہم رکھے گئے ہیں، یہاں غالباً چھاؤنی کے افسر رہا کرتے تھے۔ گاہ گاہ جنگی قیدیوں کے لیے بھی اسے کام میں لایا گیا ہے۔ جنگ بوئر[۱۴] کے زمانے میں جو قیدی ہندوستان لائے گئے تھے اُن کے افسروں کا ایک گروہ یہیں رکھا گیا تھا۔ گزشتہ جنگ میں بھی ہندوستان کے جرمن یہیں نظر بند کیے گئے اور موجودہ جنگ میں بھی اطالوی افسروں کا ایک گروہ جو مصر سے لایا گیا تھا، یہیں نظر بند رہا:

چیتہ خاں کہتا ہے کہ ہمارے آنے سے پہلے یہاں فوجی افسروں کی ٹریننگ کی ایک کلاس کھولی گئی تھی۔ کل میرے کمرے میں الماری ہٹا کر اس نے دکھایا کہ ایک بڑا سیاہ بورڈ دیوار پر بنا ہے۔ میں نے جی میں کہا، غالباً اسی لیے ہمیں یہاں لا کر رکھا گیا ہے کہ ابھی درس گاہِ جنون و وحشت کے کچھ سبق باقی رہ گئے تھے:

دریں تعلیم شد عمر و ہنوز ابجد ہمی خوانم
نہ دانم کے سبق آموز خواہم شد بہ دیوانش[۱۵]

(۱۲۱)

احاطہ کے مغربی رُخ پر جو کمرے ہیں اور جو ہمیں رہنے کے لیے دیئے گئے ہیں ان کی کھڑکیاں قلعہ کے احاطہ میں کھلتی ہیں۔ کھڑکیوں کے اوپر روشندان بھی ہیں۔ اس خیال سے کہ ہماری طرح ہماری نگاہیں بھی باہر نہ جا سکیں، تمام کھڑکیاں دیواریں چن کر بند کر دی گئی ہیں۔ دیواریں ہمارے آنے سے ایک دن پہلے چنی گئی ہوں گی۔ کیونکہ جب ہم آئے تھے تو سفیدی خشک ہوئی تھی۔ ہاتھ پڑ جاتا تو اپنا نقش بٹھا دیتا اور نقش اس طرح بیٹھتا کہ پھر اٹھتا نہیں:

ہر داغِ معاصی مِرا اس دامنِ تر سے
جوں حرفِ سرِ کاغذِ نم اُٹھ نہیں سکتا[۱۶]

دیواریں اس طرح چنی گئی ہیں کہ اُوپر تلے، داہنے بائیں کوئی رخنہ باقی نہیں چھوڑا۔ روشندان تک چھپ گئے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر کھڑکیاں کھلی بھی ہوتیں تو کونسا بڑا میدان سامنے کھل جاتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ قلعہ کی سنگی دیواروں تک نگاہیں جاتیں اور ٹکرا کر واپس آجاتیں۔ لیکن ہماری نگاہوں کی اتنی رسائی بھی خطرناک سمجھی گئی۔ روشندان کے آئینے تک بند کردیئے گئے:۔

ہوسِ گُل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے[1]

قلعہ کے دروازے کی شب و روز پاسبانی کی جاتی ہے اور قلعہ کے اندر بھی مسلح سنتری چاروں طرف پھرتے رہتے ہیں۔ پھر بھی ہماری حفاظت کے لیے مزید روک تھام ضروری سمجھی گئی۔ ہمارے احاطہ کا شمالی رُخ پہلے کھلا تھا، اب دس دس فٹ اُونچی دیواریں کھینچ دی گئی ہیں اور ان میں دروازہ بنایا گیا ہے، اور اس دروازے پر بھی رات دن مسلح فوجی پہرہ رہتا ہے۔ فوج یہاں تمام تر انگریز سپاہیوں کی ہے۔ وہی ڈیوٹی پر لگائے جاتے ہیں۔ جیلر اور ایک وارڈر کے سوا جسے بازار سے سودا سلف لانے کے لیے نکلنا پڑتا ہے اور کوئی شخص باہر نہیں جاسکتا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جو کوئی دروازے پر سے گزرے سنتری کو جامہ تلاشی دے۔ وارڈر کو ہر مرتبہ برہنہ ہوکر تلاشی دینی پڑتی ہے۔ وہ جیلر کے پاس جاجا کر روتا ہے مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ پہلے دن جیلر نکلا تھا تو اس سے بھی جامہ تلاشی کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ ''ایں ہم بچہ شتر ست''۔

بازار سے سودا سلف لانے کا انتظام یوں کیا گیا ہے کہ قلعہ کے دروازے کے پاس فوجی ادارہ کا ایک دفتر ہے۔ یہاں کے سپرنٹنڈنٹ کا آفس ٹیلی فون کے ذریعہ اس سے جوڑ دیا گیا ہے۔ جب بازار سے کوئی چیز آتی ہے تو پہلے وہاں روکی جاتی ہے اور اس کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ پھر وہاں کا متعینہ افسر سپرنٹنڈنٹ کو فون کرتا ہے کہ فلاں چیز اس طرح کی اور اس شکل میں آئی ہے۔ مثلاً ٹوکری میں ہے، رومال میں بندھی ہے یا ٹین کا ڈبہ ہے۔ اس اطلاع کے ملنے پر یہاں سے جیلر احاطہ کے دروازے پر جاتا ہے اور نشان زدہ سامان سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں اُٹھوالے جاتا ہے۔ اب یہاں پھر دوبارہ دیکھ بھال کی جاتی

ہے۔ اگر ٹوکری ہے تو اسے خالی کر کے اُس کا ہر حصہ اچھی طرح دیکھ لیا جائے گا کہ اِدھر اُدھر کوئی پرچہ تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ شکر اور آٹے کی خاص طور پر دیکھ بھال کی جاتی ہے کیونکہ ان کی تہ میں بہت کچھ چھپا کر رکھ دیا جا سکتا ہے۔

وارڈر جو پونا سے یہاں لائے گئے ہیں، وہ آئے تو تھے قیدیوں کی نگرانی کرنے مگر اب خود قیدی بن گئے ہیں۔ نہ تو احاطہ سے باہر قدم نکال سکتے ہیں نہ گھر سے خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ جیلر کو بھی گھر خط لکھنے کی اجازت نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے انہی راہوں سے کوئی خبر باہر پہنچ جائے۔ وہ روتا رہتا ہے کہ مجھے صرف ایک دن کی چھٹی ہی مل جائے کہ پونا ہو آؤں، مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ یہاں جسے دیکھو ہائے ہائے کر رہا ہے:

شبنم خرابِ مہر، کتاں سینہ چاکِ ماہ

لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں! [۱۸]

اِس صورت حال نے یہاں کی ضروریات کی فراہمی میں عجیب عجیب الجھاؤ ڈال دیئے ہیں۔ چیتہ خاں جب دیکھو کسی نہ کسی گرہ کے کھولنے میں الجھا ہوا ہے مگر گرہیں ہیں کہ کھُلنے کا نام نہیں لیتیں۔ سب سے پہلا مسئلہ باورچی کا پیش آنا تھا اور پیش آیا۔ باہر کا کوئی آدمی رکھا نہیں جا سکتا کیونکہ وہ قیدی بن کر رہنے کیوں لگا؟ اور قیدیوں میں ضروری نہیں کہ باورچی نکل آئے۔ قیدی باورچی جبھی مل سکتا ہے کہ پہلے کوئی قرینہ کا باورچی ذوق جرائم پیشگی میں اتنی ترقی کرے کہ پکڑا جائے اور پکڑا بھی جائے کسی اچھے خاصے جرم میں کہ اچھی مدت کے لیے سزا دی جا سکے۔ لیکن ایسا حُسن اتفاق گاہ گاہ ہی پیش آ سکتا ہے اور آج کل تو سُوءِ اتفاق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس علاقہ کے باورچیوں میں کوئی مرد میدان رہا ہی نہیں۔ انسپکٹر جنرل جب آیا تھا تو کہتا تھا، یرودا جیل میں ہر گروہ اور پیشے کے قیدی موجود ہیں مگر باورچیوں کا کال ہے۔ نہیں معلوم ان کم بختوں کو کیا ہو گیا ہے:

(۱۲۲) کس نہ دارد ذوقِ مستی، مے گساراں راچہ شد [۱۹]

جو قیدی یہاں چن کر کام کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں، اِن میں سے دو قیدیوں پر باورچی ہونے کی تہمت لگائی گئی ہے:

(۱۲۳) ستم رسیدہ یکے، نا امیدوار یکے [۲۰]

حالانکہ دونوں اس الزام سے بالکل معصوم واقع ہوئے ہیں اور زبانِ حال سے نظیری کا یہ شعر دُہرا رہے ہیں۔ داد دیجئے گا، کہاں کی بات کہاں لا کر ڈالی ہے، اور کیا برمحل بیٹھی ہے:

تا مُنفعل ز رنجشِ بے جا نہ بینمش
می آرم اعترافِ گناہ نہ بودہ را [۲۱]

چیتہ خاں یہاں آتے ہی اس عقدۂ لاینحل کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ روز اپنی طلب و جستجو کی ناکامیوں کی کہانیاں سُناتا:

(۱۲۵) اگر دستے کنم پیدا، نمی یابم گریباں را [۲۲]

ایک دن خوش خوش آیا اور یہ خبر سنائی کہ ایک بہت اچھے باورچی کا شہر میں انتظام ہو گیا ہے۔ کلکٹر نے ابھی فون کے ذریعہ خبر دی ہے کہ کل سے کام پر لگ جائے گا:

(۱۲۶) صبا بہ خوش خبری ہُدہُدِ سلیماں ست
کہ مُودۂ طرب از گلشنِ سبا آورد [۲۳]

دُوسرے دن کیا دیکھتا ہُوں کہ واقعی ایک جیتا جاگتا آدمی اندر لایا گیا ہے۔ معلوم ہوا طباخِ موعُود یہی ہے:

(۱۲۷) آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید [۲۴]

مگر نہیں معلوم اس غریب پر کیا بیتی تھی کہ آنے کو تو آ گیا لیکن کچھ ایسا کھویا ہوا اور سراسیمہ حال تھا جیسے مصیبتوں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا ہو۔ وہ کھانا کیا پکاتا اپنے ہوش وحواس کا مسالہ کُوٹنے لگا:

اُڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا [۲۵]

بعد کو اس معاملہ کی جو تفصیلات کھلیں، اُن سے معلوم ہوا کہ یہ شکار واقعی کلکٹر ہی کے جال میں پھنسا تھا۔ کچھ اس کے زورِ حکومت نے کام دیا، کچھ ساٹھ روپے ماہانہ تنخواہ کی ترغیب نے اور یہ اجل رسیدہ دام میں پھنس گیا۔ اگر اسے بعافیت قلعہ میں فوراً پہنچا دیا جاتا تو ممکن ہے کچھ دنوں تک جال میں پھنسا رہتا لیکن اب ایک اور مشکل پیش آ گئی۔ یہاں کے کمانڈنگ آفیسر سے باورچی رکھنے کے بارے میں ابھی بات چیت ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ

پونا کے صدر دفتر کی ہدایت کا انتظار کر رہا تھا اور اس لیے اس شکار کو فوراً قلعہ کے اندر نے نہیں جا سکتا تھا۔ اب اگر اسے اپنے گھر جانے کا موقع دیا جاتا ہے تو اندیشہ ہے کہ شہر میں چرچا پھیل جائے گا اور بہت ممکن ہے کوئی موقع طلب اس معاملہ سے بروقت فائدہ اٹھا کر باورچی کو نامہ و پیام کا ذریعہ بنا لے۔ اگر روک لیا جاتا ہے، تو پھر رکھا کہاں جائے کہ زیادہ سے زیادہ محفوظ جگہ ہو اور باہر کا کوئی آدمی وہاں تک پہنچ نہ سکے۔

یہ بعد از انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا![۲۶]

اسے کلکٹر کے یارانِ طریقت کی عقل مندی سمجھیے یا بے وقوفی کہ اسے بہلا پھسلا کر یہاں کے مقامی قید خانہ میں بھیج دیا۔ کیونکہ اُن کے خیال میں قلعہ کے علاوہ اگر کوئی اور محفوظ جگہ یہاں ہو سکتی تھی تو وہ قید خانہ کی کوٹھڑی ہی تھی۔ قید خانہ میں جو اسے ایک رات دن قید و بند کے توے پر سینکا گیا تو بھوننے تلنے کی ساری ترکیبیں بھول گیا۔ اِس احمق کو کیا معلوم تھا کہ ساٹھ روپے کے عشق میں یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے؟ اِس ابتدائے عشق ہی نے کچومر نکال دیا تھا۔ قلعہ تک پہنچتے پہنچتے قلیہ بھی طیار ہو گیا:

(۱۲۸) کہ عشق آساں نمود اوّل ، ولے اُفتاد مشکل ہا![۲۷]

بہرحال دو دن اس نے کسی نہ کسی طرح نکال دیئے تیسرے دن ہوش و حواس کی طرح صبر و قرار نے بھی جواب دے دیا۔ میں صبح کے وقت کمرے کے اندر بیٹھا لکھ رہا تھا کہ اچانک کیا سنتا ہوں، جیسے باہر ایک عجیب طرح کا مخلوط شور و غل ہو رہا ہو۔ ''مخلوط'' اس لیے کہنا پڑا کہ صرف آوازوں ہی کا غل نہیں تھا، رونے کی چیخیں بھی ملی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی آدمی گھٹی ہوئی آواز میں کچھ کہتا جاتا ہے اور پھر بیچ بیچ میں روتا بھی جاتا ہے۔ گویا وہ صورت حال ہے جو خسرو نے سختی کشان عشق کی سنائی تھی کہ:

(۱۲۹) قدرے گرید ، وہم برسرِ افسانہ رود ![۲۸]

باہر نکلا تو سامنے کے برآمدے میں ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ چیتہ خاں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا ہے، سامنے باورچی زمین پر لوٹ رہا ہے۔ تمام وارڈرز حلقہ باندھے کھڑے ہیں، قیدیوں کی قطار صحن میں صف بستہ ہو رہی ہے اور ہمارے قافلہ کے تمام زندانی بھی ایک ایک کر کے کمروں سے نکل رہے ہیں۔ گویا اس خرابہ کی ساری آبادی وہیں

سمٹ آئی ہے:

آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں ![۲۹]

چیتہ خاں کہ رہا ہے، تمھیں کوئی اختیار نہیں کہ یہاں سے نکلو۔ باورچی چیختا ہے کہ مجھے پورا اختیار ہے، تمھیں کوئی اختیار نہیں کہ مجھے روکو۔ جبر و اختیار (Determinism and Freewill) کا یہ مناظرہ سُن کر مجھے بے اختیار نعمت خاں عالی کا وہ قطعہ یاد آ گیا جو اس نے مختار خاں کی ہجو میں کہا تھا اور جس کی شرح لکھنے میں صاحب خزانہ عامرہ نے بڑی مغز پاشی کی ہے:[۳۰]

(۱۳۰)
ایں دلیل از جبری آورد او از اختیار
ایں سخن ہم درمیاں ماندہ ست امرِ بین بین[۳۱]

باورچی اُن لوگوں میں معلوم ہوتا تھا جن کی نسبت کہا گیا ہے کہ:

(۱۳۱)
قومے بہ جدّ و جہد گرفتند وصلِ دوست[۳۲]

مگر چیتہ خاں اس پر زور دیتا تھا کہ:

(۱۳۲)
قومے دگر حوالہ بہ تقدیر می کنند ![۳۲]

جیلر نے خیال کیا کہ حقیقت حال کچھ ہی ہو، مگر ''بین الجبر والاختیار'' ☆ کا مذہب اختیار کیے بغیر چارہ نہیں۔ اُس کی نظر اشاعرہ کے ''کسب،، [۳۳] اور شوپن ہار (Schopenhauer) کے ''ارادہ'' پر گئی:

(۱۳۳)
گناہ اگرچہ نہ بود اختیار ما حافظ
تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہِ من ست[۳۴]

☆ یعنی ''ڈٹرمن'' اور ''فری ول'' کے درمیان راہ نکالنے کا مذہب جیسا کہ مسلمان متکلموں میں اشاعرہ نے اختیار کیا۔ وہ کہتے ہیں، اگرچہ انسان خدا کی قدرت کے احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتا، مگر اسے ''کسب'' کی قوت حاصل ہے۔ یعنی ارادہ کے ساتھ کام کرنے اور اس کے اثرات کسب کرنے کی قوت حاصل ہے، اگرچہ اس کا ارادہ بھی خود اس کے بس کی چیز نہیں۔ دراصل اشاعرہ کا ''کسب'' بھی مذہب ''جبر'' کی ہی ایک دوسری تعبیر ہے۔ شوپن ہار نے اسی اعتقاد کو یوں تعبیر کیا کہ ہمارے تمام افعال کی تہ میں ہمارا ارادہ کام کرتا ہے، اگرچہ ہمارا ارادہ ہمارے اختیار میں نہیں۔

اس نے باورچی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس طرح کی ہٹ ٹھیک نہیں۔ کسی نہ کسی طرح ایک مہینا نکال دو پھر تمہیں گھر جانے کی اجازت مل جائے گی:

(۱۳۴) مرغِ زیرک چوں بہ دام اُفتد تحمل بایدش [۳۵]

لیکن اس کا معاملہ اب نصیحت پذیریوں کی حد سے گذر چکا تھا:

نکل چکا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے [۳۶]

ایک مہینے کی بات جو اُس نے سنی تو اور کپڑے پھاڑنے لگا:

دِل سے دیوانے کو مت چھیڑ، یہ زنجیر نہ کھینچ! [۳۷]

شام کو چیتہ خاں اس طرف آیا تو میں نے اس سے کہا کہ اس طرح مجبور کر کے کسی آدمی کو رکھنا ٹھیک نہیں اسے فوراً رخصت کر دیا جائے۔ اگر اسے جبراً رکھا گیا تو ہم اس کا پکایا ہوا کھانا چھونے والے نہیں۔ چنانچہ دوسرے دن اسے رہائی مل گئی۔ اتوار کے دن حسب معمول کلکٹر آیا تو معلوم ہوا جس دن چھوٹا تھا، اُسی دن اُس نے اپنا بوریا بستر سنبھالا اور سیدھا ریلوے اسٹیشن کا رُخ کیا۔ پیچھے مڑ کے دیکھا تک نہیں:

(۱۳۵)
کردہ ام توبہ، داز توبہ پشیماں شدہ ام
کافرم، باز نہ گوئی کہ مسلماں شدہ ام

یہ تو باورچی کی سرگزشت ہُوئی، لیکن یہاں کوئی دن نہیں جاتا کہ کوئی نہ کوئی نئی سرگزشت پیش نہ آتی ہو۔ باورچی کے بعد حجام کا مسئلہ پیش آیا۔ ابھی وہ حل نہیں ہوا تھا کہ دھوبی کے سوال نے سر اٹھایا۔ چیتہ خاں کا سارا وقت ناخن تیز کرنے میں بسر ہوتا ہے۔ مگر رشتہ کار میں کچھ ایسی گانٹھیں پڑ گئی ہیں کہ کھلنے کا نام نہیں لیتیں۔ یہ وہی غالب والا حال ہوا کہ:

پہلے ڈالی ہے سرِ رشتۂ امید میں گانٹھ
پیچھے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل [۳۸]

ابوالکلام

حکایت بادۂ و تریاک

قلعہ احمد نگر

۲۷ر اگست ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم

انسان اپنی ایک زندگی کے اندر کتنی ہی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے مجھے بھی اپنی زندگی کی دو قسمیں کر دینی پڑیں۔ ایک قید خانے سے باہر کی، ایک اندر کی:

(۱۳۶)
ہم سمندر باش وہم ماہی کہ در اقلیم عشق
رُوئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست[1]

دونوں زندگیوں کے مرقعوں کی الگ الگ رنگ و روغن سے نقش آرائی ہوئی ہے، آپ شاید ایک کو دیکھ کر دوسری کو پہچان نہ سکیں:

(۱۳۷)
لباسِ صورت اگر واژگوں کنم بینند
کہ خرقۂ خشنم مایۂ طلا باف است[2]

قید سے باہر کی زندگی میں اپنی طبیعت کی افتاد بدل نہیں سکتا۔ خود رفتگی اور خود مشغولی مزاج پر چھائی رہتی ہے۔ دماغ اپنی فکروں سے باہر آنا نہیں چاہتا اور دل اپنی نقش آرائیوں کا گوشہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بزم و انجمن کے لیے بار خاطر نہیں ہوتا لیکن یارِ شاطر بھی بہت کم بن سکتا ہوں:

(۱۳۸)
تا کے چو موجِ بحر بہر سو شتافتن
در عینِ بحر پائے چو گرداب بند کن![3]

لیکن جونہی حالات کی رفتار قید و بند کا پیام لاتی ہے، میں کوشش کرنے لگتا ہوں

کہ اپنے آپ کو یک قلم بدل دوں۔ میں اپنا پچھلا دماغ سر سے نکال دیتا ہوں اور ایک نئے دماغ سے اس کی خالی جگہ بھرنی چاہتا ہوں۔ حریم دل کے طاقوں کو دیکھتا ہوں کہ خالی ہو گئے تو کوشش کرتا ہوں کہ نئے نئے نقش و نگار بناؤں اور انہیں پھر سے آراستہ کر دوں:

(۱۳۹) وقتست ، دگر بت کدہ سازند حرم را[۴]

اس تحولِ صورت (Metamorphism) کے عمل میں کہاں تک مجھے کامیابی ہوتی ہے، اس کا فیصلہ تو دوسروں ہی کی نگاہیں کر سکیں گی لیکن خود میرے فریب حال کے لیے اتنی کامیابی بس کرتی ہے کہ اکثر اوقات اپنی پچھلی زندگی کو بھولا رہتا ہوں اور جب تک اس کے سراغ میں نہ نکلوں، اُسے واپس نہیں لا سکتا:

(۱۴۰)
دل کہ جمع ست، غم از بے سروسامانی نیست
فکرِ جمعیت اگر نیست، پریشانی نیست ![۵]

اگر آپ مجھے اس عالم میں دیکھیں تو خیال کریں، میری پچھلی زندگی مجھے قید خانے کے دروازے تک پہنچا کر واپس چلی گئی اور اب ایک دوسری ہی زندگی سے سابقہ پڑا ہے۔ جو زندگی کل تک اپنی حالتوں میں غم اور خوش کامیوں اور دل شگفتگیوں سے بہت کم آشنا تھی، آج اچانک ایک ایسی زندگی کے قالب میں ڈھل گئی جو شگفتہ مزاجیوں اور خندہ روئیوں کے سوا اور کسی بات سے آشنا ہی نہیں "ہر وقت خوش رہو اور ہر ناگوار حالت کو خوش گوار بناؤ" جس کا دستور العمل ہے:

(۱۴۱)
حاصلِ کارگہِ کون و مکاں ایں ہمہ نیست
بادہ پیش آر کہ اسبابِ جہاں ایں ہمہ نیست
پنج روزے کہ دریں مرحلہ مہلت داری
خوش بیاسائے زمانے کہ زماں ایں ہمہ نیست[۶]

میں نے قید خانے کی زندگی کو دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے۔ اس میں ایک جز "رواقیہ" (Stocis) کا ہے ایک لذتیہ (Epicureans) کا:

(۱۴۲) پنبہ را آشتی ایں جا بہ شرار افتاد است[۷]

جہاں تک حالات کی ناگواریوں کا تعلق ہے رواقیت سے اُن کے زخموں پر مرہم

لگاتا ہوں اور ان کی چبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں:

۱۴۳

ہر وقت بد کہ رُوئے دہد آبِ سیلِ داں
ہر نقشِ خوش کہ جلوہ کند، موجِ آب گیر [8]

جہاں تک زندگی کی خوشگواریوں کا تعلق ہے لذتیہ کا زاویۂ نگاہ کام میں لاتا ہوں اور خوش رہتا ہوں:

ہر وقت خوش کہ دست دہد مغتنم شمار
کس را وقوف نیست کہ انجام کار چیست! [9]

میں نے اپنے کاک تیل [10] (Cocktail) کے جام میں دونوں بوتلیں انڈیل دیں۔ میرا ذوق بادہ آشامی بغیر اس جامِ مرکب کے تسکین نہیں پا سکتا تھا۔ اسے قدیم تعبیر میں یوں سمجھیے کہ گویا حکایتِ بادہ و تریاک میں نے تازہ کر دی ہے:

۱۴۵

چناں افیون ساقی درمے افگند
حریفاں را نہ سرماند و نہ دستار [11]

البتہ کاک تیل یہ نسخۂ خاص ہر خامکار کے بس کی چیز نہیں ہے۔ صرف بادہ گُساران کہن مشق ہی اسے کام میں لا سکتے ہیں۔ ورموتھ (Vermouth) اور جن [12] (Gin) کا مرکب پینے والے اس رطلِ گراں کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔ مولانائے رومؒ نے ایسے ہی معاملات کی طرف اشارہ کیا تھا:

۱۴۶

بادۂ آں درخورِ ہر ہوش نیست
حلقۂ آں سخرۂ ہر گوش نیست [13]

آپ کہیں گے، قید خانہ کی زندگی رواقیت کے لیے تو موزوں ہُوئی کہ زندگی کے رنج و راحت سے بے پرواہ بنا دینا چاہتی ہے۔ لیکن لذتیہ کی عشرت اندوزیوں کا وہاں کیا موقع ہوا؟ جو نامراد قید خانے سے باہر کی آزادیوں میں بھی زندگی کی عیش کوشیوں سے تہی دست رہتے ہیں، اُنہیں قید و بند کی محروم زندگی میں اِس کا سروساماں کہاں میسّر آ سکتا ہے؟ لیکن مَیں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ اِنسان کا اصلی عیش دماغ کا عیش ہے جسم کا نہیں۔ میں لذتیہ سے ان کا دماغ لے لیتا ہوں جسم اُن کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ داغؔ مرحوم نے ناصح

سے صرف اُس کی زبان لے لینی چاہی تھی:

ملے جو حشر میں، لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طولِ مدّعا کے لیے[14]

اور غور کیجیے تو یہ بھی ہمارے وہم وخیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سروسامانِ کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آ جائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے خود ہمارے اندر ہی موجود ہے۔ عیش ومسرّت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے۔ وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں۔ لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے مگر خود اپنی خبر نہیں۔ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ[15]

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اِک جہاں ڈھونڈھا
پھر آخر دل ہی میں پایا، بغل ہی میں سے تو نکلا![16]

جنگل کے مور کو کبھی باغ وچمن کی جُستجو نہیں ہوئی، اس کا چمن خود اس کی بغل میں موجود رہتا ہے۔ جہاں کہیں اپنے پر کھول دے گا[17]، ایک چمنستان بوقلموں کھل جائے گا:

نہ باصحرا سرے دارم، نہ باگلزار سودائے
بہ ہر جا می روم از خویش می جوشد تماشائے![18]

قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سُورج ہر روز چمکتا ہے اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔ اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں، اسیرانِ قید ومحن کو بھی اپنی جلوہ فرشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں۔ صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی گلگوں چادریں پھیلانے لگے گی تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا، قید خانے کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انہیں دیکھ لیا کریں گی۔ فطرت نے اِنسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شادکام رکھے کسی کو محروم کر دے۔ وہ جب کبھی اپنے چہرہ سے نقاب اُلٹتی ہے تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دیتی ہے۔ یہ ہماری غفلت اندیشی ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھتے نہیں اور صرف اپنے گرد وپیش ہی میں کھوئے

رہتے ہیں:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں، ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا[19]

جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھُپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمانے لگتی ہوں کبھی چاندنی کی حُسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں، اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟ یہاں سروسامان کار کی تو اتنی فراوانی ہوئی کہ کسی گوشہ میں بھی گم نہیں ہوسکتا۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ خود ہمارا دل و دماغ ہی گم ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے سے باہر ساری چیزیں ڈھونڈھتے رہیں گے مگر اپنے کھوئے ہوئے دل کو کبھی نہیں ڈھونڈھیں گے۔ حالانکہ اگر اُسے ڈھونڈھ نکالیں تو عیش و مسرت کا سارا سامان اسی کوٹھڑی[20] کے اندر سمٹا ہوا مل جائے:

بغیر دل ہمہ نقش و نگار بے معنی ست
ہمیں ورق کہ سیہ گشت، مدعا ایں جاست[21]

ایوان و محل نہ ہوں تو کسی درخت کے سائے سے کام لے لیں۔ دیبا و مخمل کا فرش نہ ملے تو سبزۂ خودرو کے فرش پر جا بیٹھیں۔ اگر برقی روشنی کے کنول میسر نہیں ہیں تو آسمان کی قندیلوں کو کون بجھا سکتا ہے؟ اگر دُنیا کی ساری مصنوعی خوشنمائیاں اوجھل ہوگئی ہیں تو ہو جائیں صبح اب بھی ہر روز مسکرائے گی۔ چاندنی اب بھی ہمیشہ جلوہ فروشیاں کرے گی۔ لیکن اگر دل زندہ پہلو میں نہ رہے تو خدارا بتلایئے اس کا بدل کہاں ڈھونڈھیں؟ اس کی خالی جگہ بھرنے کے لیے کس چولھے کے انگارے کام دیں گے؟

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ، تو نہ مر جائے
کہ زندگی عبارت ہے تیرے جینے سے[22]

میں آپ کو بتلاؤں، اِس راہ میں میری کامرانیوں کا راز کیا ہے؟ میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا۔ کوئی حالت ہو، کوئی جگہ ہو، اس کی تڑپ دھیمی نہیں پڑے گی۔ میں جانتا

ہوں کہ جہانِ زندگی کی ساری رونقیں اسی میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں۔ یہ اُجڑا، اور ساری دُنیا اُجڑ گئی:

ازصد سخنِ پیرم یک حرف مرا یادست
"عالم نہ شود ویراں تامیکدہ آبادست"[۲۳]

باہر کے سارے سازوسامان عشرت مجھ سے چھن جائیں لیکن جب تک یہ نہیں چھنتا، میرے عیش وطرب کی سرمستیاں کون چھین سکتا ہے؟

۱۵۰

دیدمش[۲۴] خرم و خنداں قدحِ بادہ بدست
واندراں[۲۵] آئینہ صد گونہ تماشا می کرد
گفتم "ایں جامِ جہاں بیں بتو کے داد حکیم؟
گفت "آں روز کہ ایں گنبد مینا می کرد"[۲۶]

آپ کو معلوم ہے، میں ہمیشہ صبح تین سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جامِ صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں۔ خواجہ شیراز کی طرح میری صدائے حال بھی یہ ہوتی ہے کہ:

خورشیدِ مے زمشرقِ ساغر طلوع کرد
گر برگِ عیش می طلبی، ترکِ خواب کن[۲۷]

یہ وقت ہمیشہ میرے اوقات زندگی کا سب سے زیادہ پُر کیف وقت ہوتا ہے۔ لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اس کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا جو اس وقت خواب آلود آنکھیں لیے ہوئے اٹھے اور قرینہ سے چائے بنا کر میرے سامنے دھر دے۔ اس لیے خود اپنے ہی دستِ شوق کی سرگرمیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں اس وقت بادۂ کُہن کے شیشہ کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈبا کھولتا ہوں اور ایک ماہر فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دم دیتا ہوں۔ پھر جام وصراحی کو میز پر دہنی طرف جگہ دوں گا کہ اس کی اولیت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سروسامان کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور کچھ نہ پوچھیے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا؟ کسی بادہ گسار نے شامپین[۲۸] اور بورڈو[۲۹] کے

صد سالہ تہ خانوں کے عرق کہن سال میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا ہوگا جو چائے کے اس دورِ صبح گاہی کا ہر گھونٹ میرے لیے مہیا کر دیتا ہے۔

﴿۱۵۲﴾
ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر زلذتِ شرب مدامِ ما[۳۰]

آپ کو معلوم ہے کہ میں چائے کے لیے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں۔ یہ چائے کی معمولی پیالیوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر بے ذوقی کے ساتھ پیجیے تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائیں مگر خدانخواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا؟ میں جرعہ کشانِ کہن مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیوں گا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لوں گا۔ پھر جب پہلا فنجان ختم ہو جائے گا تو کچھ دیر کے لیے رُک جاؤں گا اور اس درمیانی وقفہ کو امتدادِ کیف کے لیے جتنا طول دے سکتا ہوں طول دوں گا۔ پھر دُوسرے اور تیسرے کے لیے ہاتھ بڑھاؤں گا اور دنیا کو اور اُس کے سارے کارخانۂ سود و زیاں کو یک قلم فراموش کر دوں گا:

﴿۱۵۳﴾
خوشتر از فکرِ مے و جام چہ خواہد بودن
تابہ بینیم ، سر انجام چہ خواہد بودن ![۳۱]

اِس وقت بھی کہ یہ سطریں بے اختیار نوکِ قلم سے نکل رہی ہیں، اُسی عالم میں ہوں اور نہیں جانتا کہ ۹ راگست کی صبح کے بعد سے دنیا کا کیا حال ہوا اور اب کیا ہو رہا ہے؟

﴿۱۵۴﴾
شرابِ تلخ دہ ساقی کہ مرد افگن بود زورش
کہ تا یک دم بیاسایم ز دنیا و شر و شورش
کمندِ صید بہرامی بیفگن، جامِ مے بردار
کہ من پیمودم ایں صحرا نہ بہرام ست نے گورش[۳۲]

میرا دوسرا اُبر کیف وقت دو پہر کا ہوتا ہے یا زیادہ صحتِ تعین کے ساتھ کہوں کہ زوال کا ہوتا ہے۔ لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتا ہوں۔ پھر اُٹھتا ہوں، غسل کرتا ہوں، چائے کا دور تازہ کرتا ہوں اور تازہ دم ہو کر پھر اپنی مشغولیتوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ اس وقت آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی کا جی بھر کے نظارہ کروں گا اور رواقِ دل کا ایک ایک دریچہ کھول دوں گا۔ گوشہ ہائے خاطر

افسردگیوں اور گرفتگیوں سے کتنے ہی غبار آلودہ ہوں لیکن آسمان کی کشادہ پیشانی اور سورج کی چمکتی ہوئی خندہ روئی دیکھ کر ممکن نہیں کہ اچانک روشن نہ ہو جائیں:

(۱۵۵)
بازم بہ کلبہ کیست ، نہ شمع و نہ آفتاب
بام و درم زذرّہ پروانہ پُر شدہ ست [۳۳]

لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لائیں لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوئی، یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مر جائیے اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہیے۔ جس نے یہ مشکل حل کر لی، اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا:

(۱۵۶)
ناصحم گفت "کہ جُز غم چہ ہنر دارد عشق؟"
گفتم "اے خواجۂ عاقل، ہنرے بہتر ازیں"! [۳۴]

غالباً قدیم چینیوں نے زندگی کے مسئلہ کو دوسری قوموں سے بہتر سمجھا تھا۔ ایک پرانے چینی مقولہ میں سوال کیا گیا ہے "سب سے زیادہ دانش مند آدمی کون ہے؟"، پھر جواب دیا ہے "جو سب سے زیادہ خوش رہتا ہے"۔ اس سے ہم چینی فلسفۂ زندگی کا زاویۂ نگاہ معلوم کر لے سکتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ بالکل سچ ہے:

(۱۵۷)
نہ ہر درخت تحمل کند جفائے خزاں
غلام ہمتِ سردم کہ ایں قدم دارد [۳۵]

اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے تو یقین کیجیے کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔ اب اس کے بعد اس سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا؟ خود بھی خوش رہیے اور دوسروں سے بھی کہتے رہیے کہ اپنے چہروں کو غمگین نہ بنائیں:

(۱۵۸)
چو مہمان خراباتی بعشرت باش باِرنداں
کہ دردِ سرکشی جاناں، گرایں مستی خمار آرد [۳۶]

زمانۂ حال کے ایک فرانسیسی اہلِ قلم آندری ژید [۳۷] (Andre Gide) کی ایک

بات مجھے بہت پسند آئی جو اُس نے اپنی خود نوشتہ سوانح میں لکھی ہے۔ خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔ یعنی ہماری انفرادی زندگی کی نوعیت کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں رہتا، وہ دوسروں تک بھی متعدی ہوتا ہے، یا یوں کہیے کہ ہماری ہر حالت کی چھوت دوسروں کو بھی لگتی ہے۔ اس لیے ہمارا اخلاقی فرض ہوا کہ خود افسردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں:

(۱۵۹) افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را[۳۸]

ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بیک وقت سینکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے۔ اگر ایک چہرے پر غبار آ جائے گا تو سینکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے۔ وہ پورے مجموع کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اُٹھتی ہے لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوئی؛ ہم جو کچھ اپنے لیے کرتے ہیں اس میں بھی دوسروں کا حصہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے اکٹھے ہو جائیں گے۔ ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں۔ یہی حقیقت ہے جسے عرفی نے اپنے شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا تھا:

(۱۶۰)
بدیدارِ تو دل شادند باہم دوستانِ تو
ترا ہم شادماں خواہم چو رُوئے دوستاں بینی[۳۹]

یہ عجیب بات ہے کہ مذہب، فلسفہ اور اخلاق، تینوں نے زندگی کا مسئلہ حل کرنا چاہا اور تینوں میں خود زندگی کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنا زیادہ بجھا دل اور سوکھا چہرہ لے کر پھرے گا، اتنا ہی زیادہ مذہبی، فلسفی اور اخلاقی قسم کا ہوگا۔ گویا علم اور تقدس دونوں کے لیے یہاں ماتمی زندگی ضروری ہوئی۔ زندگی کی تحقیر اور توہین صرف یونان کے کلبیہ (Cynics) ہی کا شعار نہ تھا بلکہ رواقی (Stoics) اور مشائی (Peripatetic) نقطۂ نگاہ میں بھی اس کے عناصر برابر کام کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ

رفتہ افسردہ دلی اور ترش روئی فلسفیانہ مزاج کا ایک نمایاں خط و خال بن گئی۔ اخلاق سے اگر اس کے مذہب طمانیت و مسرّت (Eudemonism) اور مادیاتی مذہب عشرت (Hedonsim) کے تصورات مستثنیٰ کر دیجیے تو اس کا عام طبعی مزاج بھی فلسفیانہ سر کہ روئی سے خالی نہیں ملے گا۔ مذہب اور روحانیات کی دنیا میں تو زُہدِ خشک اور طبعِ خنک کی اتنی گرم بازاری ہُوئی کہ اب زہد مزاجی اور حق آگاہی کے ساتھ کسی ہنستے ہُوئے چہرے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ دینداری اور ثقالتِ طبع تقریباً مرادف لفظ بن گئے ہیں۔ یہاں تک کہ قاآنی کو کہنا پڑا تھا:

(۱۶۱)
اسبابِ طرب را بہ براز مجلس بیروں
زاں پیش کہ ناگاہ ثقیلے رسد از در[۸۰]

آپ جانتے ہیں کہ اہل ذوق کی مجلس طرب تنگ دلوں کے گوشہ خاطر کی طرح تنگ نہیں ہوتی، اُس کی وسعت میں بڑی سمائی ہے۔ نظامی گنجوی نے اس کی تصویر کھینچی تھی:

(۱۶۲)
ہر چہ در جملہ بہ آفاق دریں جا حاضر
مومن و ارمنی و گبر و نصارا و یہود[۸۱]

لیکن اتنی سمائی ہونے پر بھی اگر کسی چیز کی وہاں گنجائش نہ نکل سکی تو وہ زاہدان خشک کے ضخیم اور گنبد نما عمامے تھے۔ ایک عمامہ بھی پہنچ جاتا ہے تو پوری مجلس تنگ ہو جاتی ہے۔ اس لیے بعض یاران بے تکلف کو کہنا پڑا تھا:

(۱۶۳)
درمجلس مازاہد! ازنہار تکلف نیست
البتہ تومی گنجی، عمامہ نمی گنجد

یہ سچ ہے کہ جن مسئلوں کو دنیا سینکڑوں برس کی کاوشوں سے بھی حل نہ کر سکی، آج ہم اپنی خوش طبعی کے چند لطیفوں سے اُنہیں حل نہیں کر دے سکتے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں ایک حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ایک فلسفی، ایک زاہد، ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اس مرقع میں کھپ نہیں سکتے جو نقاشِ فطرت کے مُوقلم نے یہاں کھینچ دیا ہے۔ جس مُرقع میں سورج کی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک، درختوں کا رقص،

پرندوں کا نغمہ، آبِ رواں کا ترنم اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں، اُس میں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرہ کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہوسکتے۔ فطرت کی اِس بزم نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو اور جو چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر، ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر، پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال لے سکتی ہو۔ صائب کیا خوب کہہ گیا ہے:

دریں دو ہفتہ کہ چوں گل دریں گلستانی
کشادہ روئے تراز رازہائے مستاں باش
تمیز نیک و بدروزگار کار تو نیست
چو چشم آئینہ، درخوب وزشت حیراں باش [۴۲]

ابوالکلام

قلعہ احمد نگر

۲۹/اگست ۱۹۴۲ء

این رسم و راہِ تازۂ حرمان عہدِ ماست
عنقا بہ روزگار کسے نامہ برنہ بود[1]

صدیق مکرم

وہی چار بجے صبح کا جانفزا وقت ہے۔ چائے کا فنجان سامنے دھرا ہے اور طبیعت درازنفسی کے لیے بہانے ڈھونڈھ رہی ہے۔ جانتا ہوں کہ میری صدائیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ تاہم طبعِ نالہ سنج کو کیا کروں کہ فریاد وشیون کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں، میرے ذوقِ مخاطبت کے لیے یہ خیال بس کرتا ہے کہ روئے سخن آپ کی طرف ہے:

(۱۶۶) اگر نہ دیدی تپیدنِ دل، شنیدنی بود نالۂ ما[2]

بانسری اندر سے خالی ہوتی ہے مگر فریادوں سے بھری ہوتی ہے؛ یہی حال میرا ہے:

بہ فسانۂ ہوسِ طرب، تہی از خودیم و پراز طلب
چہ دمد زصنعتِ صفرنے☆ بجز اینکہ نالہ فزوں کند[3]

قید وبند کے جتنے تجربے اس وقت تک ہوئے تھے، موجودہ تجربہ ان سب سے کئی باتوں میں نئی قسم کا ہوا۔ اب تک یہ صُورت رہتی تھی کہ قید خانے کے قواعد کے ماتحت عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کا موقع مل جایا کرتا تھا۔ نجی خط وکتابت روکی نہیں جاتی

☆ بانسری میں جو سوراخ بنائے جاتے ہیں، انہیں فارسی میں ''صفرِ نے'' کہتے ہیں، یعنی بانسری کے نقطے[4]

تھی۔ اخبارات دیے جاتے تھے اور اپنے خرچ سے منگوانے کی بھی اجازت ہوتی تھی۔ خاص خاص حالتوں میں اس سے بھی زیادہ دروازہ کھلا رہتا تھا۔ چنانچہ جہاں تک خط و کتابت اور مُلاقاتوں کا تعلق ہے، مجھے ہمیشہ زیادہ سہولتیں حاصل رہیں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ گو ہاتھوں میں زنجیریں اور پاؤں میں بیڑیاں پڑ جاتی تھیں لیکن کان بند نہیں ہو جاتے تھے اور آنکھوں پر پٹیاں نہیں بندھتی تھیں۔ قید و بند کی ساری رکاوٹوں کے ساتھ بھی آدمی محسوس کرتا تھا کہ ابھی تک اسی دُنیا میں بس رہا ہے جہاں گرفتاری سے پہلے رہا کرتا تھا:

زندان [میں] بھی خیال بیاباں نورد تھا![5]

کھانے پینے اور ساز و سامان کی تکلیفیں اُن کو پریشان نہیں کر سکتیں جو جسم کی جگہ دماغ کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ آدمی اپنے آپ کو احساسات کی عام سطح سے ذرا بھی اونچا کر لے تو پھر جسم کی آسائشوں کا فقدان اسے پریشان نہیں کر سکے گا۔ ہر طرح کی جسمانی راحتوں سے محروم رہ کر بھی ایک مطمئن زندگی بسر کر دی جا سکتی ہے اور زندگی بہر حال بسر ہو ہی جاتی ہے:

رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام؟
زیں ہو سہا بگور یا نگزر، می گزرد ![6]

۱۶۸

یہ حالت انقطاع و تجرد کا ایک نقشہ بناتی تھی، مگر نقشہ اُدھورا ہوتا تھا[7]۔ کیونکہ نہ تو باہر کے علاقے پوری طرح منقطع ہو جاتے تھے، نہ باہر کی صداؤں کو زندان کی دیواریں روک سکتی تھیں:

قید میں بھی ترے وحشی کو رہی زلف کی یاد
ہاں، کچھ اک رنج گرانباریٔ زنجیر بھی تھا[8]

لیکن اس مرتبہ جو حالت پیش آئی، اُس نے ایک دوسری ہی طرح کا نقشہ کھینچ دیا باہر کی نہ صرف تمام صُورتیں ہی یک قلم نظروں سے اوجھل ہو گئیں بلکہ صدائیں بھی بیک دفعہ رُک گئیں۔ اصحابِ کہف کی نسبت کہا گیا ہے کہ فَضَرَبْنَا عَلٰۤی اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا[9]، تو ایسی ہی ضرب علی الاذان کی حالت ہم پر بھی طاری ہو گئی۔ گویا جس دنیا میں بستے تھے، وہ دُنیا ہی نہ رہی:

کان لم یکن بین الحجون الی الصفا

(۱۶۹)

انیس، ولم یسمر بمکۃ سامر ![۱۰]

اچانک ایک نئی دُنیا میں لا کر بند کر دیئے گئے جس کا پورا جغرافیہ ایک سو گز سے زیادہ پھیلاؤ نہیں رکھتا اور جس کی مردم شماری پندرہ زندہ شکلوں سے زیادہ نہیں۔ اسی دُنیا میں ہر صبح کی روشنی طلوع ہونے لگی، اسی میں ہر شام کی تاریکی پھیلنے لگی:

گویا نہ وہ زمین ہے نہ وہ آسماں ہے اب[۱۱]

اگر کہوں کہ اِس ناگہانی صُورتِ حال سے طبیعت کا سکوں متاثر نہیں ہوا تو یہ صریح بناوٹ ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ طبیعت متاثر ہُوئی اور تیزی اور شدت کے ساتھ ہُوئی لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس حالت کی عمر چند گھنٹوں سے زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ گرفتاری کے دوسرے ہی دن جب حسب معمول علی الصّباح اٹھا اور جام و مینا کا دور گردش میں آیا تو ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے طبیعت کا سارا انقباض اچانک دور ہو رہا ہو[۱۲] اور افسردگی و تنگی کی جگہ انشراح و شگفتگی دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہو۔ مخلص خاں عالمگیری نے کیا خوب لف و نشر مرتب کیا ہے۔ اس ذوقِ سخن میں میرا ساتھ دیجیے:

خمارِ ما و درِ توبہ و دلِ ساقی

(۱۷۰)

بیک تبسّمِ مینا شکست و بست و کشاد[۱۳]

اب معلوم ہوا کہ اگرچہ نگاہوں اور کانوں کی ایک محدود دنیا کھوئی گئی ہے، فکر و تصور کی کتنی ہی نئی دنیائیں اپنی ساری پہنائیوں اور بے کناریوں کے ساتھ سامنے آ کھڑی ہوئی ہیں۔ اگر ایک دروازے کے بند ہونے پر اتنے دروازے کھل جا سکتے ہیں تو کون ایسا زیان عقل ہوگا جو اس سودے پر گلہ مند ہو:

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب

دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں[۱۴]

باقی رہی قید و بند کی تنہائی اور علائق کا انقطاع تو حقیقت یہ ہے کہ یہ حالت کبھی میرے لیے موجب شکایت نہ ہو سکی۔ میں اس سے گریزاں نہیں رہتا، اِس کا آرزو مند رہتا ہوں۔ تنہائی خواہ کسی حالت میں آئے اور کسی شکل میں، میرے دل کا دروازہ ہمیشہ کھلا پائے گی۔

بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَاب [۱۵]

ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طبعِ وحشت سرشت کے ساتھ نبھائے نہیں جا سکتے، اس لیے بہ تکلف خود کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانا پڑتا ہے مگر دل کی طلب ہمیشہ بہانے ڈھونڈھتی رہتی ہے۔ جونہی ضرورت کے تقاضوں سے مہلت ملی اور وہ اپنی کاموئیوں میں لگ گئی:

(۱۷۱)

در خراباتم نہ دیدستی خراب
بادہ پنداری کہ پنہاں می زنم [۱۶]

لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں، مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشہ میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔ کلکتہ میں آپ نے ڈلہوزی اسکوائر [۱۷] ضرور دیکھا ہوگا، جنرل پوسٹ آفس کے سامنے واقع ہے؛ اسے عام طور پر لال ڈگی کہا کرتے تھے۔ اِس میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا کہ باہر سے دیکھیے تو درخت ہی درخت ہیں؛ اندر جایئے تو اچھی خاصی جگہ ہے اور ایک بینچ [۱۸] بھی بچھی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں اب بھی یہ جھنڈ ہے کہ نہیں۔ میں جب سیر کے لیے نکلتا تو کتاب ساتھ لے جاتا اور اس جھنڈ کے اندر بیٹھ کر مُطالعہ میں غرق ہو جاتا والد مرحوم کے خادمِ خاص حافظ ولی اللہ مرحوم ساتھ ہوا کرتے تھے۔ وہ باہر ٹہلتے رہتے اور جھنجلا جھنجلا کر کہتے ''اگر تجھے کتاب ہی پڑھنی تھی تو گھر سے نکلا کیوں؟،، یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور ان کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ دریا کے کنارے ایڈن گارڈن میں بھی اس طرح کے کئی جھنڈ تھے۔ ایک جھنڈ جو برمی پگوڈا کے پاس مصنوعی نہر کے کنارے تھا اور شاید اب بھی ہو، میں نے چن لیا کیونکہ اس طرف لوگوں کا گزر بہت کم ہوتا تھا۔ اکثر سہ پہر کے وقت کتاب لے کر نکل جاتا اور شام تک اس کے اندر رہتا۔ اب وہ زمانہ یاد آ جاتا ہے تو دل کا عجیب حال ہوتا ہے:۔

عالم بے خبری، طرفہ بہشتے بوداست
حیف صد حیف کہ ما دیر خبردار شدیم [۱۹]

کچھ یہ بات نہ تھی کہ کھیل کود اور سیر و تفریح کے وسائل کی کمی ہو۔ میرے چاروں طرف ان کی ترغیبات پھیلی ہوئی تھیں اور کلکتہ جیسا ہنگامہ گرم کن شہر تھا لیکن میں طبیعت ہی کچھ ایسی لے کر آیا تھا کہ کھیل کود کی طرف رُخ ہی نہیں کرتی تھی:

(۱۷۳)

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیالِ ماہے
چہ کنم کہ نفسِ بدخو نہ کند بہ کس نگاہے [۲۰]

والد مرحوم میرے اس شوق علم سے خوش ہوتے۔ مگر فرماتے، یہ لڑکا اپنی تندرستی بگاڑ دے گا۔ معلوم نہیں جسم کی تندرستی بگڑی یا سنوری مگر دل کو ایسا روگ لگ گیا کہ پھر کبھی پنپ نہ سکا۔

(۱۷۴)

کہ گفتہ بود کہ ہوردش دوا پذیر مباد ! [۲۱]

میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو علم و مشیخت کی بزرگی اور مرجعیت رکھتا تھا۔ اس لیے خلقت کا جو ہجوم و احترام آج کل سیاسی لیڈری کے عروج کا کمال مرتبہ سمجھا جاتا ہے، وہ مجھے مذہبی عقیدت مندیوں کی شکل میں بغیر طلب و سعی کے مل گیا تھا۔ میں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے پاؤں چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے۔ خاندانی پیشوائی و مشیخت کی اس حالت میں نوعمر طبیعتوں کے لیے بڑی ہی آزمائش ہوتی ہے۔ اکثر حالتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ ابتداء ہی سے طبیعتیں برخود غلط ہو جاتی ہیں اور نسلی غرور اور پیدائشی خود پرستی کا وہی روگ لگ جاتا ہے جو خاندانی امیر زادوں کی تباہی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ ممکن ہے اس کے کچھ نہ کچھ اثرات میرے حصے میں بھی آئے ہوں کیونکہ اپنی چوریاں پکڑنے کے لیے خود اپنے کمین میں بیٹھنا، جیسا کہ عرفی نے کہا ہے، آسان نہیں:

(۱۷۵)

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا
یک دم منافقانہ نشین درکمین خویش [۲۲]

لیکن جہاں تک اپنی حالت کا جائزہ لے سکتا ہوں، مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ میری طبیعت کی قدرتی اُفتاد مجھے بالکل دوسری ہی طرف لے جا رہی تھی۔ میں خاندانی مریدوں کی ان عقیدت مندانہ پرستاریوں سے خوش نہیں ہوتا تھا، بلکہ طبیعت میں ایک طرح

کا انقباض اور توحش رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ اس فضا سے بالکل الگ ہو جاؤں اور کوئی آدمی آ کر میرے ہاتھ پاؤں نہ چومے۔ لوگ یہ کمیاب جنس ڈھونڈتے ہیں اور ملتی نہیں، مجھے گھر بیٹھے ملی اور اس کا قدر شناس نہ ہو سکا:

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں [23]

البتہ اب سوچتا ہوں تو یہ معاملہ بھی فائدہ سے خالی نہ تھا اور یہاں کونسا معاملہ ہے جو فائدہ سے خالی ہوتا ہے؟ یہی فائدہ کیا کم ہے کہ جس غذا کے لیے دنیا کی طبیعتیں للچائی رہتی ہیں اس سے پہلے ہی دن اپنا جی سیر ہو گیا اور طبیعت میں للچاہٹ باقی نہ رہی۔ فیضی نے ایک شعر ایسا کہا ہے کہ اگر اور کچھ نہ کہتا جب بھی فیضی تھا:

کعبہ را ویراں مکن اے عشق، کانجا یک نفس
گہ گہے پسماندگان راہ منزل می کنند [24]

(۱۷۶)

طبیعت کی اس اُفتاد نے ایک بڑا کام یہ دیا کہ زمانے کے بہت سے حربے میرے لیے بیکار ہو گئے۔ لوگ اگر میری طرف سے رُخ پھیرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو، اور زیادہ منت گزار ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ ان کا جو ہجوم لوگوں کو خوش حال کرتا ہے میرے لیے بسا اوقات نا قابل برداشت ہو جاتا ہے۔ میں اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں تو یہ میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی، اضطرار و تکلف کی مجبوری ہوتی ہے۔ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈھا تھا؛ سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا۔ میرا معاملہ سیاسی زندگی کے ساتھ وہ ہوا جو غالب کا شاعری کے ساتھ ہوا تھا۔ [25]

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما [26]

(۱۷۷)

اسی طرح اگر حالات کی رفتار قید و بند کا باعث ہوتی ہے تو اس حالت کی جو روکاوٹیں اور پابندیاں دوسروں کے لیے اذیت کا موجب ہوتی ہیں میرے لیے یکسوئی اور بخود مشغولی کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور کسی طرح بھی طبیعت کو افسردہ نہیں کر سکتیں۔ میں جب کبھی قید خانے میں سنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قید تنہائی کی سزا دی گئی ہے تو حیران رہ جاتا

ہوں کہ تنہائی کی حالت آدمی کے لیے سزا کیسے ہو سکتی ہے؟ اگر دنیا اسی کو سزا سمجھتی ہے تو کاش ایسی سزائیں عُمر بھر کے لیے حاصل کی جاسکیں:

﴿۱۷۸﴾
حسدِ تہمت آزادی سردم بگداخت
کیں مرادیست کہ بر تہمت آں ہم حسد ست [۲۷]

ایک مرتبہ قید کی حالت میں ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے جو میرے آرام و راحت کا بہت خیال رکھنا چاہتے تھے مجھے ایک کوٹھڑی [۲۸] میں تنہا دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی۔ سپرنٹنڈنٹ فوراً طیار ہو گیا کہ مجھے ایسی جگہ رکھے جہاں اور لوگ بھی رکھے جاسکیں اور تنہائی کی حالت باقی نہ رہے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے اُن حضرت سے کہا آپ نے مجھے راحت پہنچانی چاہی، مگر آپ کو معلوم نہیں کہ جو تھوڑی سی راحت یہاں حاصل تھی وہ بھی آپ کی وجہ سے اب چھنی جا رہی ہے۔ یہ تو وہی غالبؔ والا مُعاملہ ہوا کہ:

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے [۲۹]

میں اپنی طبیعت کی اِس افتاد سے خوش نہیں ہوں، نہ اسے حسن و خوبی کی کوئی بات سمجھتا ہوں [۳۰]۔ یہ ایک نقص ہے کہ آدمی بزم و انجمن کا حریف نہ ہو اور صحبت و اجتماع کی جگہ خلوت و تنہائی میں راحت محسوس کرے:

﴿۱۷۹﴾
حریف صافی و دُردی نۂ خطا اینجا ست
تمیز ناخوش و خوش می کنی، بلا اینجاست [۳۱]

لیکن اب طبیعت کا سانچہ اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اسے توڑا جاسکتا ہے مگر موڑا نہیں جاسکتا:

﴿۱۸۰﴾
قطرہ از تشویشِ موج آخر نہاں شد در صدف
گوشہ گیری ہائے خلق از انفعالِ صحبت ست [۳۲]

اس افتادِ طبیعت کے ہاتھوں ہمیشہ طرح طرح کی بدگمانیوں کا مورد رہتا ہوں اور لوگوں کو حقیقت حال سمجھا نہیں سکتا۔ لوگ اس حالت کو غرور و پندار پر محمول کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں، میں دوسروں کو سبک سر تصور کرتا ہوں، اس لیے ان کی طرف بڑھتا نہیں، حالانکہ

مجھے خود اپنا ہی بوجھ اٹھنے نہیں دیتا، دوسروں کی فکر میں کہاں رہ سکتا ہوں؟ غنی کشمیری نے ایک شعر کیا خوب کہا ہے[۳۳]:

﴿۱۸۱﴾ طاقت برخاستن از گرد نمنا کم نہ ماند
خلق پندارد کہ مے خوردست ومست افتادہ است

سرخوش نے کلمات الشعراء میں جو شعر نقل کیا ہے، اس میں ''خلق می داند'' ہے مگر میں خیال کرتا ہوں یہ محل ''دانستن'' کا نہیں ہے ''پنداشتن'' کا ہے۔ اس لیے ''پندارد'' زیادہ موزوں ہوگا اور عجب نہیں اصل میں ایسا ہی ہو۔

بہر حال جو صورت حال پیش آئی ہے اُس سے جو کچھ بھی انقباض خاطر ہوا تھا وہ صرف اس لیے ہوا تھا کہ باہر کے علائق اچانک یک قلم قطع ہو گئے اور ریڈیو پوسٹ اور اخبار تک روک دیئے گئے، ورنہ قید و بند کی تنہائی کا کوئی شکوہ نہ پہلے ہوا ہے، نہ اب ہے

دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا؟[۳۴]

اور پھر جو کچھ بھی زبان قلم پر طاری ہوا، صورت حال کی حکایت تھی شکایت نہ تھی کیونکہ اس راہ میں شکوہ و شکایت کی تو گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اگر ہمیں اختیار ہے کہ اپنا سر ٹکراتے رہیں تو دوسرے کو بھی اختیار ہے کہ نئی نئی دیواریں چنتا رہے۔ بیدل کا یہ شعر موجودہ صورت حال پر کیا چسپاں ہوا ہے:

﴿۱۸۲﴾ دوریٔ وصلش طلسمِ اعتبار ما شکست
ورنہ ایں عجزے کہ می بینی، غبار ناز بود[۳۵]

اگرچہ یہاں تنہا نہیں ہوں۔ گیارہ رفیق ساتھ ہیں لیکن چونکہ ان میں سے ہر شخص ازراہ عنایت میرے معمولات کا لحاظ رکھتا ہے، اس لیے حسب دلخواہ یکسوئی اور مشغولیت کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ دن بھر میں صرف چار مرتبہ کمرہ سے نکلنا پڑتا ہے۔ کیونکہ کھانے کا کمرہ قطار کا آخری کمرہ ہے، اور چائے اور کھانے کے اوقات میں وہاں جانا ضروری ہوا؛ باقی تمام اوقات کی تنہائی اور خود مشغولی بغیر کسی خلل کے جاری رہتی ہے:

خوش فرش بوریا و گدائی و خوابِ امن
کیں عیش نیست درخور اورنگ خسروی[۳۶]

زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود سے باہر تھا، اگر چھن گیا ہے تو کیا مضائقہ؟ وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا، سینہ میں چھپائے ساتھ لایا ہوں، اسے سجاتا ہوں اور اس کے سیر و نظارہ میں محو رہتا ہوں:

آئینہ نقش بندِ طلسمِ خیال نیست
تصویر خود بہ لوح دگر می کشیم ما ![۳۷]

گرفتاری چونکہ سفر کی حالت میں ہوئی تھی، اس لیے مطالعہ کا کوئی سامان ساتھ نہ تھا، صرف دو کتابیں میرے ساتھ آ گئی تھیں جو سفر میں دیکھنے کے لیے رکھ لی تھیں۔ اسی طرح دو چار کتابیں بعض ساتھیوں کے ساتھ آ ئیں۔ یہ ذخیرہ بہت جلد ختم ہو گیا اور مزید کتابوں کے منگوانے کی کوئی راہ نہیں نکلی۔ لیکن اگر پڑھنے کے سامان کا فقدان ہوا تو لکھنے کے سامان کی کوئی کمی نہیں ہوئی۔ کاغذ کا ڈھیر میرے ساتھ ہے اور روشنائی کی احمد نگر کے بازار میں کمی نہیں۔ تمام وقت خامہ فرسائی میں خرچ ہوتا ہے:

درجنوں بیکار نہ تواں زیستن
آتشم تیزست و داماں می زنم ![۳۸]

جب تھک جاتا ہوں تو کچھ دیر کے لیے برآمدہ میں نکل کر بیٹھ جاتا ہوں، یا صحن میں ٹہلنے لگتا ہوں:

بیکاری جنوں میں ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی[۳۹]

میں نے جو خط انسپکٹر جنرل کو لکھا تھا، وہ اس نے گورنمنٹ کو بھیج دیا تھا۔ کل اس کا جواب ملا۔ اب نئے احکام ہمارے لیے یہ ہیں کہ اخبار دیے جائیں گے، قریبی رشتہ داروں کو خط لکھا جا سکتا ہے لیکن ملاقات کسی سے نہیں کی جا سکتی۔ چیتہ خاں نے یہاں کے فوجی مس[۴۰] (Mess) سے ٹائمز آف انڈیا کا تازہ پرچہ منگوا لیا تھا۔ وہ اس نے خط کے ساتھ حوالہ کیا۔ اخبار کا ہاتھ میں لینا تھا کہ تین ہفتہ پہلے کی دنیا جو ہمارے لیے معدوم ہو چکی تھی،

پھر سامنے آ کھڑی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ہمارے گرفتار ہو جانے سے ملک میں امن چین نہیں ہو گیا، بلکہ نئے ہنگاموں نے نئے غلغلے برپا کیے:

ہے ایک خلق کا خوں، اشک خونفشاں پہ میرے
سکھائی طرز اُسے دامن اُٹھا کے آنے کی [۴۱]

میں نے چیتہ خاں سے کہا کہ اگر ۹ راگست سے ۲۷ تک کے پچھلے پرچے کہیں سے مل سکیں تو منگوا دے۔ اس نے ڈھونڈھوایا تو بہت سے پرچے مل گئے۔ رات دیر تک انہیں دیکھتا رہا تھا:

۱۸۶

دیوانگان ہزار گریباں دریدہ اند
دست طلب بہ دامنِ صحرا نہ می رسد [۴۲]

مگر مجھے یہ قصہ یہاں نہیں چھیڑنا چاہیے۔ میری آپ کی مجلس آرائی اس افسانہ سرائی کے لیے نہیں ہوا کرتی:

۱۸۷

ازما بجز حکایت مہر و وفا مپرس [۴۳]

میری دکان سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی لیکن آپ کے لیے کچھ نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے۔ دیکھیے اس چھان لینے کے مضمون کو شریف خاں شیرازی نے کہ جہانگیر کے عہد میں امیر الامراء ہوا، کیا خوب باندھا ہے:

۱۸۸

شررِ نالہ بہ غربال ادب می بیزم
کہ بہ گوشِ تو مبادا رسد آوازِ درشت [۴۴]

یہ وہی امیر الامراء ہے جس کے حسب ذیل شعر پر جہانگیر نے شعرائے دربار سے غزلیں لکھوائی تھیں اور خود بھی طبع آزمائی کی تھی:

۱۸۹

بگور مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق
یک زندہ کردنِ تو بہ صد خوں برابرست [۴۵]

ابوالکلام

قلعہ احمد نگر

۱۲/اکتوبر۱۹۴۲ء

صدیق مکرم

آج غالباً صُبح عید ہے۔عید کی تبریک آپ تک پہنچا نہیں سکتا،البتہ آپ کو مخاطب تصور کر کے صفحہ کاغذ پر نقش کر سکتا ہوں:

اے غائب از نظر کہ شدی ہمنشین دل
می گویمت دعاؤ ثنامی فرستمت
در راہِ دوست مرحلۂ قُرب و بُعد نیست
می بنیمت عیاں و دُعا می فرستمت

(۱۹۰)

اپنی حالت کیا لکھوں:

خمیازہ سنج تہمت عیش رمیدہ ایم
مے آں قدر نہ بود کہ رنج خمار بُرد[1]

معلوم نہیں، ایک خاص طرح کے ذہنی واردہ کی حالت کا آپ کو تجربہ ہوا ہے یا نہیں؟ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں تازہ نہیں ہوتی۔گویا کسی کونے میں سو رہی ہے۔پھر کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اٹھے گی، جیسے اسی وقت دماغ نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو۔اشعار و مطالب کی یادداشت میں اس طرح کی واردات اکثر پیش آتی رہتی ہیں۔تیس چالیس برس پیشتر کے مطالعہ کے نقوش کبھی اچانک اس طرح

ابھر آئیں گے کہ معلوم ہوگا، ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اٹھا ہوں۔ مضمون کے ساتھ کتاب یاد آجاتی ہے، کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ اور صفحہ کے ساتھ یہ تعین کہ مضمون ابتدائی سطروں میں تھا یا درمیانی سطروں میں یا آخری سطروں میں؛ نیز صفحہ کا رخ کہ دہنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی، حسب معمول سو کر اٹھا تو بغیر کسی ظاہری مناسبت اور تحریک کے یہ شعر خود بخود زبان پر طاری تھا:

کم لذتم و قیمتم افزوں ز شمارست
گوئی ثمر پیشتر از باغ وجودم ![1]

(۱۹۲)

ساتھ ہی یاد آ گیا کہ شعر حکیم صدرائے شیرازی کا ہے جو اواخر عہد اکبری میں ہندوستان آیا اور شاہ جہاں کے عہد تک زندہ رہا، اور آفتاب عالم تاب[2] میں نظر سے گذرا تھا۔ غالباً بائیں طرف کے صفحہ میں اور صفحہ کی ابتدائی سطروں میں۔ آفتاب عالم تاب دیکھے ہوئے کم سے کم تیس برس ہو گئے ہوں گے پھر اتفاق نہیں ہوا کہ اسے کھولا ہو۔

غور فرمایئے کیا عمدہ مثال دی ہے۔ آپ نے اکثر بے فصل کے میوے کھائے ہوں گے۔ مثلاً جاڑوں میں آم چونکہ بے فصل کی چیز ہوتی ہے، نایاب اور تحفہ سمجھی جاتی ہے؛ لوگ بڑی بڑی قیمتیں دے کر خریدتے ہیں اور دوستوں کو بطور تحفہ کے بھیجتے ہیں لیکن جو علت اس کی تحفگی اور گرانی کی ہوئی وہی بے لذتی کی بھی ہوگئی۔ کھایئے تو مزہ نہیں ملتا اور مزہ ملے تو کیسے ملے؟ جو موسم ابھی نہیں آیا، اس کا میوہ ناوقت پیدا ہو گیا۔ یہ زمین کی غلط اندیشی تھی کہ وقت کی پابندی بھول گئی اور اس غلط اندیشی کی پاداش ضروری ہے کہ میوہ کے حصے میں آئے۔ تاہم چونکہ چیز کمیاب ہوتی ہے، اس لیے بے مزہ ہونے پر بھی بے قدر نہیں ہو جاتی۔ کھانے والوں کو مزہ نہیں ملتا؛ پھر بھی زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر خریدیں گے اور کہیں گے، یہ جنس نایاب جتنی بھی گراں ہو، ارزاں ہے۔

غور کیجیے تو انسان کے افکار و اعمال کی دُنیا کا بھی یہی حال ہے۔ یہاں صرف موسم کے درخت ہی نہیں اُگتے، موسم کے دماغ بھی اُگا کرتے ہیں اور پھر جس طرح یہاں کا ہر فضائی موسم اپنے مزاج کی ایک خاص نوعیت رکھتا ہے اور اسی کے مطابق اس کی تمام پیداوار ظہور میں آتی رہتی ہے، اسی طرح وقت کا ہر دماغی موسم بھی اپنا ایک خاص معنوی

مزاج رکھتا ہے، اور ضروری ہے کہ اس کے مطابق طبیعتیں اور ذہنیتیں ظہور میں آئیں۔ لیکن چونکہ یہاں فطرت کی یکسانیوں اور ہم آہنگیوں کی طرح اس کی گاہ گاہ کی ناہمواریاں بھی ہوئیں اور یہاں کا کوئی قانون اپنے فلتات اور شواذ سے خالی نہیں، اس لیے کبھی کبھی ایسا بھی ہونے لگتا ہے کہ ناوقت کے پھلوں کی طرح ناوقت کی طبیعتیں ظہور میں آجاتی ہیں۔ اسے کارخانہ نشوونما کے کاروبار کا نقص کہیے یا زمانہ کی غلط اندیشی وقت (Anachornism) لیکن بہرحال ایسا ہوتا ضرور ہے۔ ایسی ناوقت کی طبیعتیں جب کبھی ظہور میں آئیں گی تو ناوقت کے پھلوں کی طرح موسم کے لیے اجنبی ہوں گی۔ نہ تو وہ وقت کا ساتھ دے سکیں گی، نہ وقت ان کے ساتھ میل کھا سکے گا۔ تاہم چونکہ ان کی نمود میں ایک طرح کی غرابت ہوتی ہے، اس لیے ناوقت کی چیز ہونے پر بھی بے قدر نہیں ہو جاتیں۔ لوگوں کو مزہ ملے یا نہ ملے لیکن ان کی گراں قیمتی کا اعتراف ضرور کریں گے۔ صدرائے شیرازی کی دقّتِ تخیّل نے اِسی صورتِ حال کا سراغ لگایا اور دو مصرعوں میں ایک بڑی کہانی سنادی۔

یہ شعر دہراتے ہوئے مجھے خیال ہوا، میرا اور زمانہ کا باہمی معاملہ بھی شاید کچھ ایسی ہی نوعیت کا ہوا۔ طبیعت کی بے میل افتادِ فکر و عمل کے کسی گوشہ میں بھی وقت اور موسم کے پیچھے چل نہ سکی۔ اسے وجود کا نقص کہیے، لیکن یہ ایک ایسا نقص تھا جو اوّل روز سے طبیعت اپنے ساتھ لائی تھی اور اس لیے وقت کی کوئی خارجی تاثیر اسے بدل نہیں سکتی تھی۔ زمانہ جو قدرتی طور پر موسمی چیزوں کا دلدادہ ہوتا ہے، اس ناوقت کے پھل میں کیا لذّت پا سکتا تھا؟ لوگ کھاتے ہیں تو مزہ نہیں ملتا تاہم اِس بے مزگی پر بھی اپنی قیمت ہمیشہ گراں ہی رہی۔ لوگ جانتے ہیں کہ مزہ ملے نہ ملے، مگر یہ جنس ارزاں نہیں ہوسکتی:

(۱۹۳) متاعِ من کہ نصیبش مباد ارزانی

بازار میں ہمیشہ وہی جنس رکھی جاتی ہے جس کی مانگ ہوتی ہے اور چونکہ مانگ ہوتی ہے اس لیے ہر ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہے اور ہر آنکھ اسے قبول کرتی ہے مگر میرا معاملہ اس سے بالکل الٹا رہا۔ جس جنس کی بھی عام مانگ ہوئی میری دکان میں جگہ نہ پاسکی۔ لوگ زمانہ کے روز بازار میں ایسی چیزیں ڈھونڈ کر لائیں گے جن کا رواج عام ہو، میں نے

ہمیشہ ایسی جنس ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کی جس کا کہیں رواج نہ ہو۔ اوروں کے لیے پسند و انتخاب کی جو علّت ہوئی، وہی میرے لیے ترک و اعراض کی علّت بن گئی۔ انہوں نے دکانوں میں ایسا سامان سجایا جس کے لیے سب کے ہاتھ بڑھیں، میں نے کوئی چیز ایسی رکھی ہی نہیں جس کے لیے سب کے ہاتھ بڑھ سکیں:

﴿۱۹۴﴾
قماش دست زدِ شہر و دِہ زمن مطلب
متاعِ من ہمہ دریائی ست یا کانی ![۵]

لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگاتے ہیں، جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دکان لگائی، تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گزر ہو سکے:

﴿۱۹۵﴾
در کوئے ماشکستہ دلی می خرند و بس
بازارِ خود فروشی ازاں سُوئے دیگر ست[۶]

مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں، جس طرف بھی نکلنا پڑا، اکیلا ہی نکلنا پڑا؛ کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا:

﴿۱۹۶﴾
بارفیقانِ زخود رفتہ سفر دست نداد
سیر صحرائے جنوں حیف کہ تنہا کردیم![۷]

جس راہ میں بھی قدم اٹھایا، وقت کی منزلوں سے اِتنا دور ہوتا گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گردِ راہ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی:

﴿۱۹۷﴾
آں نیست کہ من ہم نفساں را بگوا رم
با آبلہ پایاں چہ کنم، قافلہ تیز ست![۸]

اس تیز رفتاری سے تلوؤں میں چھالے پڑ گئے۔ لیکن عجب نہیں، راہ کے کچھ خس و خاشاک بھی صاف ہو گئے ہوں:

﴿۱۹۸﴾
خارہا از اثر گرمیِ رفتارم سوخت
منّتے بر قدمِ را ہردان ست مرا[۹]

اب اس وقت رشتۂ فکر کی گرہ کھل گئی ہے تو یہ توقع نہ رکھیے کہ اسے جلد لپیٹ سکوں گا:

(۱۹۹) ایں رشتہ بہ انگشت نہ پیچی کہ دراز ست [۱۰]

زندگی میں بہت سے حالات ایسے پیش آئے جو عام حالات میں کم پیش آتے ہیں لیکن معاملہ کا ایک پہلو ایسا ہے جو ہمیشہ میرے لیے ایک معمہ رہا اور شاید دوسروں کے لیے بھی رہے۔ انسان اپنی ساری باتوں میں حالات کی تخلوق اور گرد و پیش کے مؤثرات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ مؤثرات اکثر صورتوں میں آشکارا ہوتے ہیں اور سطح پر سے دیکھ لیے جاسکتے ہیں۔ بعض صورتوں میں مخفی ہوتے ہیں اور تہہ میں اُتر کر انہیں ڈھونڈھنا پڑتا ہے، تاہم سراغ ہر حال میں مل جاتا ہے؛ نسل، خاندان، صحبت، تعلیم و تربیت، ان مؤثرات کے عنصری سرچشمے ہیں:

(۲۰۰) عن المرءِ لا تسئل، وَسل عن قرینه [۱۱]

لیکن اس اعتبار سے اپنی زندگی کے ابتدائی حالات پر نظر ڈالتا ہوں تو بڑی حیرانی میں پڑ جاتا ہوں۔ فکر و طبیعت کی کتنی ہی بنیادی تبدیلیاں ہیں جن کا کوئی خارجی سرچشمہ دکھائی نہیں دیتا اور جو گرد و پیش کے تمام مؤثرات کے خلاف ظہور میں آئیں۔ کتنی ہی ہیں کہ ان کا ظہور سرتا سر متضاد شکلوں میں ہوا۔ دونوں صورتوں میں معاملہ ایک عجیب افسانہ سے کم نہیں:

(۲۰۱)
فریادِ حافظ ایں ہمہ آخر بہ ہرزہ نیست
ہم قصۂ عجیب و حدیثِ غریب ہست [۱۲]

جہاں تک طبیعت کی سیرت اور عادات و خصائل کا تعلق ہے، میں اپنی خاندانی اور نسلی وراثت سے بے خبر نہیں ہوں۔ ہر انسان کی اخلاقی اور معاشرتی صورت کا قالب نسل و خاندان کی مٹی سے بنتا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ میری عادات و خصائل کی مورتی بھی اسی مٹی سے بنی۔ ہر خاندان اپنی روایتی زندگی کی ایک انفرادیت پیدا کر لیتا ہے اور وہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ میں صاف محسوس کرتا ہوں کہ اِس روایتی زندگی کے اثرات میرے خمیر میں رَچ گئے ہیں اور میں ان کی پکڑ سے باہر نہیں جاسکتا۔ میری عادات و

خصائل، چال ڈھال، طور طریقہ، امیال واذواق......سب کے اندر خاندان کا ہاتھ صاف صاف دکھائی دے رہا ہے۔ یہ خاندانی زندگی کی روایتیں مجھے میرے ددھیال اور ننھیال، دونوں سلسلوں سے ملیں اور دونوں پر صدیوں کی قدامت اور تسلسل کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بہرحال میرے حصے میں آنی تھیں ان کے قبول کرنے یا نہ کرنے میں میری خواہش اور پسند کو کوئی دخل نہ تھا لیکن یہاں سوال عادات وخصائل کا نہیں ہے، افکار وعقائد کا ہے اور جب اس اعتبار سے اپنی حالت کا جائزہ لیتا ہوں تو خاندان، تعلیم، ابتدائی گردوپیش......کوئی گوشہ بھی میل کھاتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ فکری مؤثرات کے جتنے بھی احوال وظروف (Environments) ہوسکتے ہیں، اُن میں سے ایک ایک کو اپنے سامنے لاتا ہوں اور ان میں اپنے آپ کو ڈھونڈتا ہوں، مگر اپنا سراغ کہیں نہیں ملتا۔

میں نے ہوش سنبھالتے ہی ایسے بزرگوں کو اپنے سامنے پایا جو عقائد وافکار میں اپنا ایک خاص مسلک رکھتے تھے اور اس میں اس درجہ سخت اور بے لچک تھے کہ بال برابر بھی ادھر اُدھر ہونا کفر وزندقہ تصور کرتے تھے۔ میں نے بچپن سے اپنے خاندان کی جو روائتیں سنیں، وہ بھی سرتاسر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور میرا دماغی ورثہ اس تصلّب اور جمود سے بوجھل تھا۔ میری تعلیم ایسے گردوپیش میں ہوئی جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور تقلید کی چاردیواری میں گھرا ہوا تھا اور باہر کی مخالف ہواؤں کا وہاں تک گزر ہی نہ تھا۔ والد مرحوم کے علاوہ جن اساتذہ سے تحصیل کا اتفاق ہوا وہ بھی وہی تھے جنہیں والد مرحوم نے پہلے اچھی طرح ٹھونک بجا کے دیکھ لیا تھا، کہ اُن کے معیارِ عقائد وفکر پر پورے اتر سکتے ہیں اور یہ معیار اس درجہ تنگ اور سخت تھا کہ ان کے معاصرین میں سے خال خال اشخاص ہی کی وہاں تک رسائی ہوسکتی تھی۔ پس ظاہر ہے کہ اِس دروازہ سے بھی کسی نئی ہوا کے گزرنے کا امکان نہ تھا۔ جہاں تک زمانے کے فکری اِنقلابات کا تعلق ہے، میرے خاندان کی دنیا وقت کی راہوں سے اِس درجہ دور واقع ہوئی تھی کہ اُن راہوں کی کوئی صدا وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی اور اس اعتبار سے گویا سو برس پہلے کے ہندوستان میں میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ ابتدائی صحبتوں کو انسانی دماغ کا سانچہ ڈھالنے میں بہت دخل ہوتا ہے لیکن میری سوسائٹی اوائلِ عمر میں گھر کی چاردیواری کے اندر محدود رہی اور گھر کے عزیزوں

اور بزرگوں کے علاوہ اگر کوئی دوسرا گروہ ملا بھی تو وہ خاندان کے معتقدوں اور مریدوں کا گروہ تھا، وہ میرے ہاتھ پاؤں چومتے اور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے؛ یا رجعتِ قہقری کر کے پیچھے ہٹتے اور دور مؤدب ہو کر بیٹھ جاتے۔ یہ فضا صورت حال میں تبدیلی پیدا کرنے کی جگہ اور زیادہ اسے گہری کرتی رہتی۔ والد مرحوم کے مریدوں میں ایک بڑی تعداد علماء اور انگریزی تعلیم یافتہ اشخاص کی بھی تھی۔ دیوان خانہ میں اکثر ان کا مجمع رہتا، مگر یہ پورا مجمع بھی سرتاسر اسی خاندانی رنگ میں رنگا ہوا تھا؛ کسی دوسرے رنگ کی وہاں جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

علاوہ بریں مرید اور معتقد جب کبھی مجھ سے ملتے تھے تو مجھے مرشد زادہ سمجھ کر منتظر رہتے تھے کہ مجھ سے کچھ سنیں۔ وہ مجھے کچھ سنانے کی گستاخانہ جرات کب کر سکتے تھے؟

انگریزی تعلیم کی ضرورت کا تو یہاں کسی کو وہم و گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا لیکن کم از کم یہ تو ہو سکتا تھا کہ قدیم تعلیم کے مدرسوں میں سے کسی مدرسہ سے واسطہ پڑتا۔ مدرسہ کی تعلیمی زندگی بہر حال گھر کی چار دیواری کے گوشۂ تنگ سے زیادہ وسعت رکھتی ہے اور اس لیے طبیعت کو کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع مل جاتا ہے لیکن والد مرحوم یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ کلکتہ کے سرکاری مدرسہ یعنی مدرسہ عالیہ کی تعلیم ان کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی اور فی الحقیقت قابلِ وقعت تھی بھی نہیں اور کلکتہ سے باہر بھیجنا انہیں گوارا نہ تھا۔ انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ خود تعلیم دیں یا بعض خاص اساتذہ کے قیام کا انتظام کر کے ان سے تعلیم دلائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں تک تعلیمی زمانہ کا تعلق ہے، گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نکالنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بلاشبہ اس کے بعد قدم کھلے اور ہندوستان سے باہر تک پہنچے لیکن یہ بعد کے واقعات ہیں جبکہ طالب علمی کا زمانہ بسر ہو چکا تھا اور میں نے اپنی نئی راہیں ڈھونڈھ نکالی تھیں۔ میری عمر کا وہ زمانہ جسے باقاعدہ طالب علمی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے، چودہ پندرہ برس کی عمر سے آگے نہیں بڑھا۔

پھر خود اس تعلیم کا حال کیا تھا جس کی تحصیل میں تمام ابتدائی زمانہ بسر ہوا؟ اِس کا جواب اگر اختصار کے ساتھ بھی دیا جائے تو صفحوں کے صفحے سیاہ ہو جائیں اور آپ کے لیے تفصیل ضروری نہیں۔ ایک ایسا فرسودہ نظام تعلیم جسے فنِ تعلیم کے جس زاویۂ نگاہ سے بھی

دیکھا جائے سرتا سر عقیم ہو چکا ہے۔ طریقِ تعلیم کے اعتبار سے ناقص، مضامین کے اعتبار سے ناقص، انتخاب کتب کے اعتبار سے ناقص، درس و املا کے اسلوب کے اعتبار سے ناقص۔ اگر فنونِ آلیہ کو الگ کر دیا جائے تو درس نظامیہ میں بنیادی موضوع دو ہی رہ جاتے ہیں۔ علوم دینیہ اور معقولات۔ علوم دینیہ کی تعلیم جن کتابوں کے درس میں منحصر رہ گئی ہے، اس سے ان کتابوں کے مطالب و عبارت کا علم حاصل ہو جاتا ہو، لیکن خود ان علوم میں کوئی مجتہدانہ بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ معقولات سے اگر منطق الگ کر دی جائے تو پھر جو کچھ باقی رہ جاتا ہے اس کی علمی قدر و قیمت اس سے زیادہ کچھ نہیں [۱۳] کہ تاریخ فلسفہ قدیم کے ایک خاص عہد کی ذہنی کاوشوں کی یادگار ہے۔ حالانکہ علم کی دنیا اس عہد سے صدیوں آگے بڑھ چکی۔ فنون ریاضیہ جس قدر پڑھائے جاتے ہیں، وہ موجودہ عہد کی ریاضیات کے مقابلہ میں بمنزلہ صفر کے ہیں اور وہ بھی عام طور پر نہیں پڑھائے جاتے: میں نے اپنے شوق سے پڑھا تھا۔ جامع الازہر قاہرہ کے نصاب تعلیم کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ ہندوستان میں متاخرین کی کتب معقولات کو فروغ ہوا۔ وہاں اتنی وسعت بھی پیدا نہ ہو سکی:

اے طبلِ بلند بانگ، در باطن ہیچ! [۱۴]

سیّد جمال الدّین اسد آبادی [۱۵] نے جب مصر میں کتبِ حکمت کا درس دینا شروع کیا تھا تو بڑی جستجو سے چند کتابیں وہاں مل سکی تھیں اور علماء ازہر ان کتابوں کے ناموں سے بھی آشنا نہ تھے۔ بلاشبہ اب ازہر کا نظام تعلیم بہت کچھ اصلاح پا چکا ہے، لیکن جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس وقت تک اصلاح کی کوئی سعی کامیاب نہیں ہوئی تھی اور شیخ محمد عبدہ [۱۶] مرحوم نے مایوس ہو کر ایک نئی سرکاری درسگاہ "دارالعلوم" کی بنیاد ڈالی تھی۔

فرض کیجیے، میرے قدم اسی منزل میں رُک گئے ہوتے اور علم و نظر کی جو راہیں آگے چل کر ڈھونڈھی گئیں، ان کی لگن پیدا نہ ہوئی ہوتی تو میرا کیا حال ہوتا! ظاہر ہے کہ تعلیم کا یہ ابتدائی سرمایہ مجھے ایک جامد اور ناآشنائے حقیقت دماغ سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتا تھا۔

تعلیم کی جو رفتار عام طور پر رہا کرتی ہے، میرا معاملہ اس سے مختلف رہا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۰۰ میں جب میری عمر بارہ تیرہ برس سے زیادہ نہ تھی، میں فارسی کی تعلیم

سے فارغ اور عربی کی مبادیات سے گزر چکا تھا اور شرح ملا اور قطبی وغیرہ کے دور میں تھا۔ میرے ساتھیوں میں میرے مرحوم بھائی[17] مجھ سے عمر میں دو برس بڑے تھے۔ باقی اور جتنے تھے، ان کی عمریں بیس اکیس برس سے کم نہ ہوں گی۔ والد مرحوم کا طریق تعلیم یہ تھا کہ ہر علم میں سے پہلے کوئی ایک مختصر متن حفظ کر لینا ضروری سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ شاہ ولی اللہ[18] (رحمۃ اللہ علیہ) کے خاندان کا طریق تعلیم ایسا ہی تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں، میں نے فقہ اکبر، تہذیب، خلاصہ کیدانی وغیرہا بر زبان حفظ کر لی تھیں اور اپنے بروقت استحضار اور اقتباسات سے نہ صرف طالبعلموں بلکہ مولویوں کو بھی حیران کر دیا کرتا تھا۔ وہ مجھے گیارہ بارہ برس کا لڑکا سمجھ کر بہت اُڑتے، تو میزان ومنشعب کے سوالات کرتے۔ میں انہیں منطق کے قضیّوں اور اُصول کی تعریفوں میں لے جا کر ہکا بکا کر دیتا۔ اِس طریقہ کے فائدہ میں کلام نہیں۔ آج تک اُن متون کا ایک ایک لفظ حافظہ میں محفوظ ہے۔ خلاصۂ کیدانی کی لوح کا شعر تک بھولا نہیں، کسی افغانی ملّا نے ''کے دانی'' اور ''کیدانی'' کی تک بندی کی تھی:

تو طریق صلوٰۃ کے دانی
گر نہ خوانی خلاصۂ کیدانی

کتابوں کی درسی تحصیل کی مدّت بھی عام رفتار سے بہت کم رہا کرتی تھی۔ اساتذہ میری تیز رفتاریوں سے پہلے جھنجلاتے، پھر پریشان ہوتے، پھر مہربان ہو کر جرأت افزائی کرنے لگتے۔ جب کسی کتاب کا نیا دور شروع ہوتا تو باہر کے چند طلباء بھی شریک ہو جاتے لیکن ابھی چند دن بھی گزرنے نہ پاتے کہ میرا سبق دوسروں سے الگ ہو جاتا کیونکہ وہ میری رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ میرے معقولات کے ایک استاد لوگوں سے کہا کرتے تھے ''یہ چھوٹے حضرت مجھے آج کل صدرا سنایا کرتے ہیں اور غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مجھ سے درس لیتے ہیں۔''

۱۹۰۳ء میں کہ عمر کا پندرھواں سال شروع ہوا تھا، میں درسِ نظامیہ کی تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور والد مرحوم کی ایما[19] سے چند مزید کتابیں بھی نکال لی تھیں۔ چونکہ تعلیم کے باب میں قدیم خیال یہ تھا کہ جب تک پڑھا ہوا پڑھایا نہ جائے استعداد پختہ نہیں ہوتی، اس لیے فاتحہ فراغ کی مجلس ہی میں طلباء کا ایک حلقہ میرے سپرد کر دیا گیا؛ اور ان کے مصارف

قیام کے والد مرحوم کفیل ہو گئے۔ میں نے تکمیل فنون کے لیے طب شروع کر دی تھی۔ خود قانون پڑھتا اور طلباء کو مطوّل، میر زاہد اور ہدایہ وغیرہ کا درس دیتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا اور شک وشبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں، ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیے اور علم وحقیقت کی دُنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے، جتنی سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ یہ چُبھن عمر کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتی گئی یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر عقائد وافکار کی وہ تمام بُنیادیں جو خاندان، تعلیم اور گرد وپیش نے چنی تھیں، بہ یک دفعہ متزلزل ہو گئیں؛ اور پھر وہ وقت آیا کہ اس ہلتی ہوئی دیوار کو خود اپنے ہاتھوں ڈھا کر اس کی جگہ نئی دیواریں چننی پڑیں:

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نہ داشت
دانہ می چیدم درآں روزے کہ خرمن داشتم [۲۰]

۲۰۴

اِنسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک، اس کے تقلیدی عقائد ہیں۔ اسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر دے سکتی جس طرح تقلیدی عقائد کی زنجیریں کر دیا کرتی ہیں۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا اِس لیے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں وہ انہیں زیور کی طرح محبوب رکھتا ہے۔ ہر عقیدہ، ہر عمل، ہر نقطہ نگاہ، جو اسے خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم و صُحبت کے ہاتھوں مل گیا ہے اس کے لیے ایک مقدس ورثہ ہے۔ وہ اس ورثہ کی حفاظت کرے گا مگر اسے چھونے کی جرات نہیں کرے گا۔ بسا اوقات موروثی عقائد کی پکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گرد وپیش کا اثر بھی اسے ڈھیلا نہیں کر سکتا۔ تعلیم دماغ پر ایک نیا رنگ چڑھا دے گی لیکن اس کی بناوٹ کے اندر نہیں اُترے گی۔ بناوٹ کے اندر ہمیشہ نسل، خاندان اور صدیوں کی متوارث روایات ہی کا ہاتھ کام کرتا رہے گا۔

میری تعلیم خاندان کے موروثی عقائد کے خلاف نہ تھی کہ اس راہ سے کوئی کشمکش پیدا ہوتی۔ وہ سرتا سر اُسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جو موثرات نسل اور خاندان نے مہیّا کر دیئے تھے تعلیم نے انہیں اور زیادہ تیز کرنا چاہا اور گرد وپیش نے انہیں اور زیادہ سہارے دیے۔ تاہم یہ کیا بات ہے کہ شک کا سب سے پہلا کانٹا جو خُود بخود دل میں چبھا، وہ اسی تقلید

کے خلاف تھا؟ میں نہیں جانتا تھا کہ کیوں مگر بار بار یہی سوال سامنے اُبھرنے لگا تھا کہ اعتقاد کی بنیاد علم ونظر پر ہونی چاہیے تقلید اور توارث پر کیوں ہو؟ یہ گویا دیوار کی بنیادی اینٹوں کا ہل جانا تھا۔ کیونکہ موروثی اور روایتی عقائد کی پوری دیوار صرف تقلید ہی کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ جب بنیاد ہل گئی تو پھر دیوار کب کھڑی رہ سکتی تھی؟ کچھ دنوں تک طبیعت کی درماندگی سہارے دیتی رہیں، لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اب کوئی سہارا بھی اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھال نہیں سکتا:

﴿۲۰۵﴾ ازاں کہ پیروی خلق گمرہی آرد
نمی رویم برا ہے کہ کارواں رفتست [۲۱]

شک کی یہی چبھن تھی جو تمام آنے والے یقینوں کے لیے دلیل راہ بنی۔ بلاشبہ اس نے پچھلے سرمایوں سے تہی دست کر دیا تھا، مگر نئے سرمایوں کے حصول کی لگن بھی لگا دی تھی اور بالآخر اسی کی رہنمائی تھی جس نے یقین اور طمانیت کی منزل مقصود تک پہنچایا۔ گویا جس علت نے بیمار کیا تھا، وہی بالآخر داروئے شفا بھی ثابت ہوئی:

﴿۲۰۶﴾ دردہا دادی و درمانی ہنوز! [۲۲]

ہر چند سراغ لگانا چاہتا ہوں کہ یہ کانٹا کہاں سے اُڑا تھا کہ تیر کی طرح دل میں ترازو ہو گیا مگر کوئی پتہ نہیں لگتا، کوئی تعلیل کام نہیں دیتی:

﴿۲۰۷﴾ چہ مستی ست نہ دانم کہ روبما آورد
کہ بود ساقی و ایں بادہ از کجا آورد [۲۳]

بلاشبہ آگے چل کر کئی حالات ایسے پیش آئے جنھوں نے اس کانٹے کی چبھن اور زیادہ گہری کر دی، لیکن اس وقت تک تو کسی خارجی محرّک کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی اور ہوش وآگہی کی عمر ہی نہ تھی کہ باہر کے موثرات کے لیے دل ودماغ کے دروازے کھل سکتے۔ یہ تو وہ حال ہوا کہ:

﴿۲۰۸﴾ اتانی ھواھا، قبل ان اعرف الھوٰے
فصادف قلبا فارغاً فتمکنا [۲۴]

یہی زمانہ ہے جب پیرزادگی اور نسلی بزرگی کی زندگی بھی مجھے خود بخود چبھنے لگی اور

معتقدوں اور مریدوں کی پرستاریوں سے طبیعت کو ایک گونہ توحش ہونے لگا۔ میں اس کی کوئی خاص وجہ اس وقت محسوس نہیں کرتا تھا مگر طبیعت کا ایک قدرتی تقاضہ تھا جو ان باتوں کے خلاف لے جا رہا تھا:

بوئے آن دود کہ امسال بہ ہمسایہ رسید
زآتشے بود کہ در خانۂ من پار گرفت ![25]

﴿۲۰۹﴾

سوال یہ ہے کہ تمام حالات اور موثرات کے خلاف طبیعت کی یہ افتاد کیونکر بنی اور کہاں سے آئی؟ خاندان، عقائد و افکار کا جو ڈھانچہ ڈھالنا چاہتا تھا، نہ ڈھال سکا۔ تعلیم جس طرف لے جانا چاہتی تھی، نہ لے جا سکی۔ حلقہ صحبت و اثرات[26] کا جو تقاضہ تھا پورا نہ ہوا۔ اس عالمِ اسباب میں ہر حالت کا دامن کسی نہ کسی عِلّت سے بندھا ہوتا ہے۔ آخر اس رشتہ کا بھی تو کوئی سرا ملنا چاہیے؟ واقعہ یہ ہے کہ نہیں ملتا۔ ممکن ہے یہ میری نظر کی کوتاہی ہو اور کوئی دوسری دقیقہ سنج نگاہ حالات کا مطالعہ کرے تو کوئی نہ کوئی محرّک ڈھونڈھ نکالے، مگر مجھے تو تھک کر دوسری ہی طرف دیکھنا پڑا:

کارِ زلفِ تست مشک افشانی، اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے برآ ہوئے چیں بستہ اند[27]

﴿۲۱۰﴾

جس نامراد ہستی کو چودہ برس کی عمر میں زمانہ کی آغوش سے اس طرح چھین لیا گیا ہو وہ اگر کچھ عرصہ کے لیے شاہراہ عام سے گم ہو کر آوارہ دشتِ وحشت نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا؟ ایک عرصہ تک طرح طرح کی سرگردانیوں میں نشانِ راہ گم رہا؛ نہ مقصد کی خبر مل سکی، نہ منزل کی:

سگِ آستانم، اما ہمہ شب قلادہ خائم
کہ بسر شکار دارم، نہ ہوائے پاسبانی!
عجب ست، گرنہ باشد خضرے بہ جستجویم
کہ فتادہ ام بہ ظلمت چو زُلالِ زندگانی![28]

﴿۲۱۱﴾

لیکن جس ہاتھ نے زمانہ کی آغوش سے کھینچا تھا، بالآخر اسی نے دشت نوردیوں کی تمام بے راہ رویوں میں رہنمائی بھی کی، اور اگرچہ قدم قدم پر ٹھوکروں سے دوچار ہونا پڑا اور

چپّہ چپّہ پر رکاوٹوں سے اُلجھنا پڑا، مگر طلب ہمیشہ آگے ہی کی طرف بڑھائے لے گئی اور جستجو نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ درمیانی منزلوں میں رُک کر دم لے لے۔ بالآخر دم لیا تو اس وقت لیا جب منزلِ مقصود سامنے جلوہ گر تھی اور اس کی گردِ راہ سے چشمِ تمنائی روشن ہو رہی تھی:

(۲۱۲)
بہ وصلش تا رسم صد بار برخاک افگند شوقم
کہ نو پروازم و شاخِ بلندے آشیاں دارم [۲۹]

چوبیس برس کی عمر میں جبکہ لوگ عشرتِ شباب کی سرمستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں میں اپنی دشت نوردیاں ختم کر کے تلووں کے کانٹے چن رہا تھا:

(۲۱۳)
دربیاباں گر بہ شوقِ کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خارِ مغیلاں ، غم مخور [۳۰]

گویا اس معاملے میں بھی اپنی چال زمانہ سے الٹی ہی رہی۔ لوگ زندگی کے جس مرحلے میں کمر باندھتے ہیں، میں کھول رہا تھا:

کام تھے عشق میں بہت ، پر میرؔ
ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے [۳۱]

اُس وقت سے لے کر آج تک کہ کاروانِ بادرفتارِ عمر منزلِ خمسین سے بھی گزر چکا، فکر و عمل کے بہت سے میدان نمودار ہوئے اور اپنی راہ پیمائیوں کے نقوش جا بجا بنانے پڑے۔ وقت یا تو انہیں مٹا دے گا جیسا کہ ہمیشہ مٹاتا رہا ہے، یا محفوظ رکھے گا جیسا کہ ہمیشہ محفوظ رکھتا آیا ہے:

(۲۱۴)
آئینہ نقش بند طلسم خیال نیست
تصویرِ خود بلوحِ دگر می کشیم ما ! [۳۲]

یہاں زندگی بسر کرنے کے دو ہی طریقے تھے جنہیں ابوطالب کلیم نے دو مصرعوں میں بتلا دیا ہے:

(۲۱۵)
طبعے بہم رساں کہ بسازی بعالمے
یا ہمتے کہ از سرِ عالم تواں گزشت [۳۳]

پہلا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی طبیعت ہی نہیں لایا تھا۔ ناچار دوسرا

اختیار کرنا پڑا:

﴿۲۱۶﴾ کار مشکل بود، ما بر خویش آساں کردہ ایم [۳۴]

جو نامراد، یہ دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں، وہ نہ تو راہ کی مشکلوں اور رکاوٹوں سے ناآشنا ہوتے ہیں، نہ اپنی ناتوانیوں اور درماندگیوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ تاہم وہ قدم اٹھا دیتے ہیں کیونکہ قدم اٹھائے بغیر رہ نہیں سکتے۔ زمانہ اپنی ساری ناموافقتوں اور بے امتیازیوں کے ساتھ بار بار اُن کے سامنے آتا ہے اور طبیعت کی خلقی درماندگیاں قدم قدم پر دامن عزم و ہمت سے الجھنا چاہتی ہیں، تاہم ان کا سفر جاری رہتا ہے۔ وہ زمانہ کے پیچھے نہیں چل سکتے تھے لیکن زمانہ کے اُوپر سے گزر جا سکتے تھے اور بالآخر بے نیازانہ گزر جاتے ہیں:

﴿۲۱۷﴾ وقتِ عرفیؔ خوش، کہ نہ کشودند گر در بر رخش
بر در نکشودہ ساکن شد در دیگر نہ زد! [۳۵]

اب صبح عید نے اپنے چہرہ سے صبح صادق کا ہلکا نقاب بھی اُلٹ دیا ہے اور بے حجابانہ مُسکرا رہی ہے:

اک نگارِ آتشیں رخ، سر کھلا [۳۶]

میں اب آپ کو اور زیادہ اپنی طرف متوجہ رکھنے کی کوشش نہیں کروں گا کیونکہ صبح عید کی اس جلوہ نمائی کا آپ کو جواب دینا ہے۔ کئی سال ہوئے، ایک مکتوب گرامی میں شبہائے رمضان کی ''عنبریں چائے'' کا ذکر آیا تھا۔ بے محل نہ ہوگا اگر اس کے جرعہ ہائے پیہم سے قبل صلوٰۃ عید افطار کیجیے کہ عید الفطر میں تعجیل مسنون ہوئی اور عید الاضحیٰ [۳۷] میں تاخیر: [۳۸]

﴿۲۱۸﴾ عیدست و نشاط و طرب و زمزمہ عام ست
مے نوش، گنہ بر من اگر بادہ حرام ست
از روزہ اگر کوفتہ بادہ رواگیر
ایں مسئلہ حل گشت ز ساقی کہ امام ست [۳۹]

ابوالکلام

قلعہ احمد نگر

۱۷/اکتوبر۱۹۴۲ء

(۲۱۹) از بہر چہ گویم "ہست" از خود خبرم چوں نیست
وز بہر چہ گویم "نیست" با اونظرے چوں ہست

صدیق مکرم

صبح کے ساڑھے تین بجے ہیں۔ اس وقت لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو معلوم ہوا سیاہی ختم ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ سیاہی کی شیشی خالی ہو چکی تھی، نئی شیشی منگوانی تھی مگر منگوانا بھول گیا۔ میں نے سوچا، تھوڑا سا پانی کیوں نہ ڈال دوں؟ یکایک چائے دانی پر نظر پڑی۔ میں نے تھوڑی سی چائے فنجان میں اونڈیلی اور قلم کا مُنہ اُس میں ڈبو کر پچکاری چلا دی، پھر اسے اچھی طرح ہلا دیا کہ روشنائی کی دھوون پوری طرح نکل آئے اور اب دیکھیے روشنائی کی جگہ چائے کے تند و تیز گرم عرق سے اپنے نفسہائے سرد صفحۂ قرطاس پر نقش کر رہا ہوں۔

(۲۲۰) می کشد شعلہ سرے از دلِ صد پارۂ ما
جوشِ آتش بود امروز بہ فوارۂ ما[1]

طبیعت افسردہ ہوتی ہے تو الفاظ بھی افسردہ نکلتے ہیں۔ میں طبیعت کی افسردگیوں کا چائے کے گرم جاموں سے علاج کیا کرتا ہوں۔ آج قلم کو بھی ایک گھونٹ پلا دیا:

(۲۲۱) ایں کہ در جام و سبو دارم مہیا آتش ست[2]

آپ اس طریق کار پر متعجب نہ ہوں۔ آج سے ساڑھے تین سو برس پہلے فیضی کو

بھی یہی طریقہ کام میں لانا پڑا تھا۔ نل دمن میں اُس نے ہمیں خبر دی ہے:

﴿۲۲۲﴾ تا تازہ و تر زنم رقم را
در بادہ کشیدہ ام قلم را[3]

آج بھی جام وہی ہے جو روز گردش میں آتا ہے، لیکن جام میں جو کچھ اونڈیل رہا ہوں اس کی کیفیتیں کچھ بدلی ہوئی پایئے گا۔

﴿۲۲۳﴾ از مئے دوشیں قدرے تند تر[4]

بارہا مجھے خیال ہوا کہ ہم خدا کی ہستی کا اقرار کرنے پر اس لیے بھی مجبور ہیں کہ اگر نہ کریں تو کارخانۂ ہستی کے معمے کا کوئی حل باقی نہیں رہتا اور ہمارے اندر ایک حل کی طلب ہے جو ہمیں مضطرب رکھتی ہے:

﴿۲۲۴﴾ آں کہ ایں نامۂ سربستہ نوشتہ است نخست
گرہے سخت بہ سررشتہ مضمون زدہ است[5]

اگر ایک الجھا ہوا معاملہ ہمارے سامنے آتا ہے اور ہمیں اس کے حل کی جستجو ہوتی ہے تو ہم کیا کرتے ہیں؟ ہمارے اندر بالطبع یہ بات موجود ہے اور منطق اور ریاضی نے اسے راہ پر لگایا ہے کہ ہم الجھاؤ پر غور کریں گے۔ ہر الجھاؤ اپنے حل کے لیے ایک خاص طرح کے تقاضے کا جواب چاہتا ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ ایک کے بعد ایک، طرح طرح کے حل سامنے لائیں اور دیکھیں اس تقاضا کا جواب ملتا ہے یا نہیں؟ پھر جونہی ایک حل ایسا نکل آئے گا جو الجھاؤ کے سارے تقاضوں کا جواب دے دے گا اور معاملہ کی ساری کلیں ٹھیک ٹھیک بیٹھ جائیں گی، ہمیں پورا پورا یقین ہو جائے گا کہ الجھاؤ کا صحیح حل نکل آیا اور صورتِ حال کی یہ اندرونی شہادت ہمیں اس درجہ مطمئن کر دے گی کہ پھر کسی بیرونی شہادت کی احتیاج باقی نہیں رہے گی۔ اب کوئی ہزار شبہے نکالے، ہمارا یقین متزلزل ہونے والا نہیں۔

فرض کیجیے، کپڑے کے ایک تھان کا ٹکڑا کسی نے پھاڑ لیا ہو اور ٹکڑا پھٹا ہوا اس طرح ٹیڑھا ترچھا اور دندانہ دار ہو کر کہ جب تک ویسے ہی الجھاؤ کا ایک ٹکڑا وہاں آ کر بیٹھتا نہیں، تھان کی خالی جگہ بھرتی نہیں۔ اب اسی کپڑے کے بہت سے ٹکڑے ہمیں مل جاتے ہیں اور ہر ٹکڑا وہاں بٹھا کر ہم دیکھتے ہیں کہ اس خلاء کی نوعیت کا تقاضا پورا ہوتا ہے یا نہیں۔ مگر کوئی

ٹکڑا ٹھیک بیٹھتا نہیں۔ اگر ایک گوشہ میل کھاتا ہے تو دوسرے گوشے جڑنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اچانک ایک ٹکڑا ایسا نکل آتا ہے کہ ٹیرھے ترچھے کٹاؤ کے سارے تقاضے پورے کر دیتا ہے اور صاف نظر آ جاتا ہے کہ صرف اسی ٹکڑے سے یہ خلاء بھرا جا سکتا ہے۔ اب اگرچہ اس کی تائید میں کوئی خارجی شہادت موجود نہ ہو، لیکن ہمیں پورا یقین ہو جائے گا کہ یہی ٹکڑا یہاں سے پھاڑا گیا تھا اور اس درجہ کا یقین ہو جائے گا کہ "لو کشف الغطاء لم ازددت یقیناً!"[۱]

اس مثال سے ایک قدم اور آگے بڑھایئے اور گورکھ دھندے کی مثال سامنے لایئے۔ بیشمار طریقوں سے ہم اسے مرتب کرنا چاہتے ہیں مگر ہوتا نہیں۔ بالآخر ایک خاص ترتیب ایسی نکل آتی ہے کہ اس کے ہر جز کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے اور اس کی چول ٹھیک بیٹھ جاتی ہے۔ اب گو کوئی خارجی دلیل اس ترتیب کی صحت کی موجود نہ ہو لیکن یہ بات کہ صرف اسی ایک ترتیب سے اس کا الجھاؤ دور ہو سکتا ہے، بجائے خود ایک ایسی فیصلہ کن دلیل بن جائے گی کہ پھر ہمیں کسی اور دلیل کی احتیاج باقی ہی نہیں رہے گی۔ الجھاؤ کا دور ہو جانا اور ایک نقش کا نقش بن جانا بجائے خود ہزاروں دلیلوں کی ایک دلیل ہے!

اب علم و تیقّن کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایئے اور ایک تیسری مثال سامنے لایئے۔ آپ نے حرفوں کی ترتیب سے کھلنے والے قفل دیکھے ہوں گے۔ انہیں پہلے قفل ابجد کے نام سے پکارتے تھے۔ ایک خاص لفظ کے بننے سے وہ کھلتا ہے اور وہ ہمیں معلوم نہیں۔ اب ہم طرح طرح کے الفاظ بناتے جائیں گے اور دیکھیں گے کہ کھلتا ہے یا نہیں؟ فرض کیجیے ایک خاص لفظ کے بنتے ہی کھل گیا۔ اب کیا ہمیں اس بات کا یقین نہیں ہو جائے گا کہ اسی لفظ میں اس قفل کی کنجی پوشیدہ تھی؟ جستجو جس حل کی تھی، وہ قفل کا کھلنا تھا۔ جب ایک لفظ نے قفل کھول دیا تو پھر اس کے بعد باقی کیا رہا جس کی مزید جستجو ہو!

ان مثالوں کو سامنے رکھ کر اس طلسمِ ہستی کے معمّے پر غور کیجیے جو خود ہمارے اندر اور ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ انسان نے جب سے ہوش و آگہی کی آنکھیں کھولی ہیں، اس معمّہ کا حل ڈھونڈھ رہا ہے۔ لیکن اس پرانی کتاب کا پہلا اور آخری ورق کچھ اس طرح کھویا گیا ہے کہ نہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شروع کیسے ہوئی تھی، نہ اسی کا کچھ سراغ ملتا

ہے کہ ختم کہاں جا کر ہوگی[7] اور کیونکر ہوگی؟

۲۲۵ اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتادست[8]

زندگی اور حرکت کا یہ کارخانہ کیا ہے اور کیوں ہے؟ اس کی کوئی ابتداء بھی ہے یا نہیں؟ یہ کہیں جا کر ختم بھی ہوگا یا نہیں؟ خود انسان کیا ہے؟ یہ جو ہم سوچ رہے ہیں کہ "انسان کیا ہے؟" تو خود یہ سوچ اور سمجھ کیا چیز ہے؟ اور پھر حیرت اور درماندگی کے ان تمام پردوں کے پیچھے کچھ ہے بھی یا نہیں؟

۲۲۶
مُردم در انتظار دریں پردہ راہ نیست
یا ہست و پردہ دار نشانم نمی دہد[9]

اس وقت سے لے کر جب کہ ابتدائی عہد کا انسان پہاڑوں کے غاروں سے سر نکال نکال کر سورج کو طلوع و غروب ہوتے دیکھتا تھا، آج تک، جبکہ وہ علم کی تجربہ گاہوں سے سر نکال کر فطرت کے بے شمار چہرے بے نقاب دیکھ رہا ہے، انسان کے فکر و عمل کی ہزاروں باتیں بدل گئیں مگر یہ معمہ، معمہ ہی رہا۔

۲۲۷
اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من
ویں حرفِ معمہ نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوئے من و تو
چوں پردہ برافتد، نہ تو مانی و نہ من[10]

ہم اس الجھاؤ کو نئے نئے حل نکال کر سلجھانے کی جتنی کوششیں کرتے ہیں وہ اور زیادہ الجھتا جاتا ہے۔ ایک پردہ سامنے دکھائی دیتا ہے اسے ہٹانے میں نسلوں کی نسلیں گزار دیتے ہیں لیکن جب وہ ہٹتا ہے تو معلوم ہوتا ہے سو پردے اور اس کے پیچھے پڑے تھے اور جو پردہ ہٹا تھا وہ فی الحقیقت پردے کا ہٹنا نہ تھا بلکہ نئے نئے پردوں کا نکل آنا تھا۔ ایک سوال کا جواب ابھی مل نہیں چکتا کہ دس نئے سوال سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں[11]۔ ایک راز ابھی حل نہیں ہو چکتا کہ سو نئے راز چشمک کرنے لگتے ہیں:

دریں میدان پُر نیرنگ حیران ست دانائی
کہ یک ہنگامہ آرائی وصد کشور تماشائی![12]

"آئن سٹائن"[13] (Einstein) نے اپنی ایک کتاب[☆] میں سائنس کی جستجوئے حقیقت کی سرگرمیوں کو شرلاک ہومز[14] کی سراغ رسانیوں سے تشبیہ دی ہے، اور اس میں شک نہیں کہ نہایت معنی خیز تشبیہ دی ہے۔ علم کی یہ سراغ رسانی فطرت کی غیر معلوم گہرائیوں کا کھوج لگانا چاہتی تھی، مگر قدم قدم پر نئے نئے مرحلوں اور نئی نئی دشواریوں سے دوچار ہوتی رہی۔ ڈی مقراطیس[15] (Democritus) کے زمانہ سے لے کر جس نے چار سو برس قبل مسیح مادہ کے سالمات (Atoms) کی نقش آرائی کی تھی، آج تک، جبکہ نظریہ مقادیر عنصری (Quantum Theory) کی رہنمائی میں ہم سالمات کا ازسرنو تعاقب کر رہے ہیں، علم کی ساری کدّ و کاوش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ پچھلی گتھیاں سلجھتی گئیں، نئی نئی گتھیاں پیدا ہوتی گئیں۔ اس ڈھائی ہزار برس کی مسافرت میں ہم نے بہت سی نئی منزلوں کا سراغ پالیا جو اثنائے سفر میں نمودار ہوتی رہیں، لیکن حقیقت کی وہ آخری منزل مقصود جس کے سراغ میں علم کا مسافر نکلا تھا، آج بھی اسی طرح غیر معلوم ہے، جس طرح ڈھائی ہزار برس پہلے تھی۔ ہم جس قدر اس سے قریب ہونا چاہتے ہیں، اتنا ہی وہ دور ہوتی جاتی ہے:

بامن آویزشِ او الفتِ موج ست و کنار
دمبدم بامن و ہر لحظہ گریزاں ازمن[16]

دوسری طرف ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اندر ایک نہ بجھنے والی پیاس کھول رہی ہے جو اس معمۂ ہستی کا کوئی حل چاہتی ہے۔ ہم کتنا ہی اسے دبانا چاہیں، مگر اس کی تپش لبوں پر آہی جائے گی۔ ہم بغیر ایک حل کے سکونِ قلب نہیں پاسکتے۔ بسا اوقات ہم اس دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ کسی تشفی بخش حل کی ہمیں ضرورت نہیں لیکن یہ محض ایک بناوٹی تخیل ہوتا ہے اور جونہی زندگی کے قدرتی تقاضوں سے ٹکراتا ہے، پاش پاش ہوکر رہ جاتا ہے۔

☆ "دی ایولیوشن آف فزکس"، جس کی ترتیب میں لیوپولڈ انفلیڈ بھی شریک تھا۔

یورپ اور امریکہ کے مفکرّوں کے تازہ ترین مآثر کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے، موجودہ جنگ نے ان تمام دماغوں میں جو کل تک اپنے آپ کو مطمئن تصور کرنے کی کوشش کرتے تھے کیسا تہلکہ مچا رکھا ہے؟ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ پروفیسر جوڈ[17] (Joad) کا ایک مقالہ میری نظر سے گزرا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ان تمام فیصلوں پر جو ہم نے مذہب اور خدا کی ہستی کے بارے میں کیے تھے، اب از سرِ نو غور کرنا چاہیے۔ یہ پروفیسر جوڈ کا بعد از جنگ کا اعلان ہے لیکن پروفیسر جوڈ کے قبل از جنگ کے اعلانات کس درجہ اس سے مختلف تھے؟ برٹرینڈ رسل[18] (Bertran Russell) نے بھی گزشتہ سال ایک مطوّل مقالہ میں جو بعض امریکی رسائل میں شائع ہوا، ایسی ہی رائے ظاہر کی تھی۔

مگر جس وقت یہ معمّہ انسانی دماغ کے سامنے نیا نیا ابھرا تھا، اسی وقت اس کا حل بھی ابھر آیا تھا۔ ہم اس حل کی جگہ دوسرا حل ڈھونڈھنا چاہتے ہیں اور یہیں سے ہماری تمام بے حاصلیاں سر اٹھانا شروع کر دیتی ہیں۔

اچھا، اب غور کیجیے، اس معمّہ کے حل کی کاوش بالآخر ہمیں کہاں سے کہاں لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ یہ پورا کارخانۂ ہستی اپنے ہر گوشہ اور اپنی ہر نمود میں سرتاسر ایک سوال ہے۔ سورج سے لے کر اس کی روشنی کے ذرّوں تک، کوئی نہیں جو یک قلم پرسش و تقاضا نہ ہو۔ ''یہ سب کچھ کیا ہے؟'' ''یہ سب کچھ کیوں ہے؟'' ''یہ سب کچھ کس لیے ہے؟'' ہم عقل کا سہارا لیتے ہیں اور اس روشنی میں جسے ہم نے علم کے نام سے پکارا ہے، جہاں تک راہ ملتی ہے چلتے چلے جاتے ہیں لیکن ہمیں کوئی حل ملتا[19] نہیں جو اس الجھاؤ کے تقاضوں کی پیاس بجھا سکے۔ روشنی گل ہو جاتی ہے، آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور عقل و ادراک کے سارے سہارے جواب دے دیتے ہیں لیکن پھر جونہی ہم پرانے حل کی طرف لوٹتے ہیں اور اپنی معلومات میں صرف اتنی بات بڑھا دیتے ہیں کہ ''ایک صاحبِ ادراک و ارادہ قوت پسِ پردہ موجود ہے'' تو اچانک صورتِ حال یک قلم منقلب ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے اندھیرے سے نکل کر یکایک اجالے میں آ کھڑے ہوئے ہیں۔ اب جس طرف بھی دیکھتے ہیں، روشنی ہی روشنی ہے۔ ہر سوال نے اپنا جواب پا لیا، ہر تقاضے کی طلب پوری ہو گئی، ہر پیاس کو سیرابی مل گئی۔ گویا یہ سارا الجھاؤ ایک قفل تھا جو اس کنجی کے چھوتے

ہی کھل گیا۔

چنداں کہ دست وپا زدم، آشفتہ ترشدم
ساکن شدم، میانۂ دریا کنارشد[1]

اگر ایک ذی عقل ارادہ پسِ پردہ موجود ہے تو یہاں جو کچھ ہے، کسی ارادہ کا نتیجہ ہے اور کسی معیّن اور طے شدہ مقصد کے لیے ہے۔ جونہی یہ حل سامنے رکھ کر ہم اس گورکھ دھندے کو ترتیب دیتے ہیں معاً اس کی ہر کج پیچ نکل جاتی ہے اور ساری چولیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک آ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ کیونکہ ہر ''کیا ہے؟'' اور ''کیوں ہے؟'' کو ایک معنی خیز جواب مل جاتا ہے۔ گویا اس معمہ کے حل کی ساری روح ان چند لفظوں کے اندر سمٹی ہوئی تھی۔ جونہی یہ سامنے آئے معمہ معمہ نہ رہا، ایک معنی خیز داستان بن گیا۔ پھر جونہی یہ الفاظ سامنے سے ہٹنے لگتے ہیں تمام معانی واشارات غائب ہو جاتے ہیں اور ایک خنک اور بے جان چیستان باقی رہ جاتی ہے۔

اگر جسم میں روح بولتی ہے اور لفظ میں معنی ابھرتا ہے تو حقائقِ ہستی کے اجسام بھی اپنے اندر کوئی روحِ معنی رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ معمۂ ہستی کے بے جان اور بے معنی جسم میں صرف اسی ایک حل سے روحِ معنی پیدا ہو سکتی ہے، ہمیں مجبور کر دیتی ہے کہ اس حل کو حل تسلیم کر لیں۔

اگر کوئی ارادہ اور مقصد پردے کے پیچھے نہیں ہے تو یہاں تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن اگر ایک ارادہ اور مقصد کام کر رہا ہے تو پھر جو کچھ بھی ہے، روشنی ہی روشنی ہے۔ ہماری فطرت میں روشنی کی طلب ہے۔ ہم اندھیرے میں کھوئے جانے کی جگہ روشنی میں چلنے کی طلب رکھتے ہیں اور ہمیں یہاں روشنی کی راہ صرف اسی ایک حل سے مل سکتی ہے۔

فطرتِ کائنات میں ایک مکمل مثال (Pattern) کی نموداری ہے۔ ایسی مثال جو عظیم بھی ہے اور جمالی (Aesthetic) بھی۔ اس کی عظمت ہمیں مرعوب کرتی ہے۔ اس کا جمال ہم میں محویّت پیدا کرتا ہے۔ پھر کیا ہم فرض کر لیں کہ فطرت کی یہ نمود بغیر کسی مدرک (Intelligent) قوت کے کام کر رہی ہے؟ ہم چاہتے ہیں کہ فرض کر لیں مگر نہیں کر سکتے۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ایسا فرض کر لینا ہماری دماغی خودکشی ہوگی۔

اگر غور کیجیے تو اس حل پر یقین کرتے ہوئے ہم اسی طریقِ نظر سے کام لینا چاہتے ہیں جو ریاضیات کے اعدادی اور پیمائشی حقائق سے ہمارے دماغوں میں کام کرتا رہتا ہے۔ ہم کسی عددی اور پیمائشی الجھاؤ کا حل صرف اسی حل کو تسلیم کریں گے جس کے ملتے ہی الجھاؤ دور ہو جائے۔ الجھاؤ کا دور ہو جانا ہی حل کی صحت کی اٹل دلیل ہوتی ہے۔ بلاشبہ دونوں صورتوں میں الجھاؤ اور حل کی نوعیت ایک طرح کی نہیں ہوتی اعدادی مسائل میں الجھاؤ عددی ہوتا ہے یہاں عقلی ہے۔ وہاں عددی حل عددی حقائق کا یقین پیدا کرتا ہے یہاں عقلی حل عقلی اذعان کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ تاہم طریقِ نظر کا سانچا دونوں جگہ ایک ہی طرح کا ہوا۔ دونوں راہیں ایک ہی طرح کھلتی اور ایک ہی طرح بند ہوتی ہیں۔

اگر کہا جائے، حل کی طلب ہم اس لیے محسوس کرتے ہیں کہ اپنے محسوسات و تعقل کے محدود دائرے میں اس کے عادی ہو گئے ہیں اور اگر اس حل کے سوا اور کسی حل سے ہمیں تشفی نہیں ملتی تو یہ بھی اسی لیے ہے کہ ہم حقیقت تولنے کے لیے اپنے محسوسات ہی کا ترازو ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں تو اس کا جواب بھی صاف ہے۔ ہم اپنے آپ کو اپنے فکر و نظر کے دائرے سے باہر نہیں لے جاسکتے۔ ہم مجبور ہیں کہ اسی کے اندر رہ کر سوچیں اور حکم لگائیں اور یہ جو ہم کہہ رہے ہیں کہ "ہم مجبور ہیں کہ سوچیں اور حکم لگائیں" تو

۲۳۱ — ایں سخن نیز بہ اندازۂ ادراکِ من ست [۲۱]

مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جو اگر غور کریں تو فوراً ہمارے سامنے نمایاں ہو جائے گا۔ انسان کے حیوانی وجود نے مرتبۂ انسانیت میں پہنچ کر نشو و ارتقاء کی تمام پچھلی منزلیں بہت پیچھے چھوڑ دی ہیں اور بلندی کے ایک ایسے ارفع مقام پر پہنچ گیا ہے جو اسے کرۂ ارضی کی تمام مخلوقات سے الگ اور ممتاز کر دیتا ہے۔ اب اسے اپنی لامحدود ترقیوں کے لیے ایک لامحدود بلندی کا نصب العین چاہیے، جو اسے برابر اوپر ہی کی طرف کھینچتا رہے۔ اس کے اندر بلند سے بلند تر ہوتے رہنے کی طلب ہمیشہ ابلتی رہتی ہے اور وہ اونچی سے اونچی بلندی تک اڑ کر بھی رکنا نہیں چاہتی۔ اس کی نگاہیں ہمیشہ اوپر ہی کی طرف لگی رہتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ لامحدود بلندیوں کا نصب العین کیا ہو سکتا ہے؟ ہمیں بلا تامل تسلیم کر لینا پڑے گا کہ خدا کی ہستی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ ہستی اس کے سامنے سے ہٹ جائے تو پھر اس کے

لیے اوپر کی طرف دیکھنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہے گا۔

کرۂ ارضی کی موجودات میں جتنی چیزیں ہیں، سب انسان سے نچلے درجے کی ہیں، وہ ان کی طرف نظر نہیں اٹھا سکتا۔ اس کے اوپر اجرام سماوی کی موجودات پھیلی ہوئی ہیں لیکن ان میں بھی کوئی ہستی ایسی نہیں جو اس کے لیے نصب العین بن سکے۔ وہ سورج کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتا۔ وہ چمکتے ہوئے ستاروں سے عشق نہیں کر سکتا۔ سورج اس کے جسم کو گرمی بخشتا ہے لیکن اس کی مخفی قوتوں کی امنگوں کو گرم نہیں کر سکتا۔ ستارے اس کی اندھیری راتوں میں قندیلیں روشن کر دیتے ہیں لیکن اس کے دل و دماغ کے نہاں خانہ کو روشن نہیں کر سکتے۔ پھر وہ کون سی ہستی ہے جس کی طرف وہ اپنی بلند پروازیوں کے لیے نظر اٹھا سکتا ہے؟

یہاں اس کے چاروں طرف پستیاں ہی پستیاں ہیں جو اسے انسانیت کی بلندی سے پھر حیوانیت کی پستیوں کی طرف لے جانا چاہتی ہیں حالانکہ وہ اوپر کی طرف اڑنا چاہتا ہے۔ وہ عناصر کے درجہ سے بلند ہو کر نباتاتی زندگی کے درجہ میں آیا۔ نباتات سے بلند تر ہو کر حیوانی زندگی کے درجہ میں پہنچا؛ پھر حیوانی مرتبہ سے اڑ کر انسانیت کی شاخ بلند پر اپنا آشیانہ بنایا۔ اب وہ اس بلندی سے پھر نیچے کی طرف نہیں دیکھ سکتا، اگرچہ حیوانیت کی پستی اسے برابر نیچے ہی کی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ وہ فضا کی لا انتہا بلندیوں کی طرف آنکھ اٹھاتا ہے:

نہ باندازۂ بازوست کمندم ہیہات
ورنہ با گوشۂ بامیم سروکارے ہست [۲۲] ﴿۲۳۲﴾

اسے بلندیوں، لامحدود بلندیوں کا ایک بامِ رفعت چاہیے جس کی طرف وہ برابر دیکھتا رہے اور جو اسے ہر دم بلند سے بلند تر ہوتے رہنے کا اشارہ کرتا رہے:

ترا ز کنگرۂ عرش مے زنند صفیر
ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتادست! [۲۳] ﴿۲۳۳﴾

اسی حقیقت کو ایک جرمن فلسفی ریل (Riehl) نے ان لفظوں میں ادا کیا تھا: "انسان تن کر سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا جب تک کوئی ایسی چیز اس کے سامنے موجود نہ ہو جو خود اس سے بلند تر ہے؛ وہ کسی بلند چیز کے دیکھنے ہی کے لیے سر اوپر کر سکتا ہے"!

بلندی کا یہ نصب العین خدا کی ہستی کے تصور کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اگر یہ بلندی اس کے سامنے سے ہٹ جائے تو پھر اسے نیچے کی طرف دیکھنے کے لیے جھکنا پڑے گا اور جونہی اس نے نیچے کی طرف دیکھا، انسانیت کی بلندی پستی میں گرنے لگی۔

یہی صورت حال ہے جو ہمیں یقین دلاتی ہے کہ خدا کی ہستی کا عقیدہ انسان کی ایک فطری احتیاج کے تقاضے کا جواب ہے اور چونکہ فطری تقاضے کا جواب ہے، اس لیے اس کی جگہ انسان کے اندر پہلے سے موجود ہونی چاہیے، بعد کی بنائی ہوئی بات نہیں ہوئی۔[24] زندگی کے ہر گوشہ میں انسان کے فطری تقاضے ہیں۔ فطرت نے فطری تقاضوں کے فطری جواب دیئے ہیں اور دونوں کا دامن اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا ہے کہ اب اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں میں سے کون پہلے ظہور میں آیا تھا! تقاضے پہلے پیدا ہوئے تھے یا ان کے جوابوں نے پہلے سر اٹھایا تھا؟ چنانچہ جب کبھی ہم کوئی فطری تقاضا محسوس کرتے ہیں تو ہمیں پورا پورا یقین ہوتا ہے کہ اس کا فطری جواب بھی ضرور موجود ہوگا۔ اس حقیقت میں ہمیں کبھی شبہ نہیں ہوتا۔

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے بچہ کی دماغی نشو و نما اور اس کی قوتِ محاکات کے ابھرنے کے لیے مثالوں اور نمونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مثالوں اور نمونوں کے بغیر اپنی فطری قوتوں کو ان کی اصلی چال چلا نہیں سکتا۔[25] حتیٰ کہ بات کرنا بھی نہیں سیکھ سکتا جو اس کے مرتبۂ انسانیت کا امتیازی وصف ہے؛ اور چونکہ یہ اس کی ایک فطری طلب ہے اس لیے ضروری تھا کہ خود فطرت ہی نے اوّل روز سے اس کا جواب بھی مہیا کر دیا ہوتا۔ چنانچہ یہ جواب پہلے ماں کی ہستی میں ابھرتا ہے، پھر 'باپ' کے نمونے میں سر اٹھاتا ہے۔ پھر روز بروز اپنا دامن پھیلاتا جاتا ہے۔ اب غور کیجیے کہ اس صورتِ حال کا یقین کس طرح ہمارے دماغوں میں بسا ہوا ہے؟ ہم کبھی اس میں شک کر ہی نہیں سکتے۔ ہمارے دماغوں میں یہ سوال اٹھتا ہی نہیں کہ بچے کے لیے والدین کا نمونہ ابتداء سے کام دیتا آیا ہے یا بعد کو انسانی بناوٹ نے پیدا کیا ہے؟ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک فطری مطالبہ ہے اور فطرت کے تمام مطالبے جبھی سر اٹھاتے ہیں، جب ان کے جواب کا بھی سر و سامان مہیا ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح اگر ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی دماغ کی نشو و نما ایک خاص درجہ تک پہنچ کر

ان تمام نمونوں سے آگے بڑھ جاتی ہے جو اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور اپنے عروج وارتقاء کی پرواز جاری رکھنے کے لیے اوپر کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتی ہے تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اس کی ہستی کا ایک فطری مطالبہ ہے اور اگر فطری مطالبہ ہے تو ضروری ہے کہ اس کا فطری جواب بھی خود اس کی ہستی کے اندر ہی موجود ہو اور اس کے ہوش و خرد نے آنکھیں کھولتے ہی اسے اپنے سامنے دیکھ لیا ہو۔ یہ جواب کیا ہو سکتا ہے؟ جس قدر جستجو کرتے ہیں، خدا کی ہستی کے سوا اور کوئی دکھائی نہیں دیتا۔

آسٹریلیا کے وحشی قبائل سے لے کر تاریخی عہد کے متمدّن انسانوں تک کوئی بھی اس تصور کی امنگ سے خالی نہیں رہا۔ رگ وید[26] کے زمزموں کا فکری مواد اس وقت بننا شروع ہوا تھا جب تاریخ کی صبح بھی پوری طرح طلوع نہیں ہوئی تھی اور حتیوں[27] (Hittites) اور عیلامیوں[28] نے جب اپنے تعبدانہ تصورات کے نقش و نگار بنائے تھے تو انسانی تمدّن کی طفولیت نے ابھی ابھی آنکھیں کھولی تھیں۔ مصریوں نے ولادت مسیح سے ہزاروں سال پہلے اپنے خدا کو طرح طرح کے ناموں سے پکارا۔ کالڈیا[29] کے صنعت گروں نے مٹی کی پکی ہوئی اینٹوں پر حمد و ثنا کے وہ ترانے کندہ کیے جو گزری ہوئی قوموں سے انہیں ورثہ میں ملے تھے:

(۲۳۴)

درہیچ پردہ نیست نہ باشد نوائے تو
عالم پرست از تو و خالیست جائے تو[30]

ابوالفضل[31] نے عبادتگاہِ کشمیر کے لیے کیا خوب کتبہ تجویز کیا تھا۔ "الٰہی، بہ ہر خانہ کہ می نگرم جویائے تو اند، و بہر زباں کہ می شنوم، گویائے تو۔"

اے تیرِ غمت را دلِ عشاق نشانہ
خلقے بتو مشغول و تو غائب زمیانہ

گہ معتکف دیرم و گہ ساکن کعبہ،
یعنی کہ ترا می طلبم خانہ بخانہ[32]

۱۳

قلعہ احمد نگر

۱۸؍اکتوبر ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم

کل کا مکتوب کاغذ پر ختم ہو چکا تھا، لیکن دماغ میں ختم نہیں ہوا تھا۔ اس وقت قلم اٹھایا تو پھر خیالات اسی رخ پر بڑھنے لگے۔

غور وفکر کی یہی منزل ہے جو ہمیں ایک دوسری حقیقت کی طرف بھی متوجہ کر دیتی ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ انسان خدا کے ماورائے تعقل اور غیر شخصی تصور[1] پر قانع نہ رہ سکا اور کسی نہ کسی شکل میں اپنے فکر واحساسات کے مطابق ایک شخصی تصور پیدا کرتا رہا؟ میں ''شخصی'' تصور یہاں اس معنی میں بول رہا ہوں جس معنی میں ''پرسنل گاڈ'' (Personal God) کی اصطلاح بولی جاتی ہے۔ شخصی تصور کے مختلف مدارج ہیں، ابتدائی درجہ تو شخصِ محض کا ہوتا ہے جو صرف شخصیت کا اثبات کرتا ہے۔ لیکن پھر آگے چل کر یہ شخصیت خاص خاص صفتوں اور فعالیتوں کا جامہ پہن لیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جامہ ناگزیر کیوں ہوا؟ اس کی علت بھی یہی ہے کہ انسان کی فطرت کو بلندی کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کی پیاس بغیر ایک متشخص اور علائق نواز تصور کے بجھ نہیں سکتی۔ حقیقت کچھ ہی ہو، لیکن یہ تصور جب کبھی اس کے سامنے آئے گا تو تشخص کی ایک نقاب چہرہ پر ضرور ڈال لے گا۔ یہ نقاب کبھی بھاری رہی، کبھی ہلکی ہوگئی، کبھی ڈرانے والی رہی، کبھی لبھانے والی بن گئی، لیکن چہرہ سے اتری کبھی نہیں اور یہیں سے ہمارے دیدۂ صورت پرست کی ساری درماندگیاں شروع ہوگئیں۔

بر چہرہ حقیقت اگر ماند پردہ
جرم نگاہ دیدہ صورت پرست ماست[2]

دنیا میں وحدت الوجود (Pantheism) کے عقیدہ کا سب سے قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے۔ غالباً یونان اور اسکندریہ میں بھی یہیں سے یہ عقیدہ پہنچا اور مذہب افلاطون جدید (Neo-Platonism) نے (جسے غلطی سے عربوں نے افلاطون کا مذہب خیال کیا تھا) اس پر اپنی اشراقی عمارتیں استوار کیں۔ یہ عقیدہ حقیقت کے تصور کو ہر طرح کے تصوری تشخصات سے منزہ کر کے ایک کامل مطلق اور بے تصور قائم کر دیتا ہے۔ اس تصور کے ساتھ صفات متشکل نہیں ہو سکتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو تعینات اور مظاہر کے اعتبار سے نہ کہ ذات مطلق کی ہستی کے اعتبار سے۔ اس عقیدہ کا روشناس اس کی ذات کے بارے میں بجز اس کے "کہ ہے" اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہاں تک کہ اشارہ بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر ہم اپنے اشارات کی پرچھائیں بھی اس پر پڑنے دیتے ہیں تو ذاتِ مطلق، مطلق نہیں رہتی، تشخص اور حدود کے غبار سے آلودہ ہو جاتی ہے۔ بابا فغانی نے دو مصرعوں کے اندر سب کچھ کہہ دیا ہے:

(۲۳۷)

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست
امانہ می تواں کہ اشارت باو کنند[۳]

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے اوپنیشدوں نے نفی صفات کی راہ اختیار کی اور تنزیہہ کی "نیتی نیتی" کو بہت دور تک لے گئے، لیکن پھر دیکھیے اسی ہندوستان کو اپنی پیاس اس طرح بجھانی پڑی کہ نہ صرف برہما (ذات مطلق) کو ایشور (ذات متصف و متشخص) کی نمود میں دیکھنے لگے، بلکہ پتھر کی مورتیاں بھی تراش کر سامنے رکھ لیں کہ دل کے اٹکاؤ کا کوئی ٹھکانا تو سامنے رہے:۔

کرے کیا کعبہ میں جو سرِّ بت خانہ سے آگاہ ہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے واں اللہ ہی اللہ ہے[۴]

یہودیوں نے خدا کو ایک قاہر و جابر شہنشاہ کی صورت میں دیکھا اور اسرائیل کے گھرانے سے اس کا رشتہ ایسا ہوا جیسا ایک غیور شوہر کا اپنی چہیتی بیوی[۵] کے ساتھ ہوتا ہے۔ شوہر اپنی بیوی کی ساری خطائیں معاف کر دے گا مگر اس کی بے وفائی کبھی معاف نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ اس کی محبت کے ساتھ کسی دوسرے کی

محبت بھی شریک ہو۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (۴-۴۸)[6] چنانچہ تورات کے احکام عشرہ[7] میں ایک حکم یہ تھا تو کسی چیز کی مورتی نہ بنائیو، نہ اس کے آگے جھکیو، کیونکہ میں خداوند تیرا خدا ایک غیور خدا ہوں۔ لیکن پھر زمانہ جوں جوں بڑھتا گیا، یہ تصور بھی زیادہ وسعت اور رقت پیدا کرتا گیا یہاں تک کہ یسعیا [ؑ] (Isaiah) ثانی☆ کے زمانہ میں اس تصور کی بنیادیں پڑنے لگیں جو آگے چل کر مسیحی تصور کی شکل اختیار کرنے والا تھا۔ چنانچہ مسیحیت نے شوہر کی جگہ باپ☆☆ کو دیکھا۔ کیونکہ باپ اپنے بچوں کے لیے سرتاسر رحم وشفقت اور یک قلم عفوو درگزر رہوتا ہے:

من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میان من و تو چیست بگو[8]

﴿۲۳۸﴾

اسلام نے اپنے عقیدہ کی بنیاد سرتاسر تنزیہہ پر رکھی ہے۔ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ[9] میں تشبیہ کی ایسی عام اور قطعی نفی کردی کہ ہمارے تصوری تشخص کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ لَا تَضْرِبُوا لِلّٰہِ الْاَمْثَالَ[10] (۱۶:۷۴) نے تمثیلوں کے سارے دروازے بند کردیے لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ[11] (۶:۱۰۳) اور لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ[12] (۷:۱۴۳) نے ادراکِ حقیقت کی کوئی امید باقی نہ چھوڑی۔

زباں بند و نظر باز کن کہ منع کلیم
اشارت از ادب آموزی تقاضائی ست[13]

﴿۲۳۹﴾

تاہم انسان کے نظارۂ تصور کے لیے اسے بھی صفات کی ایک صورت آرائی کرنی ہی پڑی اور تنزیہہ مطلق نے صفاتی تشخص کا جامہ پہن لیا وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی

☆ انیسویں صدی میں بائبل کے نقد وتدبر کا جو مسلک ''انتقادِ اعلیٰ'' کے نام سے اختیار کیا گیا تھا، اس کے بعض فیصلے آج تک طے شدہ سمجھے جاتے ہیں؛ از آنجملہ یہ کہ یسعیا [ؑ] نبی کے نام سے جو صحیفہ موجود ہے، وہ تین مختلف مصنفوں نے تین مختلف زمانوں میں مرتب کیا ہوگا۔ باب اول سے باب ۳۹ تک ایک مصنف کا کلام ہے، باب ۴۰ سے باب ۵۵ آیت ۱۳ تک دوسرے مصنف کا اور اس کے بعد کا آخری حصہ تیسرے کا۔ ان تینوں مصنفوں کو امتیاز کے لیے یسعیا [ؑ] اوّل، ثانی اور ثالث سے موسوم کیا جاتا ہے۔

☆☆ ہندو تصور نے باپ کی جگہ ماں کی تمثیل اختیار کی تھی، کیونکہ ماں کی محبت باپ کی محبت سے بھی زیادہ گہری اور غیر متزلزل ہوتی ہے۔

فَـــاذْعُوْهُ بِهَـــا [۱۴] (۷۔۱۸۰) اور پھر صرف اتنے ہی پر معاملہ نہیں رکا، جا بجا مجازات کے چہرو کے بھی کھولنے پڑے بَـلْ یَـدَاهُ مَبْسُـوْطَتَانِ [۱۵] (۵۔۶۴) اور یَـدُ اللّٰـهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ [۱۶] (۴۸۔۱۰) اور مَـا رَمَـیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ رَمٰی [۱۷] (۸۔۱۷) اور اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی [۱۸] (۲۰۔۵) اور اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ [۱۹] (۸۹۔۱۴) اور کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ! [۲۰] (۵۵۔۲۹)

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر [۲۱]

اس سے معلوم ہوا کہ بلندی کے ایک نصب العین کی طلب انسان کی فطرت کی طلب ہے، اور وہ بغیر کسی ایسے تصور کے پوری نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی شکل میں اس کے سامنے آئے، اور سامنے جبھی آ سکتا ہے کہ اس کے مطلق اور غیر مشخص چہرہ پر کوئی نہ کوئی نقاب تشخص کی پڑ گئی ہو:

(۲۴۰)

آہ ازاں حوصلہ تنگ و ازاں حسنِ بلند
کہ دلم راگلہ از حسرتِ دیدارِ تو نیست [۲۲]

غیر صفاتی تصور کو انسانی دماغ پکڑ نہیں سکتا اور طلب اسے ایسے مطلوب کی ہوئی جو اس کی پکڑ میں آ سکے۔ وہ ایک ایسا جلوۂ محبوبی چاہتا ہے جس میں اس کا دل اٹک سکے، جس کے حسن گریزاں کے پیچھے والہانہ دوڑ سکے، جس کا دامن کبریائی پکڑنے کے لیے اپنا دست عجز و نیاز بڑھا سکے، جس کے ساتھ راز و نیازِ محبت کی راتیں بسر کر سکے، جو اگرچہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو، لیکن پھر بھی اسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو [۲۳] کہ اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ ☆ (۸۹۔۱۴) اور [۲۴] وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ، فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ. اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ. ☆☆ (۲۔۱۸۶)

در پردہ و برہمہ کس پردہ می دری
با ہر کسی و با تو کسے را وصال نیست [۲۵]

☆ بلاشبہ تیرا پروردگار ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہے۔

☆☆ اے پیغمبر! جب میری نسبت میرے بندے تجھ سے دریافت کریں تو (ان سے کہہ دے) میں ان سے دور کب ہوں؟ میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

غیر صفاتی تصور محض نفی و سلب ہوتا ہے، مگر صفاتی تصور نفی تشبّہ کے ساتھ ایک ایجابی صورت بھی متشکل کر دیتا ہے۔ اسی لیے یہاں صفات کی نقش آرائیاں ناگزیر ہوئیں اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں علمائے سلف اور اصحابِ حدیث نے تفویض کا مسلک اختیار کیا اور تاویلِ صفات سے گریزاں رہے اور اسی بناء پر انہوں نے جہمیہ کے انکارِ صفات کو تعطل سے تعبیر کیا اور معتزلہ و متکلمین کی تاویلوں میں بھی تعطیل کی بو سونگھنے لگے۔ متکلمین نے اصحاب حدیث کو تشبّہ اور تجسّم (Anthropomorphism) کا الزام دیا تھا۔ مگر وہ کہتے تھے کہ تمہارے تعطل سے تو ہمارا نام نہاد تشبّہ ہی بہتر ہے کیونکہ یہاں تصور کے لیے ایک ٹھکانا تو باقی رہتا ہے۔ تمھاری سلب و نفی کی کاوشوں کے بعد تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا!

ہندوستان کے اوپنشدوں نے ذات مطلق کو ذات متصف میں اتارتے ہوئے جن تنزلات کا نقشہ کھینچا ہے، مسلمان صوفیوں نے اس کی تعبیر ''احدیّت'' اور ''واحدیّت'' کے مراتب میں دیکھی۔ ''احدیت'' کا مرتبہ یکتائی محض کا ہوا، لیکن ''واحدیت'' کی جگہ اوّل کی ہوئی اور اوّلیت کا مرتبہ چاہتا ہے کہ دوسرا، تیسرا، چوتھا بھی ہو۔ ''کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ'' [۲۶] اگرچہ حدیث قدسی نہیں ہے، مگر جس کسی کا بھی قول ہے اس میں شک نہیں کہ ایک بڑے ہی گہرے تفکّر کی خبر دیتا ہے:۔

دل کشتۂ یکتائی حسن است، وگرنہ
در پیش تو آئینہ شکستن ہنرے بود [۲۷] (۲۴۲)

ترجمان القرآن جلد اول میں بہ ضمن تفسیر سورہ فاتحہ [۲۸] اور جلد دوم میں بہ ضمن تفسیر وَلاَ تَضْرِبُوا لِلّٰہِ الْاَمْثَالَ [۲۹] اس مبحث کی طرف اشارات کیے گئے ہیں اور مبحث ایسا ہے کہ اگر پھیلایا جائے تو بہت دور تک پھیل سکتا ہے۔

تلقین درسِ اہل نظر یک اشارت ست
کردم اشارتے و مکرر نمی کنم [۳۰] (۲۴۳)

اس سلسلہ میں ایک اور مقام بھی نمایاں ہوتا ہے اور اس کی وسعت بھی ہمیں دور دور تک پہنچا دیتی ہے۔ اگر یہاں مادہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو پھر مرتبۂ انسانی میں ابھرنے والی وہ قوت جسے ہم فکر و ادراک کے نام سے پکارتے ہیں، کیا ہے؟ کس انگیٹھی سے یہ

چنگاری اڑی؟ یہ کیا ہے جو ہم میں یہ جوہر پیدا کر دیتی ہے کہ ہم خود مادہ کی حقیقت میں غور و خوض کرنے لگتے ہیں اور اس پر طرح طرح کے احکام لگاتے ہیں؟ یہ سچ ہے کہ موجودات کی ہر چیز کی طرح یہ جوہر بھی بتدریج اس درجہ تک پہنچا۔ وہ عرصہ تک نباتات میں سوتا رہا، حیوانات میں کروٹ بدلنے لگا اور پھر انسانیت کے مرتبہ میں پہنچ کر جاگ اٹھا، لیکن صورت حال کا یہ علم ہمیں اس گتھی کے سلجھانے میں کچھ مدد نہیں دیتا۔ یہ بیج فوراً برگ و بار لے آیا ہو یا مدتوں کے نشو و ارتقاء کے بعد اس درجہ تک پہنچا ہو، بہر حال مرتبۂ انسانیت کا جوہر و خلاصہ ہے اور اپنی نمود و حقیقت میں تمام مجمع موجودات سے اپنی جگہ الگ اور بالاتر رکھتا ہے۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان حیوانیت کی پچھلی کڑیوں سے جدا ہو گیا اور کسی آئندہ کڑی تک مرتفع ہونے کی استعداد اس کے اندر سر اٹھانے لگی۔ وہ زمین کی حکمرانی کے تخت پر بیٹھ کر جب اوپر کی طرف نظر اٹھاتا ہے تو فضا کے تمام اجرام اسے اس طرح دکھائی دینے لگتے ہیں جیسے وہ بھی صرف اسی کی کاربراریوں کے لیے بنائے گئے ہوں۔ وہ ان کی بھی پیمائشیں کرتا ہے اور ان کے خواص و افعال پر بھی حکم لگاتا ہے۔ اسے کارخانہ قدرت کی لاانتہائیوں کے مقابلہ میں اپنی درماندگیوں کا قدم قدم پر اعتراف کرنا پڑتا ہے لیکن درماندگیوں کے اس احساس سے اس کی سعی و طلب کی امنگیں پژمردہ نہیں ہو جاتیں بلکہ اور زیادہ شگفتگیوں کے ساتھ ابھرنے لگتی ہیں اور اسے مزید بلندیوں کی طرف اڑا لے جانا چاہتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ فکر و ادراک کی یہ فضائے لامتناہی جو انسان کو اپنی آغوش پرواز میں لیے ہوئے اڑ رہی ہے، کیا ہے؟ کیا اس کے جواب میں اس قدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ محض ایک اندھی بہری قوت ہے جو اپنے طبعی خواص اور طبعی اعمال و ظروف سے ترقی کرتی ہوئی فکر و ادراک کا شعلۂ جوالہ بن گئی؟ جو لوگ مادیت کے دائرے سے باہر دیکھنے کے عادی نہیں ہیں، وہ بھی اس کی جرأت بہت کم کر سکے کہ اس سوال کا جواب بلا تامل اثبات میں دے دیں۔

میں ابھی اس انقلاب کی طرف اشارہ کرنا نہیں چاہتا جو انیسویں صدی کے آخر میں رونما ہونا شروع ہوا اور جس نے بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی کلاسیکل طبیعیات کے تمام بنیادی مسلمات یک قلم متزلزل کر دیے۔ میں ابھی اس سے الگ رہ کر ایک عام نقطۂ نگاہ

سے مسئلہ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔

اور پھر خود وہ صورت حال جسے ہم نشو وارتقاء (Evolution) سے تعبیر کرتے ہیں، کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ کیا وہ ایک خاص رخ کی طرف انگلی اٹھائے اشارہ نہیں کر رہی ہے؟ ہم نے سینکڑوں برس کی سراغ رسانیوں کے بعد یہ حقیقت معلوم کی کہ تمام موجوداتِ ہستی آج جس شکل و نوعیت میں پائی جاتی ہیں، یہ بیک دفعہ ظہور میں نہیں آ گئیں یعنی کسی براہ راست تخلیقی عمل نے انھیں یکا یک یہ شکل و نوعیت نہیں دے دی بلکہ ایک تدریجی تغیر کا عالمگیر قانون یہاں کام کرتا رہا ہے اور اس کی اطاعت وانقیاد میں ہر چیز درجہ بدرجہ بدلتی رہتی ہے اور ایک ایسی آہستہ چال سے جسے ہم فلکی اعداد و شمار کی مدتوں سے بھی بہ مشکل اندازہ میں لا سکتے ہیں، نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتی چلی آتی ہے۔ ذرات سے لے کر اجرام سماوی تک، سب نے اسی قانون تغیر و تحول کے ماتحت اپنی موجودہ شکل و نوعیت کا جامہ پہنا ہے۔ یہی نیچے سے اوپر کی طرف چڑھتی ہوئی رفتارِ فطرت ہے جسے ہم نشو وارتقاء کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی ایک معین، طے شدہ، ہم آہنگ اور منظم، ارتقائی تقاضا ہے جو تمام کارخانۂ ہستی پر چھایا ہوا ہے اور اسے کسی خاص رخ کی طرف اٹھائے اور بڑھائے لیے جا رہا ہے۔ ہر نچلی کڑی بتدریج اپنے سے اوپر کی کڑی کا درجہ پیدا کرے گی اور ہر اوپر کا درجہ نچلے درجہ کی رفتار حال پر ایک خاص طرح کا اثر ڈالتے ہوئے اسے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا رہے گا۔ یہ ارتقائی صورت حال خود توضیحی (Self Explanatory) نہیں ہے، یہ اپنی ایک توضیح چاہتی ہے لیکن اس کی کوئی مادی توضیح ہمیں نہیں ملتی۔ سوال یہ ہے کہ کیوں صورت حال ایسی ہی ہوئی کہ یہاں ایک ارتقائی تقاضا موجود ہوا اور وہ ہر تخلیقی ظہور کو نچلی حالتوں سے اٹھاتا ہوا بلند تر درجوں کی طرف بڑھائے لیے جائے؟ کیوں فطرت وجود میں رفعت طلبیوں کا ایسا تقاضا پیدا ہوا کہ سلسلۂ اجسام کی ایک مرتب سیڑھی نیچے سے اوپر تک اٹھتی ہوئی چلی گئی جس کا ہر درجہ اپنے مابعد سے اوپر مگر اپنے ماسبق سے نیچے واقع ہوا ہے؟ کیا یہ صورت حال بغیر کسی معنی اور حقیقت کے ہے؟ کیا یہ سیڑھی بغیر کسی بالا خانہ کی موجودگی کے بن گئی اور یہاں کوئی بام رفعت نہیں جس تک یہ ہمیں پہنچانا چاہتی ہے۔

یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست؟[۳۱]

زمانۂ حال کے علمائے علم الحیات میں پروفیسر لائیڈ مارگن (Liayd Morgan) نے اس مسئلہ کا علم الحیاتی (Biological) نقطہ خیال سے گہرا مطالعہ کیا ہے لیکن بالآخر اسے بھی اسی نتیجہ تک پہنچنا پڑا کہ اس صورت حال کی کوئی مادی توضیح نہیں کی جاسکتی۔ وہ لکھتا ہے کہ جو حاصلات (Resultants) یہاں کام کر رہی ہیں، ہم ان کی توضیح اس اعتبار سے تو کر سکتے ہیں کہ انھیں موجودہ احوال وظروف کا نتیجہ قرار دیں لیکن ارتقائی تقاضا کا فجائی ظہور (Emergence) جس طرح ابھرتا رہا ہے، مثلاً زندگی کی نمود، ذہن وادراک کی جلوہ طرازی، ذہنی شخصیت اور معنوی انفرادیت کا ڈھلاؤ ان کی کوئی توضیح بغیر اس کے نہیں کی جاسکتی کہ ایک الٰہی قوت کی کارفرمائی یہاں تسلیم کرلی جائے۔ ہمیں یہ صورت حال بالآخر مجبور کردیتی ہے کہ فطرت کائنات میں ایک تخلیقی اصل (Creative principle) کی کارفرمائی کے اعتقاد سے گریز نہ کریں۔ ایک ایسی تخلیقی اصل جو اس کارخانۂ ظرف وزماں میں ایک لازماں (Timeless) حقیقت ہے۔

حقائق ہستی کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ایک خاص بات فوراً ہمارے سامنے ابھرنے لگتی ہے۔ یہاں فطرت کا ہر نظام کچھ اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ جب تک اسے اس کی سطح سے بلند ہو کر نہ دیکھا جائے، اس کی حقیقت بے نقاب نہیں ہوسکتی یعنی فطرت کے ہر نظم کو دیکھنے کے لیے ہمیں ایک ایسا مقام نظر پیدا کرنا پڑتا ہے جو خود اس سے بلند تر جگہ پر واقع ہو۔ عالم طبیعات کے غوامض علم الحیاتی (Biological) عالم میں کھلتے ہیں۔ علم الحیاتی غوامض نفسیاتی (Psychological) عالم میں نمایاں ہوتے ہیں۔ نفسیاتی غوامض کے لیے ہمیں منطقی بحث وتحلیل کے عالم میں آنا پڑتا ہے لیکن منطقی بحث و تحلیل کے معموں کو کس مقام سے دیکھا جائے؟ اس سے اوپر بھی کوئی مقام نظر ہے یا نہیں جو حقیقت کی کسی آخری منزل تک ہمیں پہنچا دے سکتا ہو؟

ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ اس سے اوپر بھی ایک مقام نظر ہے لیکن وہ اس سے بلند تر ہے کہ عقلی نظر وتعلیل سے اس کی نقش آرائی کی جاسکے۔ وہ ماورائے محسوسات (Super Sensible) ہے اگرچہ محسوسات سے معارض نہیں۔ وہ ایک ایسی آگ ہے جو دیکھی نہیں جاسکتی البتہ اس کی گرمی سے ہاتھ تاپ لیے جاسکتے ہیں۔ وَمَنْ لَمْ یَذُقْ، لَمْ یَدْرِ. [۳۲]

﴿۲۴۵﴾

تو نظر باز نہ‌ٔ، ورنہ تغافل نگہ ست
تو زباں فہم نہ‌ٔ، ورنہ خموشی سخن ست [۳۳]

کائنات ساکن نہیں ہے متحرک ہے اور ایک خاص رخ پر بنتی اور سنورتی ہوئی بڑھی چلی جارہی ہے۔ اس کا اندرونی تقاضا ہر گوشہ میں تعمیر و تکمیل ہے۔ اگر کائنات کی اس عالمگیر ارتقائی رفتار کی کوئی مادی توضیح ہمیں نہیں ملتی تو ہم غلطی پر نہیں ہو سکتے۔ اگر اس معمہ کا حل روحانی حقائق میں ڈھونڈھنا چاہتے ہیں۔

اس موقعہ پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ مادہ کی نوعیت کے بارے میں اٹھارویں اور انیسویں صدی نے جو عقائد پیدا کیے تھے وہ اس صدی کے شروع ہوتے ہی ہلنا شروع ہو گئے اور اب یکسر منہدم ہو چکے ہیں۔ اب ٹھوس مادہ کی جگہ مجرّد قوت نے لے لی ہے اور الیکٹرون (Electron) کے خواص و افعال اور سالمات کے اعدادی و شماری انضباط کے مباحث نے معاملہ کو سائنس کے دائرہ سے نکال کر پھر فلسفہ کے صحرا میں گم کر دیا ہے۔ سائنس کو اپنی خارجیّت (Objective) کے علم و انضباط کا جو یقین تھا [۳۴] وہ اب یکسر متزلزل ہو چکا اور علم پھر داخلی ذہنیت [۳۵] (Subjective) کے اسی ذہنی اور کلیاتی مقام پر واپس لوٹ رہا ہے۔ جہاں سے نَشْأَۃِ جَدِیْدَہ کے دور کے بعد اس نے نئی مسافرت کے قدم اٹھائے تھے لیکن میں ابھی یہ داستان نہیں چھیڑوں گا کیونکہ بجائے خود یہ ایک مستقل بحث ہے۔

یہ سچ ہے کہ یہ راہ محض استدلالی ذریعۂ علم سے طے نہیں کی جا سکتی۔ یہاں کی اصلی روشنی کشف و مشاہدہ کی روشنی ہے لیکن اگر ہم کشف و مشاہدہ کے عالم کی خبر نہیں رکھنی چاہتے جب بھی حقیقت کی نشانیاں اپنے چاروں طرف دیکھ سکتے ہیں اور اگر غور کریں تو خود ہماری ہستی ہی سرتا سر نشان راہ ہے۔ وَلَقَدْ اَحْسَنَ مَنْ قَالَ:

﴿۲۴۶﴾

خلقے نشان دوست طلب می کنند و باز
از دوست غافل اند، بچندیں نشاں کہ ہست [۳۶]

ابوالکلام

قلعہ احمد نگر

۵ر دسمبر ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم

پانچویں صلیبی حملہ کی سرگزشت ایک فرانسیسی مجاہد "Cruasder" ژے آن دوژوان ویل[1] (Jean De Join Ville) نامی نے بطور یادداشت کے قلم بند کی تھی۔ اس کے کئی انگریزی ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ زیادہ متداول نسخہ ایوری مینس لائبریری کا ہے۔

پانچواں صلیبی حملہ[2] سینٹ لوئس[3] (Lewis) شاہِ فرانس نے براہِ راست مصر پر کیا تھا۔ دمیاط[4] (Demiette) کا عارضی قبضہ، قاہرہ کی طرف اقدام، ساحلِ نیل کی لڑائی، صلیبیوں کی شکست، خود سینٹ لوئس کی گرفتاری اور زر فدیہ کے معاہدہ پر رہائی، تاریخ کے مشہور واقعات ہیں اور عرب مورخوں نے اِن کی تمام تفصیلات قلم بند کی ہیں[5]۔ لوئس رہائی کے بعد عکہ[6] (Acre) آیا جو چند دوسرے ساحلی مقامات کے ساتھ صلیبیوں کے قبضہ میں باقی رہ گیا تھا اور کئی سال تک وہاں مقیم رہا۔ ژواین ویل نے یہ تمام زمانہ لوئس کی ہمراہی میں بسر کیا۔ مصر اور عکہ کے تمام اہم واقعات اس کے چشم دید واقعات ہیں۔

لوئس ۱۲۴۸ء میں فرانس سے روانہ ہوا۔ دوسرے سال دمیاط پہنچا۔ تیسرے سال عکہ، پھر ۱۲۵۴ء میں فرانس واپس ہوا۔ یہ سنین اگر ہجری سنین سے مطابق کیے جائیں تو تقریباً ۶۴۶ھ اور ۶۵۲ھ ہوتے ہیں۔

ژواین ویل جب لوئس کے ہمراہ فرانس سے روانہ ہوا تو اس کی عمر چوبیس برس کی تھی لیکن یہ یادداشت اس نے بہت عرصہ کے بعد اپنی زندگی کے آخری سالوں میں لکھی

یعنی ۱۳۰۹ء (۷۰۸ھ) میں؎ جب اس کی عمر خود اس کی تصریح کے مطابق پچاسی برس کی ہو چکی تھی اور صلیبی حملہ کے واقعات پر نصف صدی کی مدّت گذر چکی تھی۔ اس طرح کی کوئی تصریح موجود نہیں جس کی بنا پر خیال کیا جا سکے کہ مصر اور فلسطین کے قیام کے زمانہ میں وہ اہم واقعات قلم بند کر لیا کرتا تھا۔ پس جو کچھ اُس نے لکھا ہے، وہ پچاس برس پیشتر کے حوادث کی ایک ایسی روایت ہے جو اس کے حافظہ نے محفوظ رکھ لی تھی بااین ہمہ اس کے بیانات جہاں تک واقعات جنگ کا تعلق ہے، عام طور پر قابل وثوق تسلیم کیے گئے ہیں۔

مسلمانوں کے دینی عقائد و اعمال اور اخلاق و عادات کی نسبت اس کی معلومات ازمنۂ وسطیٰ کی عام فرنگی معلومات سے چنداں مختلف نہیں، تاہم درجہ کا فرق ضرور ہے۔ چونکہ اب یورپ اور مشرق وسطیٰ کے باہمی تعلقات پر جو صلیبی لڑائیوں کے سائے میں نشو و نما پاتے رہے تھے تقریباً ڈیڑھ سو برس کا زمانہ گزر چکا تھا اور فلسطین کے نو آباد صلیبی مجاہد اب مسلمانوں کو زیادہ قریب ہو کر دیکھنے لگے تھے، اس لیے قدرتی طور پر ژواین ویل کے ذہنی تاثرات کی نوعیت ان تاثرات کی نوعیت سے مختلف دکھائی دیتی ہے جو ابتدائی عہد کے صلیبیوں کے رہ چکے ہیں۔ مسلمان کافر ہیں، ہیدین (Heathen) ہیں، پے نیم (Paynim) ہیں، پے گن (Paygan) ہیں، مسیحؑ کے دشمن ہیں۔ تاہم کچھ اچھی باتیں بھی ان کی نسبت خیال میں لائی جا سکتی ہیں اور ان کے طور طریقہ میں تمام باتیں بُری ہی نہیں ہیں۔ مصری حکومت اور اس کے ملکی اور فوجی نظام کے بارے میں اس نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ستر فی صد کے قریب صحیح ہے لیکن مسلمانوں کے دینی عقائد و اعمال کے بیانات میں پچیس فی صد سے زیادہ صحت نہیں۔ پہلی معلومات غالباً اس کی ذاتی ہیں، اس لیے صحت سے قریب تر ہیں۔ دوسری معلومات زیادہ تر فلسطین کے کلیسائی حلقوں سے حاصل کی گئی ہیں، اس لیے تعصب و نفرت پر مبنی ہیں۔ اس عہد کی عام فضا دیکھتے ہوئے یہ صورتِ حال چنداں تعجب انگیز نہیں۔

ایک عرصہ کے بعد مجھے اس کتاب کے دیکھنے کا یہاں پھر اتفاق ہوا۔ ایک رفیقِ زنداں نے ایبوری مینس لائبریری کی کچھ کتابیں منگوائی تھیں، اُن میں یہ بھی آ گئی۔ اس سلسلہ میں دو واقعات خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہیں۔

قیامِ عکّہ کے زمانے میں لوئس نے ایک سفیر سلطانِ دمشق کے پاس بھیجا تھا، جس کے ساتھ ایک شخص ایوے لابرتاں (Yevo La Bretan) بطورِ مترجم کے گیا تھا۔ یہ شخص مسیحی واعظوں کے ایک حلقہ سے تعلق رکھتا تھا اور "مسلمانوں کی زبان" سے واقف تھا۔ "مسلمانوں کی زبان" سے مقصود یقیناً عربی زبان ہے۔ ژواین ویل اس سفارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:[8]

"جب سفیر اپنی قیام گاہ سے سُلدان (سلطان) کے محل کی طرف جا رہا تھا تو لابرتیان کو راستہ میں ایک مسلمان بڑھیا عورت ملی۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک برتن آگ کا تھا بائیں ہاتھ میں پانی کی صراحی تھی۔ لابرتیاں نے اس عورت سے پوچھا "یہ چیزیں کیوں اور کہاں لے جا رہی ہو؟" عورت نے کہا "میں چاہتی ہوں اس آگ سے جنت کو جلا دوں اور پانی سے جہنّم کی آگ بجھا دوں تاکہ پھر دونوں کا نام و نشاں باقی نہ رہے"۔ لابرتیاں نے کہا "تم ایسا کیوں کرنا چاہتی ہو؟" اس نے جواب دیا "اس لیے تاکہ کسی انسان کے لیے اس کا موقعہ باقی نہ رہے کہ جنت کے لالچ اور جہنّم کے ڈر سے نیک کام کرے۔ پھر وہ جو کچھ کرے گا صرف خدا کی محبت کے لیے کرے گا"

(Memoires of the Crusades:240)

اس روایت کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ بجنسہٖ یہی عمل اور یہی قول حضرت رابعہ بصریہ[9] سے منقول ہے۔ اس وقت کتابیں یہاں موجود نہیں، لیکن حافظہ سے مدد لے کر کہہ سکتا ہوں کہ قشیری،[10] ابوطالب مکی،[11] فریدالدین عطّار،[12] صاحب عرائس المجالس، صاحب روح البیان اور شعرانی[13]، سب نے یہ مقولہ نقل کیا ہے اور اسے رابعہ بصریہ کے فضائل مقامات میں سے قرار دیا ہے۔

رابعہ بصریہ پہلے طبقہ کی کبار صوفیہ میں شمار کی گئی ہیں۔ دوسری صدی ہجری یعنی آٹھویں صدی مسیحی میں اس کا انتقال ہوا۔ ان کے حالات میں سب لکھتے ہیں کہ ایک دن اس عالم میں گھر سے نکلیں کہ ایک ہاتھ میں آگ کا برتن تھا دوسرے میں پانی کا کوزہ۔

لوگوں نے پوچھا کہاں جارہی ہو، جواب میں بجنسہٖ وہی بات کہی جولا بریتاں نے دمشق کی عورت کی زبانی نقل کی ہے۔"آگ سے جنت کو جلا دینا چاہتی ہوں، پانی سے دوزخ کی آگ بجھا دینی چاہتی ہوں تاکہ دونوں ختم ہو جائیں اور پھر لوگ خدا کی عبادت صرف خدا کے لیے کریں جنت اور دوزخ کے طمع وخوف سے نہ کریں۔"قدرتی طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کی رابعہ بصریہ کا مقولہ کس طرح ساتویں صدی ہجری کی ایک عورت کی زبان پر طاری ہو گیا جو دمشق کی سڑک سے گزر رہی تھی؟ یہ کیا بات ہے کہ تعبیر معارف کی ایک خاص تمثیل (پارٹ) جو پانچ سو برس پہلے بصرہ کے ایک کوچہ میں دکھائی گئی تھی بعینہٖ اب دمشق کی ایک شاہراہ پر دہرائی جارہی ہے؟ کیا یہ محض افکار واحوال کا توارد ہے یا تکرار اور نقالی ہے؟ یا پھر راوی کی ایک افسانہ تراشی؟

ہر توجیہ کے لیے قرائن موجود ہیں اور معاملہ مختلف بھیسوں میں سامنے آتا ہے

(ا) یہ وہ زمانہ تھا جب صلیبی جماعتوں کی قوت فلسطین میں پاش پاش ہو چکی تھی ساحل کی ایک چھوٹی سی دھجی کے سوا ان کے قبضہ میں اور کچھ باقی نہیں رہا تھا؛ اور وہاں بھی امن اور چین کی زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے۔ رات دن کے لگاتار حملوں اور محاصروں سے پامال ہوتے رہتے تھے۔ لوئس ان کی اعانت کے لیے آیا لیکن وہ خود اعانت کا محتاج ہو گیا۔ جنگی قوت کے افلاس سے کہیں زیادہ ان کا اخلاقی افلاس انہیں تباہ کر رہا تھا۔ ابتدائی عہد کا مجنونانہ مذہبی جوش وخروش جو تمام یورپ کو بہالے گیا تھا، اب ٹھنڈا پڑ چکا تھا؛ اور اب اس کی جگہ ذاتی خود غرضیاں اور صلیبی حلقہ بندیوں کی باہمی رقابتیں کام کرنے لگی تھیں۔ پے در پے شکستوں اور ناکامیوں سے جب ہمتیں پست ہوئیں تو اصل مقصد کی کشش بھی کمزور پڑ گئی اور بدعملیوں اور ہوس رانیوں کا بازار گرم ہو گیا۔ مذہبی پیشواؤں کی حالت امرا اور عوام سے بھی بدتر تھی۔ دینداری کے اخلاص کی جگہ ریاکاری اور نمائش ان کا سرمایہ پیشوائی تھا۔ ایسے افراد بہت کم تھے جو واقعی مخلص اور پاک عمل ہوں۔

جب اس عہد کے مسلمانوں کی زندگی سے اس صورت حال کا مقابلہ کیا جاتا تھا تو مسیحی زندگی کی مذہبی اور اخلاقی پستی اور زیادہ نمایاں ہونے لگتی تھی۔ مسلمان اب صلیبیوں کے ہمسایہ میں تھے اور التوائے جنگ کے بڑے بڑے وقفوں نے باہمی میل جول کے

دروازے دونوں پر کھول دیئے تھے۔ صلیبیوں میں جو لوگ پڑھے لکھے تھے، ان میں سے بعض نے شامی عیسائیوں کی مدد سے مسلمانوں کی زبان بھی سیکھ لی تھی اور ان کے مذہبی اور اخلاقی افکار و عقائد سے واقفیت پیدا کرنے لگے تھے۔ کلیسائی واعظوں کے جو حلقے یہاں کام کر رہے تھے ان میں بھی بعض متجسّس طبیعتیں ایسی پیدا ہو گئی تھیں[14] جو مسلمان عالموں اور صوفیوں سے ملتیں اور دینی اور اخلاقی مسائل پر مذاکرے کرتیں۔ اس عہد کے متعدد عالموں اور صوفیوں کے حالات میں ایسی تصریحات ملتی ہیں کہ صلیبی قسّیس اور رُہبان ان کے پاس آئے اور باہمدگر سوال و جواب ہوئے۔ بعض مسلمان علماء جو صلیبیوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے تھے، عرصہ تک ان میں رہے اور ان کے مذہبی پیشواؤں سے مذہبی مباحثے کیے۔ شیخ سعدی شیرازی کو اسی عہد میں صلیبیوں نے گرفتار کر لیا تھا اور انہیں عرصہ تک طرابلس میں گرفتاری کے دن کاٹنے پڑے تھے[15]۔

اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ صلیبیوں میں جو لوگ مخلص اور اثر پذیر طبیعتیں رکھتے تھے وہ اپنے گروہ کی حالت کا مسلمانوں کی حالت سے مقابلہ کرتے۔ وہ مسلمانوں کا مذہبی اور اخلاقی تفوق دکھا کر عیسائیوں کو غیرت دلاتے کہ اپنی نفس پرستیوں اور بدعملیوں سے باز آئیں اور مسلمانوں کی دیندارانہ زندگی سے عبرت پکڑیں۔ چنانچہ خود ژواین ویل کی سرگزشت میں جا بجا اس ذہنی انفعال کی جھلک ابھرتی رہتی ہے۔ متعدد مقام ایسے ملتے ہیں جہاں وہ مسلمانوں کی زبانی اس طرح کے اقوال نقل کرتا ہے جس سے عیسائیوں کے لیے عبرات اور تنبّہ کا پہلو نکلتا ہے۔ اسی دمشق کی سفارشات کے سلسلہ میں اس نے جان دی آرمینین (John The Armenian) کے سفر دمشق کا ایک واقعہ نقل کیا ہے[16]۔ یہ شخص دمشق اس لیے گیا تھا کہ کمانیں بنانے کے لیے سینگ اور سریش خرید کرے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے دمشق میں ایک عمر رسیدہ مسلمان ملا جس نے میری وضع قطع دیکھ کر پوچھا ''کیا تم مسیحی ہو؟'' میں نے کہا ہاں۔ مسلمان شیخ نے کہا:

> ''تم مسیحی آپس میں ایک دوسرے سے اب زیادہ نفرت کرنے لگے ہو اسی لیے ذلیل و خوار ہو رہے ہو۔ ایک زمانہ وہ تھا جب میں نے یروشلم کے صلیبی بادشاہ بالڈوین (Baldwin) کو دیکھا تھا۔ وہ کوڑھی تھا اور اس

کے ساتھ مسلح آدمی صرف تین سو تھے۔ پھر بھی اس نے اپنے جوش و ہمت سے سالا دین (صلاح الدین) کو پریشان کر دیا تھا۔ لیکن اب تم اپنے گناہوں کی بدولت اتنے گر چکے ہو کہ ہم جنگلی جانوروں کی طرح تمہیں رات دن شکار کرتے رہتے ہیں۔"

پس ممکن ہے کہ لابرتیاں ایسے ہی لوگوں میں سے ہو جنہیں مسلمان صوفیوں کے اعمال و اقوال سے یک گونہ واقفیت حاصل ہو گئی ہو اور وہ وقت کے ہر معاملہ کو عیسائیوں کی عبرت پذیری کے لیے کام میں لانا چاہتا ہو۔ لابرتیاں کی نسبت ہمیں بتایا گیا ہے [۱۷] کہ مسیحی واعظوں کے حلقہ سے وابستگی رکھتا تھا اور عربی زبان سے واقف تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ اسے ان خیالات سے واقفیت کا موقعہ ملا ہو جو اس عہد کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں عام طور پر پائے جاتے تھے۔ چونکہ رابعہ بصریہ کا یہ مقولہ عام طور پر مشہور تھا اور مسلمانوں کے میل جول سے اس کے علم میں آ چکا تھا، اس لیے سفر دمشق کے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اس نے ایک عبرت انگیز کہانی گھڑ لی۔ مقصود یہ تھا کہ عیسائیوں کو دین کے اخلاص عمل کی ترغیب دلائی جائے اور دکھایا جائے کہ مسلمانوں میں ایک بڑھیا عورت کے اخلاص عمل کا جو درجہ ہے، وہ اس تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ خود ژواین ویل کے علم میں یہ مقولہ آیا ہو اور اس نے لابرتیاں کی طرف منسوب کر کے اسے دمشق کے ایک بروقت واقعہ کی شکل دے دی ہو۔

ہمیں معلوم ہے کہ انیسویں صدی کے نقادوں نے ژواین ویل کو صلیبی عہد کا ایک ثقہ راوی قرار دیا ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ وہ بظاہر ایک دیندار اور مخلص مسیحی تھا جیسا کہ اس کی تحریر سے جا بجا مترشح ہوتا ہے۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ ایک دیندار راوی میں دینی اور اخلاقی اغراض سے مفید مقصد روایتیں گھڑنے کی استعداد نہ رہی ہو۔ فن روایت کی گہرائیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ نیک سے نیک انسان بھی بعض اوقات جعل و صناعت کے تقاضوں سے اپنی نگرانی نہیں کر سکتے۔ وہ اس دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر نیک مقصد کے لیے ایک مصلحت آمیز جعلی روایت گھڑ لی جائے تو کوئی برائی کی [۱۸] بات نہیں۔ مسیحی مذہب کے ابتدائی عہدوں میں جن لوگوں نے حواریوں کے نام سے طرح طرح کے نوشتے

گھڑے تھے اور جنہیں آگے چل کر کلیسا نے غیر معروف و مدفون (Apocrypha)[19] نوشتوں میں شمار کیا، وہ یقیناً بڑے ہی دیندار اور مقدس آدمی تھے۔ تاہم یہ دینداری انہیں اس بات سے نہ روک سکی کہ حواریوں کے نام سے جعلی نوشتے تیار کر لیں۔

تاریخ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جن لوگوں نے بے شمار جھوٹی حدیثیں بنائیں ان میں ایک گروہ دیندار واعظوں اور مقدس زاہدوں کا بھی تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ لوگوں میں دینداری اور نیک عملی کا شوق پیدا کرنے کے لیے جھوٹی حدیثیں گھڑ کر سنانا کوئی برائی کی بات نہیں۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل[20] کو کہنا پڑا کہ حدیث کے واعظوں میں سب سے زیادہ خطرناک گروہ ایسے ہی لوگوں کا ہے۔[21]

اس سلسلہ میں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ یہ زمانہ یعنی ساتویں صدی ہجری کا زمانہ صوفیانہ افکار و اعمال کے شیوع و احاطہ کا زمانہ تھا۔ تمام عالم اسلامی خصوصاً بلادِ مصر و شام میں وقت کی مذہبی زندگی کا عام رجحان تصوف اور تصوف آمیز خیالات کی طرف جا رہا تھا۔ ہر جگہ کثرت کے ساتھ خانقاہیں بن گئی تھیں اور عوام اور اُمراء دونوں کی عقیدت مندیاں انہیں حاصل تھیں۔ تصوّف کی اکثر متداول مصنّفات تقریباً اسی صدی اور اس کے بعد کی صدی میں مدوّن ہوئیں۔ حافظ ذہبی جنہوں نے اس زمانہ سے ساٹھ ستر برس بعد اپنی مشہور تاریخ لکھی ہے، لکھتے ہیں کہ اِس عہد کے تمام ملوک اور اُمرائے اسلام صُوفیوں کے زیر اثر تھے۔ مقریزی نے تاریخ مصر میں جن خانقاہوں کا حال لکھا ہے ان کی بڑی تعداد تقریباً اِسی عہد کی پیداوار ہے۔ ایسی حالت میں یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ جن صلیبیوں کو مُسلمانوں کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنے کا موقعہ ملا ہو، وہ مسلمان صوفیوں کے اقوال پر مطلع ہو گئے ہوں کیونکہ وقت کا عام رنگ یہی تھا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ لا بریتاں ایسے لوگوں میں سے ہو جن میں افسانہ سرائی اور حکایت سازی کا ایک قدرتی تقاضا پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بغیر کسی مقصد کے بھی محض سامعین کا ذوق و استعجاب حاصل کرنے کے لیے فرضی واقعات گھڑ لیا کرتے ہیں۔ دنیا میں فنِ روایت کی آدھی غلط بیانیاں راویوں کے اسی جذبہ داستاں سرائی[22] سے پیدا ہوئیں۔ مسلمانوں میں وعّاظ و قصّاص کا گروہ یعنی واعظوں اور قصّہ گویوں کا گروہ محض سامعین کے استعجاب توجہ کی

تحریک کے لیے سینکڑوں روایتیں برجستہ گھڑ لیا کرتا تھا اور پھر وہی روایتیں قید کتابت میں آکر ایک طرح کے نیم تاریخی مواد کی نوعیت پیدا کر لیتی تھی۔ ملا معین واعظ[۲۳] کاشفی وغیرہ کی مصنفات ایسے قصوں سے بھری ہوئی ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ واقعہ صحیح ہو، اور اس عہد میں ایک ایسی صوفی عورت موجود ہو جس نے رابعہ بصریہ والی بات بطور نقل واتباع کے یا واقعی اپنے استغراقِ حال کی بنا پر دہرا دی ہو۔

افکار واحوال کے اشباہ و امثال ہمیشہ مختلف وقتوں اور مختلف شخصیتوں میں سر اُٹھاتے رہتے ہیں اور فکر ونظر کے میدان سے کہیں زیادہ احوال و واردات کا میدان اپنی یک رنگیاں اور ہم آہنگیاں رکھتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ساتویں صدی کی ایک صاحبِ حال عورت کی زبان سے بھی اخلاصِ عمل اور عشقِ الٰہی کی وہی تعبیر نکل گئی ہو جو دوسری صدی کی رابعہ بصریہ کی زبان سے نکلی تھی۔ افسوس ہے کہ یہاں کتابیں موجود نہیں ورنہ ممکن تھا کہ اس عہد کے صوفیائے دمشق کے حالات میں کوئی سراغ مل جاتا۔ ساتویں صدی کا دمشق تصوف واصحابِ تصوف کا دمشق تھا۔

یہ یاد رہے کہ تذکروں میں ایک رابعہ شامیہ[۲۴] کا بھی حال ملتا ہے۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو جامی نے بھی نفحات کے آخر میں ان کا ترجمہ لکھا ہے لیکن ان کا عہد اس سے بہت پیشتر کا ہے۔ اس عہد کے شام میں ان کی موجودگی تصور میں نہیں لائی جاسکتی۔

آخری امکانی صورت جو سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس عہد میں کوئی نمائش پسند عورت تھی جو بطور نقالی کے صوفیوں کا پارٹ دِکھایا کرتی تھی اور وہ لا بریتاں سے دوچار ہوگئی۔ یا یہ سن کر کہ عکہ کی مسیحی سفارت آرہی ہے، قصداً اس کی راہ میں آگئی۔ مگر یہ سب سے زیادہ بعید اور دوراز قرائن صورت ہے جو ذہن میں آسکتی ہے۔

ژواین ویل نے ایک دوسرا واقعہ ''دی اولڈ مین آف دی ماؤنٹین'' کی سفارت کا نقل کیا ہے[۲۵] یعنی کوہستان اَلَموت[۲۶] کے ''شیخ الجبال'' کی سفارت کا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ''شیخ الجبال'' کے لقب سے پہلے حسن بن صباح[۲۷] ملقب ہوا تھا پھر اس کا ہر جانشین اسی لقب سے پُکارا جانے لگا۔ فرقہ باطنیہ کی دعوت کا یہ عجیب وغریب نظام تاریخ

عالم کے غرائب حوادث میں سے ہے۔ یہ بغیر کسی بڑی فوجی طاقت کے تقریباً ڈیڑھ سو برس تک قائم رہا اور مغربی ایشیا کی تمام طاقتوں کو اس کی ہولناکی کے آگے جھکنا پڑا۔ اس نے یہ اقتدار فوج اور مملکت کے ذریعہ حاصل نہیں کیا تھا بلکہ صرف جانفروش فدائیوں کے بے پناہ قاتلانہ حملے تھے جنھوں نے اسے ایک ناقابل تسخیر طاقت کی حیثیت دے دی تھی۔ وقت کا کوئی پادشاہ، کوئی وزیر، کوئی امیر، کوئی سربرآوردہ انسان ایسا نہ تھا جس کے پاس اس کا پُراسرار خنجر نہ پہنچ جاتا ہو۔ اس خنجر کا پہنچنا اس بات کی علامت تھی کہ اگر شیخ الجبال کی فرمائش کی تعمیل نہیں کی جائے گی تو بلاتامل قتل کر دیئے جاؤ گے۔ یہ فدائی تمام شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ سائے کی طرح پیچھا کرتے اور آسیب کی طرح محفوظ سے محفوظ گوشوں میں پہنچ جاتے۔

صلیبی جنگ آزماؤں کا بھی ان سے سابقہ پڑا۔ کئی ٹمپلر[۲۸] (Templer) اور ہاسپٹلر[۲۹] (Hospitaller) فدائیوں کے خنجروں کا نشانہ بنے اور بالآخر مجبور ہو گئے کہ "شیخ الجبال" کی فرمائشوں کی تعمیل کریں۔ یروشلم (بیت المقدس) جب صلیبیوں نے فتح کیا تھا اور بالڈوین تخت نشین ہوا تھا تو اسے بھی ایک سالانہ رقم بطور نذر کے اَلَموت بھیجنی پڑی تھی۔ فریڈرک ثانی[۳۰] جب ۱۲۲۹ میں سلطان مصر کی اجازت لے کر یروشلم کی زیارت کے لیے آیا تو اُس نے بھی اپنا ایک سفیر گرانقدر تحفوں کے ساتھ شیخ الجبال کے پاس بھیجا تھا۔ یورپ میں قلعہ الموت کے عجائب کی حکایتیں انھی صلیبیوں کے ذریعہ پھیلیں جو بعد کی مصنفات میں ہمیں طرح طرح کے ناموں سے ملتی ہیں۔ انیسویں صدی کے بعض افسانہ نگاروں نے اسی مواد سے اپنے افسانوں کی نقش آرائیاں کیں اور بعض اس دھوکے میں پڑ گئے کہ شیخ الجبال سے مقصود کوہستان شام کا کوئی پُراسرار شیخ تھا جس کا صدر مقام لبنان تھا۔

ژواین ویل لکھتا ہے:[۳۱]

> "عکّہ میں پادشاہ (لوئس) کے پاس کوہستان کے "اولڈ مین" کے ایلچی آئے۔ ایک امیر عمدہ لباس میں ملبوس آگے تھا اور ایک خوش پوش نوجوان اس کے پیچھے۔ نوجوان کی مٹھی میں تین چھریاں تھیں جن کے پھل ایک

دُوسرے کے دستہ میں پیوست تھے۔ یہ چھریاں اس غرض سے تھیں کہ اگر پادشاہ امیر کی پیش کردہ تجویز منظور نہ کرے تو انہیں بطور مقابلہ کی علامت کے پیش کر دیا جائے۔ نوجوان کے پیچھے ایک دوسرا نوجوان تھا۔ اس کے بازو پر ایک چادر لپٹی ہوئی تھی۔ یہ اس غرض سے تھی کہ اگر پادشاہ سفارت کا مُطالبہ منظور کرنے سے انکار کر دے تو یہ چادر اس کے کفن کے لیے پیش کر دی جائے یعنی اسے متنبہ کر دیا جائے کہ اِس کی موت ناگزیر ہے"۔

امیر نے پادشاہ سے کہا "میرے آقا نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ میں آپ سے پوچھوں آپ انہیں جانتے ہیں یا نہیں؟ پادشاہ نے کہا، میں نے ان کا ذکر سنا ہے۔ امیر نے کہا پھر یہ کیا بات ہے کہ آپ نے اس وقت تک انہیں اپنے خزانے کے بہترین تحفے نہیں بھیجے، جس طرح جرمنی کے شہنشاہ، ہنگری کے پادشاہ "بابل" کے سُلدان (سلطان) اور دوسرے سلاطین انہیں سال بسال بھیجتے رہتے ہیں؟ ان تمام پادشاہوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کی زندگیاں میرے آقا کی مرضی پر موقوف ہیں۔ وہ جب چاہے ان کی زندگیوں کا خاتمہ کرا دے سکتا ہے۔"

اس مکالمہ میں شہنشاہ اور شاہ ہنگری کے سال بسال تحائف ونذور کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف ایک ہی مرتبہ اپنے زمانہ ورودِ فلسطین میں تحفے نہیں بھیجے تھے بلکہ ہر سال بھیجتے رہے تھے۔ "سلدان بابل" سے مقصود سلطان مصر ہے کیونکہ صلیبی زمانے کے فرنگی عام طور پر قاہرہ کو "بابل"، کے نام سے پکارتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ جس بابل کا ذکر کتبِ مقدسہ میں آیا ہے، وہ یہی شہر ہے۔ چنانچہ اس دَور کی تمام رزمیہ نظموں میں بار بار "بابل" کا نام آتا ہے۔ ایک صلیبی نائٹ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ کافروں کو رگیدتا ہوا ایسے مقام تک چلا گیا جہاں سے "بابل" کے سر بفلک منارے صاف دِکھائی دیتے تھے۔

اس کے بعد ژواین[۳۲] وِیل لکھتا ہے کہ اُس زمانہ میں شیخ الجبال ٹمپل اور ہاسپٹل کو ایک سالانہ رقم بطور خراج کے دیا کرتا تھا کیونکہ ٹمپلر اور ہاسپٹلر اس کے قاتلانہ حملوں سے

بالکل نڈر تھے اور وہ انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ شیخ الجبال کے سفیر نے کہا اگر پادشاہ میرے آقا کی فرمائش کی تعمیل نہیں کرنی چاہتا تو پھر یہی کرے کہ جو خراج ٹمپل کو ادا کیا جاتا ہے، اس سے میرے آقا کو بری الذمہ کرادے"۔ پادشاہ نے یہ پورا معاملہ ٹمپلرس کے حوالہ کر دیا۔ ٹمپلرس نے دوسرے دن سفیر کو بلایا اور کہا [۳۳] "تمہارے آقا نے یہ بڑی غلطی کی کہ اس طرح کا گستاخانہ پیغام پادشاہ فرانس کو بھیجا۔ اگر پادشاہ کے احترام سے ہم مجبور نہ ہوتے جس کی حفاظت تمہیں بہ حیثیت سفیر کے حاصل ہے تو ہم تمہیں پکڑ کے سمندر کی موجوں کے حوالے کر دیتے۔ بہر حال اب ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ یہاں سے فوراً رخصت ہو جاؤ اور پھر پندرہ دن کے اندر الموت سے واپس آؤ لیکن اس طرح واپس آؤ کہ ہمارے پادشاہ کے نام ایک دوستانہ خط اور قیمتی تحائف تمہارے ساتھ ہوں۔ اس صورت میں پادشاہ تمہارے آقا سے خوشنود ہو جائے گا اور ہمیشہ کے لیے اس کی دوستی تمہیں حاصل ہو جائے گی۔" چنانچہ سفیر اس حکم کی تعمیل میں فوراً رخصت ہو گئے اور ٹھیک پندرہ دن کے اندر شیخ کا دوستانہ خط اور قیمتی تحائف لے کر واپس ہوئے۔

ژوائن ویل کی روایت کا یہ حصّہ محلِ نظر ہے اور عرب مورخوں کی تصریحات اس کا ساتھ نہیں دیتیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ صلیبی جماعتیں اپنے عروج و اقتدار کے زمانے میں مجبور ہوئی تھیں کہ اپنی جانوں کی سلامتی کے لیے شیخ الجبال کو نذرانے بھیجتی رہیں حتیٰ کہ فریڈرک ثانی نے بھی ضروری سمجھا تھا کہ اس طرح کی رسم و راہ قائم رکھے۔ پھر یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ ۱۲۵۱ء میں جبکہ صلیبیوں کی تمام طاقت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور وہ فلسطین کے چند ساحلی مقامات میں ایک محصور و مقہور گروہ کی مایوس زندگی بسر کر رہے تھے، کیوں اچانک صورت حال منقلب ہو جائے اور شیخ الجبال ٹمپلروں سے خراج لینے کی جگہ خراج دینے پر مجبور ہو جائے؟ اتنا ہی نہیں، بلکہ ان تباہ حال ٹمپلروں سے اس درجہ خوف زدہ ہو کہ ان کے حاکمانہ احکام کی بلاچون وچرا تعمیل کر دے!

جو بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ٹمپلروں اور ہاسپٹلروں کے تعلقات شیخ الجبال سے قدیمی تھے اور اس وابستگی کی وجہ سے ہر طرح کی ساز باز اس کے کارندوں کے ساتھ کرتے رہتے تھے۔ شیخ الجبال نے جب لوئس کی آمد کا حال سنا اور یہ بھی

سنا کہ اس نے ایک گرانقدر فدیہ دے کر سلطانِ مصر کی قید سے رہائی حاصل کی ہے[۳۴] تو حسب معمول اسے مرعوب کرنا چاہا اور اپنے سفیر قاتلانہ حملوں کے مرموز پیاموں کے ساتھ بھیجے۔ لوئس کو معلوم ہو چکا تھا کہ ٹمپلروں سے شیخ کے پُرانے تعلقات ہیں۔ اس نے معاملہ ان کے سپرد کر دیا اور انہوں نے بیچ میں پڑ کر دونوں کے درمیان دوستانہ علاقہ قائم کرا دیا۔ پھر طرفین سے تحفہ تحائف ایک دوسرے کو بھیجے گئے اور دوستانہ خط و کتابت جاری ہو گئی۔ عرب مورخوں کی تصریحات سے بھی صورت حال کا ایسا ہی نقشہ سامنے آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ الجبال اور صلیبیوں کے باہمی تعلقات اس درجہ بڑھے ہوئے تھے کہ صلیبیوں نے کئی بار اس کے فدائیوں کے ذریعہ بعض سلاطین اسلام کو قتل کرانا چاہا تھا۔

لیکن پھر ژواین ویل کے بیان کی کیا توجیہ کی جائے؟

معاملہ دو حالتوں سے خالی نہیں۔ ممکن ہے کہ ٹمپلروں نے حقیقت حال مخفی رکھی ہو اور شیخ الجبال کے طرز عمل کی تبدیلی کو اپنے فرضی اقتدار و تحکم کی طرف منسوب کر دیا ہو۔ اس لیے ژواین ویل پر اصلیت نہ کھل سکی اور جو کچھ اس نے سنا تھا، یادداشت میں لکھ دیا۔ یا پھر ماننا پڑے گا کہ خود ژواین ویل کی دینی و قومی عصبیت بیان حقیقت میں حائل ہو گئی اور اس نے صلیبیوں کا غیر معمولی تفوق اور اقتدار دکھانے کے لیے اصل واقعہ کو یک قلم اُلٹ دیا۔ ژواین ویل نے صلیبیوں کی شکستوں کی سرگزشت جس بے لاگ صفائی کے ساتھ قلم بند کی ہے، اسے پیش نظر رکھتے ہوئے غالباً قرین صواب پہلی ہی صورت ہو گی۔

اس روایت کی کمزوری اس بات سے بھی نکلتی ہے کہ ٹمپلروں کی نسبت بیان کیا گیا ہے[۳۵] کہ انہوں نے سفیروں سے کہا: پندرہ دن کے اندر شیخ کا جواب لے کر واپس ہو۔ یعنی سات دن جانے میں صرف کرو، سات دن واپس آنے میں۔ یہ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں عکّہ اور اَلَموت کی باہمی مُسافت سات دن کے اندر طے نہیں کی جا سکتی تھی۔ مستوفی نے نزہتہ القلوب میں اس عہد کی منزلوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ شمالی ایران کے قافلے بیت المقدس تک کی مسافت دو ماہ[۳۶] سے کم میں طے نہیں کر سکتے تھے اور اَلَموت تک پہنچنے کے لیے تو ایران سے بھی آگے کی مزید مسافت طے کرنی پڑتی ہو گی۔ ہاں برید یعنی گھوڑوں کی ڈاک کے ذریعہ کم مدّت میں آمد و رفت ممکن

ہو گی لیکن سفیروں کا برید کے ذریعہ سفر کرنا مستبعد معلوم ہوتا ہے۔

ژواین ویل لکھتا ہے[۳۷] کہ شیخ الجبال نے لوئس کو جو تحفے بھیجے تھے، ان میں بلور کا تراشا ہوا ایک ہاتھی اور ایک جی راف (Giraffe) یعنی زرافہ بھی تھا نیز بلور کے سیب اور شطرنج کے مہرے تھے۔ یہ اسی طرح کی بلوری مصنوعات ہوں گی جن کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ اَلموت کا باغِ بہشت ان سے آراستہ کیا گیا تھا۔ بلوری مصنوعات مغربی ایشیاء میں پہلے چین سے آتی تھیں پھر عرب صناع بھی بنانے لگے تھے۔

اس کے بعد اُس سفارت کا حال ملتا ہے جو لوئس نے شیخ الجبال کے پاس بھیجی تھی۔ اس سفارت میں بھی ہمارا پرانا دوست لابرتیاں بطور مترجم کے نمایاں ہوتا ہے اور اس کی زبانی شیخ کا ایک مکالمہ نقل کیا گیا ہے لیکن پورا مکالمہ بعید از قیاس باتوں پر مبنی ہے اور قابل اعتنا نہیں۔ بعض حصے صریح بناوٹی معلوم ہوتے ہیں یا سرتا سر غلط فہمیوں سے وجود پذیر ہوئے ہیں۔ مثلاً شیخ الجبال نے سینٹ پیٹر (پطرس) کی تقدیس کی اور کہا[۳۸] ''ہابیل کی رُوح نوح میں آئی، نوح کے بعد ابراہیم میں اور پھر ابراہیم سے پیٹر میں منتقل ہوئی، اس وقت جبکہ ''خدا زمین پر نازل ہوا تھا'' (یعنی حضرت مسیح کا ظہور ہوا تھا)۔

ممکن ہے شیخ نے یہ بات ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ حضرت مسیح کا منکر نہیں ہے یہ کہا ہو کہ جس وحی الٰہی کا ظہور پچھلے نبیوں میں ہوا تھا اُسی کا ظہور حضرت مسیح میں ہوا، اور لابرتیاں نے اِسے دوسرا رنگ دے دیا۔

ژواین ویل شیعہ سُنّی اختلافات سے واقف ہے لیکن اُس کی تشریح یوں کرتا ہے:[۳۹]

> ''شیعہ محمد ﷺ کی شریعت پر نہیں چلتے، علی کی شریعت پر چلتے ہیں۔ علی، محمد ﷺ کا چچا تھا اسی نے محمد ﷺ کو عزت کی مسند پر بٹھایا لیکن جب محمد ﷺ نے قوم کی سرداری حاصل کر لی تو اپنے چچا کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا اور اس سے الگ ہو گیا۔ یہ حال دیکھ کر علی نے کوشش کی کہ جتنے آدمی اپنے گرد جمع کر سکتا ہے جمع کر لے اور پھر انہیں محمد ﷺ کے دین کے علاوہ ایک دوسرے دین کی تعلیم دے۔ چنانچہ اس اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ

اب علی کی شریعت پر عامل ہیں، وہ محمد ﷺ کے ماننے والوں کو بے دین سمجھتے ہیں۔ اِسی طرح پیروانِ محمد ﷺ پیروانِ علی کو بے دین کہتے ہیں۔"

پھر لکھتا[1] ہے:

"جب لابریتاں شیخ الجبال کے پاس گیا تو اسے معلوم ہوا کہ شیخ محمد ﷺ پر اعتقاد نہیں رکھتا، علی کی شریعت ماننے والا ہے۔"

ژوائن ویل کا یہ بیان تمام تر ان خیالات سے ماخوذ ہے جو اس عہد کے کلیسائی حلقوں میں عام طور پر پھیلے ہوئے تھے اور پھر صدیوں تک یورپ میں نسلاً بعد نسلٍ ان کی اشاعت ہوتی رہی۔ یہ بیانات کتنے ہی غلط ہوں، تاہم ان بیانات سے تو بہر حال غنیمت ہیں جو صلیبی حملہ کے ابتدائی دور میں ہر کلیسائی واعظ کی زبان پر تھے۔ مثلاً یہ بیان کہ "موہامت" (Mohamet) ایک سونے کا خوفناک بُت ہے جس کی مسلمان پوجا کرتے ہیں۔ چنانچہ فرانسیسی اور تلیانی (اٹالین) زبان کے قدیم ڈراموں میں ترواگاں (Tervagant) اور (Trivigante) مسلمانوں کے ایک ہولناک بُت کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔ یہی لفظ قدیم انگریزی میں آ کر ٹروے گینٹ (Tervagant) بن گیا، اور اب ٹرمے گینٹ (Termagant) ایسی عورت کے لیے بولنے لگے ہیں جو وحشیانہ اور بے لگام مزاج رکھتی ہو۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ شیخ الجبال کون تھا؟ یہ زمانہ تقریباً ۶۴۹ھ کا زمانہ تھا۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد تاتاریوں کی طاقت مغربی ایشیاء میں پھیلی اور انھوں نے ہمیشہ کے لیے اس پراسرار مرکز کا خاتمہ کر دیا۔ پس غالباً یہ آخری شیخ الجبال خورشاہ[1] ہو گا۔ یہاں کتابیں موجود نہیں اس لیے قطعی طور پر نہیں لکھ سکتا۔

صلیبی جہاد نے ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کو مشرق وسطیٰ کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا۔ یورپ اس عہد کے مسیحی دماغ کی نمائندگی کرتا تھا، مشرق وسطیٰ مسلمانوں کے دماغ کی، اور دونوں کی متقابل حالت سے اس کی متضاد نوعیتیں آشکارا ہو گئی تھیں۔ یورپ مذہب کے مجنونانہ جوش کا علم بردار تھا مسلمان علم و دانش کے علمبردار تھے۔ یورپ دعاؤں کے ہتھیار سے لڑنا چاہتا تھا مسلمان لوہے اور آگ کے ہتھیاروں سے لڑتے تھے۔ یورپ کا اعتماد

صرف خدا کی مدد پر تھا۔ مسلمانوں کا خدا کی مدد پر بھی تھا لیکن خدا کے پیدا کیے ہوئے سروسامان پر بھی تھا۔ ایک صرف روحانی قوتوں کا معتقد تھا دوسرا روحانی اور مادّی عمل کے ظہور کا۔ معجزے ظاہر نہیں ہوئے لیکن نتائج عمل نے ظاہر ہو کر فتح و شکست کا فیصلہ کر دیا۔ ژواین ویل کی سرگزشت میں بھی یہ متضاد تقابل ہر جگہ نمایاں ہے۔ جب مصری فوج نے منجنیقوں (Petrays) کے ذریعہ آگ کے بان پھینکنے شروع کیے تو فرانسیسی جن کے پاس پُرانے دستی ہتھیاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا، بالکل بے بس ہو گئے۔ ژواین ویل اس سلسلے میں لکھتا ہے:[۱۴۲]

"ایک رات جب ہم ان برجیوں پر جو دریا کے راستے کی حفاظت کے لیے بنائی گئی تھیں، پہرہ دے رہے تھے، تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ایک انجن جسے پٹریری (یعنی منجنیق) کہتے ہیں، لا کر نصب کر دیا اور اس سے ہم پر آگ پھینکنے لگے۔ یہ حال دیکھ کر میرے لارڈ والٹر نے جو ایک اچھا نائٹ تھا ہمیں یوں مخاطب کیا۔ "اس وقت ہماری زندگی کا سب سے بڑا خطرہ پیش آ گیا ہے کیونکہ اگر ہم نے ان برجیوں کو نہ چھوڑا اور مسلمانوں نے ان میں آگ لگا دی تو ہم بھی برجیوں کے ساتھ جل کر خاک ہو جائیں گے لیکن اگر ہم برجیوں کو چھوڑ کر نکل جاتے ہیں تو پھر ہماری بے عزتی میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ ہم ان کی حفاظت پر مامور کیے گئے ہیں۔ ایسی حالت میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو ہمارا بچاؤ کر سکے۔ میرا مشورہ آپ سب لوگوں کو یہ ہے کہ جونہی مسلمان آگ کے بان چلائیں، ہمیں چاہیے کہ گھٹنے کے بل جھک جائیں اور اپنے نجات دہندہ خداوند سے دعا مانگیں کہ اس مصیبت میں ہماری مدد کرے۔" چنانچہ ہم سب نے ایسا ہی کیا۔ جیسے ہی مسلمانوں کا پہلا بان چلا، ہم گھٹنوں کے بل جھک گئے اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ یہ بان اتنے بڑے ہوتے تھے، جیسے شراب کے پیپے اور آگ کا شعلہ جو ان سے نکلتا تھا، اس کی دُم اتنی لمبی ہوتی تھی جیسے ایک بہت بڑا نیزہ۔ جب یہ آتا تو ایسی آواز نکلتی جیسے بادل گرج

رہے ہوں۔ اس کی شکل ایسی دکھائی دیتی تھی جیسے ایک آتشیں اژدہا ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ اِس کی روشنی نہایت تیز تھی۔ چھاؤنی کے تمام حصے اس طرح اُجالے میں آجاتے جیسے دن نکل آیا ہو۔"

اس کے بعد خود لوئس کی نسبت لکھتا ہے:[43]

"ہر مرتبہ جب بان چھوٹنے کی آواز ہمارا ولی صفت پادشاہ سنتا تھا، تو بستر سے اُٹھ کھڑا ہوتا تھا اور روتے ہوئے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ہمارے نجات دہندہ سے التجائیں کرتا۔ مہربان مولیٰ میرے آدمیوں کی حفاظت کر! میں یقین کرتا ہوں کہ ہمارے پادشاہ کی ان دعاؤں نے ہمیں ضرور فائدہ پہنچایا"۔

لیکن فائدہ کا یہ یقین خوش اعتقادانہ وہم سے زیادہ نہ تھا کیونکہ بالآخر کوئی دعا بھی سودمند نہ ہوئی اور آگ کے بانوں نے تمام برجیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

یہ حال تو تیرھویں صدی مسیحی کا تھا لیکن چند صدیوں کے بعد جب پھر یورپ اور مشرق کا مقابلہ ہوا، تو اب صورت حال یکسر اُلٹ چکی تھی۔ اب بھی دونوں جماعتوں کے متضاد خصائص اسی طرح نمایاں تھے، جس طرح صلیبی جنگ کے عہد میں رہے تھے لیکن اتنی تبدیلی کے ساتھ کہ جو دماغی جگہ پہلے یورپ کی تھی وہ اب مسلمانوں کی ہوگئی تھی اور جو جگہ مسلمانوں کی تھی، اسے اب یورپ نے اختیار کر لیا تھا۔

اٹھارویں صدی کے اواخر میں نپولین[44] نے مصر پر حملہ کیا[45] تو مُراد بک نے جامع ازہر کے علماء کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ علمائے ازہر نے بالاتفاق یہ رائے دی تھی کہ جامع ازہر میں صحیح بخاری کا ختم شروع کر دینا چاہیے کہ انجاح مقاصد کے لیے تیر بہدف ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا[46]۔ لیکن ابھی صحیح بخاری کا ختم، ختم نہیں ہوا تھا کہ اہرام کی لڑائی نے مصری حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ شیخ عبدالرحمٰن الجبرتی[47] نے اس عہد کے چشم دید حالات قلم بند کیے ہیں اور بڑے ہی عبرت انگیز ہیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تھا تو امیر بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ختم خواجگان پڑھا جائے۔ اُدھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں ادھر لوگ ختم خواجگان کے حلقوں میں بیٹھے، "یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوب

یَا مُحوّلَ الاَحوال“ کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ بالآخر وہی نتیجہ نکلا جو ایک ایسے مقابلہ کا نکلنا تھا، جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو، دوسری طرف ختم خواجگان!

دُعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں مگر اُنہی کو پہنچاتی جو عزم و ہمت رکھتے ہیں، بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترک عمل اور تعطل قویٰ کا حیلہ بن جاتی ہیں۔

ژواین ویل نے اس آتش فشانی کو ”یونانی آگ“ (Greek Fire) سے تعبیر کیا ہے اور اسی نام سے اس کی یورپ میں شہرت ہوئی۔ غالباً اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ جس مواد سے یہ آگ بھڑکتی تھی، وہ قسطنطنیہ میں صلیبیوں نے دیکھا تھا اور اس لیے اسے یونانی آگ سے پکارنے لگے تھے۔

آتش فشانی کے لیے روغن نفط یعنی مٹی کا تیل کام میں لایا جاتا تھا۔ مٹی کے تیل کا یہ پہلا استعمال ہے جو عربوں نے کیا۔ آذربائیجان کے تیل کے چشمے اس زمانے میں بھی مشہور تھے۔ وہیں سے یہ تیل شام اور مصر میں لایا جاتا تھا۔ ابن فضل اللہ اور نویری نے اس کے استعمال کا مفصل حال لکھا ہے۔

آتش فشانی کے لیے دو طرح کی مشینیں کام میں لائی جاتی تھیں۔ ایک تو منجنیق کی قسم کی تھی جو پتھروں کے پھینکنے کے لیے ایجاد ہوئی تھی۔ دوسری ایک طرح کا آلہ کمان کی شکل کا تھا اور توپ کی بیڑیوں کی طرح زمین میں نصب کر دیا جاتا تھا۔ اس کی مار منجنیق سے زیادہ دُور تک پہنچتی تھی۔ ژواین ویل نے پہلے کو (Petrary) سے اور دوسرے کو (Swivel Crossbow) سے موسوم کیا ہے۔ ”منجنیق“ کا لفظ اسی یونانی لفظ کی تعریب ہے جس سے انگریزی کا (Mechanic) نکلا ہے۔ یہ آلہ، عربوں نے رومیوں اور ایرانیوں سے لیا تھا لیکن دوسرا خود عربوں کی ایجاد تھا۔ چنانچہ اُسے عربی میں ”مدفع“ کہتے تھے یعنی پھینکنے والا آلہ۔ یہی ”مدفع“ بعد کو توپ کے لیے بولا جانے لگا۔

عربی میں مٹی کے تیل کے لیے ”نفط“ کا لفظ مستعمل ہوا یہی ”نفط“ ہے جس نے یورپ کی زبانوں میں (Naphthlene) اور (Naphtha) وغیرہا کی شکل اختیار کر لی ہے۔

ابوالکلام

قلعہ احمد نگر

۱۷ دسمبر ۱۹۴۲

صدیق مکرم

وقت وہی ہے مگر افسوس، وہ چائے نہیں ہے جو طبع شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکر عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی:

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے[1]

وہ چینی چائے جس کا عادی تھا، کئی دن ہوئے ختم ہوگئی اور احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنس گرانمایہ سے آشنا نہیں۔

یک نالۂ مستانہ زجائے نہ شنیدیم
ویراں شود آں شہر کہ مے خانہ نہ دارد[2]

مجبوراً ہندوستان کی اسی سیاہ پتی کا جوشاندہ پی رہا ہوں جسے تعبیر و تسمیہ کے اس قاعدے کے بموجب کہ:

۲۴۸

برعکس نہند نام زنگی کافور[3]

لوگ چائے کے نام سے پکارتے ہیں اور دودھ ڈال کر اس کا گرم شربت بنایا کرتے ہیں:

درماندۂ صلاح و فسادیم، الحذر
زیں رسم ہا کہ مردم عاقل نہاندہ اند[4]

اس کارگاہ سود و زیاں کی کوئی عشرت نہیں کہ کسی حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔ یہاں زلال صافی کا کوئی جام نہیں بھرا گیا کہ دردِ کدورت اپنی تہہ میں نہ رکھتا ہو۔ بادۂ کامرانی کے تعاقب میں ہمیشہ خمار ناکامی لگا رہا اور خندۂ بہار کے پیچھے ہمیشہ گریۂ خزاں کا شیون برپا ہوا۔ ابوالفضل کیا خوب کہہ گیا ہے۔ قدحے پُر نہ شد کہ تہی نہ کردند، وصفحہ تمام نہ شد کہ ورق برنہ گردید:

﴿۲۵۰﴾

نیکو نہ بود ہیچ مرادے بہ کمال
چوں صفحہ تمام شد ورق برگردد [5]

اُمید ہے کہ آپ کی ''عنبریں چائے'' کا ذخیرہ جس کا ایک مرتبہ رمضان میں آپ نے ذکر کیا تھا، اس نایابی کی گزند سے محفوظ ہوگا۔

﴿۲۵۱﴾

امید کہ چوں بندہ تنک مایہ نہ باشی
مے خوردنِ ہر روزہ زعاداتِ کرام است [6]

معلوم نہیں، کبھی اس مسئلہ کے دقائق و معارف پر بھی آپ کی توجہ مبذول ہوئی ہے یا نہیں؟ اپنی حالت کیا بیان کروں؟ واقعہ یہ ہے کہ وقت کے بہت سے مسائل کی طرح اس معاملہ میں بھی طبیعت کبھی سوادِ اعظم کے مسلک سے متفق نہ ہو سکی۔ زمانے کی بے راہ رویوں کا ہمیشہ ماتم گسار رہنا پڑا:

﴿۲۵۲﴾

ازاں کہ پیروِ ئ خلق گمرہی آرد
نہ می رویم بہ راہے کہ کارواں رفتست [7]

چائے کے باب میں ابنائے زمانہ سے میرا اختلاف صرف شاخوں اور پتوں کے معاملہ ہی میں نہیں ہوا کہ مفاہمت کی صورت نکل سکتی بلکہ سرے سے جڑ میں ہوا یعنی اختلاف فرع کا نہیں، اصل الاصول کا ہے:

دہن کا ذکر کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے [8]

سب سے پہلا سوال چائے کے بارے میں خود چائے کا پیدا ہوتا ہے۔ میں چائے کو چائے کے لیے پیتا ہوں، لوگ شکر اور دودھ کے لیے پیتے ہیں۔ میرے لیے وہ مقاصد میں داخل ہوئی، ان کے لیے وسائل میں۔ غور فرمائیے میرا رخ کس طرف ہے اور زمانہ کدھر جا رہا ہے؟

﴿۲۵۳﴾

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست[9]

چائے چین کی پیداوار ہے اور چینیوں کی تصریح کے مطابق پندرہ سو برس سے استعمال کی جارہی ہے لیکن وہاں کبھی کسی کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہیں گزری کہ اس جوہرِ لطیف کو دودھ کی کثافت سے آلودہ کیا جاسکتا ہے۔ جن جن ملکوں میں چین سے براہِ راست گئی مثلاً روس، ترکستان، ایران، وہاں کبھی بھی کسی کو یہ خیال نہیں گزرا مگر سترھویں صدی میں جب انگریز اس سے آشنا ہوئے تو نہیں معلوم ان لوگوں کو کیا سوجھی، انہوں نے دودھ ملانے کی بدعت ایجاد کی اور چونکہ ہندوستان میں چائے کا رواج انہیں کے ذریعے ہوا، اس لیے یہ بدعتِ سیئہ یہاں بھی پھیل گئی۔ رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ لوگ چائے میں دودھ ڈالنے کی جگہ دُودھ میں چائے ڈالنے لگے۔ ''بنیادِ ظلم در جہاں اندک بود۔ ہر کہ آمد براں مزید کرد''۔[10] اب انگریز تو یہ کہہ کر الگ ہوگئے کہ زیادہ دودھ نہیں ڈالنا چاہیے لیکن ان کے تخمِ فساد نے جو برگ و بار پھیلا دیئے ہیں، انہیں کون چھانٹ سکتا ہے؟ لوگ چائے کی جگہ ایک طرح کا سیال حلوہ بناتے ہیں۔ کھانے کی جگہ پیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے چائے پی لی۔ ان نادانوں سے کون کہے کہ:

ہائے کمبخت، تو نے پی ہی نہیں[11]

پھر ایک بنیادی سوال چائے کی نوعیت کا بھی ہے اور اس بارے میں بھی ایک عجیب عالمگیر غلط فہمی پھیل گئی ہے۔ کس کس سے جھگڑیئے اور کس کس کو سمجھایئے۔

﴿۲۵۴﴾

روز و شب عربدہ باخلقِ خدا نتواں کرد[12]

عام طور پر لوگ ایک خاص طرح کی پتی کو جو ہندوستان اور سیلون میں پیدا ہوتی ہے سمجھتے ہیں چائے ہے اور پھر اس کی مختلف قسمیں کر کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں اور اس ترجیح کے بارے میں باہم ردوکد کرتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے سیلون کی چائے بہتر ہے، دوسرا کہتا ہے دارجلنگ کی بہتر ہے، گویا یہ بھی وہ معاملہ ہوا کہ:

﴿۲۵۵﴾

در رہِ عشق نہ شد کس بہ یقین محرم راز
ہر کسے برحسب فہم گمانے دارد[13]

حالانکہ ان فریب خوردگانِ رنگ و بو کو کون سمجھائے کہ جس چیز پر جھگڑ رہے ہیں وہ سرے سے چائے ہے ہی نہیں:

﴿۲۵۶﴾ چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند [14]

دراصل یہ عالمگیر غلطی اس طرح ہوئی کہ اُنیسویں صدی کے اوائل میں جب چائے کی مانگ ہر طرف بڑھ رہی تھی ہندوستان کے بعض انگریز کاشتکاروں کو خیال ہوا کہ سیلون اور ہندوستان کے بلند اور مرطوب مقامات میں چائے کی کاشت کا تجربہ کریں۔ انہوں نے چین سے چائے کے پودے منگوائے اور یہاں کاشت شروع کی۔ یہاں کی مٹی نے چائے پیدا کرنے سے تو انکار کر دیا مگر تقریباً اسی شکل وصورت کی ایک دوسری چیز پیدا کر دی۔ ان زیاں کاروں نے اسی کا نام چائے رکھ دیا اور اس غرض سے کہ اصلی چائے سے ممتاز رہے، اسے کالی چائے کے نام سے پکارنے لگے:

غلطی ہائے مضامین مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں [15]

دنیا جو اس جستجو میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ جنس کمیاب ارزاں ہو، بے سمجھے بوجھے اسی پر ٹوٹ پڑی اور پھر گویا پوری نوع انسانی نے اس فریب خوردگی پر اجماع کر لیا۔ اب آپ ہزار سر پیٹیے، سنتا کون ہے:

اسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر
کہیں پرسشِ داد خواہاں نہیں [16]

معاملہ کا سب سے زیادہ درد انگیز پہلو یہ ہے کہ خود چین کے بعض ساحلی باشندے بھی اس عالمگیر فریب کی لپیٹ میں آگئے اور اسی پتی کو چائے سمجھ کر پینے لگے۔ یہ وہی بات ہوئی کہ بدخشانیوں نے لال پتھر کو لعل سمجھا اور کشمیریوں نے رنگی ہوئی گھاس کو زعفران سمجھ کر اپنی دستاریں رنگنی شروع کر دیں:

﴿۲۵۷﴾ چو کفر از کعبہ برخیزد، کجا ماند مسلمانی ! [17]

نوعِ انسانی کی اکثریت کے فیصلوں کا ہمیشہ ایسا ہی حال رہا ہے۔ جمعیت بشری کی یہ فطرت ہے کہ ہمیشہ عقلمند آدمی اِکادُکا ہوگا بھیڑ بے وقوفوں ہی کی رہے گی۔ ماننے

پر آئیں گے تو گائے کو خدا مان لیں گے انکار پر آئیں گے تو مسیح کو سولی پر چڑھا دیں گے۔ حکیم سنائی زندگی بھر ماتم کرتا رہا:

(۲۵۸)
گاؤ را دارند باور درخدائی عامیاں
نوح را باور ندارند از پئے پیغمبری[۱۸]

اسی لیے عرفائے طریق کو کہنا پڑا:

(۲۵۹)
اِنکاریٔ خلق باش، تصدیق اینست
مشغول بہ خویش باش توفیق اینست
تبعیت خلق باش از حق باطل کرد
ترکِ تقلید گیر، تحقیق اینست[۱۹]

یہ تو اصول کی بحث ہوئی اب فروع میں آئیے۔ یہاں بھی کوئی گوشہ نہیں جہاں زمین ہموار ملے۔ سب سے اہم مسئلہ شکر کا ہے۔ مقدار کے لحاظ سے بھی اور نوعیت کے لحاظ سے بھی:

(۲۶۰)
دردا کہ طبیب صبری فرماید
وین نفس حریص شکری باید[۲۰]

جہاں تک مقدار کا تعلق ہے اسے میری محرومی سمجھیے یا تلخ کامی، کہ مجھے مٹھاس کے ذوق کا بہت کم حصہ ملا ہے۔ نہ صرف چائے میں بلکہ کسی چیز میں بھی زیادہ مٹھاس گوارا نہیں کرسکتا۔ دنیا کے لیے جو چیز مٹھاس ہوئی، وہی میرے لیے بدمزگی ہوگئی۔ کھاتا ہوں تو منہ کا مزہ بگڑ جاتا ہے۔ لوگوں کو جو لذت مٹھاس میں ملتی ہے، مجھے نمک میں ملتی ہے۔ کھانے میں نمک پڑا ہو مگر میں اوپر سے اور چھڑک دوں گا۔ میں صباحت کا نہیں ملاحت کا قتیل ہوں:

(۲۶۱)
وِلِلنَّاس فِی ما یعشقون مَذاھبُ[۲۱]

گویا کہہ سکتا ہوں کہ "اخی یوسف اصبح وانا املح[۲۲] منہ" کے مقام کا لذت شناس ہوں۔

(۲۶۲)
گر نکتہ دانِ عشقی، خوش بشنو ایں حکایت[۲۳]

اس حدیث کے تذکرہ نے یارانِ قصص و مواعظ کی وہ خانہ ساز روایت یاد دلا دی کہ "الایمان حلو والمؤمن یحبّ الحلویٰ" ☆ لیکن اگر مدارجِ ایمانی کے حصول اور مراتب ایقانی کی تکمیل کا یہی معیار ٹھہرا، تو نہیں معلوم ان تہی دستانِ نقدِ حلاوت کا کیا حشر ہونے والا ہے جن کی محبتِ حلاوت کی ساری پونجی چائے کی چند پیالیوں سے زیادہ نہیں ہوئی اور ان میں بھی کم شکر پڑی ہوئی، اور پھر اس کم شکر پر بھی تاسف کہ نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ ہا۔ مولانا شبلی مرحوم کا بہترین شعر یاد آ گیا:

(۲۶۳)

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے ست سالک را
خجل ہستم زکفرِ خود کہ دارد بوئے ایماں ہم [۲۴]

بچوں کا مٹھاس کا شوق ضرب المثل ہے، مگر آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ میں بچپنے میں بھی مٹھاس کا شائق نہ تھا۔ میرے ساتھی مجھے چھیڑا کرتے تھے کہ تجھے نیم کی پتیاں چبانی چاہییں اور ایک مرتبہ پسی ہوئی پتیاں کھلا بھی دی تھیں۔

اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے
کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخیٔ دوراں سے [۲۶]

میں نے یہ دیکھ کر کہ مٹھاس کا شائق نہ ہونا نقص سمجھا جاتا ہے، کئی بار بہ تکلف کوشش کی کہ اپنے آپ کو شائق بناؤں مگر ہر مرتبہ ناکام رہا۔ گویا وہی چندر بھان والی بات ہوئی کہ:

(۲۶۴)

مرا دلے ست بہ کفر آشنا، کہ چندیں بار
بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم [۲۷]

بہر حال یہ تو شکر کی مقدار کا مسئلہ تھا، مگر معاملہ اس پر ختم کہاں ہوتا ہے؟

(۲۶۵)

کوتہ نظر ببیں کہ سخن مختصر گرفت [۲۸]

ایک دقیق سوال اس کی نوعیت کا بھی ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ جو شکر ہر چیز میں ڈالی جا سکتی ہے، وہی چائے میں بھی ڈالنی چاہیے۔ اس کے لیے کسی خاص شکر کا

☆ یعنی ایمان مٹھاس ہے اور جو مومن ہے، وہ مٹھاس کو محبوب رکھے گا۔ [۲۵]

اہتمام ضروری نہیں۔ چنانچہ باریک دانوں کی دوبارہ شکر جو پہلے جاوا اور ماریشس سے آتی تھی اور اب ہندوستان میں بننے لگی ہے، چائے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ حالانکہ چائے کا معاملہ دوسری چیزوں سے مختلف واقع ہوا ہے۔ اسے حلوے پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا مزاج اس قدر لطیف اور بے میل ہے کوئی بھی چیز جو خود اسی کی طرح صاف اور لطیف نہ ہو گی فوراً اسے مکدر کر دے گی۔ گویا چائے کا معاملہ بھی وہی ہوا کہ:

نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا [۲۹]

یہ دوبارہ شکر اگرچہ صاف کیے ہوئے رس سے بنتی ہے مگر پوری طرح صاف نہیں ہوتی۔ اس غرض سے کہ مقدار کم نہ ہو جائے، صفائی کے آخری مراتب چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جونہی اسے چائے میں ڈالیے معاً اس کا ذائقہ متاثر اور لطافت آلودہ ہو جائے گی۔ اگرچہ یہ اثر حال میں پڑتا ہے، تاہم دودھ کے ساتھ پیجیے تو چنداں محسوس نہیں ہوتا، کیونکہ دُودھ کے ذائقہ کی گرانی چائے کے ذائقہ پر غالب آ جاتی ہے اور کام چل جاتا ہے، لیکن سادہ چائے پیجیے تو فوراً بول اٹھے گی اس کے لیے ایسی شکر چاہیے جو بلور کی طرح بے میل اور برف کی طرح شفاف ہو۔ ایسی شکر ڈلیوں کی شکل میں بھی آتی ہے اور بڑے دانوں کی شکل میں بھی۔ میں ہمیشہ بڑے دانوں کی شفاف شکر کام میں لاتا ہوں اور اس سے وہ کام لیتا ہوں جو مرزا غالب گلاب سے لیا کرتے تھے:

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوئے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را [۳۰]

میرے لیے شکر کی نوعیت کا یہ فرق ویسا ہی محسوس اور نمایاں ہوا، جیسا شربت پینے والوں کے لیے قند اور گڑ کا فرق ہوا لیکن یہ عجیب مصیبت ہے کہ دوسروں کو کسی طرح بھی محسوس نہیں کرا سکتا۔ جس کسی سے کہا اس نے یا تو اسے مبالغہ پر محمول کیا، یا میرا وہم و تخیل سمجھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو میرے ہی منہ کا مزہ بگڑ گیا ہے یا دنیا میں کسی کے منہ کا مزہ درست نہیں۔ یہ نہ بھولیے کہ بحث چائے کے تکلفات میں نہیں ہے اس کی لطافت و کیفیت کے ذوق و احساس میں ہے۔ بہت سے لوگ چائے کے لیے صاف ڈلیاں اور موٹی شکر استعمال کرتے ہیں اور یورپ میں تو زیادہ تر ڈلیوں ہی کا رواج ہے، مگر یہ اس لیے نہیں کیا

جاتا کہ چائے کہ ذائقہ کے لیے ضروری چیز ہوئی، بلکہ محض تکلف کے خیال سے کیونکہ اس طرح کی شکر نسبتاً قیمتی ہوتی ہے۔ آپ انہیں معمولی شکر ڈال کر چائے دے دیجیے، بے غل و غش پی جائیں گے اور ذائقہ میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کریں گے۔

شکر کے معاملہ میں اگر کسی گروہ کو حقیقت آشنا پایا تو وہ ایرانی ہیں۔ اگرچہ چائے کی نوعیت کے بارے میں چنداں ذی حس نہیں مگر یہ نکتہ انہوں نے پالیا ہے۔ عراق اور ایران میں عام طور پر یہ بات نظر آئی تھی کہ چائے کے لیے قند کی جستجو میں رہتے تھے اور اسے معمولی شکر پر ترجیح دیتے تھے کیونکہ قند صاف ہوتی ہے اور وہی کام دیتی ہے جو موٹے دانوں کی شکر سے لیا جاتا ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ اب وہاں کا کیا حال ہے۔

اور اگر ''تعرف الاشیاء باضدادہا'' کی بنا پر کہ چائے کے معاملہ میں سب سے زیادہ خیرہ مذاق گروہ کون ہوا؟ تو میں بلا تامل انگریزوں کا نام لوں گا۔ یہ عجیب بات ہے کہ یورپ اور امریکہ میں چائے انگلستان کی راہ سے گئی اور دنیا میں اس کا عالمگیر رواج بھی بہت کچھ انگریزوں ہی کا منت پذیر ہے۔ تاہم یہ نزدیکان بے بصر حقیقت حال سے اتنے دور جا پڑے کہ چائے کی حقیقی لطافت و کیفیت کا ذوق انہیں چھو کر بھی نہیں گیا۔ جب اس راہ کے اماموں کا یہ حال ہے تو ان کے مقلدوں کا جو حال ہوگا معلوم ہے:

(۲۶۷) آشنا را حال این ست، وائے بر بیگانہ[۱]

انہوں نے چین سے چائے پینا تو سیکھ لیا مگر اور کچھ سیکھ نہ سکے۔ اوّل تو ہندوستان اور سیلون کی سیاہ پتی ان کے ذوق چائے نوشی کا منتہائے کمال ہوا۔ پھر قیامت یہ ہے کہ اس میں بھی ٹھنڈا دودھ ڈال کر اسے یک قلم گندہ کر دیں گے۔ مزید ستم ظریفی دیکھیے کہ اس گندے مشروب کی معیار سنجیوں کے لیے ماہرین فن کی ایک پوری فوج موجود رہتی ہے۔ کوئی ان زیاں کاروں سے پوچھے کہ اگر چائے نوشی سے مقصود انہی پتیوں کو گرم پانی میں ڈال کر پی لینا ہے تو اس کے لیے ماہرین فن کی دقیقہ سنجیوں کی کیا ضرورت ہے؟ جو پتی بھی پانی کو سیاہی مائل کر دے اور ایک تیز بو پیدا ہو جائے چائے ہے اور اس میں ٹھنڈے دودھ کا ایک چمچہ ڈال کر کافی مقدار میں گندگی پیدا کر دی جا سکتی ہے۔ چائے کا ایک ماہر فن بھی اس سے زیادہ کیا خاک بتلائے گا؟

ہیں یہی کہنے کو وہ بھی، اور کیا کہنے کو ہیں؟[۳۲]

اگر چہ فرانس اور براعظم میں زیادہ تر رواج کافی کا ہوا، تاہم اعلیٰ طبقہ کے لوگ چائے کا بھی شوق رکھتے ہیں اور ان کا ذوق بہر حال انگریزوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ وہ زیادہ تر چینی چائے پییں گے اور اگر سیاہ چائے پییں گے بھی تو اکثر حالتوں میں بغیر دودھ کے یا لیموں کی ایک قاش کے ساتھ جو چائے کی لطافت کو نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ اور نکھار دیتی ہے۔ یہ لیموں کی ترکیب دراصل روس، ترکستان اور ایران سے چلی۔ سمرقند اور بخارا میں عام دستور ہے کہ چائے کا تیسرا فنجان لیمونی ہوگا۔ بعض ایرانی بھی دور کا خاتمہ لیمونی ہی پر کرتے ہیں۔ یہ کمبخت دودھ کی آفت تو صرف انگریزوں کی لائی ہوئی ہے:

﴿۲۶۸﴾ سرایں فتنہ زجائیست کہ من می دانم[۳۳]

اب ادھر اک اور نئی مصیبت پیش آ گئی ہے۔ اب تک تو صرف شکر کی عام قسم ہی کے استعمال کا رونا تھا لیکن اب معاملہ صاف صاف گڑ تک پہنچنے والا ہے۔ ہندوستان قدیم میں جب لوگوں نے گڑ کی منزل سے قدم آگے بڑھانا چاہا تھا تو یہ کیا تھا کہ گڑ کو کسی قدر صاف کر کے لال شکر بنانے لگے تھے۔ یہ صفائی میں سفید شکر سے منزلوں دور تھی مگر ناصاف گڑ[۳۴] سے ایک قدم آگے نکل آئی تھی۔ پھر جب سفید شکر عام طور پر بننے لگی تھی تو اس کا استعمال زیادہ تر دیہاتوں میں محدود رہ گیا لیکن اب پھر دنیا اپنی ترقی معکوس میں اسی طرف لوٹ رہی ہے جہاں سے سیکڑوں برس پہلے آگے بڑھی تھی۔ چنانچہ آج کل امریکہ میں اس لال شکر کی بڑی مانگ ہے۔ وہاں کے اہل ذوق کہتے ہیں کافی بغیر اس شکر کے مزہ نہیں دیتی اور جیسا کہ قاعدہ مقررہ ہے، اب ان کی تقلید میں یہاں کے اصحاب ذوق بھی ''براؤن شوگر'' کی صدائیں بلند کرنے لگے ہیں۔ میری یہ پیشین گوئی لکھ رکھیے کہ عنقریب یہ براؤن شکر کا ہلکا سا پردہ بھی اٹھ جائے گا اور صاف صاف گڑ کی مانگ ہر طرف شروع ہو جائے گی۔ یاران ذوق جدید کہیں گے کہ گڑ کے ڈلے ڈالے بغیر نہ چائے مزہ دیتی ہے نہ کافی۔ فرمایئے اب اس کے بعد باقی کیا رہ گیا ہے جس کا انتظار کیا جائے؟

﴿۲۶۹﴾ وائے گر درپس امروز بود فردائے[۳۵]

شکر اور گڑ کی دنیائیں اس درجہ ایک دوسرے سے مختلف واقع ہوئی ہیں کہ آدمی

ایک کا ہو کر پھر دوسرے کے قابل نہیں رہ سکتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے زندگی میں دو چار مرتبہ بھی گڑ کھا لیا، شکر کی لطافت کا احساس پھر ان میں باقی نہیں رہا۔ جواہر لال چونکہ مٹھاس کے بہت شائق ہیں، اس لیے گڑ کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ میں نے یہاں ہزار کوشش کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق جو میرے لیے اس درجہ نمایاں ہے انہیں بھی محسوس کراؤں لیکن نہ کرا سکا اور بالآخر تھک کے رہ گیا۔ بہر حال زمانہ کی حقیقت فراموشیوں پر کہاں تک ماتم کیا جائے:

(۲۷۰) کوتہ نہ تواں کرد کہ ایں قصہ درازست [۳۶]

آیئے، آپ کو کچھ اپنا حال سناؤں۔ اصحاب نظر کا قول ہے کہ حسن اور فن کے معاملہ میں حبّ الوطنی کے جذبہ کو دخل نہیں دینا چاہیے:

(۲۷۱) متاع نیک، ہر دکّان کہ باشد

پر عمل کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں بھی چائے کے باب میں شاہدانِ ہند کا نہیں، خوبانِ چین کا معتقد ہوں:

(۲۷۲)
دوائے دردِ دل خود ازاں مفرح جوئے
کہ در صراحی چینی و شیشہ حلبی ست [۳۷]

میرے جغرافیہ میں اگر چین کا ذکر کیا گیا ہے تو اس لیے نہیں کہ جنرل چنگ کائی شک [۳۸] اور میڈم چنگ [۳۹] وہاں سے آئے تھے، بلکہ اس لیے کہ چائے وہیں سے آتی ہے:

(۲۷۳)
مئے صافی زفرنگ آید و شاہد ز تتار
ما ندانیم کو بسطامے و بغدادے ہست [۴۰]

ایک مدّت سے جس چینی چائے کا عادی ہوں وہ وہائٹ جیسمین (White Jasmine) کہلاتی ہے۔ یعنی "یاسمین سفید" یا ٹھیٹ اُردو میں یوں کہیے کہ "گوری چنبیلی":

(۲۷۴)
کسے کہ محرم راز صبا ست مے داند
کہ باوجودخزاں بوئے یاسمن باقی ست [۴۱]

اِس کی خوشبو جس قدر لطیف ہے، اتنا ہی کیف تند و تیز ہے۔ رنگت کی نسبت کیا کہوں؟ لوگوں نے آتشِ سیّال کی تعبیر سے کام لیا ہے:

﴿۲۷۵﴾
مے میانِ شیشۂ ساقی نگر
آتشے گویا بہ آب آلودہ اند[۴۲]

لیکن آگ کا تخیل پھر ارضی ہے اور اس چائے کی علویت کچھ اور چاہتی ہے میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یوں سمجھئے، جیسے کسی نے سُورج کی کرنیں حل کر کے بلوریں فنجان میں گھول دی ہوں۔ ملا محمد مازندرانی صاحب بُت خانہ نے اگر یہ چائے پی ہوتی تو خانخاناں کی خانہ ساز شراب کی مدح میں ہرگز یہ نہ کہتا

﴿۲۷۶﴾
نہ می ماندایں بادہ اصلاً بہ آب
تو گوئی کہ حل کردہ اند آفتاب

لڑائی کی وجہ سے جہازوں کی آمدورفت بند ہوئی تو اس کا اثر چائے پر بھی پڑا۔ میں کلکتہ کے جس چینی اسٹور سے چائے منگوایا کرتا تھا، اس کا ذخیرہ جواب دینے لگا تھا۔ پھر بھی چند ڈبے مل گئے اور بعض چینی دوستوں نے بطور تحفہ کے بھی بھیج کر چاہ سازی کی تھی۔ جب کلکتہ سے نکلا تو ایک ڈبہ ساتھ تھا۔ ایک گھر میں چھوڑ آیا تھا۔ بمبئے سے گرفتار کر کے یہاں لایا گیا تو سامان کے ساتھ وہ بھی آ گیا اور پھر قبل اس کے کہ ختم ہو گھر والا ڈبہ بھی پہنچ گیا۔ اس طرح یہاں اور چیزوں کی کتنی ہی کمی محسوس ہوئی ہو لیکن چائے کی کمی محسوس نہیں ہوئی اور اگر چائے کی کمی محسوس نہیں ہوئی تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کسی چیز کی کمی بھی محسوس نہیں ہوئی:

﴿۲۷۷﴾
حافظ! دگر چہ می طلبی از نعیم دہر؟
مئے می خوری و طرّۂ دلدار می کشی![۴۳]

اس کی فکر کبھی نہیں ہوئی کہ یہ آخری ڈبہ چلے گا کب تک؟ کیونکہ خواجۂ شیراز کی موعظت ہمیشہ پیش نظر رہتی ہے:

﴿۲۷۸﴾
تا ساغرت پرست، بنوشان و نوش کن[۴۴]

یہاں ہمارے زندانیوں کے قافلہ میں اس جنس کا شناسا کوئی نہیں ہے۔ اکثر حضرات دودھ اور دہی کے شائق ہیں اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ دودھ اور دہی کی دنیا چائے کی دنیا سے کتنی دور واقع ہوئی ہے؟ عمریں گزر جائیں پھر بھی یہ مسافت طے نہیں ہو سکتی کہاں چائے کے ذوق لطیف کا شہرستان کیف وسُرور اور کہاں دُودھ اور دہی کی شکم پُری کی نگری!

اِک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں؟[۴۵]

جواہر لال بلاشبہ چائے کے عادی ہیں اور چائے پیتے بھی ہیں، خواص یورپ کی ہم مشربی کے ذوق میں بغیر دودھ کی؛ لیکن جہاں تک چائے کی نوعیت کا تعلق ہے شاہراہ عام سے باہر قدم نہیں نکال سکتے اور اپنی لپٹن و پیجو[۴۶] کی قسموں پر قانع رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان حضرات کو اس چائے کے پینے کی زحمت دینا نہ صرف بے سود تھا، بلکہ "وضع الشئی فی غیر محلّہ" کے حکم میں داخل تھا:

(۲۷۹)
مئے بہ زہّاد مکن عرضہ کہ ایں جوہر ناب
پیش ایں قوم بہ شوربۂ زمزم نہ رسد[۴۷]

ان حضرات میں سے صرف ایک صاحب ایسے نکلے جنھوں نے ایک مرتبہ میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے یہ چائے پی تھی اور محسوس کیا تھا کہ اگرچہ بغیر دودھ کی ہے مگر اچھی ہے؛ یعنی بہتر چیز تو وہی دودھ والا گرم شربت ہوا جو وہ روز پیا کرتے ہیں مگر یہ بھی چنداں بری نہیں۔ زمانے کی عالمگیر خیرہ مذاقی دیکھتے ہوئے یہ ان کی صرف "اچھی ہے" کی داد بھی مجھے اتنی غنیمت معلوم ہوئی کہ کبھی کبھی اُنھیں بُلا لیا کرتا تھا کہ آیئے، ایک پیالی اس "اچھی ہے" کی بھی پی لیجیے:

(۲۸۰)
عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است!

ان کے لیے یہ صرف اچھی ہوئی۔ یہاں چائے کا سارا معاملہ ہی ختم ہو جائے اگر یہ "اچھی ہے" ختم ہو جائے۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے:

(۲۸۱)
زاہد ازما خوشہ تا کے بہ چشم کم مبیں
ہیں، نمی دانی کہ یک پیمانہ نقصان کردہ ایم[۴۸]

مگر ایک ڈبہ کب تک کام دے سکتا تھا؟ آخر ختم ہو جانے پر آیا۔ چیتہ خاں نے یہاں دریافت کرایا، پونا بھی لکھا، لیکن اس قسم کی چائے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اب بمبئی اور کلکتہ لکھوایا ہے دیکھیے کیا نتیجہ نکلتا ہے، ایک ہفتہ سے وہی ہندوستانی سیاہ پتی پی رہا ہوں اور مستقبل کی امیدوں پر جی رہا ہوں:

﴿۲۸۲﴾
نہ کنی چارہ لب خشک مسلمانے را
اے بہ ترسا بچگان کردہ مئے ناب سبیل![۴۹]

آج کل چینی ہندوستان کے تمام شہروں میں پھیل گئے ہیں اور ہر جگہ چینی ریسٹوران[۵۰] کھل گئے ہیں۔ چونکہ احمد نگر انگریزی فوج کی بڑی چھاؤنی ہے، اس لیے یہاں بھی ایک چینی ریسٹوران کھل گیا ہے۔ جیلر کو خیال ہوا کہ اِن لوگوں کے پاس یہ چائے ضرور ہوگی۔ اس نے خالی ڈبا بھیج کر دریافت کرایا۔ انہوں نے ڈبا دیکھتے ہی کہا کہ یہ چائے اب کہاں مل سکتی ہے؟ لیکن تمہیں یہ ڈبا کہاں سے ملا؟ اور اس چائے کی یہاں ضرورت کیا پیش آئی؟ کیا چین کا کوئی بڑا آدمی یہاں آ رہا ہے؟ جو وارڈر بازار گیا تھا اس نے ہر چند باتیں بنائیں مگر ان کی تشفی نہیں ہوئی۔ دوسرے دن سارے شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ میڈم چنگ کائی شک قلعہ کے قیدیوں سے ملنے آ رہی ہے، اور اس کے لیے چینی چائے کا اہتمام کیا جا رہا ہے:

﴿۲۸۳﴾
بہ بیں نقشِ اَملہا چہ باطل اُفتادست[۵۱]

چائے کے ڈبے کی تہ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ پتّیوں کا چورا بیٹھ جایا کرتا ہے اور اسے ڈبے کے ساتھ پھینک دیا کرتے ہیں۔ یہ آخری ڈبا ختم ہونے پر آیا تو تھوڑا سا چورا اس کی تہ میں جمع تھا۔ میں نے چھوڑ دیا کہ اسے کیا کام میں لاؤں لیکن چیتہ خاں نے دیکھا تو کہا، آج کل لڑائی کی وجہ سے "ضائع مت کرو" کا نعرہ زبانوں پر ہے، یہ چورا بھی کیوں نہ کام میں لایا جائے؟ میں نے بھی سونچا کہ:

﴿۲۸۴﴾
بہ درد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ ہرچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است[۵۲]

چنانچہ چورا بھی کام میں لایا گیا اور اُس کا ایک ایک ذرّہ دم دے کر پیتا رہا۔ جب فنجان میں چائے ڈالتا تھا، تو ان ذرّوں کی زبانِ حال پکارتی تھی:

﴿۲۸۵﴾
ہر چند کہ نیست رنگ و بویم
آخر نہ گیاہ باغ اُویم![۵۳]

اس تخیل نے کہ ان ذرّوں کے ہاتھ سے کیف و سرور کا جام لے رہا ہوں، توسنِ فکر کی جولانیوں کے لیے تازیانہ کا کام دیا اور اچانک ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا۔ ہا،

مرزا بیدل نے میری زبانی کہا تھا:

اگر دماغم دریں شبستان، خمارِ شرمِ عدم نگیرد
زچشمکِ ذرّہ جام گیرم، بہ آں شکوہ ہے کہ جم نگیرد

دریں قلمرو کفِ غبارم، بہ ہیچ کس ہمسری ندارم
کمالِ میزانِ اعتبارم بس ست کز ذرہ کم نگیرد [۵۴]

اس تجربے کے بعد بے اختیار خیال آیا کہ اگر ہم تشنہ کاموں کی قسمت میں اب سرجوشِ خم کی کیفیتیں نہیں رہی ہیں تو کاش اس تہ شیشۂ ناصاف ہی کے چند گھونٹ مل جایا کریں، غالب نے کیا خوب کہا ہے:

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ
یوں ہے کہ مجھے دردِ تہہِ جام بہت ہے [۵۵]

شکر کے مسئلہ نے بھی یہاں آتے ہی سر اُٹھایا تھا، مگر مجھے فوراً ہی اس کا حل مل گیا، اور اب اس طرف سے مطمئن ہُوں۔ موٹے دانوں کی صاف شکر تھوڑی سی میرے سفری سامان میں تھی جو کچھ دنوں تک چلتی رہی۔ جب ختم ہوگئی تو میں نے خیال کیا کہ یہاں ضرور مل جائے گی۔ نہیں ملی تو ڈلیوں کے بکس تو ضرور مل جائیں گے؛ لیکن جب بازار میں دریافت کرایا تو معلوم ہوا امن کے وقتوں میں بھی یہاں ان چیزوں کی مانگ نہ تھی اور اب کہ جنگ کی رکاوٹوں نے راہیں روک دی ہیں، ان کا سراغ کہاں مل سکتا ہے؟ مجبوراً مصری منگوائی اور چاہا کہ اسے کٹوا کر شکر کی طرح کام میں لاؤں لیکن کوٹنے کے لیے ہاون کی ضرورت ہوئی۔ جیلر سے کہا: ایک ہاون اور ہاون دستہ منگوا دیا جائے۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ یہاں نہ ہاون ملتا ہے نہ دستہ۔ حیران رہ گیا کہ کیا اس بستی میں کبھی کسی کو اپنا سر پھوڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی؟ آخر لوگ کیسے زندگی بسر کرتے ہیں؟

حدیث عشق چہ داند کہ درہمہ عمر
بہ سر نہ کوفتہ باشد در سرائے را [۵۶]

۲۸۷

مجبوراً میں نے ایک دوسری ترکیب نکالی۔ ایک صاف کپڑے میں مصری کی ڈلیاں رکھیں اور بہت سارڈی کاغذ اُوپر تلے دھر دیا۔ پھر ایک پتھر اٹھا کر ایک قیدی کے حوالہ

کیا، جو یہاں کام کاج کے لیے لایا گیا ہے کہ اپنے سر کی جگہ اسے پیٹ:

(۲۸۸)

دریں کہ کوہکن از ذوق داد جاں چہ سخن؟
ہمیں کہ تیشہ برسر دیر زد سخن باقی ست [۵۷]

لیکن یہ گرفتارِ آلات و وسائل بھی کچھ ایسا:

سرگشتہ خمارِ رسوم و قیود تھا! [۵۸]

کہ ایک چوٹ بھی قرینہ کی نہ لگا سکا۔ مصری تو کٹنے سے رہی۔ البتہ کاغذ کے پرزے پرزے اڑ گئے اور کپڑے نے بھی اس کے روئے صبیح کا نقاب بننے سے انکار کر دیا:

چلی تھی برچھی کسی پر، کسی کے آن لگی! [۵۹]

بہرحال کئی دنوں کے بعد خدا خدا کر کے ہاون کا چہرۂ زشت نظر آیا۔ ''زشت'' اس لیے کہتا ہوں کہ کبھی ایسا انگھڑ ظرف نظر سے نہیں گزرا تھا۔ آج کل ٹاٹا نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ یہ خبر دیتی ہے کہ ہزاروں برس پہلے وسط ہند کے ایک قبیلہ نے ملک کو لوہے اور لوہاری کی صنعت سے آشنا کیا تھا۔ عجب نہیں یہ ہاون بھی اسی قبیلہ کی دست کاریوں کا بقیہ ہو اور اس انتظار میں گردشِ لیل و نہار کے دن گنتا رہا ہو کہ کب قلعہ احمد نگر کے زندانیوں کا قافلہ یہاں پہنچتا ہے اور کب ایسا ہوتا ہے کہ انہیں سر پھوڑنے کے لیے تیشہ کی جگہ ہاون دستہ کی ضرورت پیش آتی ہے:

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں [۶۰]

خیر کچھ ہو، مصری کوٹنے کی راہ نکل آئی، لیکن اب کٹی ہوئی مصری موجود ہے تو وہ چیز موجود نہیں جس میں مصری ڈالی جائے:

(۲۸۹) اگر دستے کنم پیدا، نمی یابم گریباں را [۶۱]

دیکھیے صرف اتنی بات کہنی چاہتا تھا کہ چائے ختم ہو گئی، مگر بائیس صفحے تمام ہو چکے اور ابھی تک بات تمام نہیں ہوئی:

یک حرف بیش نیست سراسر حدیثِ شوق
(۲۹۰) ایں طرفہ تر کہ ہیچ بہ پایاں نمی رسد! [۶۲]

ابوالکلام

قلعہ احمد نگر

۷؍جنوری ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ سردی اپنے پورے عروج پر ہے۔ کمرہ کا دروازہ اور کھڑکی کھلی چھوڑ دی ہے۔ ہوا کے برفانی جھونکے دمبدم آ رہے ہیں۔ چائے دم دے کے ابھی ابھی رکھی ہے۔ منتظر بیٹھا ہوں کہ پانچ چھ منٹ گزر جائیں اور رنگ و کیف اپنے معیاری درجہ پر آ جائے تو دور شروع کروں۔ دو مرتبہ نگاہ گھڑی کی طرف اٹھ چکی ہے مگر پانچ منٹ ہیں کہ کسی طرح ہونے پر نہیں آتے۔ خواجہ شیراز کا ترانہ صبح گاہی دل و دماغ میں گونج رہا ہے۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ گنگناؤں مگر ہمسایوں کی نیند میں خلل پڑنے کا اندیشہ لبوں کو کھلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ناچار نوکِ قلم کے حوالہ کرتا ہوں:[1]

صبح ست و ژالہ می چکد از ابر بہمنی
برگ صبوح ساز و بزن جام یک منی
گر صبحدم خمار ترا دردِ سر دہد
پیشانی خمار ہماں بہ کہ بشکنی
ساقی، بہوش باش، کہ غم در کمین ماست
مطرب، نگاہ دار ہمیں رہ کہ مے زنی
ساقی بہ بے نیازی یزداں کہ مے بیار
تا بشنوی ز صوتِ مغنّی "ہوالغنی"

۲۹۱

اس علاقہ میں عام طور پر سردی بہت ہلکی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں، کبھی اس طرف بھی آپ کا گزر رہا ہے یا نہیں؟ اور اگر رہا ہے تو کس موسم میں؟ لیکن پونا تو آپ بارہا گئے ہوں گے۔ دسمبر ۱۹۱۵ء کا سفر مجھے یاد ہے، جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے موقع پر آپ سے وہاں ملاقات ہوئی تھی۔ پونا یہاں سے[۲] صرف اسّی میل کی مسافت پر واقع ہے اور دکن کا یہ تمام حصّہ ایک ہی سطح مرتفع ہے۔ اِس لیے یہاں کی موسمی حالت کو پونا پر قیاس کر لیجیے۔ علاوہ بریں وقت کے زندانی کچھ پونا میں رکھے گئے ہیں، کچھ یہاں؛ اس لیے ویسے بھی اہل قیاس کے نزدیک بقول عرفی دونوں کا حکم ایک ہی ہوا:

(۲۹۲) یکے ست نسبتِ شیرازی و بدخشانی[۳]

فیضی[۴] کو اکبر نے جب سفارت پر یہاں بھیجا تھا تو معاملات کی پیچیدگیوں نے اسے دو سال تک ملنے نہیں دیا اور یہاں کے ہر موسم کے تجربے کا موقعہ ملا۔ اس نے اپنے مکاتیب میں احمد نگر کی آب وہوا کے اعتدال کی بہت تعریف کی تھی۔ فیضی سے بہت پہلے کا یہ واقعہ ہے کہ ملک التجار شیرازی نے مولانا جامی کو دکن آنے کی دعوت دی تھی اور لکھا تھا کہ اس ملک میں بارہ مہینے ہوائے معتدل کا لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔ خیر بارہ مہینا کہنا تو صریح مبالغہ تھا، مگر اس میں شک نہیں کہ یہاں گرمی کے دن بہت کم ہوتے ہیں اور یہاں کی برسات مالوہ کی برسات کی طرح بہت ہی پرلطف ہوتی ہے۔ غالباً ۱۹۰۵ء کی بات ہے کہ بمبئی میں مرزا فرصت شیرازی[۵] صاحب آثار العجم سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ برسات کا موسم پونا میں بسر کر کے لوٹے تھے اور کہتے تھے پونا کی ہوا کے اعتدال نے ہوائے شیراز کی یاد تازہ کردی:

(۲۹۳) اے گل بتو خرسندم، تو بوئے کسے داری[۶]

میرا ذاتی تجربہ معاملہ کو یہاں تک نہیں لے جاتا لیکن بہرحال میں شیراز میں مسافر تھا اور مرزائے موصوف صاحب البیت تھے۔ وصاحب البیت ادریٰ بما فیہا![۷]

اورنگ زیب جب دکن آیا تھا تو یہاں کے برشگال کا اعتدال اس کی طبع خشک کو بھی تر کیے بغیر نہ رہتا تھا۔ آپ نے تاریخ خوافی خاں اور مآثر الامراء وغیرہ میں جابجا پڑھا ہوگا کہ برسات کا موسم اکثر احمد نگر یا

پونا میں بسر کرتا تھا۔ پونا کا نام اس نے "محی نگر"[8] رکھا تھا مگر زبانوں پر نہیں چڑھا۔ اس کا انتقال احمد نگر ہی میں ہوا تھا۔[9]

جہاں تک اس اعتدال کا تعلق گرمی اور برسات کے موسم سے ہے، اس کے حسن وخوبی میں کلام نہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں کا سردی کا موسم بھی معتدل ہوتا ہے، حالانکہ سردی کا موسم ایک ایسا موسم ہوا کہ اس میں جس قدر بھی زیادتی ہو موسم کا حسن اور زندگی کا عیش ہے۔ اس کی کمی نقص وفتور کا حکم رکھتی ہے؛ اسے اعتدال کہہ کر سراہا نہیں جا سکتا

درماندۂ صلاح و فسادیم الحذر

زیں رسمہا کہ مردم عاقل نہاندہ اند[10]

﴿۲۹۴﴾

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اوائل عمر سے میری طبیعت کا اس بارے میں کچھ عجیب حال رہا ہے۔ گرمی کتنی ہی معتدل ہو، مگر مجھے بہت جلد پریشان کر دیتی ہے اور ہمیشہ سرد موسم کا خواستگار رہتا ہوں۔ موسم کی خنکی میرے لیے زندگی کا اصلی سرمایہ ہے۔ یہ پونجی ختم ہوئی اور گویا زندگی کی ساری کیفیتیں ختم ہو گئیں۔ چونکہ زندگی بہر حال بسر کرنی ہے اس لیے کوشش کرتا رہتا ہوں کہ ہر موسم سے سازگار رہوں لیکن طبیعت کے اصلی تقاضہ پر غالب نہیں آ سکتا۔ افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کا موسم سرما اس درجہ تنگ مایہ ہے کہ ابھی آیا نہیں کہ جانا شروع کر دیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جاتا ہے۔ میری طبع سراسیمہ کے لیے اس صورت حال میں صبر وشکیب کی ایک عجیب آزمائش پیدا ہو گئی ہے۔ جب تک وہ آتا نہیں، اس کے انتظار میں دن کاٹتا ہوں، جب آتا ہے تو اس کی آمد کی خوشیوں میں محو ہو جاتا ہوں لیکن اس کا قیام اتنا مختصر ہوتا ہے کہ ابھی اس کی پذیرائیوں سے سرو برگ سے فارغ نہیں ہوا کہ اچانک ہجران و وداع کا ماتم سر پر آ کھڑا ہوتا ہے۔

ہمچو عیدے کہ در ایام بہار آمد و رفت[11]

﴿۲۹۵﴾

میں آپ کو بتلاؤں، میرے تخیل میں عیش زندگی کا سب سے بہتر تصور کیا ہو سکتا ہے؟ جاڑے کا موسم ہو اور جاڑا بھی قریب قریب درجہ انجماد کا؛ رات کا وقت ہو، آتشدان میں اونچے اونچے شعلے بھڑک رہے ہوں اور میں کمرے کی ساری مسندیں چھوڑ کر اس

کے قریب بیٹھا ہوں اور پڑھنے یا لکھنے میں مشغول ہوں

﴿۲۹۶﴾

من ایں مقام بدنیا و عاقبت ندہم
اگرچہ درپیم افتند خلق انجمنے [۱۲]

معلوم نہیں بہشت کے موسم کا کیا حال ہوگا؟ وہاں کی نہروں کا ذکر بہت سُننے میں آیا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں گرمی کا موسم نہ رہتا ہو:

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو! [۱۳]

عجیب معاملہ ہے میں نے بارہا غور کیا کہ میرے تصور میں آتش دان کی موجودگی کو اتنی اہمیت کیوں مل گئی ہے؟ لیکن کچھ بتلا نہیں سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ سردی اور آتش دان کا رشتہ چولی دامن کا رشتہ ہوا۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ میں سردی کے موسم کا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچ ہی نہیں سکتا اگر آتش دان نہ سُلگ رہا ہو۔ پھر آتش دان بھی وہی پرانی روش کا ہونا چاہیے جس میں لکڑیوں کے بڑے بڑے کُندے جلائے جاسکیں۔ بجلی کے ہیٹر [۱۴] سے میری تسکین نہیں ہوتی بلکہ اسے دیکھ کر طبیعت چڑ سی جاتی ہے۔ ہاں گیس کے آتش دان کی ترکیب اتنی بے معنی محسوس نہیں ہوتی کیونکہ پتھر کے ٹکڑے رکھ کر انگاروں کے ڈھیر کی سی شکل بنا دیتے ہیں اور اس کے نیچے سے شعلے نکلتے رہتے ہیں۔ کم از کم شعلوں کی نوعیت باقی رہتی ہے۔ پھر بھی میں اسے ترجیح دینے کے لیے طیار نہیں۔ دراصل میں صرف گرمی ہی کے لیے آتش دان کا شیدائی نہیں ہوں، مجھے شعلوں کا منظر چاہیے۔ جب تک شعلے بھڑکتے نظر نہ آئیں دل کی پیاس بجھتی نہیں۔ بے دردوں کو جو دل کی جگہ برف کی سل سینہ میں چھپائے پھرتے ہیں، ان معاملات کی کیا خبر؟

سینۂ گرم نداری مطلب صحبتِ عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ ات، عُود مخر! [۱۵]

﴿۲۹۷﴾

آپ سن کر ہنسیں گے۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس خیال سے کہ سردی کا زیادہ سے زیادہ احساس پیدا کروں جنوری کی راتوں میں آسمان کے نیچے بیٹھ کر صُبح کی چائے پیتا رہا، اور اپنے آپ کو اس دھوکے میں ڈالتا رہا کہ آج سردی خوب پڑ رہی ہے:

از یک حدیثِ لطف کہ آں ہم دروغ بود
امشب زدفترِ گلہ صد باب شستہ ایم [16]

میری طبیعت کا بھی عجیب حال ہے۔ دوسروں سے پہلے خود اپنی حالت پر ہنستا ہوں۔ بچپنے میں چند مہینے چنسورہ میں بسر کیے تھے کیونکہ کلکتہ میں طاعون پھیل رہا تھا۔ یہ جگہ عین دریائے ہوگلی پر واقع [17] ہے۔ میں نے یہیں سب سے پہلے تیرنا سیکھا۔ صبح شام گھنٹوں دریا میں تیرتا رہتا پھر بھی جی سیر نہ ہوتا۔ اب بھی تیراکی کے لیے طبیعت ہمیشہ ترستی رہتی ہے۔ سبحان اللہ، طبعِ بوقلموں کی نیرنگ آرائیاں دیکھیے۔ ایک طرف دریا سے ہم عنانی کا یہ ذوق وشوق، دوسری طرف آگ کے شعلوں سے سیراب ہونے کی یہ تشنگی! شاید یہ اس لیے ہو کہ اقلیم زندگی کی سطح پر پانی بہتا ہے، تہہ میں آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ اسی لیے نکتہ سرایانِ حقیقت کو کہنا پڑا کہ:

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ دراقلیم عشق
روئے دریا سلسبیل وقعر دریا آتش است [18]

لوگ گرمیوں میں پہاڑ جاتے ہیں کہ وہاں گرمیوں کا موسم بسر کریں۔ میں نے کئی بار جاڑوں میں پہاڑوں کی راہ لی کہ وہاں جانے کا اصلی موسم یہی ہے۔ متنبی بھی کیا بدذوق تھا کہ لبنان کے موسم کی قدر نہ کرسکا۔ میری زندگی کے چند بہترین ہفتے لبنان میں بسر ہوئے ہیں۔

وجبال لبنان و کیف بقطعها
وهی الشتاء و صیفهنّ شتاء! [19]

زندگی کا ایک جاڑا جو موصل میں بسر ہوا تھا مجھے نہیں بھولتا۔ موصل اگرچہ جغرافیہ کی لکیروں میں معتدل خطہ سے باہر نہیں ہے لیکن گردوپیش نے اسے سردسیر حدود میں داخل کردیا ہے اور کبھی کبھی تو دیار بکر میں ایسی سخت برف پڑتی ہے کہ جب تک سڑکوں پہ کھدائی نہ ہولے، گھروں کے کواڑ کھل نہیں سکتے۔ جس سال میں گیا تھا، [20] غیر معمولی برف پڑی تھی۔ برف باری کے بعد جب آسمان کھلتا اور آرمینیا کے پہاڑوں کی ہوائیں چلتیں تو کیا عرض کروں، ٹھنڈک کا کیا عالم ہوتا؟ مجھے یاد ہے کہ کبھی کبھی سردی کی شدّت کا یہ عالم ہوتا کہ

مٹکوں کا ڈھکنا ہٹاتے تو پانی کی جگہ برف کی سل دکھائی دیتی لیکن میں پھر بھی سردی کی بے اعتدالیوں کا گلہ مند نہ تھا۔ جس شیخ کے گھر مہمان تھا، اس کے بچے دن بھر برف کے گولوں سے کھیلتے رہتے اور کبھی کبھی کوئی چھوٹی سی گولی منہ میں بھی ڈال لیتے۔ ستی کبیرہ [۲۱] یعنی شیخ کی ماں کا لونڈیوں کو حکم تھا کہ میرا آتش دان چوبیس گھنٹے روشن رکھیں۔ خود بھی دن میں دو تین مرتبہ پکار کے مجھ سے پوچھ لیا کرتیں کہ مجرہ [۲۲] کا کیا حال ہے؟ ایک لوہے کی کیتلی آتش دان کی محراب میں زنجیر سے لٹکتی رہتی اور پانی ہر وقت جوش کھاتا رہتا جس وقت چاہو، قہوہ بنا کر گرم گرم پی لو۔ چونکہ دیر تک جوش کھائے ہوئے پانی میں چائے یا کافی بنانا ٹھیک نہیں۔ اس لیے میں اسے اُتار کر رکھا دیا کرتا، لیکن لونڈی پھر لٹکا دیتی اور کہتی کہ ستی کا حکم ایسا ہی ہے۔ چائے بنانے کا یہی طریقہ مَیں نے شمالی ایران کے عام گھروں میں بھی دیکھا۔ آتش دان کی آگ صرف کمرہ گرم کرنے ہی کے کام نہیں لائی جاتی بلکہ باورچی خانہ کا بھی آدھا کام دے دیتی ہے۔ لوگ آتش دان کی آگ پر چائے کا پانی بھی گرم کر لیتے ہیں اور کھانا بھی پکا لیتے ہیں۔ اگر شمالی ایران کے لوگ ایسا نہ کریں تو اتنا ایندھن کہاں سے لائیں کہ کمروں کی کو بھی گرم رکھیں اور باورچی خانہ کا چولھا بھی سلگتا رہے؟ وہاں کے مکانوں میں آتش دان اتنے کشادہ ہوتے ہیں کہ کئی کئی دیگچیاں ان میں بیک وقت لٹک سکتی ہیں۔ آتشدان کی محراب میں تعمیر کے وقت حلقے ڈال دیئے جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح کے جیسے ہمارے مکانوں کی چھتوں میں پڑے ہوتے ہیں۔ انہی حلقوں میں زنجیر ڈال دی اور کیتلی یا دیگچی لٹکا دی۔ بعض شہروں کی سرایوں کے ہر کمرہ میں آتِشدان بنا ہے۔ جاڑوں میں سرایچی [۲۳] اسی آتِش دان پر پلاؤ دم دے کر آپ کو کھلا دے گا اور کہے گا "جائے گرم مکذاریدو بخورید"۔!

اگست کے مہینے میں جب ہم یہاں لائے گئے تو بارش کا موسم عروج پر تھا اور ہوا خوشگوار تھی۔ بالکل ایسی فضا رہتی تھی، جیسی آپ نے جولائی اور اگست میں پونا کی دیکھی ہوگی۔ پانی یہاں عام طور پر بیس پچیس انچ سے زیادہ نہیں برستا لیکن پانی کی دو چار بوندیں بھی کافی خوشگواری پیدا کر دیتی ہے۔ اُمس بہت کم ہوتی ہے۔ ہوا ابر چلتی رہتی ہے۔

ستمبر اور اکتوبر اسی عالم میں گزرا لیکن جب نومبر شروع ہوا تو طبیعت اس خیال

سے افسردہ رہنے لگی کہ یہاں سردی کا موسم بہت ہلکا ہوتا ہے۔ چھاؤنی کا کمانڈنگ افسر جو پچھلا جاڑہ یہاں بسر کر چکا ہے، کہتا تھا کہ پونا سے کچھ زیادہ سردی تھی لیکن وہ بھی بہ مشکل دس بارہ دن تک رہی ہوگی۔ عام طور پر دسمبر اور جنوری کا موسم یہاں ایسا رہتا ہے جیسا دہلی اور پنجاب میں جاڑے کے ابتدائی دِنوں کا ہوتا ہے۔ ان خبروں نے طبیعت کو بالکل مایوس کر دیا تھا، لیکن جونہی دسمبر شروع ہوا، موسم نے اچانک کروٹ لی۔ دو دِن تک بادل چھایا رہا اور پھر جو مطلع کھلا، تو کچھ نہ پوچھیے موسم کی فیاضیوں کا کیا عالم ہوا؟ دہلی اور لاہور کے چلّہ کا مزہ یاد آ گیا۔ یہاں کے کمروں میں بھلا آتش دان کہاں؟ لیکن اگر ہوتا تو موسم ایسا ضرور ہو گیا تھا کہ میں لکڑیاں چُننی شروع کر دیتا۔ چیتہ خاں جو ہر وقت خاکی تخفیفہ (یعنی شارٹ [۲۴]) پہنے رہتا تھا، یکا یک گرم سوٹ پہن کر آنے لگا اور کہنے لگا کہ سردی سے میرے گھٹنوں میں درد ہونے لگا ہے۔ چھاؤنی سے خبر آئی کہ ایک انگریز سپاہی جو رات کے پہرہ پر تھا، صبح نمونیا میں مبتلا پایا گیا اور شام ہوتے ہوتے ختم ہو گیا۔ ہمارے قافلہ کے زندانیوں کا یہ حال ہوا کہ دوپہر کے وقت بھی چادر جسم سے چمٹی رہنے لگی۔ جسے دیکھو، سردی کی بے جا ستانیوں کا شاکی ہے، اور دھوپ میں بیٹھ کر تیل کی مالش کرا رہا ہے کہ تمام جسم پھٹ کر چھلنی ہو گیا۔ حتیٰ کہ جو صاحب دہلی اور یوپی کے رہنے والے ہیں اور نینی تال کے موسم کے عادی رہ چکے ہیں، وہ بھی یہاں کے جاڑے کے قائل ہو گئے۔

چناں قحط سالے شاد اندر دمشق
که یاراں فراموش کردند عشق [۲۵] ﴿۳۰۱﴾

ضلع کا کلکٹر اسی علاقہ کا باشندہ ہے۔ وہ آیا تو کہنے لگا کہ سالہا سال گذر گئے میں نے ایسا جاڑہ اس علاقہ میں نہیں دیکھا۔ پارا چالیس درجہ سے بھی نیچے اتر چکا ہے۔ یہاں سب حیران ہیں کہ اس سال کونسی نئی بات ہوگئی ہے کہ اچانک پنجاب کی سردی احمد نگر پہنچ گئی۔ میں نے جی میں کہا: ان بے خبروں کو کیا معلوم کہ ہم زندانیوں اور خراباتیوں کی دعائیں کیا اثر رکھتی ہیں۔ رُبّ اشعث مدفوع بالا بواب، لو اقسم علی اللہ لابرہ [۲۶]

فِدائے شیوۂ رحمت کہ در لباسِ بہار
بعذر خواہی زندانِ بادہ نوش آمد [۲۷]

یہاں کے لوگ تو سردی کی سختیوں کی شکایت کر رہے ہیں، اور میرے دلِ آرزو مند سے اب بھی صدائے ہَل مِن مَّزِید [۲۸] اٹھ رہی ہے کلکتہ سے گرم کپڑے آئے پڑے ہیں، میں نے ابھی تک انہیں چھوا بھی نہیں۔ اس ڈر سے کہ اگر گرم کپڑے پہنوں گا تو سردی کا احساس کم ہو جائے گا اور تخیل کو جولانیوں کا موقع نہیں ملے گا، ابھی تک گرمیوں ہی کے لباس میں وقت نکال رہا ہوں۔ البتہ صبح اٹھتا ہوں تو اُونی چادر دُہری کر کے کاندھوں پر ڈال لیتا ہوں۔ میرا اور سردی کے موسم کا معاملہ تو وہ ہو گیا جو نظیری نیشا پوری کو پیش آیا تھا:

﴿۳۰۳﴾
اُو در وداعِ دمن بجزع، کز مئے و بہاد
رطلے سہ چار ماندۂ دروزے سہ چار خوش [۲۹]

یہاں تک لِکھ چکا تھا کہ خیال ہوا، تمہید ہی میں گیارہ صفحے سیاہ ہو گئے اور ابھی تک حرفِ مدّعا زبانِ قلم پر نہیں آیا۔ تازہ ترین واقعہ یہ ہے کہ ایک ماہ کی محرومی و انتظار کے بعد پرسوں چیتہ خاں نے مژدۂ کامرانی سنایا کہ بمبئی کے آرمی اینڈ نیوی اسٹور نے وہائٹ جیسمین چائے کہیں سے ڈھونڈھ نکالی ہے، اور ایک پونڈ کا پارسل وی پی کر دیا ہے۔ چنانچہ کل پارسل پہنچا۔ چیتہ خاں نے اس کی قیمت کا گلہ کرنا شروع کر دیا کہ تمہیں ایک پونڈ چائے کے لیے اتنی قیمت دینی پڑی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس کی ارزانی نے حیران کر دیا ہے۔ اس نایابی کے زمانے میں اگر اسٹور اس سے دوگنی رقم کا طلبگار رہوتا، جب بھی یہ جنس گرانمایہ ارزاں تھی:

﴿۳۰۴﴾
اے کہ می گوئی "چرا جے، بجانے می خری؟"
ایں سخن با ساقی ما گو کہ ارزاں کردہ است [۳۰]

حسن اتفاق دیکھیے کہ ادھر یہ پارسل پہنچا ادھر بمبئی سے بعض دوستوں نے بھی چند ڈبّے چینی دوستوں سے لے کر بھجوا دیئے۔ اب گرفتاری کا زمانہ جتنا بھی طول کھینچے، چائے کی کمی کا اندیشہ باقی نہیں رہا۔

بہر حال جو بات کہنی چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس ایک واقعہ نے صُبح کے معاملہ کی پوری فضا بدل دی، اور جوئے طبع افسردہ کا آبِ رفتہ پھر واپس آ گیا۔ اب پھر وہی صُبح کی مجلس طرب آراستہ ہے، وہی طبع سیہ مست کی عالم فراموشیاں ہیں، اور وہی فکر درماندۂ کار

کی آسماں پیمائیاں:

گوہرِ مخزنِ اسرار ہما نست کہ بود
حقہ مہر بداں مہر و نشانست کہ بود
حافظا! باز نما قِصہ خونا[31] بہ چشم
کر دریں چشمہ ہماں آب روانست کہ بود[32]

(۳۰۵)

ابوالکلام

قلعہ احمد نگر

۹ر جنوری ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

انانیتی ادبیات (Egotistic Literature) کی نسبت زمانہ حال کے بعض نقادوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ وہ یا تو وہ بہت زیادہ دلپذیر ہوں گی یا بہت زیادہ ناگوار۔ کسی درمیانی درجہ کی یہاں گنجائش نہیں۔ ''انانیتی ادبیات'' سے مقصود تمام اس طرح کی خامہ فرسائیاں ہیں جن میں ایک مصنف کا ایغو[1] (Ego) یعنی ''میں'' نمایاں طور پر سر اُٹھاتا ہے۔ مثلاً خودنوشتہ سوانح عُمریاں، ذاتی واردات وتاثرات، مشاہدات وتجارب، شخصی اسلوب نظر وفکر۔ میں نے ''نمایاں طور'' کی قید اس لیے لگائی کہ اگر نہ لگائی جائے تو دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو جائے گا۔ کیونکہ غیر نمایاں طور پر تو ہر طرح کی مصنفات میں مصنّف کی انانیت اُبھر سکتی ہے اور ابھرتی رہتی ہے اگر اس اعتبار سے صورت حال پر نظر ڈالیے تو ہماری درماندگیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ ہم اپنے ذہنی آثار کو ہر چیز سے بچالے جا سکتے ہیں مگر خود اپنے آپ سے بچا نہیں سکتے۔ ہم کتنا ہی ضمیر غائب اور ضمیر مخاطب کے پردوں میں چھپ کر چلیں، لیکن ضمیر متکلم کی پرچھائیں پڑتی ہی رہے گی۔ ہم جہاں جاتے ہیں، ہمارا سایہ ہمارے ساتھ جاتا ہے۔ ہماری کتنی ہی خود فراموشیاں ہیں جو دراصل ہماری خود پرستیوں ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک نکتہ شناس حقیقت کو کہنا پڑا تھا:

فقُلت لها "ما اذنبتُ؟" قالت مُجیبةً

"وجودک ذنبٌ لایُقاسُ بہ ذنبُ!"[2]

کل ایک زیرتسوید کتاب کا ایک خاص مقام لکھ رہا تھا کہ مبحث کی مناسبت سے قول مندرجہ صدر ذہن میں تازہ ہوگیا اور اس وقت حسبِ معمول صبح کو لکھنے بیٹھا تو بے اختیار سامنے آگیا۔ آیئے، آج تھوڑی دیر کے لیے رک کر اس معاملہ پر غور کرلیں۔ ایک ادیب، ایک شاعر، ایک مصور، ایک اہل قلم کی ''انانیت'' (Egoism) کیا ہے؟ ابھی نہ تو فلسفہ واخلاق کے مذاہب اَنا (Egoism) کا رخ کیجیے، نہ ''خودی'' (I amness) مصطلحہ تصوف میں جایئے۔ صرف ایک عام تحلیلی زاویہ نگاہ سے معاملہ کو دیکھیے۔ آپ کو صاف دکھائی دے گا کہ یہ انانیت دراصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس کی فکری انفرادیت کا ایک قدرتی سرجوش ہے جسے وہ دبا نہیں سکتا۔ اگر دبانا چاہتا ہے تو اور زیادہ ابھرنے لگتی ہے اور اپنی ہستی کا اثبات کرتی ہے۔ ابوالعلاء معرّی نے جب اپنا مشہور لامیہ کہا تھا:[۳]

(۳۰۷)
اَلافی سبیلِ المجد مَا أنا فاعِلُ
عَفَاف وَاقدامٌ وَ خَزمٌ وَ نائلُ

یا جب ابوفراس حمدانی نے اپنا لافانی رائیۃ کہا[۴]

(۳۰۸)
أراک عصّی الدّمع شیمتک الصّبرُ
اما للهویٰ نَهیٌ علیک وَلا أمرُ

یا جب ابنِ سناء الملک نے اپنے زمانہ کو مخاطب کیا تھا:[۵]

(۳۰۹)
وِانک عبدی یا زمان، وَانّنی
علی الرّغم مِنّی ان اریٰ لک سیّدا
وَما اَنا راض اِنّنی واطیءِ الثّریٰ
ولی همته، لاترتضیٰ الاُفُقَ مقعدَا

یا جب فردوسی کے قلم سے نکلا تھا:

(۳۱۰)
بسے رنج بردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بدیں پارسی![۶]

یا مثلاً فیضی نے نل دمن نظم کرتے ہوئے یہ اشعار کہے تھے:[۷]

(۳۱۱) اِمروز نہ شاعرم، حکیم دانندۂ حادث و قدیم

ہر مُوئے زمن تمام گوش ست — خاموشیٔ من بصد خروش ست
ایں بادہ کہ جوشداز ایاغم — خونے ست چکیدہ از دماغم
صد دیدہ بہ ورطۂ دل افتاد — کیں موجِ گہر بساحل افتاد
بگد اختہ آبگینۂ دل — آئینہ دہم بدستِ محفل
آنم کہ بسحر کاریٔ ژرف — از شعلہ تراش کردہ ام حرف
بانگ قلمم دریں شب تار — بس معنیٔ خفتہ کردہ بیدار
می ریخت ز سحرکاریٔ ژرف — از صُبح ستارہ و زمن حرف
ہر نغمہ کہ بستہ ام بریں تار — ناقوس نہفتہ ام بہ زنّار
ایں گل کہ بہ بوستاں نثاری ست — ازمن بہ بہار یادگاری ست

یا جب ہمارے میر انیس نے کہا تھا:[۸]

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

(۳۱۲)

تو یہ محض شاعرانہ تعلّیاں نہ تھیں؛ یہ ان کی پرجوش انفرادیت تھی، جو بےاختیار چیخ رہی تھی!

لیکن ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں، انانیت کا یہ شعور کچھ اس نوعیت کا واقع ہوا ہے کہ ہر انفرادی انانیت اپنے اندرونی آئینہ میں جو عکس ڈالتی ہے، بیرونی آئینوں میں اس سے بالکل اُلٹا عکس پڑنے لگتا ہے۔ اندر کے آئینہ میں ایک بڑا وجود دکھائی دیتا ہے، باہر کے تمام آئینوں میں ایک چھوٹی سے چھوٹی شکل اُبھرنے لگتی ہے:

خودی آئینہ دارد کہ محروم ست اظہارش[۹]

یہی صورت حال ہے جہاں سے ہر مصنّف کی جو خود اپنی نسبت کچھ کہنا چاہتا ہے، ساری مشکلیں اُبھرنی شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ جبکہ خود اپنے عکس کو جو اس کے اندرونی آئینہ میں پڑ رہا ہے، جھٹلا نہیں سکتا، تو اچانک کیا دیکھتا ہے کہ باہر کے تمام آئینے اسے جھٹلا رہے ہیں۔ جو "میں" خود اس کے لیے بے حد اہمیت رکھتی ہے، وہی دوسروں کی نگاہوں میں یکسر غیر اہم ہو رہی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی حالت میں محسوس کرنے لگتا ہے، جیسے ایک

مصور تصویر کھینچنے کے لیے موقلم اٹھائے، مگر اسے یقین ہو کہ میں کتنی ہی مصورانہ قوت کام میں لاؤں، میری نگاہ کے سوا اور کوئی نگاہ اس مرقع کی دلآویزی نہیں دیکھ سکے گی:

(۳۱۳)
آئینہ نقشِ بند طلسمِ خیال نیست
تصویر خود بلوحِ دگر می کشیم ما[1]

اس مشکل سے صرف خال خال مصنف ہی عہدہ برآ ہو سکتے تھے اور ہوئے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی "انانیت" کو بغیر کسی نمائشی وضع میں سجائے، دوسروں کے سامنے لے آنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ دنیا کے سامنے ان کی "انانیت" آئی مگر اس طرح آئی، جیسے ایک بے تکلّف آدمی بغیر سج دھج بنائے سامنے آ کھڑا ہو۔ یہ بات کہ ایک آدمی بغیر کسی بناوٹ کے اپنی واقعی صورت میں سامنے آ گیا۔ نمود حقیقت کی ایک خاص دلکشی رکھتی ہے اور اس لیے دنیا کی نگاہوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ جو خاص خاص ادیب ایسا کر سکے، ان کی "میں" خود ان کے لیے کتنی ہی بڑی اور دوسروں کے لیے کتنی ہی چھوٹی واقع ہوئی ہو، لیکن دنیا اس کی دلپذیری سے انکار نہ کر سکی۔ دنیا کو ان کی انانیت کی مقدار ناپنے کی مہلت ہی نہیں ملی، وہ اس کی بے تکلفانہ واقعیت دیکھ کر بے خود ہو گئی۔

ایک آدمی جب اپنی تصویر اُتروانی چاہتا ہے، تو خواہ اسے اس کا شعور ہو یا نہ ہو، لیکن اس خواہش کی تہ میں اس کی انانیت کی ایک دھیمی آواز ضرور بولنے لگتی ہے۔ تصویر اُتروانے کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک حالت وہ ہے جسے مصورانہ وضع (Pose) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی تصویر اُتروانے کے لیے ایک خاص طرح کا انداز بہ تکلّف اختیار کر لینا۔ ایک ماہر فن مصور جانتا ہے کہ کس چہرے اور جسم کی مصورانہ وضع کیسی ہونی چاہیے؟ وہ جب تک نشست و وضع کی نوک پلک درست نہیں کر لے گا، تصویر نہیں اُتارے گا۔ سو میں ننانوے آدمیوں کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ نشست اور ڈھنگ سجا کے تصویر اُتروائیں۔ لیکن فرض کرو ایک آدمی بغیر کسی طیاری اور وضعی انداز کے آلہ انعکاس کے سامنے آ گیا اور اسی عالم میں اس کی تصویر اُتر آئی، تو ایسی تصویر کس نگاہ سے دیکھی جائے گی؟ ایسی تصویر محض اس لیے کہ بے ساختگی اور واقعیت کی ٹھیک ٹھیک تعبیر پیش کرتی ہے یقیناً ایک خاص قدر و قیمت پیدا کر لے گی، اور جس صاحب نظر کے سامنے جائے گی اس کی توجہ اپنی طرف

کھینچ لے گی۔ وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ جس کی تصویر ہے، وہ خود کیسا ہے؟ وہ اس میں محو ہو جائے گا کہ خود تصویر کتنی بے ساختہ ہے!

بعینہ یہی مثال اس صورتِ حال کی بھی سمجھ لیجیے۔ جو مصنف اپنی انانیت کی بے ساختہ تصویر کھینچ دے سکتے ہیں وہ اس معاملہ کی ساری مشکلوں پر غالب آ جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تصویر خود اپنے قلم سے کھینچی لیکن یہ بات اس کی دلآویزی میں کچھ مخل نہ ہو سکی۔ کیونکہ تصویر بے تکلف اور بے ساختہ کھینچی۔ وہ لوگوں کو باعظمت دکھائی دے یا نہ دے لیکن اس کی بے ساختگی کی گیرائی سب کی نگاہوں کو لبھائے گی۔ ایسے ہی مصنف ہیں جو اپنی انانیت کو لافانی دلپذیری کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔

لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ انسان کی تمام معنوی محسوسات کی طرح اس کی انفرادیت کی نمود بھی مختلف حالتوں میں مختلف طرح کی نوعیتیں رکھتی ہے۔ کبھی وہ سوتی رہتی ہے، کبھی جاگ اٹھتی ہے، کبھی اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے، اور پھر کبھی زور شور سے اُچھلنے لگتی ہے۔ انسان کی ساری قوتوں کی طرح وہ بھی نشو و نما کی محتاج ہوئی۔ جس طرح ہر انسان کا ذہن و ادراک یکساں درجہ کا نہیں ہوتا اسی طرح انفرادیت کا جوش بھی ہر دیگ میں ایک ہی طرح نہیں اُبلتا۔ مدارج کا یہی فرق ہے جو ہم تمام ادیبوں، شاعروں، مصوروں اور موسیقی نوازوں میں پاتے ہیں۔ اکثروں کی انفرادیت بولتی ہے مگر دھیمے سُروں میں بولتی ہے۔ بعضوں کی انفرادیت اتنی پر جوش ہوتی ہے کہ جب کبھی بولے گی، سارا گرد و پیش گونج اُٹھے گا:

(۳۱۴)

یک بار نالہ کردہ ام از دردِ اشتیاق
از شش جہت ہنوز صدامی تواں شنید[11]

اسی لیے ایک عرب شاعر کو کہنا پڑا تھا:

(۳۱۵)

وما الدھر الّا مِن رُواۃ قصائدی
اذا قُلتُ شعراً اصبعَ الدّھرُ مُنشداً[12]

ایسے افراد اپنی ''میں'' کا سر جوش کسی طرح نہیں دبا سکتے۔ ان کی خاموشی چیخنے والی اور ان کا سکون بھی تڑپنے والا ہوتا ہے۔ ان کی انفرادیت دبانے سے اور زیادہ اچھلنے

لگے گی۔ ایسے افراد جب کبھی ''میں'' بولتے ہیں، تو اس میں قصد، بناوٹ اور نمائش کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ سرتا سر حقیقتِ حال کی ایک بے اختیارانہ چیخ ہوتی ہے۔ فیضی کی ایک ایسی ہی چیخ تھی جو اس وقت تک ہمارے سامعہ سے ٹکرا رہی ہے:

٣١٦

می کشد شعلہ سرے از دل صد پارۂ ما
جوشِ آتش بود امروز بہ فوّارۂ ما [13]

لیکن ہر قانون کی طرح یہاں بھی مستثنیات ہیں۔ ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کبھی کبھی ایسی شخصیتیں بھی دنیا کے مَسرح (اسٹیج) پر نمودار ہو جاتی ہیں جن کی انانیت کی مقدار اضافی نہیں ہوتی، بلکہ مطلق نوعیت رکھتی ہے؛ یعنی خود انہیں ان کی انانیت جتنی بڑی دکھائی دیتی ہے، اتنی ہی بڑی دوسرے بھی دیکھنے لگتے ہیں۔ ان کی انانیت کی پرچھائیں جب کبھی پڑے گی، تو خواہ اندر کا آئینہ ہو خواہ باہر کا، اس کے ابعادِ ثلاثہ (Dimensions) ہمیشہ یکساں طور پر نمودار ہوں گے!

ایسے اخص الخواص افراد کو عام معیارِ نظر سے الگ رکھنا پڑے گا۔ ایسے لوگ فکر و نظر کے عام ترازوؤں میں نہیں تولے جا سکتے۔ ادب و تصنیف کے عام قوانین انہیں اپنے کلّیوں سے نہیں پکڑ سکتے۔ زمانے کو ان کا یہ حق تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ وہ جتنی مرتبہ بھی چاہیں ''میں'' بولتے رہیں۔ ان کی ہر ''میں'' ان کی ہر ''وہ'' اور ''تم'' سے کہیں زیادہ دلپذیر ہوتی ہے!

انانیتی ادبیات کی کوئی خاص قسم لے لیجیے۔ مثلاً خود نوشتہ سوانح واردات اور پھر مثال کے لیے بغیر کاوش کے چند شخصیتیں چن لیجیے۔ مثلاً سینٹ آگسٹائن [14] (St. Audustine) روسو (Rousseau) [15]، اسٹرنڈ برگ [16] (Strind Berg)، ٹالسٹائی [17]، اناطول فرانس، [18] آندرے ژید [19] (Andregide) ان کے خود نوشتہ سوانح چھ مختلف نوعیتوں کی چھ مختلف تصویریں ہیں لیکن سب نے یکساں طور پر ادبیات عالم میں دائمی جگہ حاصل کر لی۔ کیونکہ تصویریں بے ساختہ اور واقعی ہیں۔ مشرقی ادبیات میں مثلاً غزالی، [20] ابن خلدون [21] بابر [22]، جہانگیر [23] اور ملا عبدالقادر [24] بدایونی کے خود نوشتہ حالات سامنے لایئے۔ ہم کتنی ہی مخالفانہ نگاہوں سے انہیں پڑھیں، لیکن ان کی دلآویزی کے مطالبہ سے انکار نہیں کر سکتے۔ غزالی نے اپنے فکری انفعالات کی سرگزشت سنائی۔

ابن خلدون نے اپنے تعلیمی اور سیاسی علائق کی داستاں سرائی کی۔ بابر نے جنگ اور امن کے واقعات و واردات قلم بند کیے۔ جہانگیر نے تختِ شہنشاہی پر بیٹھ کر وقائع نگاری کا قلم دان طلب کیا۔ ان کی انانیتیں بے پردہ بول رہی ہیں۔ ہم انہیں خود ان کی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ تاہم دیکھتے ہیں اور ان کی لافانی دلآویزی سے انکار نہیں کر سکتے کیونکہ کسی بغیر بناوٹ کے سامنے آ گئی ہیں۔

بدایونی کا معاملہ اَوروں سے الگ ہے؛ طبقۂ عوام کا ایک فرد جس نے وقت کی درسیاتی تعلیم حاصل کر کے علماء کے حلقے میں اپنی جگہ بنائی اور دربارِ شاہی تک رسائی حاصل کر لی۔ اس کی زندگی کی تمام سرگرمیوں میں اگر خصوصیت کے ساتھ کوئی چیز اُبھرتی ہے، تو وہ اس کی بے لچک تنگ نظری، بے روک تعصب اور بے میل راسخ الاعتقادی ہے۔ ہمیں اُس کی انانیت نہ صرف بہت چھوٹی دکھائی دیتی ہے بلکہ قدم قدم پر انکار و تبری کی دعوت دیتی ہے۔ تاہم یہ کیا بات ہے کہ اس پر بھی ہم اپنی نگاہوں کو اس کی طرح اُٹھنے سے روک نہیں سکتے؟ ہم اسے پسند نہیں کرتے، پھر بھی اسے پڑھتے ہیں اور جی لگا کر پڑھتے ہیں۔ غور کیجیے یہ وہی بات ہوئی جو ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہم سوچ رہے تھے۔ جس شخص کی یہ تصویر ہے وہ خود خوبصورت نہیں ہے لیکن تصویر بہ حیثیت ایک تصویر کے خوبصورت ہے۔ اس لیے ہماری نگاہوں کو بے اختیار اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ یہ صاحبِ تصویر نہیں تھا جس نے ہماری نگاہوں کو کھینچا؛ یہ تصویر کی بے ساختگی تھی جس کے بلاوے کی کشش سے ہم اپنے آپ کو نہ بچا سکے!

ٹالسٹائی غالباً ان خاص شخصوں میں سے تھا جن کی انانیت کی مقدار اضافی ہونے کی جگہ ایک مطلق نوعیت رکھتی تھی۔ اس کی انانیت خود اسے جتنی بڑی دکھائی دی، دنیا نے بھی اسے اتنا ہی بڑا دیکھا۔ پچھلی صدی کے آخری اور اس صدی کے ابتدائی دور میں شاید ہی وقت کا کوئی مصنف اس خود اعتمادی کے ساتھ "میں" بول سکا، جس طرح یہ عجیب و غریب رُوسی بولتا رہا۔ اس کے خودنوشتہ حالات، اس کے شخصی واردات و تاثرات، اس کے مختلف وقتوں کے مکالمے اور روزنامچے، اس کے ادبی و فنی مباحث، سب میں اس کی انانیت بغیر کسی نقاب کے دنیا کے سامنے آئی اور دنیا اسے عالمگیر نوشتوں کے ساتھ جمع کرتی رہی۔ اس کے خودنوشتہ سوانح جو ایک بے رنگ سادگی کے ساتھ لکھے گئے ہیں اس کی "وار اینڈ پیس" اور

''اینا کارنینا'' سے کم دلپذیر نہیں ہیں اور دراصل ان دونوں افسانوں میں بھی اس کی انانیت ہی کی صدائیں ہم سن رہے ہیں۔ زمانہ اس کی قلم کاریوں کا رنگ و روغن ابھی تک مدھم نہیں کر سکا۔ پچھلی جنگ کے زمانہ میں لوگ ''وار اینڈ پیس'' از سرِ نو ڈھونڈھنے لگے تھے اور اب پھر ڈھونڈھ رہے ہیں۔

موجودہ عہد میں ٹالسٹائی کی عظمت بحیثیت اور ایک مفکر کے بہت [کم] [25] دماغوں کو متوجہ کر سکے گی۔ یورپ اور امریکہ کے دماغی طبقوں میں بہت کم لوگ ایسے نکلیں گے جو اس کے معاشرتی، فلسفی اور جمالیاتی (Aesthetics) افکار کو اس نظر سے دیکھنے کے لیے طیار ہوں، جس نظر سے اس صدی کے ابتدائی دور کے لوگ دیکھا کرتے تھے۔ تاہم اس کی انانیتی ادبیات کی دلپذیری سے اب بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس کی عجیب زندگی کا معمہ اب بھی بحث و نظر کا ایک دل پسند موضوع ہے۔ ہر دوسرے تیسرے سال کوئی نہ کوئی نئی کتاب نکلتی رہتی ہے۔

پچھلی صدی کے آخری اور اس صدی کے ابتدائی دور میں بکثرت خود نوشتہ سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد کے ہر چوتھے مصنف نے ضروری سمجھا کہ اپنی گزری ہوئی زندگی کو آخر عمر میں پھر ایک مرتبہ دہرا لے۔ دنیا کے کتب خانوں نے ان سب کو اپنی الماریوں میں جگہ دی ہے، لیکن دنیا کے دماغوں میں بہت کم کے لیے جگہ نکل سکی۔

میں نے ابتدائی سطور ''ایغو'' [26] کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ وہی یونانی (Ego) کی تعریب ہے جو ارسطو کے عربی مترجموں نے ابتدا ہی میں اختیار کر لی تھی اور پھر فارابی [27] اور ابن رشد [28] وغیرہما برابر استعمال کرتے رہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ فلسفیانہ مباحث میں ''انا'' کی جگہ ''ایغو'' کا استعمال زیادہ موزوں ہوگا۔ یہ براہ راست فلسفیانہ اصطلاح کو رونما کر دیتا ہے اور ٹھیک وہی کام دیتا ہے جو یورپ کی زبانوں میں ''ایگو'' [29] دے رہا ہے۔ یہ اس اشتباہ کو بھی دور کر دے گا جو ''انا'' مُصطَلَحِ فلسفہ اور ''انا'' مصطلحِ تصوف میں باہم دگر پیدا ہو جا سکتا ہے۔ اردو میں ہم ''ایگو'' بجنسہٖ لے سکتے ہیں کیونکہ ہمیں گاف سے احتراز کرنے کی ضرورت نہیں۔

ابوالکلام

حکایتِ زاغ و بُلبل

قلعہ احمد نگر

۲ر مارچ ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

کل عالم تصور میں حکایتِ زاغ و بُلبل ترتیب دے رہا تھا۔

مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا،[۱]

اس وقت خیال ہوا، ایک فصل آپ کو بھی سُنادوں

تا فصلے از حقیقتِ اشیاء نوشتہ ایم

۳۱۷ آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم[۲]

ایک دن صبح چائے پیتے ہُوئے نہیں معلوم سید محمود[۳] صاحب کو کیا سوجھی، ایک طشتری میں تھوڑی سی شکر لے کر نکلے اور صحن میں جا بجا کچھ ڈھونڈھنے سے لگے۔

۳۱۸ گوئی ایں طائفہ ایں جا گہرے یافتہ اند[۴]

جب ان کا تعاقب کیا گیا تو معلوم ہوا چیونٹیوں کے بل ڈھونڈھ رہے ہیں۔ جہاں کوئی سوراخ دکھائی دیا، شکر کی ایک چٹکی ڈال دی۔ میں نے جو یہ حال دیکھا تو یہ کہہ کر ان کے سمندِ سعی پر ایک اور تازیانہ لگا دیا کہ:

۳۱۹ وللارض من کاس الکرام نصیب[۵]

کہنے لگے اس کا ترجمہ کیجیے۔ میں نے کہا، خواجہ شیراز مع اضافہ کے کر چکے ہیں:

۳۲۰

اگر شراب خوری جُرعہ فشاں بر خاک
ازاں گناہ کہ نفعے رسد بغیر چہ باک[۶]

یہاں کمروں کی چھتوں میں گوریاؤں کے جوڑوں نے جابجا گھونسلے بنا رکھے ہیں، دن بھر ان کا شور و ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ چند دنوں کے بعد محمود صاحب کو خیال ہوا ان کی بھی کچھ تواضع کرنی چاہیے ممکن ہے گوریاؤں کی زبانِ حال نے انہیں توجہ دلائی ہو کہ:

نگاہِ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں[۷]

چھپرہ میں ایک مرتبہ انہوں نے مرغیاں پالی تھیں۔ دانہ ہاتھ میں لے کر آ، آ کرتے تو ہر طرف سے ڈوڑتی ہوئی چلی آتیں۔ یہی نسخہ چڑیوں پر بھی آزمانا چاہا لیکن چند دنوں کے بعد تھک کر بیٹھ رہے۔ کہنے لگے عجیب معاملہ ہے۔ دانہ دکھا دکھا کر جتنا پاس جاتا ہوں، اتنی ہی تیزی سے بھاگنے لگتی ہیں گویا دانہ کی پیش کش بھی ایک جرم ہوا۔

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں جائے ہے مجھ سے[۸]

میں نے کہا طلب و نیاز کی راہ میں قدم اٹھایا ہے، تو عشوہ و ناز کی تغافل کیشیوں کے لیے صبر و شکیب پیدا کیجیے۔ نیازِ عشق کے دعوؤں کے ساتھ نازِ حسن کی گلہ مندیاں زیب نہیں دیتیں۔

بہ ناز کی نہ بری پے بہ منزل مقصود
مگر طریق رہش از سر نیاز کنی
اگر بہ ناز براند، مَرَو کہ آخرِ کار
بہ صد نیاز بخواند ترا و نازکنی!

یہاں کبھی کبھی صبح کو جنگلی میناؤں کے بھی تین جوڑے آنکلتے ہیں اور اپنی غُر رغُر ر اور چیو چیو کے شور سے کان بہرا کر دیتے ہیں۔ اب محمود صاحب نے گوریاؤں کے عشق پر تو واسوخت پڑھا، مگر اِن آہوانِ ہوائی کے لیے دام ضیافت بچھا دیا۔

۳۲۲

من وآہوئے صحرائے کہ دائم می رمید از من[۹]

روز صبح روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہاتھ میں لے کر نکل جاتے اور صحن میں جا کھڑے ہوتے۔ پھر جہاں تک حلق کام دیتا، آ، آ، آ کرتے جاتے اور ٹکڑے فضاء کو دکھا دکھا کر پھینکتے رہتے۔ یہ صلائے عام میناؤں کو تو ملتفت نہ کر سکی البتہ شہرستانِ ہوا کے دریوزہ گران ہرجائی یعنی کووں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کر دیا۔ میں نے کووں کو شہرستانِ ہوا کا دریوزہ گر اس لیے کہا کہ کبھی انہیں مہمانوں کی طرح کہیں جاتے دیکھا نہیں؛ طفیلیوں کے غول میں بھی بہت کم دکھائی پڑے؛ ہمیشہ اسی عالم میں پایا کہ فقیروں کی طرح ہر دروازے پر پہنچے، صدائیں لگائی اور چل دیئے۔

فقیرانہ آئے، صدا کر چلے![10]

بہر حال محمود صاحب آ، آ، کے تسلسل سے تھک کر جونہی مڑتے یہ دریوزہ گرانِ کوتہ آستین فوراً بڑھتے اور اپنی دراز دستیوں سے دستر خوان صاف کر کے رکھ دیتے۔

(۳۲۳) اے کوتہ آستیناں! تاکے دراز دستی[11]

صحن کے شمالی کنارے میں نیم کا ایک تناور درخت ہے۔ اس پر گلہریوں کے جھنڈ کودتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے جو دیکھا کہ:

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے[12]

تو فوراً لبیک لبیک اور ''مرحمت عالی زیاد'' کہتے ہوئے اس دسترخوانِ کرم پر ٹوٹ پڑیں:

(۳۲۴) یاران! صلائے عام ست گرے کنید کارے[13]

کووں کی دراز دستیوں سے جو کچھ بچتا، ان کوتاہ دستوں کی کامجوئیوں کا کھاجا بن جاتا۔ پہلے روٹی کے ٹکڑوں پر منہ مارتیں پھر فوراً گردن اُٹھا لیتیں۔ ٹکڑا چباتی جاتیں اور سر ہلا ہلا کر کچھ اشارے بھی کرتی جاتیں۔ گویا محمود صاحب کو دادِ ضیافت دیتے ہوئے بہ طریق حسنِ طلب یہ بھی کہتی جاتی ہیں کہ:

(۳۲۵) گرچہ خوب است ولیکن قدرے بہتر ازیں،[14]

خیر بیچاری گلہریوں کا شمار تو اسفرۂ کرم کے ریزہ چینوں میں ہوا، لیکن کوے جنہیں طفیلی سمجھ کر میزبان عالی ہمت نے چنداں تعرض نہیں کیا تھا، اچانک اس قدر بڑھ گئے کہ

معلوم ہونے لگا، پورے احمد نگر کو اس بخششِ عام کی خبر مل گئی ہے اور علاقہ سے سارے کوّوں نے اپنے اپنے گھروں کو خیر باد کہہ کر یہیں دُھونی رمانے کی ٹھان لی ہے۔ بیچاری میناؤں کو جو اس اہتمامِ ضیافت کی اصلی مہمان تھیں ابھی تک خبر بھی نہیں پہنچی تھی۔ اب اگر پہنچ جاتی تو بھلا طفیلیوں کے اس ہجوم میں ان کے لیے جگہ کہاں نکلنے والی تھی۔

(۳۲۶) طفیلی جمع شد چنداں کہ جائے میہماں گم شد [۱۵]

محمود صاحب کے صلائے عام سے پہلے ہی یہاں کوّوں کی کائیں کائیں کی روشن چوکی برابر بجتی رہتی تھی۔ اب جو اِن کا دستر خوان کرم بچھا تو نقاروں پر بھی چوب پڑ گئی۔ ایک دو دن تک تو لوگوں نے صبر کیا، آخر ان سے کہنا پڑا کہ اگر آپ کے دستِ کرم کی بخششیں رک نہیں سکتیں تو کم از کم چند دنوں کے لیے ملتوی ہی کر دیجیے ورنہ ان ترکانِ یغما دوست کی ترکتازیاں، کمروں کے اندر کے گوشہ نشینوں کو بھی امن چین سے بیٹھنے نہ دیں گی۔ اور ابھی تو صرف احمد نگر کے کوّوں کو خبر ملی ہے اگر فیض عام کا یہ لنگر خانہ اسی طرح جاری رہا تو عجب نہیں تمام دکن کے کوّے قلعہ احمد نگر پر حملہ بول دیں اور آپ کو صائب کا شعر یاد دلائیں کہ:

(۳۲۷)
دور دستاں را بہ احسان یاد کردن ہمت ست
ورنہ ہر نخلے بہ پائے خود ثمر می افگند [۱۶]

ابھی محمود صاحب اس درخواست پر غور کر ہی رہے تھے کہ ایک دوسرا واقعہ ظہور میں آ گیا۔ ایک دن صبح کیا دیکھتے ہیں کہ چھت کی منڈیر پر دو معمّر و متین گدھ بھی تشریف لے آئے ہیں:

پیری سے کمر میں اک ذرا خم
توقیر کی صورت مجسّم [۱۷]

اور گردن اٹھائے صلائے سُفرہ کے منتظر ہیں:

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی [۱۸]

معلوم ہوتا ہے، ان ناخواندہ مہمانوں کی آمد محمود صاحب پر بھی باایں ہمہ جود و سخائے عام گراں گزری۔ کہنے لگے، بزرگوں نے کہا ہے، گدھوں کا آنا منحوس ہوتا ہے۔

بہر حال ان حضرات کے بارے میں بزرگانِ سلف کا کچھ ہی خیال رہا ہو، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی تشریف آوری ہمارے لیے تو بڑی ہی بابرکت ثابت ہوئی۔ کیونکہ ادھر ان کا مبارک قدم آیا، اُدھر محمود صاحب نے ہمیشہ کے لیے اپنا سُفرہ کرم لپیٹنا شروع کر دیا۔ ایک لحاظ سے معاملہ پر یوں بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے کہ ان کی آمد کی آبادی میں اس ہنگامہ ضیافت کی ویرانی پوشیدہ تھی۔ دیکھیے کیا موقعہ سے مومن خاں کا قصیدہ یاد آ گیا:

شیخ جی آپ کے آتے ہی ہوا دیر خراب
قصد کعبہ کا نہ کیجیے گا بہ ایں یمنِ قدوم [19]

خیر، چند دنوں کے بعد بات آئی گزری ہوئی، لیکن کوّوں کے غولوں سے اب نجات کہاں ملنے والی تھی؟ دریوزہ گروں نے کریم کی چوکھٹ پہچان لی۔ وہ روز معیّن وقت پر آتے اور اپنے فراموش کار میزبان کو پُکار پُکار کے دعائیں دیتے:

میاں، خوش رہو ہم دعا کر چلے ! [20]

اسی اثناء میں موسم نے پلٹا کھایا۔ جاڑے نے رختِ سفر باندھنا شروع کیا۔ بہار کی آمد آمد کا غلغلہ برپا ہوا۔ اگر چہ ابھی تک:

اُڑتی سی اک خبر تھی زبانی طیور کی ! [21]

ہم جب گذشتہ سال اگست میں یہاں آئے تھے تو صحن بالکل چٹیل میدان تھا بارش نے سبزہ پیدا کرنے کی بار بار کوششیں کیں، لیکن مٹی نے بہت کم ساتھ دیا۔ اس بے رنگ منظر سے آنکھیں اُکتا گئی تھیں اور سبزہ وگل کے لیے ترسنے لگی تھیں۔ خیال ہوا کہ باغبانی کا مشغلہ کیوں نہ اختیار لیا جائے کہ مشغلہ کا مشغلہ ہوتا ہے اور اصحابِ صورت اور اصحابِ معنی، دونوں کے لیے سامانِ ذوق بہم پہنچاتا ہے۔

بہ بو اصحابِ معنی را بہ رنگ اصحابِ صورت را [22]

(۳۲۸)

جواہر لال جن کا جوہر مستعدی ہمیشہ ایسی تجویزوں کی راہ تکتا رہتا ہے، فوراً کمر بستہ ہو گئے اور اس خرابے میں رنگ و بو کی تعمیر کا سروسامان شروع ہو گیا:

دل کے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی [23]

اس کارخانۂ رنگ و بو کے ہر گوشے میں وجُود کی پیدائش اور جامۂ ہستی کی آرائش

کے لیے دو باتوں کی درستگی ضروری ہوتی ہے۔ پہلی یہ کہ بیج درست ہو

(۳۲۹)
گرجاں بد ہد سنگِ سیہ لعل نہ گردد
باطینتِ اصلی چہ کند، بد گہر افتاد ![24]

دوسری یہ کہ زمین مستعد ہو۔

(۳۳۰)
جوہر طینتِ آدم زخمیر دگرست
تو توقع زگلِ کوزہ گراں می داری ![25]

چنانچہ یہاں بھی سب سے پہلے انہی دو باتوں کی فکر کی گئی۔ بیج کے لیے چیتہ خاں کو کہہ کر پونا لکھوایا گیا کہ وہاں کے بعض باغوں کے ذخیرے بیجوں کی خوبی و صلاحیت کے لیے مشہور ہیں، لیکن زمین کی درستگی کا معاملہ اتنا آسان نہ تھا۔ احاطہ کی پوری زمین دراصل قلعہ کی پرانی عمارتوں کا ملبہ ہے۔ ذرا کھودیئے اور پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے اور چونے اور ریت کا بُرادہ ہر جگہ نکلنے لگتا ہے۔ درمیانی حصّہ تو گویا گنبدوں اور مقبروں کا مدفن ہے۔ نہیں معلوم کن کن فرمانرواؤں اور کیسے کیسے پری چہروں کی ہڈیوں سے اس خرابے کی مٹی گوندھی گئی ہے اور زبان حال سے کہہ رہی ہے۔

(۳۳۱)
قدح بشرطِ ادب گیر، زاں کہ ترکیبش
زکاسۂ سر جمشید و بہمن ست و قباد[26]

ناچار تختوں کی داغ بیل ڈال کر دو دو تین[27] فٹ زمین کھودی گئی اور باہر سے مٹی اور کھاد منگوا کر انہیں بھرا گیا۔ کئی ہفتے اس میں نکل گئے۔ جواہر لال صُبح و شام پھاوڑا اور کدال ہاتھ میں لیے کوہ کندن اور کاہ برآوردن میں لگے رہتے تھے:

(۳۳۲)
آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل،
قانونِ باغبانی صحرا نوشتہ ایم ![28]

اس کے بعد آبپاشی کا مرحلہ پیش آیا اور اس پر غور کیا گیا کہ کیمسٹری کے حقائق سے فن زراعت کے اعمال میں کہاں تک مدد لی جا سکتی ہے۔ اس موضوع پر ارباب فن نے بڑی بڑی نکتہ آفرینیاں کیں، ہمارے قافلہ میں ایک صاحب بنگال کے ہیں۔ جن کی سائنٹفک معلومات ہر موقعہ ہر ضرورت ہو یا نہ ہو اپنی جلوہ طرازیوں کا فیاضانہ اسراف کرتی

رہتی ہے۔ انہوں نے یہ دقیق نکتہ سنایا کہ اگر پھولوں کے پودوں کو حیوانی خون سے سینچا جائے، تو اُن میں نباتاتی درجہ سے بلند ہو کر حیوانی درجہ میں قدم رکھنے کا ولولہ پیدا ہو جائے گا اور ہفتوں کی راہ دنوں میں طے کرنے لگیں گے۔ لیکن آج کل جبکہ جنگ کی وجہ سے آدمیوں کو خون کی ضرورت پیش آ گئی ہے؛ اس کے بینک کھل رہے ہیں، بھلا درختوں کے لیے کون اپنا خون دینے کے لیے طیار ہوگا۔ ایک دوسرے صاحب نے کہا، یہاں قلعہ کے فوجی میس (MESS)[۲۹] میں روز مرغیاں ذبح کی جاتی ہیں۔ ان کا خون جڑوں میں کیوں نہ ڈالا جائے؟ اس پر مجھے ارتجالاً ایک شعر سوجھ گیا۔ حالانکہ شعر کہنے کی عادت مدّتیں ہوئیں بھلا چکا ہوں:

کلیوں میں اہتزاز ہے پروازِ حسن کی،
سینچا تھا کس نے باغ کو مرغی کے خون سے[۳۰]

اگر مرغی کی جگہ بلبل کر دیجیے تو خیال بندوں کی طرز کا اچھا خاصہ شعر ہو جائے گا۔

غنچوں میں اہتزاز ہے پروازِ حسن کی،
سینچا تھا کس نے باغ کو بلبل کے خون سے[۳۰]

شعر سن کر آصف علی[۳۱] صاحب کے شاعرانہ ولولے جاگ اُٹھے۔ انہوں نے اس زمین میں غزل کہنی شروع کر دی، لیکن پھر شکایت کرنے لگے کہ قافیہ تنگ ہے۔ میں نے کہا ویسے بھی یہاں قافیہ تنگ ہی ہو رہا ہے۔

دیکھیے! سمندِ فکر کی وحشت خرامی بار بار جادۂ سخن سے ہٹنا چاہتی ہے اور میں چونک چونک کر باگ کھینچنے لگتا ہوں۔ جو بات کہنی چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ ستمبر اور اکتوبر میں بیج ڈالے گئے۔ دسمبر[۳۲] کے شروع ہوتے ہی سارے میدان کی صورت بدل گئی اور جنوری آئی تو اس عالم میں آئی کہ ہر گوشہ مالن کی جھولی تھا ہر تختۂ گل فروش کا ہاتھ تھا گویا:

کنوں کہ در چمن آمد گل از عدم بوجود
بنفشہ در قدمِ او نہاد سر بسجود

بہ باغ تازہ کن آئینِ دینِ زردشتی
کنوں کہ لالہ برا فروخت آتشِ نمرود

زدستِ شاہد سیمیں عذار عیسیٰ دوم
شارب نوش ورہا کن حدیثِ عاد وثمود [۴۳]

کا عالم طاری ہوگیا۔لیکن آئین زردشتی کے تازہ کرنے کا سامان یہاں کہاں تھا؟ اور شاہد سیمیں عذار کے انفاس عیسوی کی اعجاز فرمائیاں کہاں میسر آسکتی تھیں؟ سواس کی کمی عالم تصور کی جولانیوں سے پوری کی گئی۔زمانہ کی تنگ مایگی جس قدر کوتاہیاں کرتی رہتی ہے، فکرِ فراخ حوصلہ کی آسودگیاں اتنی ہی بڑھتی جاتی ہیں:

(۳۳۴)
چوں دستِ ما بہ دامنِ وصلش نہ می رسد
پائے طلب شکستہ بداماں نشستہ ایم [۴۴]

وقت کی رعایت سے اکثر پھول موسمی تھے۔چالیس سے زیادہ قسمیں گنی جاسکتی تھیں۔سب سے پہلے مارننگ گلوری (Morning Glory) نے اس خرابۂ بے رنگ کو اپنی گل شگفتگیوں سے رنگین کیا۔جب صبح کے وقت آسمان پر سورج کی کرنیں مسکرانے لگتیں تو زمین پر مورننگ گلوری کی کلیاں کھل کھلا کر ہنسنا شروع کردیتیں۔ابو طالب کلیم کو کیا خوب تمثیل سوجھی تھی۔ [۴۵]

(۳۳۵)
شیرینی تبسم ہر غنچہ را مپرس
در شیر صبح خندۂ گلہا شکر گزاشت

کوئی پھول یاقوت کا کٹورا تھا، کوئی نیلم کی پیالی تھی۔کسی پھول پر گنگا جمنی کی قلمکاری کی گئی تھی۔کسی پر چھینٹ کی طرح رنگ رنگ کی چھپائی ہورہی تھی۔بعض پھولوں پر رنگ کی بوندیں اس طرح پڑ گئی تھیں کہ خیال ہوتا تھا، صناع قدرت کے مُوقلم میں رنگ زیادہ بھر گیا ہوگا۔صاف کرنے کے لیے جھٹکنا پڑا اور اس کی چھینٹیں قبائے گل کے دامن پر پڑ گئیں:

تکلف سے بَری ہے حسنِ ذاتی،
قبائے گل میں گُل بوٹا کہاں ہے؟ [۴۶]

"گلوری" کا اردو ترجمہ کیجیے تو بات بنتی نہیں۔"اجلالِ صبح" وغیرہ کہہ سکتے ہیں لیکن ذوق سلیم حرف گیری کرتا ہے۔اس لیے میں مارننگ گلوری کو "بہارِ صبح" کے نام سے پکارتا ہوں:

یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا[۳۷]

"بہارِ صبح" کی بیلیں برآمدے کی چھت تک پہنچا کر پھر اندر کی طرف پھیلا دی گئی تھیں۔ چند دنوں بعد نظر اٹھائی تو ساری چھت پر پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں پھیل گئی تھیں، لیکن لوگ پھولوں کی سیج بچھاتے ہیں اور اپنی کروٹوں سے اسے پامال کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے حصے میں کانٹوں کا فرش آیا تو ہم نے اپنی پھولوں کی سیج بستر سے اٹھا کر چھت پر الٹ دی۔ تلوؤں کے کانٹے چبھتے رہتے ہیں مگر نگاہ ہمیشہ اوپر کی طرف رہتی ہے

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی![۳۸]

سامنے دو تختوں میں زینیا (Zinnia) کے پھول رنگ برنگ کے صافے باندھے نمودار ہو گئے۔ زینیا کے پھول کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ بڑے زینیا کے پھول تھے۔ ان کے صافوں کی لپیٹ اتنی مرتّب اور مدوّر واقع ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا، کسی مشاق دستار بند نے قالب پر چڑھا کر پیچوں کی ایک سلوٹ نکال دی ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی، صافوں کی ضخامت بھی بڑھتی گئی اور پھر تو ایسا معلوم ہونے لگا، جیسے پہرہ داروں کی صفیں رنگ برنگ کی پگڑیاں باندھے کھڑی ہیں اور زندانیانِ قلعہ کی طرح اس باغِ نورستہ کی بھی پاسبانی ہو رہی ہے۔

۳۳۶ کہ بلبلاں ہمہ مستند و باغباں تنہا[۳۹]

ان تختوں کے درمیان گلِ خطمی یعنی ہالی ہاک (Holly Hock) کا حلقہ تھا۔ یہ رنگ برنگ کے وائن گلاس☆ ہاتھوں میں لیے کھڑے تھے۔ ہر شاخ اتنے گلاس سنبھالے ہوئی تھی کہ دل اندیشہ ناک رہتا، کہیں ایسا نہ ہو، ہوا کے جھونکوں کی ٹھوکر لگے اور گلاس گر کر چُور چُور ہو جائیں۔ دانش مشہدی نے غالباً انہی پھولوں کی ایک شاخ دیکھ کر کہا تھا:[۴۰]

دیدہ ام شاخِ گلے بر خویش می پیچم کہ کاش
می توانستم بہ یک دست ایں قدر ساغر گرفت

☆ قدیم ایرانی میں ظروف میں "پیمانہ" اسی قسم کا ظرف تھا، جس طرح کا آج کل "وائن گلاس" ہوتا ہے، لیکن اگر پیمانہ کہیے تو کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ناچار "وائن گلاس" کہنا پڑتا ہے۔

تخیل دراصل امیر خسرو سے ماخوذ ہے جس نے اسی زمین میں کہا تھا:[۱۱]

ہست صحرا چوں کفِ دست و برداز لالہ جام
خوش کفِ دستے کہ چندیں جامِ صہبا برگرفت

گل عظمی کے پھولوں کی تشبیہ کتنی ہی دلکش ہو، مگر یہ ماننا پڑے گا کہ حسنِ نزاکت کی ادائیں یہاں نہیں مل سکتیں۔ گلاس خوشنما ہیں مگر نازک نہیں ہیں۔ پٹونیا (Petunia) نے بھی میدان کے ہر گوشے کو دامن رنگین بنا دیا تھا۔ لیکن اس کی رنگتوں کی سادگی سے تخیل کی پیاس کہاں بجھ سکتی تھی؟ میدان کے وسط میں جھنڈے کے چبوترے کے دونوں طرف اسٹر (Aster) کارن فلاور (Corn Flower) سویٹ پیس (Sweet Peas) کو کنار (Poppy) فلکس (Phlex) کلیو پسیس اور کاسمس (Cosmos) کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ نکل آئے تھے۔ گویا میدان کی کمر میں بوقلموں رنگوں کا ایک پٹکہ بندھ گیا تھا، لیکن وہ بھی چشمِ تماشائی کا سامان دید تھا، اہل بنیش کے لیے ذوق نظر کا سامان نہ تھا، حالانکہ:

بزم میں اہلِ نظر بھی تھے، تماشائی بھی[۱۲]

اِس غرض کے لیے پنکس (Pinks) سلویا (Salvia) اور پینزی (Pansy) وغیرہ کے تختوں کا رُخ کرنا پڑتا تھا جن کی جلوہ فروشیاں ہر دم دیدۂ و دل کو دعوت نظارہ دیتی رہتی تھیں۔ قدرت کے قلم صنعت کی یہ بھی ایک عجیب کرشمہ سنجی ہے کہ پھولوں کے ورق اور تتلیوں کے پروں پر ایک ہی مُوقلم سے مینا کاری کر دی اور ایک ہی رنگ کی دواتیں کام میں لائی گئیں۔ ان پھولوں کے اوراق کا مطالعہ کیجیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے بڑے پھولوں کی کترن سے کچھ کاغذ بچ رہا تھا۔ اسے بھی ضائع نہیں کیا گیا اور قینچی سے تراش تراش کر ننھے ننھے پھولوں کے ورق بنا لیے۔ اگر ایک چیز نازک اور خوبصورت ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں، یہ پھول ہے۔ لیکن اگر خود پھولوں کے لیے کچھ کہنا چاہیں تو انہیں کس چیز سے تشبیہ دیں؟ حقیقت یہ ہے کہ زبان درماندہ کو یہاں یارائے سخن نہیں اور خاموشی کے بغیر چارہ کار نہیں۔ حسن کی جلوہ طرازیاں محویت کا پیام ہوتی ہیں، خامہ فرسائی اور سخن آرائی کا تقاضا نہیں ہوتا۔

(۳۳۹)
ازنگہ چشم تہی گشت و تما شاہ ماندہ ست
درزبانِ حرف نماندہ ست وسخن ہا ماندہ ست [۴۳]

ان پھولوں کو موسمی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی پیدائش اور زندگی صرف موسم ہی تک محدود رہتی ہے۔ ادھر موسم ختم ہوا، ادھر انہوں نے بھی دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔ گویا زندگی کا ایک ہی پیراہن ان کے حصّے میں آیا تھا، وہی کفن کا بھی کام دے گیا۔

(۳۴۰)
ہمچو ماہی غیر داغم پوششِ دیگر نہ بود
تا کفن آمد ہمیں یک جامہ برتن داشتم [۴۴]

میر مبارک اللہ واضح عالمگیری کو یہی خیال پانی کا بلبلہ دیکھ کر ہوا تھا۔ دیکھیے کیا خوب کہہ گیا ہے: [۴۵]

(۳۴۱)
رشک فرمائے دلم نیست بجز عیش حباب
یافت یک پیرہن ہستی و آں ہم کفن ست

بہار میں پھولوں سے درخت لد جاتے ہیں، خزاں میں غائب ہو جاتے ہیں پھر جونہی موسم کا دور پلٹتا ہے دوبارہ آ موجود ہوتے ہیں۔ مگر موسمی پھولوں کے پودوں کا شیوۂ یک رنگی و یک ساختگی دیکھیے کہ جب ایک مرتبہ دنیا کو پیٹھ دکھا دی تو پھر دوبارہ مڑ کے دیکھنا نہیں چاہتے۔ گویا ابو طالب کلیم کا اشارہ انہی کی طرف تھا [۴۶]

(۳۴۲)
وضعِ زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست
رو پس نکرد، ہر کہ ازیں خاکدان گزشت

پھولوں کے جمالیاتی (Aesthetic) منظر سے اگر نظر ہٹایئے تو پھر ایک اور گوشہ سامنے آ جاتا ہے۔ یہ ان کی عجائب آفرینیوں کا گوشہ ہے۔ روحِ نباتی بھی روحِ حیوانی کی طرح قسم قسم کے جسموں میں ابھرتی ہے اور طرح طرح کے افعال و خواص کی نمائش کرتی رہتی ہے۔ یہ کہیں سوئی ہوئی دکھائی دیتی ہے، کہیں کروٹ بدلنے لگتی ہے اور پھر کہیں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ہمارے اس چھوٹے سے گوشہ چمن میں ابھی صرف ایک ہی پھول ایسا ہے جسے اس قسم کے غیر معمولی پھولوں سے شمار کیا جا سکتا ہے۔ یعنی گلوری اور اوس سیو پربا (Gloriosa Superba) اس کی پانچ جڑیں گملوں میں لگائی گئی تھیں، چار

بار آور ہوئیں۔ اب ان کی شاخیں کلیوں سے لدی ہوئی ہیں۔ ان کا پھول پہلے پنجے کی طرح کھلے گا، پھر پیالے کی طرح الٹ جائے گا۔ پھر فانوس کی طرح مدوّر ہونے لگے گا، پھر تھوڑی دیر دم لینے کے لیے رک جائے گا اور پھر دیکھیے تو جن منزلوں سے گزرتا ہوا آیا تھا، انہیں منزلوں سے گزرتا ہوا اُلٹے پاؤں واپس ہونے لگے گا۔ واپسی میں پہلے فانوس کی اٹھی ہوئی شاخیں پھیل کر ایک پیالہ بنائیں گی، پھر اچانک یہ[47] پیالہ اُلٹ جائے گا۔ گویا زندگی کے جامِ واژگوں میں اب کچھ باقی نہ رہا۔

لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی[48]

ہر پھول کی آمد و رفت کی یہ مُسافرت دس سے بارہ دن کے اندر طے ہوا کرتی ہے۔ چھ دن آنے میں لگتے ہیں چھ واپسی میں اور دراصل اس کا آنا بھی جانے ہی کے لیے ہوتا ہے:

ترا آنا نہ تھا ظالم، مگر تمہید جانے کی[49]

رنگت کے اعتبار سے بھی اس کی بوقلمونیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ کلیاں جب نمودار ہوں گی تو ہلکے سبز رنگ کی ہوں گی۔ پھر جوں جوں کھلنے کا وقت آنے لگے گا زردی اُبھرنے لگے گی اور پھر زردی بتدریج سرخی مائل ہونا شروع ہو جائے گی۔ پہلے آدھا سُرخ آدھا زرد رہے گا پھر زردی تیزی کے ساتھ گھٹنے لگے گی اور پورا پھول سُرخ ہو کر مرچ[50] کی پھلیوں کی طرح چمکنے لگے گا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس کی نسل ہندوستان کی طرف منسوب کی جاتی ہے مگر یہاں اس کی شہرت نہیں۔

(۳۳۳) عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ[51]

یہ پھول نباتات کی اس قسم میں داخل ہے جسے اتحاد تناسلی کے لیے خارج کی مداخلت مطلوب ہوتی ہے اور کبھی ہوا کے جھونکوں سے اور کبھی تتلیوں اور مکھیوں کی نشست و برخاست سے فطرت یہ کام لے لیا کرتی ہے۔ اس پھول کا جزوِ رجولیت اس کے انوثیت کے جز سے اس طرح بے تعلق واقع ہوا ہے کہ جب تک خارج کا ہاتھ مادہ تلقیح کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ نہ پہنچا دے، تلقیح کا عمل انجام نہیں پا سکتا۔ جن پھولوں کو یہ خارجی اعانت مل جاتی ہے وہ باردار ہو جاتے ہیں اور اپنا بیج چھوڑ جاتے ہیں۔ جنہیں نہیں ملتی بانجھ

ہو کر بغیر بیج بنائے ختم ہو جاتے ہیں۔ ان پودوں کے لیے تتلیوں کا ایک گروہ بروقت پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ اکثر پھول باردار ہو گئے۔

خیر یہ چمن آرائی کا ذکر تو ایک جملہ معترضہ تھا جو بلاقصد اتنا طولانی ہو گیا۔ اب اصل حکایت کی طرف واپس ہونا چاہیے۔ فروری میں ابر و باد کی آمد و رفت سے موسم کا اُتار چڑھاؤ جاری رہا، مگر جونہی مہینہ ختم ہونے پر آیا، موسم بہار کا پیش خیمہ پہنچ گیا یعنی معتدل ہواؤں کے جھونکے چلنے لگے۔ پھر ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ خراماں خراماں چلتی ہوئی خود بہار بھی آ موجود ہوئی ہے اور جوانانِ چمن نے اس کی خوش آمدید کا جشن منانا شروع کر دیا ہے۔

﴿۳۴۴﴾
نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شُد
عالم پیر دگربار جواں خواہد شد[۵۲]

اُسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک دن دوپہر کے وقت کمرہ میں بیٹھا تھا کہ اچانک کیا سنتا ہوں، بُلبل کی نواؤں کی صدائیں آ رہی ہیں:

﴿۳۴۵﴾
باز نوائے بُلبلاں عشق تو یادمی دہد
ہر کہ زعشق نیست خوش عمر بباد می دہد

باہر نکل کر دیکھا تو خطمی کے شگفتہ پھولوں کے ہجوم میں ایک جوڑا بیٹھا ہے اور گردن اٹھائے نغمہ سنجی کر رہا ہے۔ بے اختیار خواجہ شیراز کی غزل یاد آ گئی۔[۵۳]

﴿۳۴۶﴾
صفیر مرغ برآمد، بطِ شراب کجا ست
فغاں فتاد ز بلبل "نقابِ گل کے درید"

یہ علاقہ اگرچہ سردسیر نہیں ہے، لیکن چونکہ بلند سطح پر واقع ہوا ہے، اس لیے پہاڑی بلبلوں سے خالی نہیں ہے۔ یہ بلبلیں اگرچہ سردسیر ایران کی بُلبلوں کی طرح ہزار داستان نہیں ہوتیں، لیکن رسیلے گلے کی ایک تان بھی کیا کم ہے۔ دوپہر کی چائے کا جو قیلولہ کے بعد پیتا ہوں، آخری فنجان باقی تھا، میں نے اُٹھایا اور اس نغمۂ عندلیب پر خالی کر دیا۔

﴿۳۴۷﴾
تو نیز بادہ بہ چنگ آر و راہِ صحرا گیر
کہ مرغ نغمہ سرا سازِ خوش نوا آورد[۵۴]

دوسرے دن صبح برآمدہ میں بیٹھا تھا کہ بلبل کے ترانے کی آواز پھر اٹھی۔ میں نے

ایک صاحب کو توجہ دلائی کہ سنا بلبل کی آواز آ رہی ہے۔ ایک دوسرے صاحب جو صحن میں ٹہل رہے تھے کچھ دیر کے لیے رک گئے اور کان لگا کر سنتے رہے۔ پھر بولے کہ ہاں قلعہ میں کوئی چھکڑا جا رہا ہے۔ اس کے پہیوں کی آواز آ رہی ہے۔ سبحان اللہ ذوقِ سماع کی دقت امتیاز دیکھیے۔ بلبل کی نواؤں اور چھکڑے کے پہیوں کی ریں ریں میں یہاں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

(۳۴۸)

ہمائے ، گو مفگن سایۂ شرف ہرگز
دراں دیار کہ طوطی کم از زغن باشد [۵۵]

خدارا انصاف کیجیے اگر دو ایسے کان ایک قفس میں بند کر دیئے جائیں کہ ایک میں تو بلبل کی نوائیں بسی ہوں، دوسرے میں چھکڑے کے پہیوں کی ریں ریں، تو آپ اسے کیا کہیں گے؟

(۳۴۹)

نوائے بُلبلت اے گُل! کجا پسند افتد
کہ گوشِ ہوش بہ مرغانِ ہرزہ گوداری [۵۶]

اصل یہ ہے کہ ہر ملک کی فضا طبیعتوں میں ایک خاص طرح کا طبعی ذوق پیدا کر دیا کرتی ہے۔ ہندوستان کا عام طبعی ذوق بلبل کی نواؤں سے آشنا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ملک کی فضاء دوسری طرح کی صداؤں سے بھری ہوئی تھی۔ یہاں کے پرندوں کی شہرت طوطا اور مینا کے پروں سے اُڑی اور دنیا کے عجائب میں سے شمار کی گئی۔

(۳۵۰)

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود [۵۷]

بلبل کی جگہ یہاں کوئل کی صدائیں شاعری کے کام آئیں اور اس میں شک نہیں کہ اس کی کوک درد آشنا دلوں کو غم و الم کی چیخوں سے کم محسوس نہیں ہوتی۔ [۵۸]

بُلبل کی نواؤں کا ذوق تو ایران کے حصے میں آیا ہے۔ موسم بہار میں باغ و صحرا ہی نہیں بلکہ ہر گھر کا پائیں باغ ان کی نواؤں سے گونج اٹھتا ہے۔ بچے جھولے میں ان کی لوریاں سُنتے سُنتے سو جائیں گے اور مائیں اشارہ کر کے بتلائیں گی کہ دیکھ یہ بلبل ہے جو تجھے اپنی کہانی سنا رہی ہے۔ جنوب سے شمال کی طرف سے جس قدر بڑھتے جائیں، یہ افسون فطرت بھی زیادہ عام اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ایک شخص نے شیراز یا

قزوین کے گل کشتوں کے سیر نہ کی ہو، وہ سمجھ نہیں سکتا کہ حافظ کی زبان سے یہ شعر کس عالم میں ٹپکے تھے۔ [۵۹]

بلبل بہ شاخِ سرو بہ گل بانگِ پہلوی
می خواند دوش درسِ مقاماتِ معنوی
یعنے بیا، کہ آتش موسیٰ نمود گل
تا از درخت نکتۂ تحقیق بشنوی
مرغانِ باغ قافیہ سنجند و بذلہ گو
تا خواجہ مے خورد بہ غزل ہائے پہلوی

یہ جو کہا کہ مرغانِ باغ ''قافیہ سنجی'' کرتے ہیں تو یہ مبالغہ نہیں ہے، واقعہ ہے میں نے ایران کے چمن زاروں میں ہزار کو قافیہ سنجی کرتے ہوئے خود سنا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کے لے بدلتی جائے گی اور ہر لے ایک ہی طرح کے اتار پر ختم ہوگی، جو سننے میں ٹھیک ٹھیک شعروں کے قوافی کی طرح متوازن اور متجانس محسوس ہوں گے۔ گھنٹوں سُنتے رہیے ان قافیوں کا تسلسل ٹوٹنے والا نہیں۔ آواز جب ٹوٹے گی، ایک ہی قافیہ پر ٹوٹے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ نوائے بُلبل بہشت بہار کا ملکوتی ترانہ ہے۔ جو ملک اس بہشت سے محروم ہے، وہ اس ترانے کے ذوق سے بھی محروم ہے۔ گرم ملکوں کو اس عالم کی کیا خبر! زمستان کی برف باری اور پت جھڑ کے بعد جب موسم کا رخ پلٹنے لگتا ہے اور بہار اپنی ساری رعنائیوں اور جلوہ فروشیوں کے ساتھ باغ وصحرا پر چھا جاتی ہے، تو اس وقت برف کی بے رحمیوں سے ٹھٹھری ہوئی دنیا یکا یک محسوس کرنے لگتی ہے کہ اب موت کی افسردگیوں کی جگہ زندگی کی سرگرمیوں کی ایک نئی دنیا نمودار ہوگئی۔ انسان اپنے جسم کے اندر دیکھتا ہے تو زندگی کا تازہ خون ایک ایک رگ کے اندر ابلتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنے سے باہر دیکھتا ہے تو فضاء کا ایک ایک ذرہ عیش ونشاط ہستی کی سرمستیوں میں رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آسمان وزمین کی ہر چیز جو کل تک محرومیوں کی سوگواری اور افسردگیوں کی جانکاہی تھی، آج آنکھیں کھولیے تو حسن کی عشوہ طرازی ہے، کان لگایئے تو نغمہ کی جاں نوازی ہے۔ سونگھیے تو سرتا سر بو کی عطر بیزی ہے۔

صبا بہ تہنیت پیرِ مے فروش آمد
کو موسمِ طرب وعیش و نائے و نوش آمد
ہوا مسیح نفس گشت و بادنافہ کشا ۳۵۲
درخت سبز شد و مرغ در خروش آمد
تنور لالہ چناں بر فروخت باد بہار
کہ غنچہ غرق عرق گشت وگل بہ جوش آمد[۶۰]

عین جوش وسرمستی کی ان عالمگیریوں میں بلبل کے مستانہ ترانوں کی گت شروع ہو جاتی ہے اور یہ نغمہ سرائے بہشتی اس محویت اور خود رفتگی کے ساتھ گانے لگتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے، خودساز فطرت کے تاروں سے نغمے نکلنے لگے۔ اس وقت اِنسانی احساسات میں جو تہلکہ[۶۱] مچنے لگتا ہے، ممکن نہیں کہ حرف و صوت سے ان کی تعبیر آشنا ہو سکے۔ شاعر پہلے مضطرب ہوگا کہ اس عالم کی تصویر کھینچ دے۔ جب نہیں کھینچ سکے گا تو پھر خود اس کی تصویر بن جائے گا۔ وہ رنگ، بواور نغمے کے اس سمندر کو پہلے کنارہ پر کھڑے ہو کر دیکھے گا، پھر کود پڑے گا اور خود اپنی ہستی کو بھی اسی کی ایک موج بنا دے گا۔

بیا تاگل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نَو دراندازیم ۳۵۳
چو دردست ست رودے خوش، بزن مطرب سرودے خوش
کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سراندازیم[۶۲]

ہندوستان میں صرف کشمیر ایک ایسی جگہ ہے جہاں اس عالم کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ اسی لیے فیضی کو کہنا پڑا تھا:

ہزار قافلہ شوق می کشد شب گیر
کہ بار عیش گشاید بخطۂ کشمیر[۶۳]

لیکن افسوس ہے لوگوں کو پھل کھانے کا شوق ہوا، عالم بہار کی جنّت نگاہیوں کا شوق نہ ہوا۔ کشمیر جائیں گے بھی تو بہار کے موسم میں نہیں، بارش کے بعد پھلوں کے موسم میں، معلوم نہیں دنیا اپنی ہر بات میں اتنی شکم پرست کیوں ہوگئی ہے حالانکہ انسان کو معدہ کے

ساتھ دل ودماغ بھی دیا گیا تھا۔

ہندوستان کے پہاڑوں میں پہاڑی بُلبل کا ترنم نینی تال اور کانگڑہ میں زیادہ سُنا جاسکتا ہے۔ مسوری اور شملہ کی چٹانی فضا اس کے لیے کافی کشش پیدا نہیں کرسکتی تھی۔

ہندوستان میں عام طور پر چار قسم کی بلبلیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ خوش نوا قسم وہ ہے جس کے چہرے کے دونوں طرف سفید بوٹے ہوتے ہیں اور اس لیے آج کل نیچرل ہسٹری کی تقسیم میں اسے وہاہٹ چیکڈ (White Cheeked) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ شاما کو اگرچہ عام طور پر بلبل نہیں سمجھا جاتا لیکن اسے بھی میدانی سرزمینوں کا بلبل ہی تصور کرنا چاہیے۔ مغربی یوپی اور پنجاب میں اس کی متعدد قسمیں پائی جاتی ہیں۔

اس وقت تک بُلبل کے تین جوڑے یہاں دکھائی دیے ہیں۔ تینوں معمولی پہاڑی قسم کے ہیں، جنھیں انگریزی میں (White Whiskered) کے نام سے پکارتے ہیں۔ ایک نے تو پھول کی ایک بیل میں آشیانہ بھی بنالیا ہے۔ دوپہر کو پہلے بالکل خاموشی رہے گی، پھر جونہی میں کچھ دیر لیٹنے کے بعد اٹھوں گا اور لکھنے کے لیے بیٹھوں گا معاً ان کی نوائیں شروع ہو جائیں گی۔ گویا انہیں معلوم ہوگیا ہے کہ یہی وقت ہے، جب ایک ہم صفیر اپنے دل وجگر کے زخموں کی پٹیاں کھولتا ہے۔ اس لیے نالہ وفریاد کے پیہم چرچے لگانا شروع کردیں۔ میرا وہی حال ہوا جو عربی کے ایک شاعر کا ہوا تھا:

وما شجانی انی کنت نائماً
اعلل من بردٍ بطیب التنسّم

الیٰ ان رعت ورقاء من غصس ایکة
تفرد مبکاھا بحسن الترنم
فلو قبل مُبکاھا بکیت صبابة ش
بُسعدیٰ شفیت النفس قبل التندّم
ولٰکن بکت قبلی ، فھیّج لی البکاء
بکاھا فقلت الفضل للمتقدم

چڑیا چڑے کی کہانی

قلعہ احمد نگر

۱۷/ مارچ ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

زندگی میں بہت سی کہانیاں بنائیں۔ خود زندگی ایسی گزری جیسے ایک کہانی ہو:

ہے آج جو سرگزشت اپنی
کل اس کی کہانیاں بنیں گی[1]

آیئے آج آپ کو چڑیا چڑے کی کہانی سناؤں:

(۳۵۶) دگرہا شنیدستی، ایں ہم شنو[2]

یہاں کمرے جو ہمیں رہنے کو ملے ہیں، پچھلی صدی کی تعمیرات کا نمونہ ہیں۔ چھت لکڑی کے شہتیروں کی ہے اور شہتیروں کے سہارے کے لیے محرابیں ڈال دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جا بجا گھونسلہ بنانے کے قدرتی گوشے نکل آئے اور گوریاؤں کی بستیاں آباد ہو گئیں۔ دن بھر ان کا ہنگامۂ تگ و دو گرم رہتا ہے۔ کلکتہ میں بالی گنج کا[3] علاقہ چونکہ کھلا اور درختوں سے بھرا ہے اس لیے وہاں بھی مکانوں کے برآمدوں اور کارنسوں پر چڑیوں کے غول ہمیشہ حملہ کرتے رہتے ہیں۔ یہاں کی ویرانی دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آ گئی:

اُگ رہا ہے درو دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں گھر میں بہار آئی ہے![4]

گزشتہ سال جب اگست میں یہاں ہم آئے تھے، تو ان چڑیوں کی آشیاں سازیوں نے بہت پریشان کر دیا تھا۔ کمرہ کے مشرقی گوشہ میں منہ دھونے کی ٹیبل[5] لگی ہے۔ ٹھیک اس کے اوپر نہیں معلوم کب سے ایک پُرانا گھونسلہ تعمیر پا چکا تھا۔ دن بھر میدان سے تنکے چن چن کر لاتیں اور گھونسلے میں بچھانا چاہتیں۔ وہ ٹیبل پر گر کے اس کے کوڑے کرکٹ سے اَٹ دیتے۔ اِدھر پانی کا جگ[6] بھروا کے رکھا، اُدھر تنکوں کی بارش شروع ہو گئی۔ پچھم کی طرف چارپائی دیوار سے لگی تھی، اس کے اوپر نئی تعمیروں کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ ان نئی تعمیروں کا ہنگامہ اور زیادہ عاجز کر دینے والا تھا۔ ان چڑیوں کو ذرا سی تو چونچ ملی ہے اور مٹھی بھر کا بھی بدن نہیں، لیکن طلب وسعی کا جوش اس بلا کا پایا ہے کہ چند منٹوں کے اندر بالشت بھر کلفات کھود کے صاف کر دیں گی۔ حکیم ارشمیدس[7] (Archimedes) کا مقولہ مشہور ہے۔

Dos Nol Pau Sto Kai Ten Gen Kineso

''مجھے فضا میں کھڑے ہونے کی جگہ دے دو، میں کرہ ارضی کو اس کی جگہ سے ہٹا دوں گا۔،، اس دعوے کی تصدیق ان چڑیوں کی سرگرمیاں دیکھ کر ہو جاتی ہے۔ پہلے دیوار پر چونچ مار مار کے اتنی جگہ بنالیں گی کہ پنجے ٹیکنے کا سہارا نکل آئے۔ پھر اس پر پنجے جما کر چونچ کا پھاوڑا چلانا شروع کر دیں گی اور اس روز سے چلائیں گی کہ سارا جسم سکڑ سکڑ کر کانپنے لگے گا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دیکھیے تو کئی انچ کلفات اُڑ چکی ہو گی۔ مکان چونکہ پُرانا ہے، اس لیے نہیں معلوم، کتنی مرتبہ چونے اور ریت کی تہیں دیوار پر چڑھتی رہی ہیں۔ اب مل کر تعمیری مسالہ کا ایک موٹا سا دَل بن گیا ہے۔ ٹوٹتا ہے تو سارے کمرے میں گرد کا دھواں پھیل جاتا ہے اور کپڑوں کو دیکھیے تو غبار کی تہیں جم گئی ہیں۔

اس مصیبت کا علاج بہت سہل تھا۔ یعنی مکان کی از سر نو مرمّت کر دی جائے اور تمام گھونسلے بند کر دیئے جائیں؛ لیکن مرمّت بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ معمار بُلائے جائیں اور یہاں باہر کا کوئی آدمی اندر قدم رکھ نہیں سکتا۔ یہاں ہمارے آتے ہی پانی کے نل بگڑ گئے تھے۔ ایک معمولی مستری کا کام تھا، لیکن جب تک ایک انگریز فوجی انجنیئر کمانڈنگ آفیسر پروانہ راہداری لے کر نہیں آیا، ان کی مرّمت نہ ہو سکی۔

چند دنوں تک تو میں نے صبر کیا، لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا اور

فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں۔

من و گرز و میدان و افراسیاب [8]

یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آ گئی ہے۔ میں نے اٹھائی اور اعلانِ جنگ کر دیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفانِ سقف و محراب کا مقابلہ ممکن نہیں۔ حیران ہو کر کبھی چھتری کی نارسائی دیکھتا، کبھی حریفوں کی بلند آشیانی۔ بے اختیار حافظ کا شعر دیا آ گیا: [9]

۳۵۸

خیالِ قد بلند تو می کند دلِ من
تو دستِ کوتہ من بین و آستین دراز

اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی۔ برآمدہ میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا۔ دوڑتا ہوا گیا اور اسے اٹھا لایا۔ اب کچھ نہ پوچھیے کہ میدان کارزار میں کس زور کا رن پڑا۔ کمرہ میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اٹھائے دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ فردوسی اور نظامی کے رجز بے اختیار زبان سے نکل رہے تھے۔

۳۵۹

بہ خنجر زمیں را میستاں کنم،
بہ نیزہ ہوا را نیستاں کنم [10]

آخر میدان اپنے ہی ہاتھ رہا اور تھوڑی دیر کے بعد کمرہ ان حریفانِ سقف و محراب سے بالکل صاف تھا:

بہ یک تاختن تا کجا تاختم
چہ گردن کشاں را سر انداختم

اب میں نے چھت کے تمام گوشوں پر فتح مندانہ نظر ڈالی؛ اور مطمئن ہو کر لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ لیکن ابھی پندرہ منٹ بھی پورے نہیں گزرے ہوں گے کہ کیا سنتا ہوں، حریفوں کی رجز خوانیوں اور ہوا پیمائیوں کی آوازیں پھر اٹھ رہی ہیں۔ سر اٹھا کے جو دیکھا تو چھت کا ہر گوشہ ان کے قبضہ میں تھا۔ میں فوراً اٹھا اور بانس لا کر پھر معرکہ کارزار گرم کر دیا:

۳۶۱

برآرم دیار از ہمہ لشکرش
بہ آتشِ بسوزم ہمہ کشورش [11]

اِس مرتبہ حریفوں نے بڑی پامردی دکھائی۔ ایک گوشہ چھوڑنے پر مجبور ہوتے تو دوسرے میں ڈٹ جاتے؛ لیکن بالآخر میدان کو پیٹھ دکھانی ہی پڑی۔ کمرے سے بھاگ کر برآمدہ میں آئے اور وہاں اپنا لاؤ لشکر نئے سرے سے جمانے لگے۔ میں نے وہاں بھی تعاقب کیا اور اس وقت تک ہتھیار ہاتھ سے نہیں رکھا کہ سرحد سے بہت دور تک میدان صاف نہیں ہو گیا تھا۔

اب دشمن کی فوج تِتر بِتر ہو گئی تھی مگر یہ اندیشہ باقی تھا کہ کہیں پھر اکٹھی ہو کر میدان کا رخ نہ کرے۔ تجربے سے معلوم ہوا تھا کہ بانس کے نیزہ کی ہیبت دشمنوں پر خُوب چھا گئی ہے۔ جس طرف رخ کرتا تھا، اسے دیکھتے ہی کلمۂ فرار پڑھتے تھے۔ اس لیے فیصلہ کیا کہ ابھی کچھ عرصہ تک اسے کمرہ ہی میں رہنے دیا جائے۔ اگر کسی اِکا دُکا حریف نے رخ کرنے کی جرات بھی کی تو یہ سر بفلک نیزہ دیکھ کر الٹے پاؤں بھاگنے پر مجبور ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ سب سے پُرانا گھونسلا منہ دھونے کی ٹیبل کے اوپر تھا۔ بانس اس طرح وہاں کھڑا کر دیا گیا کہ اس کا سرا ٹھیک گھونسلے کے دروازے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اب گو مستقبل اندیشوں سے خالی نہ تھا، تاہم طبیعت مطمئن تھی کہ اپنی طرف سے سروسامان جنگ میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ میؔر کا یہ شعر زبانوں پر چڑھ کر بہت پامال ہو چکا ہے، تاہم موقعہ کا تقاضا ٹالا بھی نہیں جا سکتا:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا[12]

اب گیارہ بج رہے تھے۔ میں کھانے کے لیے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو کمرہ میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک کے رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سارا کمرہ[13] پھر حریف کے قبضہ میں ہے اور اس اطمینان و فراغت سے اپنے کاموں میں مشغول ہیں، جیسے کوئی حادثہ پیش آیا ہی نہیں[14]۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جس ہتھیار کی ہیبت پر اس درجہ بھروسہ کیا گیا تھا، وہی حریفوں کی کاجوئیوں کا ایک نیا آلہ ثابت ہوا۔ بانس کا سرا جو گھونسلے سے بالکل لگا ہوا تھا، گھونسلے میں جانے کے لیے اب دہلیز کا کام دینے لگا۔ تنکے چن چن کر لاتے ہیں اور اس نو تعمیر دہلیز پر بیٹھ کر بہ اطمینان تمام گھونسلے میں بچھاتے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی چوں چوں بھی

کرتے جاتے ہیں۔ عجب نہیں یہ مصرعہ گنگنا رہے ہوں کہ:

(۳۶۲) عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد [15]

اپنی وہی فتح مندیوں کا یہ حسرت انگیز انجام دیکھ کر بے اختیار ہمت نے جواب دے دیا۔ صاف نظر آ گیا کہ چند لمحوں کے لیے حریف کو عاجز کر دینا تو آسان ہے مگر ان کے جوشِ استقامت کا مقابلہ کرنا آسان نہیں؛ اور اب اس میدان میں ہار مان لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا:

(۳۶۳) بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است [16]

اب یہ فکر ہوئی کہ ایسی رسم و راہ اختیار کرنی چاہیے کہ ان ناخواندہ مہمانوں کے ساتھ ایک گھر میں گزارہ ہو سکے۔ سب سے پہلے چارپائی کا معاملہ سامنے آیا۔ یہ بالکل نئی تعمیرات کی زد میں تھی۔ پُرانی عمارت کے گرنے اور نئی تعمیروں کے سروسامان سے جس قدر گرد و غبار اور کوڑا کرکٹ نکلتا، سب کا سب اسی پر گرتا۔ اس لیے اسے دیوار سے اتنا ہٹا دیا گیا کہ براہ راست زد میں نہ رہے۔ اس تبدیلی سے کمرہ کی شکل ضرور بگڑ گئی لیکن اب اس کا علاج ہی کیا تھا؟ جب خود اپنا گھر ہی اپنے قبضہ میں نہ رہا تو پھر شکل و ترتیب کی آرائشوں کی کسے فکر ہو سکتی تھی؟ البتہ منہ دھونے کے ٹیبل کا معاملہ اتنا آسان نہ تھا۔ وہ جس گوشے میں رکھا گیا تھا، صرف وہی جگہ اِس کے لیے نکل سکتی تھی، ذرا بھی اِدھر اُدھر کی گنجائش نہ تھی۔ مجبوراً یہ انتظام کرنا پڑا کہ بازار سے بہت سے جھاڑن منگوا کر رکھ لیے اور ٹیبل کی ہر چیز پر ایک ایک جھاڑن ڈال دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد انہیں اٹھا کر جھاڑ دیتا اور پھر ڈال دیتا۔ ایک جھاڑن اس غرض سے رکھنا پڑا کہ ٹیبل کی سطح کی صفائی برابر ہوتی رہے۔ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ فرش کی صفائی کا تھا۔ لیکن اسے بھی کسی نہ کسی طرح حل کیا گیا۔ یہ بات طے کر لی گئی کہ صبح کی معمولی صفائی کے علاوہ بھی کمرے میں بار بار جھاڑو پھر جانا چاہیے اور ایک نیا جھاڑو منگوا کر الماری کی آڑ میں چھپا دیا۔ کبھی دن میں دو مرتبہ، کبھی تین مرتبہ کبھی اس سے بھی زیادہ اس سے کام لینے کی ضرورت پیش آتی۔ یہاں ہر دو کمرے کے پیچھے ایک قیدی صفائی کے لیے دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر وقت جھاڑو لیے کھڑا نہیں رہ سکتا، اور اگر رہ بھی سکتا تو اس پر اتنا بوجھ ڈالنا انصاف کے خلاف تھا۔ اِس لیے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا کہ خود ہی

جھاڑو اٹھالیا اور ہم سایوں کی نظریں بچا کے جلد جلد دو چار ہاتھ مار دیئے۔ دیکھیے ان ناخواندہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں کناسی تک کرنی پڑی:

(۳۶۴) عشق ازیں بسیار کرد ست و کند [17]

ایک دن خیال ہوا کہ جب صلح ہوگئی تو چاہیے کہ پوری طرح صلح ہو۔ یہ ٹھیک نہیں کہ رہیں ایک ہی گھر میں اور رہیں بیگانوں کی طرح۔ میں نے باورچی خانے سے تھوڑا سا کچا چاول منگوایا اور جس صوفے پر بیٹھا کرتا ہوں، اس کے سامنے کی دری پر چند دانے چھٹک دیئے۔ پھر اس طرح سنبھل کے بیٹھ گیا، جیسے ایک شکاری دام بچھا کے بیٹھ جاتا ہے، دیکھیے، عرفی کا شعر صورت حال پر کیسا چسپاں ہوا ہے [18]:

(۳۶۵)
فتادم دام بر کنجشک و شادم ، یادِ آں ہمت
کہ گر سیمرغ می آمد بدام، آزاد می کردم!

کچھ دیر تک تو مہمانوں کو توجہ نہیں ہوئی؛ اگر ہوئی بھی تو ایک غلط انداز نظر سے معاملہ آگے نہیں بڑھا۔ لیکن پھر صاف نظر آ گیا تو کہ معشوقان ستم پیشہ کے تغافل کی طرح یہ تغافل بھی نظر بازی کا ایک پردہ ہے۔ ورنہ نیلے رنگ کی دری پر سفید سفید ابھرے ہوئے دانوں کی کشش ایسی نہیں کہ کام نہ کر جائے۔

(۳۶۶)
حورو جنتِ جلوہ بر زاہد دہد در راہِ دوست
اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را [19]

پہلے ایک چڑیا آئی اور اِدھر اُدھر کُودنے لگی۔ بظاہر چہچہانے میں مشغول تھی مگر نظر دانوں پر تھی۔ وحشی یزدی کیا خوب کہہ گیا ہے:

(۳۶۷)
چہ لطف ہا کہ دریں شیوۂ نہانی نیست
عنایتے کہ تو داری بمن ، بیانی نیست [20]

پھر دوسری آئی اور پہلی کے ساتھ مل کر دری کا طواف کرنے لگی۔ پھر تیسری اور چوتھی بھی پہنچ گئی اور کبھی دانوں پر نظر پڑتی، کبھی دانہ ڈالنے والے پر۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے آپس میں کچھ مشورہ ہو رہا ہے؛ اور کبھی معلوم ہوتا ہر فرد غور و فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ گوریا جب تفتیش اور تفحص کی نگاہوں سے دیکھتی ہے تو اس کے چہرے کا

کچھ عجیب سنجیدہ انداز ہو جاتا ہے۔ پہلے گردن اٹھا اٹھا کے سامنے کی طرف دیکھے گی، پھر گردن موڑ کے داہنے بائیں دیکھنے لگے گی۔ پھر کبھی گردن کو مروڑ دے کر اُوپر کی طرف نظر اٹھائے گی اور چہرے پر تفحص اور استفہام کا کچھ انداز چھا جائے گا، جیسے ایک آدمی ہر طرف متعجبانہ نگاہ ڈال ڈال کر اپنے آپ سے کہہ رہا ہو کہ آخر یہ معاملہ ہے کیا؟ اور ہو کیا رہا ہے؟ ایسی متفحص نگاہیں اس وقت بھی ہر چہرہ پر ابھر رہی تھیں:

(۳۶۸)
پایم بہ پیش از سرایں کو نمی رَود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہِ کیست [۲۱]

پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ قدم بڑھنے لگے۔ لیکن براہِ راست دانوں کی طرف نہیں۔ آڑے ترچھے ہو کر بڑھتے اور کترا کر نکل جاتے۔ گویا یہ بات دکھائی جا رہی تھی کہ خدانخواستہ ہم دانوں کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں۔ دروغ راست مانند کی یہ نمائش دیکھ کر بے اختیار ظہوری کا شعر یاد آ گیا۔

(۳۶۹)
بگو حدیثِ وفا، از تو باور است، بگو
شوم فدائے دروغے کہ راست مانند ست [۲۲]

آپ جانتے ہیں کہ صید سے کہیں زیادہ صیّاد کو اپنی نگرانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ جونہی ان کا رخ دانوں کی طرف پھرا، میں نے دم سادھ لیا، نگاہیں دوسری طرف کرلیں اور سارا جسم پتھر کی طرح بے حس وحرکت بنالیا۔ گویا آدمی کی جگہ پتھر کی ایک مورتی دھری ہے۔ کیونکہ جانتا تھا، اگر نگاہ شوق نے مضطرب ہو کر ذرا بھی جلد بازی کی، تو شکار دام کے پاس آتے آتے نکل جائے گا۔ یہ گویا نازِ حسن اور نیازِ عشق کے معاملات کا پہلا مرحلہ تھا:

(۳۷۰)
نہاں از و بہ رُخش داشتم تماشائے
نظر بہ جانبِ ما کرد و شرمسار شدم [۲۳]

خیر خدا خدا کر کے اس عشوۂ تغافل نما کے ابتدائی مرحلے طے ہوئے اور ایک بت طنّاز نے صاف صاف دانوں کی طرف رخ کیا۔ مگر یہ رخ بھی کیا قیامت کا رخ تھا۔ ہزار تغافل اس کے جلو میں چل رہے تھے۔ میں بے حس وحرکت بیٹھا دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:

(۳۷۱)
بہ ہر کجا ناز سر بر آرد، نیاز ہم پائے کم ندارد

تو خرامے وصد تغافل، من ونگاہے وصد تمنا [۲۴]

ایک قدم آگے بڑھتا تھا تو دو قدم پیچھے ہٹتے تھے۔ میں جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ التفات و تغافل کا یہ ملا جلا انداز بھی کیا خوب انداز ہے۔ کاش تھوڑی سی تبدیلی اس میں کی جا سکتی۔ دو قدم آگے بڑھتے ایک قدم پیچھے ہٹتا۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے:

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا [۲۵]

(۳۷۲)

التفات و تغافل کی ان عشوہ گریوں کی ابھی جلوہ فروشی ہو ہی رہی تھی کہ ناگہاں ایک تنومند چڑے نے جو اپنی قلندرانہ بے دماغی اور رندانہ جراتوں کے لحاظ سے پورے حلقہ میں ممتاز تھا، سلسلہ کار کی درازی سے اکتا کر بے باکانہ قدم اٹھا دیا اور زبان حال سے یہ نعرۂ مستانہ لگاتا ہوا، بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا کہ:

زدیم بر صفِ رنداں دہرچہ بادا باد [۲۶]

(۳۷۳)

اس ایک قدم کا اٹھنا تھا کہ معلوم ہوا جیسے اچانک تمام رکے ہوئے قدموں کے بندھن کھل پڑے۔ اب نہ کسی قدم میں جھجک تھی، نہ کسی نگاہ میں تذبذب۔ مجمع کا مجمع بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا اور اگر انگریزی محاورہ کی تعبیر مستعار لی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ حجاب و تامل کی ساری برف اچانک ٹوٹ گئی۔ یاں یوں کہیے کہ پگھل گئی۔ غور کیجیے، تو اس کارگاہِ عمل کے ہر گوشہ کی قدم رانیاں ہمیشہ اسی ایک قدم کے انتظار میں رہا کرتی ہیں۔ جب تک یہ نہیں اٹھتا، سارے قدم زمین میں گڑے رہتے ہیں۔ یہ اٹھا اور گویا ساری دنیا اچانک اُٹھ گئی:

نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد [۲۷]

(۳۷۴)

اس بزمِ سود و زیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لیے نہیں بھرا گیا۔ وہ ہمیشہ انہی کے حصے میں آیا جو خود بڑھ کر اٹھا لینے کی جرأت رکھتے تھے۔ شاد عظیم آبادی مرحوم نے ایک شعر کیا خوب کہا تھا: [۲۸]

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے

اس چڑے کا یہ بے باکانہ اقدام کچھ ایسا دل پسند واقع ہوا کہ اسی وقت دل نے ٹھان لی، اس مرد کار سے رسم وراہ بڑھانی چاہیے۔ میں نے اس کا نام قلندر رکھ دیا۔ کیونکہ بے دماغی اور وارستگی کی سرگرانیوں کے ساتھ ایک خاص طرح کا بانکپن بھی ملا ہوا تھا اور اس کی وضع قلندارنہ کو آب وتاب دے رہا تھا:

رہے ایک بانکپن بھی بے دماغی میں تو زیبا ہے
بڑھا دو چین ابرو پر ادائے کج کلاہی کو

دو تین دن تک اسی طرح ان کی خاطر تواضع ہوتی رہی۔ دن میں دو تین مرتبہ دانے دری پر ڈال دیتا۔ ایک ایک کر کے آتے اور ایک ایک دانہ چن لیتے۔ کبھی دانہ ڈالنے میں دیر ہو جاتی تو قلندر آ کر چوں چوں کرنا شروع کر دیتا کہ وقت معہود گزر رہا ہے۔ اِس صورت حال نے اب اطمینان دلایا دیا تھا کہ پردہ حجاب اُٹھ چکا۔ وہ وقت دور نہیں کہ رہی سہی جھجک بھی نکل جائے:

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں ![29]

چند دنوں کے بعد میں نے اس معاملہ کا دوسرا اقدم اٹھایا۔ سگرٹ کے خالی ٹین کا ایک ڈھکنا لیا۔ اس میں چاول کے دانے ڈالے اور ڈھکنا دری کے کنارے رکھ دیا۔ فوراً مہمانوں کی نظر پڑی۔ کوئی ڈھکنے کے پاس آ کر منہ مارنے لگا، کوئی ڈھکنے کے کنارے پر چڑھ کر زیادہ جمعیت خاطر کے ساتھ چگنے میں مشغول ہو گیا۔ آپس میں رقیبانہ ردّ وکد بھی ہوتی رہی۔ جب دیکھا کہ اس طریق ضیافت سے طبیعتیں آشنا ہو گئی ہیں تو دوسرے دن ڈھکنا دری کے کنارے سے کچھ ہٹا کر رکھا۔ تیسرے دن اِور زیادہ ہٹا دیا اور بالکل اپنے سامنے رکھ دیا۔ گویا اس طرح بتدریج بُعد سے قرب کی طرف معاملہ بڑھ رہا تھا۔ دیکھیے بُعد و قُرب کے معاملہ نے عالیہ بنت المھدی [30] کا مطلع یاد دلا دیا:

وَحبّب ، فِانّ الحبّ دِاعیة الحبّ
وکم من بعَید الدار مستوجب القربُ

اتنا قرب دیکھ کر پہلے تو مہمانوں کو کچھ تامل ہوا۔ دری کے پاس آ گئے مگر قدموں میں جھجک تھی اور نگاہوں میں تذبذب بول رہا تھا۔ لیکن اتنے میں قلندر اپنے قلندرانہ نعرے

لگاتا ہوا آ پہنچا اور اس کی رندانہ جراتیں دیکھ کر سب کی جھجک دور ہو گئی۔ گویا اس راہ میں سب قلندر ہی کے پیرو ہوئے۔ جہاں اس کا قدم اُٹھا، سب کے اٹھ گئے۔ وہ دانوں پر چونچ مارتا ، پھر سر اٹھا کے سینہ تان کے زبانِ حال سے مترنّم ہوتا:

﴿۳۷۶﴾

وما الدهر الّا من رواة قصائدی
اِذا قلت شعرًا، اَصْبَحَ الدهر منشد [۳۱]

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو پھر ایک قدم اور اٹھایا گیا اور دانوں کا برتن دری سے اٹھا کے تپائی پر رکھ دیا۔ یہ تپائی میرے بائیں جانب صوفے لگی رہتی ہے اور پوری طرح میرے ہاتھ کی زد میں ہے۔ اس تبدیلی سے خوگر ہونے میں کچھ دیر لگی، بار بار آتے اور تپائی کا چکر لگا کے چلے جاتے۔ بالآخر یہاں بھی قلندر ہی کو پہلا قدم بڑھانا پڑا اور اس کا بڑھنا تھا کہ یہ منزل بھی پچھلی منزلوں کی طرح سب پر کُھل گئی۔ اب تپائی کبھی تو ان کی مجلس آرائیوں کا ایوانِ طرب بنتی اور کبھی باہمی معرکہ آرائیوں کا اکھاڑا۔

جب اِس قدر نزدیک آ جانے کے خوگر ہو گئے تو میں نے خیال کیا، اب معاملہ کچھ اور آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ ایک دن صبح یہ کیا کہ چاول کا برتن صوفے پر ٹھیک اپنی بغل میں رکھ دیا اور پھر لکھنے میں اس طرح مشغول ہو گیا گویا اس معاملہ سے کوئی سروکار نہیں:

﴿۳۷۷﴾

دل و جانم بتو مشغول ونظر بر چپ وراست
تانہ دانند رقیباں کہ تو منظورِ منی ! [۳۲]

تھوڑی دیر کے بعد کیا سنتا ہوں کہ زور زور سے چونچ مارنے کی آواز آ رہی ہے۔ کنکھیوں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہمارا پُرانا دوست قلندر پہنچ گیا ہے اور بے تکان چونچ مار رہا ہے۔ ڈھکنا چونکہ بالکل پاس دھرا تھا، اس لیے اس کی دم میرے گھٹنے کو چھو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے یارانِ تیز گام بھی پہنچ گئے؛ اور پھر تو یہ حال ہو گیا کہ ہر وقت دو تین دوستوں کا حلقہ بے تکلف میری [۳۳] بغل میں اُچھل کود کرتا رہتا۔ کبھی کوئی صوفے کی پشت پر چڑھ جاتا، کبھی کوئی جست لگا کر کتابوں پر کھڑا ہو جاتا، کبھی نیچے اُتر آتا اور چوں چوں کر کے واپس آ جاتا۔ بے تکلفی کی اس اچھل کود میں کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میرے کاندھے کو درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ سمجھ کر اپنی جست وخیز کا نشانہ بنانا چاہا، لیکن پھر چونک کر

پلٹ گئے، یا پنجوں سے اسے چھوا اور اُوپر ہی اُوپر نکل گئے۔ گویا ابھی معاملہ اس منزل سے آگے نہیں بڑھا تھا، جس کا نقشہ وحشی یزدی نے کھینچا ہے:

ہنوز عاشقی و دلربائیے نہ شدہ است
ہنوز زوری و مرد آزمائیے نہ شدہ است
ہمیں تواضع عام است حسن رابا عشق
میانِ ناز و نیاز آشنائیے نہ شدہ است [۳۴]

بہر حال رفتہ رفتہ ان آہوانِ ہوائی کو یقین ہو گیا کہ یہ صورت ہمیشہ صوفے پر دکھائی دیتی ہے، آدمی ہونے پر بھی آدمیوں کی طرح خطرناک نہیں ہے۔ دیکھیے محبت کا افسوں جو انسانوں کو رام نہیں کر سکتا، وحشی پرندوں کو رام کر لیتا ہے:

درسِ وفا اگر بُوَد زمزمۂ محبتے،
جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را [۳۵]

بارہا ایسا ہوا کہ میں اپنے خیالات میں محو، لکھنے میں مشغول ہوں؛ اتنے میں کوئی دلنشین بات نوکِ قلم پر آگئی یا عبارت کی مناسبت نے اچانک کوئی پُر کیف شعر یاد دلا دیا، اور بے اختیار اس کی کیفیت کی خود رفتگی میں میرا سر و شانہ ہلنے لگا، یا منہ سے "ہا" نکل گیا، اور یکایک زور سے پروں کے اڑنے کی ایک پھڑسی آواز سنائی دی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ ان یارانِ بے تکلف کا ایک طائفہ میری بغل میں بیٹھا بے تامّل اپنی اُچھل کود میں مشغول تھا۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ یہ پتھر اب ہلنے لگا ہے، تو گھبرا کر اڑ گئے۔ عجب نہیں، اپنے جی میں کہتے ہوں، یہاں صوفے پر ایک پتھر پڑا رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی آدمی بن جاتا ہے!

قلعہ احمد نگر

۱۸ مارچ ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

کل جو کہانی شروع ہوئی تھی، وہ ابھی ختم کہاں ہوئی؟ آیئے آج آپ کو اس "منطق الطیر"[1] کا ایک دوسرا باب سناؤں۔ معلوم نہیں، اگر آپ سنتے ہوتے تو شوق ظاہر کرتے یا اکتا جاتے؟ لیکن اپنی طبیعت کو دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے داستان سرائیوں سے تھکنا بالکل بھول گئی ہو۔ داستانیں جتنی پھیلتی جاتی ہیں، ذوقِ داستان سرائی بھی اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔

فرخندہ شبے باید و خوش مہتابے ﴿۳۸۰﴾

تا با تو حکایت کنم از ہر بابے[1]

ان یارانِ سقف و محاریب میں اور مجھ میں اب خوف و تذبذب کا اک ہلکا سا پردہ حائل رہ گیا تھا چند دنوں میں وہ بھی اٹھ گیا۔

انہیں چھت سے صوفے پر اُترنے کے لیے چند درمیانی منزلوں کی ضرورت تھی اب یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ پہلی منزل کا کام پنکھے کے دستوں سے لیتے اور دوسری کا میرے سر اور کاندھوں سے۔ باہر سے اُڑتے ہوئے کمرے میں آئے اور سیدھے اپنے گھونسلے میں پہنچ گئے۔ پھر وہاں سے سر نکال کر ہر طرف نظر دوڑائی اور پورے کمرے کا جائزہ لے لیا۔ پھر وہاں سے اڑے اور سیدھے پنکھے کے دستے پر پہنچ گئے۔ پھر دستے سے جو کودے، تو کبھی

میرے سرکو اپنے قدموں کی جولانگاہ بنایا، کبھی کاندھوں کو اپنے جلوس سے عزّت بخشی۔ دیکھیے ان چڑیوں نے نہیں معلوم کتنے برسوں کے بعد مومن خان کا ترکیب بند یاد دلا دیا!

جولاں کو ہے اس کی قصدِ پامال
اے خاک! نویدِ سرفرازی[1]

پہلی دفعہ تو اس ناگہانی نزولِ اجلال نے مجھے چونکا دیا تھا اور شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ چونک کر ہل گیا تھا۔ قدرتی طور پر ان آشنایانِ زود گسل پر یہ ناقدر شناسی گراں گزری ہوگی۔ لیکن یہ جو کچھ ہوا محض ایک اضطراری سہو تھا طبیعت فوراً متنبہ ہوگئی اور پھر تو سر اور کاندھا کچھ ایسا بے حس ہو کر رہ گیا کہ منارہ کی چھتری کی جگہ بالاخانے کا کام دینے لگا۔ پنکھے سے اُتر کر سیدھے کاندھے پر پہنچتے۔ کچھ دیر چہچہاتے اور پھر کود کر صوفے پر پہنچ جاتے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ کاندھے پر سے جست لگائی اور سر پر جا بیٹھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آتشی قندھاری نے اپنی آنکھوں کی کشتی بنائی تھی۔ بدایونی نے اس کا یہ شعر نقل کیا ہے۔[2]

سرشکم رفتہ رفتہ بے تو دریا شد، تماشا کن
بیا، در کشتیِ چشمم نشین و سیرِ دریا کن

۳۸۱

اور ہمارے سودا کو تامل ہوا تھا۔[3]

آنکھوں میں دوں آئینہ رُو کو جگہ و لے
ٹپکا کرے ہے بسکہ یہ گھر، نم بہت ہے یاں

لیکن میری زبانِ حال کو شیخ شیراز کی التجائے نیاز مستعار لینی پڑی:[4]

گر بر سر و چشمِ من نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

۳۸۲

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو خیال ہوا اب ایک اور تجربہ بھی کیوں نہ کر لیا جائے؟ ایک دن صبح میں نے دانوں کا برتن کچھ دیر نہیں رکھا، مہمانانِ باصفا بار بار آئے اور جب سفرۂ ضیافت دکھائی نہیں دیا تو ادھر اُدھر چکّر لگانے اور شور مچانے لگے۔ اب میں نے برتن نکال کے ہتھیلی پر رکھ لیا اور ہتھیلی صوفے پر رکھ دی۔ جونہی قلندر کی نظر پڑی۔ معاً جست لگائی اور ایک چکّر لگا کے انگوٹھے پر آ کھڑا ہوا اور پھر تیزی کے ساتھ دانوں پر چونچ مارنے

لگا۔ اس تیزی میں کچھ تو طبع قلندرانہ کا قدرتی تقاضہ تھا اور کچھ یہ وجہ بھی ہوگی کہ دیر تک دانوں کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ چونچ کی تیز ضربوں سے دانے اُڑ اُڑ کر ڈھکنے سے باہر گرنے لگے۔ ایک دانہ انگلی کی جڑ کے پاس گر گیا، اس نے فوراً وہاں بھی ایک چونچ ماردی اور ایسی خاراشگاف ماری کہ کیا کہوں۔ اگر ان ستم پیشوں کے جور و جفا کا خوگر نہ ہو چکا ہوتا تو یقین کیجیے، بے اختیار منہ سے چیخ نکل جاتی۔

(۳۸۳)
من کشتہ کرشمہ مژگاں کہ برجگر
خنجر زد آں چناں کہ نگہ راخبر نہ شد[1]

اب میں نے ہتھیلی برتن سمیت اُوپر اٹھالی اور ہوا میں معلق کردی۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ ایک دوسری چڑیا آئی۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کا نام موتی ہے۔ موتی نے ہتھیلی کے اُوپر ایک دو چکّر لگائے اور نکل گئی گویا اندازہ کرنا چاہتی تھی اس جزیرہ پر اُترنے کے لیے محفوظ جگہ کونسی ہوگی۔ پھر دوبارہ آئی اور کہنی کے پاس اُتر کر سیدھی پہنچے تک پہنچ گئی اور پہنچے سے ہتھیلی کی خاکنائے پر اُتر کر بے تکان "منقار درازیاں" شروع کردیں۔ اس میں کوئی دانہ قاب کے باہر گر گیا، تو چونچ کا ایک نشتر اس پر بھی لگا دیا۔ دیکھیے "دست درازی" کی ترکیب میں تصرّف کرکے مجھے "مِنقار درازی" کی ترکیب وضع کرنی پڑی۔ جانتا ہوں کہ محاورات میں تصرّفات کی گنجائش نہیں ہوتی، مگر کیا کیا جائے، سابقہ ایسے یارانِ کوتہ آستین سے آپڑا، جو ہاتھ کی جگہ منہ سے "دراز دستیاں" کرتے ہیں۔

(۳۸۴)
دراز دستیِ ایں کوتہ آستیناں بیں![2]

لیکن اس آخری تجربے نے طبع کاوش پسند کو ایک دوسری ہی فکر میں ڈال دیا۔ ذوقِ عشق کی اس کوتاہی پر شرم آئی کہ ہتھیلی موجود ہے اور میں نامراد ٹین کے ڈھکنے پر ان منقاروں کی نشتر زنی ضائع کر رہا ہوں۔ میں نے دوسرے دن ٹین کا ڈھکنا ہٹا دیا۔ چاول کے دانے ہتھیلی پر رکھے اور ہتھیلی پھیلا کر صوفے پر رکھ دی۔ سب سے پہلے موتی آئی اور گردن اُٹھا اُٹھا کے دیکھنے لگی کہ آج ڈھکنا کیوں دکھائی نہیں دیتا! تو یہ اس بستی کی سب سے زیادہ خوبصورت چڑیا ہے۔ آج کل حسن کی نمائشوں میں خوبروئی اور دلآویزی کا جو فتنہ گر سب سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ اسے پورے ملک کی نسبت سے موسوم کردیا کرتے

ہیں۔ مثلاً کہیں گے مس انگلینڈ۔ مادی موازیل (Made Moiselle) فرانس [8]۔ گویا ایک حسین چہرے کے چمکنے سے سارے ملک وقوم کا چہرہ دمک اٹھتا ہے۔

۳۸۵
کنند خویش و تبار از تو نازوی نہد
بہ حسنِ یک تن اگر صد قبیلہ ناز کند!

اگر یہ طریقہ موتی کے لیے کام میں لایا جائے تو اسے "مادام قلعۂ احمد نگر" [9] سے موسوم کر سکتے ہیں:

۳۸۶
ایں نگاہیست کہ شایستۂ دیدارے ہست [10]

چھریرا بدن، نکلتی ہوئی گردن، مخروطی دُم، اور گول گول آنکھوں میں ایک عجیب طرح کا بولتا ہوا بھولا پن جب دانہ چگنے کے لیے آئے گی، تو ہر دانے پر میری طرف دیکھتی جائے گی۔ ہم دونوں کی زبانیں خاموش رہتی ہیں مگر نگاہیں گویا ہو گئی ہیں۔ وہ میری نگاہوں کی بولی سمجھنے لگی ہے، میں نے اس کی نگاہوں کو پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ ہاوحشی یزدی نے ان معاملات کو کیا ڈوب کر کہا ہے۔ [11]

۳۸۷
کرشمہ گرمِ سوال ست، لب مکن رنجہ
کہ احتیاج بہ پرسیدن زبانی نیست

بہر حال اس موقعہ پر بھی اس کی بے ساختہ نگاہوں نے مجھ سے کچھ کہا اور پھر بغیر کسی جھجک کے جست لگا کے انگوٹھے کی جڑ پر آ کھڑی ہوئی اور دانوں پر چونچ مارنا شروع کر دیا۔ یہ چونچ نہیں تھی، نشتر کی نوک تھی، جو اگر چاہتی تو ہتھیلی کے آر پار ہو جاتی مگر صرف چر کے لگا لگا کے رک جاتی تھی۔

۳۸۸
یک ناوکِ کاری زکمان تو نخوردم
ہر زخمِ تو محتاج بہ زخمِ دگرم کرد، [12]

ہر مرتبہ گردن موڑ کے میری طرف دیکھتی بھی جاتی تھی۔ گویا پوچھ رہی تھی کہ درد تو نہیں رہا بھلا میں جاں باختۂ لذّتِ اَلم اس کا کیا جواب دیتا:

۳۸۹
ایں سخن را چہ جواب است، تو ہم میدانی [13]

مرزا صائب کا یہ شعر آپ کی نگاہوں سے گذرا ہو گا:

(۳۹۰)

خویش را بر نوکِ مژگانِ ستم کیشاں زدم
آں قدر زخمے کہ دل میخواست در خنجر نہ بود[۱۴]

مجھے اس میں اس قدر تصرف کرنا پڑا کہ مژگاں کی جگہ "منقار" کردیا۔

(۳۹۱)

خویش را بر نوکِ منقار ستم کیشاں زدم
آں قدر زخمے کہ دل میخواست در خنجر نہ بود

درد کا حال تو معلوم نہیں، مگر چونچ کی ہر ضرب جو پڑتی تھی، ہتھیلی کی سطح پر ایک گہرا زخم ڈال کے اٹھتی تھی۔

(۳۹۲)

رسیدن ہائے منقارِ ہُما بر استخواں غالب
پس از عمرے بیادم داد رسم وراہ پیکاں را[۱۵]

اس بستی کے اگر عام باشندوں سے قطعِ نظر کر لی جائے، تو خواص میں چند شخصیتیں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ قلندر اور موتی سے آپ کی تقریب ہو چکی ہے، اب مختصر املا اور صوفی کا حال سن لیجیے۔ ایک چڑا بڑا ہی تنومند اور جھگڑالو ہے۔ جب دیکھو، زبان فرفر چل رہی ہے، اور سر اٹھا ہوا اور سینہ تنا ہوا رہتا ہے۔ جو بھی سامنے آ جائے، دو دو ہاتھ کیے بغیر نہیں رہے گا۔ کیا مجال کہ ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلّہ کے اندر قدم رکھ سکے۔ کئی شہ زوروں نے ہمت دکھائی لیکن پہلے ہی مقابلہ میں چت ہو گئے۔ جب کبھی فرش پر یارانِ شہر کی مجلس آراستہ ہوتی ہے، تو یہ سر و سینہ کو جنبش دیتا ہوا اور داہنے[۱۶] بائیں نظر ڈالتا ہوا فوراً آ موجود ہوتا ہے، اور آتے ہی اُچک کر کسی بلند جگہ پہنچ جاتا ہے۔ پھر اپنے شیوۂ خاص میں اس تسلسل کے ساتھ چوں چاں شروع کر دیتا ہے کہ ٹھیک قاآنی کے واعظکِ جامع کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے:[۱۷]

وی واعظکے آمد در مسجد جامع
چوں برف ہمہ جامہ سپید از پا تا سر
چشمش بسوئے چپ و چشمش بسوئے راست
تا خود کے سلامے کنداز منعم و مضطر
زانساں کہ خرامد بہ رسَن مردِ رَسَن باز

آہستہ خرامیدی و موزوں و مؤقّر
فارغ نہ شدہ خلق ز تسلیم و تشہد
برجست چو بوزینہ و بنشست بہ منبر
و انگہ بہ سر و گردن وریش و لب و بینی
بس عشوہ بیا وردہ سخن کرد چنیں سر

فرمایئے، اگر اس کا نام مُلّا نہ رکھتا تو اور کیا رکھتا؟ ٹھیک اس کے برعکس ایک دوسرا چڑا ہے۔ تعرف الاشیاء باضدادہا۔ اُسے جب دیکھیے اپنی حالت میں گم اور خاموش ہے:

(۳۹۴) کاں را کہ خبر شد، خبرش باز نیامد[18]

بہت کیا، تو کبھی کبھار ایک ہلکی سی ناتمام چوں کی آواز نکال دی اور اس ناتمام چوں کا بھی انداز لفظ و سخن کا سا نہیں ہوتا، بلکہ ایک ایسی آواز ہوتی ہے، جیسے کوئی آدمی سر جھکائے اپنی حالت میں گم پڑا رہتا ہو، اور کبھی کبھی سر اٹھا کے "ہا" کر دیتا ہو:

(۳۹۵) تا تو بیدار شوی، نالہ کشیدم، ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند[19]

دوسرے چڑے اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں، گویا اس کی کم سخنی سے عاجز آ گئے ہیں۔ پھر بھی اس کی زبان کھلتی نہیں۔ البتہ نگاہوں پر کان لگایئے، تو ان کی صدائے خاموشی سنی جا سکتی ہے:

(۳۹۶) تو نظر باز نہ، ورنہ تغافل نگہ ست
تو زبان فہم نہ، ورنہ خموشی سخن ست[20]

میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفی رکھ دیا اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تلقب،

(۳۹۷) جامۂ بود کہ برقامت او دوختہ بود![21]

صبح جب اس بستی کے تمام باشندے باہر نکلتے ہیں، تو برآمدہ اور میدان میں عجیب چہل پہل ہونے لگتی ہے۔ کوئی پھول کے گملوں پر کودتا پھرتا ہے۔ کوئی کروٹین کی شاخوں

میں جھولا جھولنے لگتا ہے۔ ایک جوڑے نے غسل کا تہیہ کیا اور اس انتظار میں رہا کہ کب پھولوں کے تختوں میں پانی ڈالا جاتا ہے۔ جونہی پانی ڈالا گیا، فوراً حوض میں اُتر گیا اور پروں کو تیزی کے ساتھ کھولنے اور بند کرنے لگا۔ ایک دوسرے جوڑے کو آس پاس پانی نہیں ملا تو فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا [۲۲] پڑھتا ہوا مٹی ہی میں نہانا شروع کر دیا۔ پہلے چونچ مار مار کے اتنی مٹی کھود ڈالی کہ سینے تک ڈوب سکے۔ پھر اس گڑھے میں بیٹھ کر اس طرح پا کوبیاں اور پر افشانیاں شروع کر دیں کہ گرد و خاک کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ فاصلہ پر ملاّ حسب معمول کسی حریف سے کشتی لڑنے میں مشغول ہے۔ ان کے لڑنے کی خود فروشیوں کا بھی عجیب حال ہوتا ہے:

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں [۲۳]

یعنی ہاتھ کو دیکھیے تو ہتھیار سے یک قلم خالی ہے، بلکہ سرے سے ہاتھ ہے ہی نہیں:

دہن کا ذکر کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے [۲۴]

مگر چونچ کو دیکھیے تو سارے ہتھیاروں کی کمی پوری کر رہی ہے۔ جوشِ غضب میں آ کر اس طرح ایک دوسرے سے گتھ جائیں گے کہ ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا۔ گویا "جدال سعدی با مدّعی در بیان توانگری و درویشی" [۲۵] کا نظر آنکھوں میں پھر جائے گا:

او درمن و من در و فتادہ ! [۲۶]

۳۹۸

ہوا میں جب کشتی لڑتے ہوئے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے ہیں، تو انہیں اس کا بھی ہوش نہیں رہتا کہ کہاں گر رہے ہیں۔ کئی مرتبہ میرے سر پر گر پڑے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ٹھیک میری گود میں آ کر پڑ گئے، میں نے ایک کو ایک ہاتھ سے، دوسرے کو دوسرے سے پکڑ لیا:

میرے دونوں ہاتھ نکلے کام کے [۲۷]

سارا جسم مُٹھی میں بند تھا۔ صرف گردنیں نکلی ہوئی تھیں۔ دل اس زور سے دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا۔ اب پھٹا، اب پھٹا۔ لیکن اس پر بھی ایک دوسرے کو چونچ مارنے

سے باز نہیں رہ سکتے تھے۔ جب میں نے مٹھیاں کھول دیں، تو پھر سے اُڑ کر پنکھے کے دستے پر جا بیٹھے، اور دیر تک چوں چوں کرتے رہے۔ غالباً ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ:

(۳۹۹) رسیدہ بود بلائے، ولے بخیر گزشت [۲۸]

موتی کے گھونسلے سے ایک بچے کی آواز عرصہ سے آ رہی تھی۔ وہ جب دانوں پر چونچ مارتی، تو ایک دو دانوں سے زیادہ نہ لیتی اور فوراً گھونسلے کا رخ کرتی۔ وہاں اس کے پہنچتے ہی بچے کا شور شروع ہو جاتا۔ ایک دو سیکنڈ کے بعد پھر آتی اور دانہ لے کر اُڑ جاتی۔ ایک مرتبہ میں نے گنا تو ایک منٹ کے اندر سات مرتبہ آئی گئی۔

جن علمائے علم الحیوان نے اس جنس کے پرندوں کے خصائص کا مطالعہ کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ ایک چڑیا دن بھر کے اندر ڈھائی سو سے تین سو مرتبہ تک بچے کو غذا دیتی ہے، اور اگر دن بھر کی مجموعی مقدارِ غذا بچے کے جسم کے مقابلہ میں رکھی جائے تو اس کا حجم (Mass) کسی طرح بھی بچے کے جسمانی حجم سے کم نہ ہوگا۔ مگر بچوں کی قوتِ ہاضمہ اس تیزی سے کام کرتی رہتی ہے کہ اِدھر دانہ ان کے اندر گیا اُدھر تحلیل ہونا شروع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ پرندوں کے بچوں کے نشو و نما کا اوسط چار پایوں کے بچوں کے اوسط سے زیادہ ہوتا ہے، اور بہت تھوڑی مدّت کے اندر وہ بلوغ تک پہنچ جاتے ہیں۔ موتی کی رفتارِ عمل سے مجھے اس بیان کی پوری تصدیق مل گئی۔

پھر جوں جوں بچوں کے پَر بڑھنے لگتے ہیں، وجدان کا فرشتہ آتا ہے اور ماں کے کان میں سرگوشیاں شروع کر دیتا ہے کہ اب انہیں اُڑنے کا سبق سکھانا چاہیے معلوم ہوتا ہے، موتی کے کانوں میں یہ سرگوشی شروع ہو گئی تھی۔ ایک دن صبح کیا دیکھتا ہوں، گھونسلے سے اُڑتی ہوئی اتری تو اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی ادھوری پرواز کے پر و بال کے ساتھ نیچے گر گیا۔ موتی بار بار اس کے پاس جاتی اور اڑنے کا اشارہ کر کے اُوپر کی طرف اڑنے لگتی لیکن بچے میں اثر پذیری کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی تھی؛ وہ پَر پھیلائے آنکھیں بند کیے، بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کے دیکھا تو معلوم ہوا ابھی پَر پوری طرح بڑھے نہیں ہیں۔ گرنے کی چوٹ کا اثر بھی تازہ ہے، اس نے بے حال کر دیا ہے۔ بے اختیار نظیری کا شعر یاد آ گیا: [۲۹]

به وصلش تارسم، صد بار بر خاک افگند شوقم

﴿۴۰۰﴾ کہ نو پروازم و شاخ بلندے آشیاں دارم

بہر حال اسے اٹھا کے دری پر رکھ دیا۔ موتی چاول کے ٹکڑے چن چن کر منہ میں لیتی اور اسے کھلا دیتی۔ وہ منہ کھولتے ہوئے چوں چوں کی ایک مدّھم اور اکھڑی سی آواز نکال دیتا اور پھر دم بخود، آنکھیں بند کیے پڑا رہتا پورا دن اسی حالت میں نکل گیا۔ دوسرے دن بھی اس کی حالت ویسی ہی رہی۔ ماں صبح سے لے کر شام تک برابر اُڑنے کی تلقین کرتی رہی، مگر اس پر کچھ ایسی مُردنی سی چھا گئی تھی کہ کوئی جواب نہیں ملتا۔ میرا خیال تھا کہ یہ اب بچے گا نہیں لیکن تیسرے دن صبح کو ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔ دھوپ کی ایک لکیر کمرہ کے اندر دور تک چلی گئی تھی، یہ اس میں جا کر کھڑا ہو گیا تھا؛ پر گرے ہوئے، پاؤں مڑے ہوئے، آنکھیں حسب معمول بند تھیں۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ یکایک آنکھیں کھول کر ایک جھرجھری سی لے رہا ہے۔ پھر گردن آگے کر کے فضا کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر گرے ہوئے پروں کو سکیڑ کر ایک دو مرتبہ کھولا، بند کیا، اور پھر جو ایک مرتبہ جست لگا کر اڑا، تو بیک دفعہ تیر کی طرح میدان میں جا پہنچا اور پھر ہوائی کی طرح فضا میں اُڑ کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ یہ منظر اس درجہ عجیب اور غیر متوقع تھا کہ پہلے تو مجھے اپنی نگاہوں پر شبہ ہونے لگا، کہیں کسی دوسری چڑیا کو اڑتے دیکھ کر دھوکے میں نہ پڑ گیا ہوں، لیکن ایک واقعہ جو ظہور میں آ چکا تھا، اب اس میں شبہ کی گنجائش کہاں باقی رہی تھی؟ کہاں تو بے حالی اور درماندگی کی یہ حالت کہ دو دن تک ماں سر کھپاتی رہی، مگر زمین سے بالشت بھر بھی اُونچا نہ ہو سکا اور کہاں آسمان پیمائیوں کا یہ انقلاب انگیز جوش کہ پہلی ہی اُڑان میں عالم حدود و قیود کے سارے بندھن توڑ ڈالے اور فضا لامتناہی کی ناپیدا کنار وسعتوں میں گم ہو گیا! کیا کہوں، اس منظر نے کیسی خود رفتگی کی حالت طاری کر دی تھی۔ بے اختیار یہ شعر زبان پر آ گیا تھا اور اس جوش و خروش کے ساتھ آیا تھا کہ ہمسائے چونک اُٹھتے تھے:

نیروئے عشق بیں کہ دریں دشتِ بیکراں

﴿۴۰۱﴾ گامے نرفتہ ایم و بپایاں رسیدہ ایم

دراصل یہ کچھ نہ تھا، زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشا تھا، جو ہمیشہ

ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتا رہتا ہے، مگر ہم اسے سمجھنا نہیں چاہتے۔ اس چڑیا کے بچے میں اڑنے کی استعداد ابھر چکی تھی۔ وہ اپنے کنج نشیمن سے نکل کر فضائے آسمانی کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا، مگر ابھی تک اس کی "خود شناسی" کا احساس بیدار نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی حقیقت سے بے خبر تھا۔ ماں بار بار اشارے کرتی تھی، ہوا کی لہریں بار بار پروں کو چھوتی ہوئی گزر جاتی تھیں، زندگی اور حرکت کا ہنگامہ ہر طرف سے آ آ بڑھاوے دیتا تھا، لیکن اس کے اندر کا چولہا کچھ اس طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا کہ باہر کی کوئی گرمجوشی بھی اسے گرم نہیں کر سکتی تھی:

۴۰۲

کلیم شکوہ ز توفیق چند، شرمت باد!
تو چوں برہ نہ نہی پائے، رہنما چہ کند[۳۰]

لیکن جونہی اس کی سوئی ہوئی "خود شناسی" جاگ اٹھی، اور اسے اِس حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ "میں اُڑنے والا پرند ہوں"۔ اچانک قالب بے جان کی ہر چیز از سرِ نو جاندار بن گئی۔ وہی جسم زار جو بے طاقتی سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا، اب سرو قد کھڑا تھا۔ وہی کانپتے ہوئے گھٹنے جو جسم کا بوجھ بھی سہا نہیں سکتے تھے، اب تن کر سیدھے ہو گئے تھے۔ وہی گرے ہوئے پَر جن میں زندگی کی کوئی تڑپ دکھائی نہیں دیتی تھی، اب سمٹ سمٹ کر اپنے آپ کو تولنے لگے تھے۔ چشم زدن کے اندر جوشِ پرواز کی ایک برق وار تڑپ نے اس کا پورا جسم ہلا کر اچھال دیا۔ اور پھر جو دیکھا، تو درماندگی اور بے حالی کے سارے بندھن ٹوٹ چکے تھے، اور مرغ ہمت، عقاب وار فضائے لامتناہی کی لاانتہائیوں کی پیائش کر رہا تھا۔ وللہ درما قال:

۴۰۳

بال بکشا و صفیر از شجرِ طوبیٰ زن
حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیرِ قفسی![۳۱]

گویا بے طاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری، بے پروبالی سے بلند پروازی، اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن کے اندر ہو گیا۔ غور کیجیے، تو یہی ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانہ کا خلاصہ ہے:

طے میشود ایں رہ بدرخشیدنِ برقے
ما بے خبراں منتظرِ شمع و چراغیم[۳۲]

اُڑنے کے سروسامان میں سے کونسی چیز تھی جو اس نوگرفتارِ قفسِ حیات کے حصّے میں نہیں آئی تھی؟ فطرت نے سارا سروسامان مہیا کر کے اسے بھیجا تھا، اور ماں کے اشارے دمبدم گرم پروازی کے لیے ابھار رہے تھے۔ لیکن جب تک اس کے اندر کی "خود شناسی" بیدار نہیں ہوئی، اور اس حقیقت کا عرفان نہیں ہوا کہ وہ طائرِ بلند پرواز ہے، اس کے بال و پَر کا سارا سروسامان بیکار رہا۔ ٹھیک اسی طرح انسان کے اندر کی "خود شناسی" بھی جب تک سوئی رہتی ہے، باہر کا کوئی ہنگامۂ سعی اسے بیدار نہیں کر سکتا۔ لیکن جونہی اس کے اندر کا عرفان جاگ اٹھا، اور اسے معلوم ہو گیا، کہ اس کی چھپی ہوئی حقیقت کیا ہے، تو پھر چشم زدن کے اندر سارا انقلابِ حال انجام پا جاتا ہے، اور ایک ہی جست میں حضیض خاک سے اڑ کر رفعتِ افلاک تک پہنچ جاتا ہے۔ خواجۂ شیراز نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا: [۴۳]

چہ گویمت کہ بہ مے خانہ دوش مستِ خراب
سروشِ عالمِ غیبم چہ مژدہا داد است
کہ اے بلند نظر، شاہبازِ سدرہ نشیں!
نشیمنِ تو نہ ایں کنج محنت آباد است
تراز کنگرۂ عرش میزنند صفیر
ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتاد است

۴۰۵

ابوالکلام

قلعہ احمد نگر

۱۱/اپریل ۱۹۴۳ء

آنچہ دل از فکر آں می سوخت بیم ہجر بود
آخر از بے مہری گردوں بہ آں ہم ساختیم [1]

صدیق مکرم

اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں، بلکہ رات کا پچھلا حصّہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسب معمول بستر پر لیٹ گیا تھا۔ لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اُٹھ بیٹھا، کمرہ میں آیا، روشنی کی اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کروں۔ اِن آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں، یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے اور نہیں معلوم ابھی اور کتنی راتیں اسی طرح گزریں گی۔

دماغ برفلک و دل بہ پائے مہر بتاں
چگو نہ حرف زنم، دِل کُجا، دماغ کُجا [2]

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا، تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویش خاطر کا موجب ہوگا مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزرا تھا۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا

کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیلِ آب وہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرہ پر واپس آرہی تھی۔

اس تمام زمانے میں میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہوگئی۔

(۴۰۸) صد بیاباں بگذشت ودگرے درپیش ست [۳]

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ کے بعد کلکتہ واپس ہوا۔ اور پھر چار دن کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لیے روانہ ہوگیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف اُمڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہورہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کرلیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائے گا۔☆ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیئے ہیں اور وہ اِن سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اِس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا [۴] کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صُورت حال کا پوری طرح اندازہ کرلیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کیے میں اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقعہ بہت کم ملا وہ میری طبیعت کی اُفتاد سے واقفِ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں

☆ گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے، ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افواہیں بے اصل نہ تھیں۔ سکرٹری آف اسٹیٹ اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کرکے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات کربھی لیے گئے تھے لیکن پھر رائے بدل گئی؛ اور بالآخر طے پایا کہ قلعہ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا، وہ یہیں حاصل ہوجائے۔

کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لیے وہ بھی خاموش تھی، لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اوران کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳ اگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا۔ اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آ گیا تو ۱۳ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں سکتی تھی جو اس کے چہرہ کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

(۴۰۹) خود راحیلہ پیشِ تو خاموش کردہ ایم ![۵]

گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آ گئی تھی؟ میں نے اُس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کیے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس موقعہ پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آ سکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ پھر جب یہ روک ہٹالی تو ۷ استمبر کو مجھے اس کا پہلا خط ملا اور اس کے بعد برابر خطوط ملتے رہے۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کرے گی۔ اس لیے گھر کے بعض دوسرے عزیزوں سے حالت دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخ کتابت سے دس بارہ دن بعد ملتے ہیں۔ اس لیے کوئی بات جلد معلوم نہیں ہوسکتی۔ ۱۵ فروری کو مجھے ایک خط ۲ فروری کا بھیجا ہوا ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعہ مزید صورت حال دریافت کی تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔

۲۳ / مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلی گرام کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اسے کلکتہ سے ملا ہے۔ نہیں معلوم جو ٹیلیگرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیے۔

چونکہ حکومت نے ہماری قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے، اس لیے ابتدا سے یہ طرز عمل اختیار کیا گیا ہے کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلی گرام باہر بھیجا جاسکتا ہے۔ نہ باہر سے کوئی آسکتا ہے۔ کیونکہ اگر آئے گا تو ٹیلی گراف آفس ہی کے ذریعہ آئے گا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائے گا۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو، لیکن تار کے ذریعہ نہیں بھیجی جاسکتی۔ اگر تار بھیجنا ہو تو اسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہیے۔ وہ اسے خط کے ذریعہ بمبئی بھیجے گا۔ وہاں سے احتساب کے بعد اسے آگے روانہ کیا جاسکتا ہے۔ خط و کتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ بعض کے لیے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے۔ بعض کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے، آگے نہ بڑھائی جائے۔ چونکہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے، اس لیے مجھے کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو ۲۳ / مارچ کو یہاں پہنچا، فوجی خط رمز (Code) میں لکھا گیا تھا

سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ فوجی ہیڈ کوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود نہ تھا۔ اس لیے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو مجھے اس کی حل شدہ کاپی مل سکی۔

دوسرے دن اخبارات آئے تو ان میں بھی یہ معاملہ آ چکا تھا۔ معلوم ہوا ڈاکٹروں نے صورت حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے۔ اور جواب کے منتظر ہیں۔ پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اطلاعات نکلنے لگیں۔ سپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو میں سُنتا تھا اور یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر کر دیتا تھا۔

جس دن تار ملا اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورت حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی۔ وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایماء سے کہی تھی۔

جونہی خطرناک صورتِ حال کی پہلی خبر ملی، میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتداء سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔

تا دسترس بود، زدم چاک گریباں (۲۱۰)
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم[٦]

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ جدوجہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر

کھلنے لگتا ہے۔

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا، میں اسے چھپانا نہیں چاہتا میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر وسکون کے ساتھ برداشت کرلوں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہوسکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے، جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے۔

سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں، ان میں فرق آنے نہ پائے۔ چائے اور کھانے کے چار وقت ہیں جن میں مجھے اپنے کمرے سے نکلنا اور کمروں کی قطار کے آخری کمرہ میں جانا پڑتا ہے۔ چونکہ زندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہوگیا ہوں، اس لیے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہوگئی اور تمام ساتھیوں کو اس کا ساتھ دینا پڑا۔ میں نے ان دنوں میں بھی اپنا معمول بدستور رکھا۔ ٹھیک وقت پر کمرہ سے نکلتا رہا اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا۔ بھوک یک قلم بند ہو چکی ہے لیکن میں چند لقمے حلق سے اتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی۔ اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا، جس طرح باتیں کرتا اور جس قسم کی باتیں کرتا تھا، وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔

اخبارات یہاں بارہ سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے سامنے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا میرے کمرے میں آتا ہے۔ جونہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی، دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی، لیکن پھر فوراً چونک اٹھتا۔ میرے صوفے کی پیٹھ دروازہ کی طرف ہے۔ اس لیے جب تک ایک آدمی اندر آ کے سامنے کھڑا نہ ہو جائے، میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا تھا تو میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا۔ گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر داریاں دکھاوے کا

ایک پارٹ تھیں جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لیے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامن صبر و قرار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔

(۴۱۱) بدہ یارب دلے، کیں صورتِ بے جاں نمی خواہم[۷]

بالآخر ۹ راپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔

(۴۱۲) فَـاِنَّ مَـا تَـحْـذَرِیْـنَ، قَـدْ وَقَـعَ ![۸]

دو بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالہ کیا۔ جس میں حادثہ کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعہ صبح ہی معلوم ہو گئی تھی اور اس نے یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقاء کا جو طرز عمل رہا اس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ابتداء میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو قدرتی طور پر انہیں پریشانی ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کے بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں کریں، لیکن جونہی معلوم ہو گیا کہ میں نے اپنے طرز عمل کا ایک فیصلہ کر لیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا، تو پھر سب نے خاموشی اختیار کر لی اور اس طرح میرے طریق کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔

اس طرح ہماری چھتیس[۹] برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں، مگر اسی دیوار کی اوٹ سے۔

مجھے اِن چند دِنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا، مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔

(۴۱۳) غافل نیم زراہ، ولے آہ چارہ نیست
زیں راہزناں کہ بردل آگاہ می زنند[۱۰]

یہاں احاطہ کے اندر ایک پورانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے جب سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ایک نئے طرح کا اُنس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ اور متمم بن نویرہ[۱۱] کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا، بے اختیار

یاد آ گیا۔

لَقَدْ لَامَنِیْ عِنْدَ الْقُبُوْرِ عَلَی الْبُکَا
رَفِیْقِیْ لِتَذْرَافِ الدُّمُوْعِ السَّوَافِکِ
فَقَالَ اَتَبْکِیْ کُلَّ قَبْرٍ رَاَیْتَہٗ
لِقَبْرٍ ثَوٰی بَیْنَ اللِّوٰی فَالدَّکَادِکِ
فَقُلْتُ لَہٗ اِنَّ الشَّجَا یَبْعَثُ الشَّجَا
فَدَعْنِیْ ، فَھٰذَا کُلُّہٗ قَبْرُ مَالِکٍ![12]

۴۱۴

اب قلم روکتا ہوں۔ اگر آپ سنتے ہوتے تو بول اٹھتے۔

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں[13]

قلعۂ احمد نگر

۱۴ر جون ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

(۴۱۵)

حسب حالے نہ نوشتیم و شدایا مے چند
قاصدے کو کہ فرستم بتو پیغامے چند [1]

گزشتہ سال جب ہم یہاں لائے گئے تھے، تو برسات کا موسم تھا۔ وہ دیکھتے دیکھتے گزر گیا اور جاڑے کی راتیں شروع ہوگئیں۔ پھر جاڑے نے بھی رختِ سفر باندھا اور گرمی اپنا سازوسامان پھیلانے لگی۔ اب پھر موسم کی گردش اسی نقطہ پر پہنچ رہی ہے جہاں سے چلی تھی۔ گرمی رخصت ہو رہی ہے اور بادلوں کے قافلے ہر طرف سے امنڈنے لگے ہیں۔ دنیا میں اتنی تبدیلیاں ہو چکیں، مگر اپنے دل کو دیکھتا ہوں تو ایک دوسرا ہی عالم دکھائی دیتا ہے؛ جیسے اس نگری میں کبھی موسم بدلتا ہی نہیں۔ سرمدؔ کی رباعی کتنی پامال ہو چکی ہے پھر بھی بھلائی نہیں جا سکتی۔

(۴۱۶)

سرما بگوشت وایں دلِ زار ہماں
گرما بگوشت وایں دلِ زار ہماں
القصہ تمام سرد و گرمِ عالم
برما بگوشت وایں دلِ زار ہماں [2]

یہاں احاطہ کے شمالی گوشہ میں ایک نیم کا درخت ہے۔ کچھ دن ہوئے، ایک وارڈر [3] نے اس کی ایک ٹہنی کاٹ ڈالی تھی اور جڑ کے پاس پھینک دی تھی۔ اب بارش ہوئی تو

تمام میدان سرسبز ہونے لگا۔ نیم کی شاخوں نے بھی زرد چیتھڑے اُتار کر بہار و شادابی کا نیا جوڑا پہن لیا۔ جس ٹہنی کو دیکھو، ہرے ہرے پتوں اور سفید سفید پھولوں سے لدرہی ہے۔ لیکن اِس کٹی ہوئی ٹہنی کو دیکھیے تو گویا اس کے لیے کوئی انقلابِ حال ہوا ہی نہیں۔ ویسی ہی سُوکھی کی سوکھی پڑی ہے اور زبانِ حال سے کہہ رہی ہے۔

﴿۴۱۷﴾
ہمچو ماہی غیر داغم پوششِ دیگر نبود
تاکفن آمد، ہمیں یک جامہ برتن داشتم [۴]

یہ بھی اسی درخت کی ایک شاخ ہے، جسے برسات نے آتے ہی زندگی اور شادابی کا نیا جوڑا پہنا دیا۔ یہ بھی آج دوسری ٹہنیوں کی طرح بہار کا استقبال کرتی، مگر اب اسے دنیا اور دنیا کے موسمی انقلابوں سے کوئی سروکار نہ رہا۔ بہار و خزاں، گرمی و سردی، خشکی و طراوت، سب اس کے لیے یکساں ہو گئے۔

کل دوپہر کو اس طرف سے گزر رہا تھا کہ یکا یک اس شاخِ بریدہ سے پاؤں ٹکرا گیا۔ میں رک گیا اور اسے دیکھنے لگا۔ بے اختیار شاعر کی حسنِ تعلیل یاد آ گئی۔

﴿۴۱۸﴾
قطعِ امید کردہ نہ خواہد نعیم دہر
شاخِ بریدہ را نظرے بر بہار نیست [۵]

میں سوچنے لگا کہ انسان کے دل کی سرزمین کا بھی یہی حال ہے۔ اس باغ میں بھی امید و طلب کے بے شمار درخت اگتے ہیں اور بہار کی آمد آمد کی راہ تکتے رہتے ہیں۔ لیکن جن ٹہنیوں کی جڑ کٹ گئی ان کے لیے بہار و خزاں کی تبدیلیاں کوئی اثر نہیں رکھتیں۔ کوئی موسم بھی انہیں شادابی کا پیام نہیں پہنچا سکتا۔

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے [۶]

موسمی پھولوں کے جو درخت یہاں اکتوبر میں لگائے تھے انہوں نے اپریل کے آخر تک دن نکالے، مگر پھر انہیں جگہ خالی کرنی پڑی۔ مئی میں خیال ہوا کہ بارش کے موسم کی تیاریاں شروع کر دینی چاہئیں۔ چنانچہ نئے سرے سے تختوں کی درستگی ہوئی۔ نئے بیج منگوائے گئے اور اب نئے پودے لگ رہے ہیں۔ چند دنوں میں نئے پھولوں سے نیا چمن

آراستہ ہو جائے گا۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر میرے سامنے رہ رہ کر ایک دوسری ہی بات آرہی ہے۔ سوچتا ہوں کہ دنیا کا باغ اپنی گل شگفتگیوں میں کتنا تنگ واقع ہوا ہے۔ جب تک ایک موسم کے پھول مرجھا نہیں جاتے، دوسرے موسم کے پھول کھلتے نہیں۔ گویا قدرت کو جتنا خزانہ لٹانا تھا، لٹا چکی، اب اسی میں ادل بدل ہوتا رہتا ہے۔ ایک جگہ کا سامان اٹھایا، دوسری جگہ سجا دیا، مگر نئی پونجی یہاں مل سکتی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدسی کو پھولوں کا کھلنا پسند نہیں آیا تھا۔ اسے اندیشہ ہوا تھا کہ اگر باغ پھول کھلے گا تو اس کے دل کی کلی بند کی بند رہ جائے گی۔

(۴۱۹)

عیشِ ایں باغ بہ اندازۂ یک تنگدل ست
کاش گل غنچہ شود تا دلِ ما بکشاید[۷]

غور کیجیے تو یہاں کی ہر بناوٹ کسی نہ کسی بگاڑ ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ یہاں کا ہر بگاڑ دراصل ایک نئی بناوٹ ہے۔

بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی[۸]

میدانوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں مگر اینٹوں کا پڑاوہ بھر جاتا ہے۔ درختوں پر آریاں چلنے لگتی ہیں مگر جہاز بن کر تیار ہو جاتے ہیں۔ سونے کی کانیں خالی ہو گئیں لیکن مُلک کا خزانہ دیکھیے تو اشرفیوں سے بھرپور ہو رہا ہے۔ مزدور نے اپنا پسینہ سر سے پاؤں[۹] تک بہا دیا مگر سرمایہ دار کی راحت و عیش کا سرو سامان درست ہو گیا۔ ہم مالن کی جھولی بھری دیکھ کر خوش ہونے لگتے ہیں مگر ہمیں یہ خیال نہیں آتا کسی کے باغ کی کیاری اُجڑی ہو گی جبھی تو یہ جھولی معمور ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب عرفی نے اپنے دامن میں پھول دیکھے تھے تو بے اختیار چیخ اٹھا تھا:

(۴۲۰)

زمانہ گلشنِ عیشِ کرا بہ یغما داد؟
کہ گُل بہ دامنِ ما دستہ دستہ می آید[۱۰]

اکتوبر سے اپریل تک موسمی پھولوں کی کیاریاں ہماری دلچسپیوں کا مرکز رہیں۔ صبح و شام کئی کئی گھنٹے ان کی رکھوالی میں صرف کر دیتے تھے، مگر موسم کا پلٹنا تھا کہ ان کی حالت نے بھی پلٹا کھایا اور پھر وہ وقت آ گیا کہ ان کی رکھوالی کرنا ایک طرف، کوئی اس کا بھی روادار

نہ رہا کہ ان اجل رسیدوں کو چند دن اوران کی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ ایک ایک کرکے تمام کیاریاں اکھاڑ ڈالی گئیں۔ وہی ہاتھ جو کبھی اونچے ہوہوکران کے سروسینہ پر پانی بہاتے تھے، اب بے رحمی کے ساتھ ایک ایک ٹہنی توڑمروڑ کر پھینک رہے تھے۔ جن درختوں کے پھولوں کا ایک ایک ورق حسن کا مرقع اور رعنائی کا پیکر تھا، اب جھلسی ہوئی جھاڑیوں اور روندی ہوئی گھانس کی طرح میدان کے ایک کونے میں ڈھیر ہورہا تھا اور صرف اسی مصرف کا رہ گیا تھا کہ جس بے سروسامان کو جلانے کے لیے لکڑیاں میسّر نہ آئیں، وہ انہی کو چولہے میں جھونک کر اپنی ہانڈی گرم کرلے۔

گلگونۂ عارض ہے، نہ ہے رنگِ حنا تو
اے خوں شدہ دل، تُو تو کسی کام نہ آیا[۱۱]

زندگی اور وجود کے جس گوشہ کو دیکھیے، قدرت کی کرشمہ سازیوں کے ایسے ہی تماشے نظر آئیں گے۔

دریں چمن کہ بہار وخزاں ہم آغوش ست
زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش ست[۱۲]

﴿۴۲۱﴾

اِنسانی زندگی کا بھی بعینہٖ یہی حال ہوا۔ سعی وعمل کا جو درخت پھل پھول لاتا ہے اس کی رکھوالی کی جاتی ہے۔ جو بیکار ہو جاتا ہے اسے چھانٹ دیا جاتا ہے۔

"فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَايَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ☆ [۱۳]

☆ یہ قرآن کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے، جس میں کارخانہ ٔ ہستی کی اس اصل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو چیز نافع ہوتی ہے، وہ باقی رکھی جاتی ہے؛ جو بے کار ہوگئی، وہ چھانٹ دی جاتی ہے۔

قلعۂ احمد نگر

۱۵ر جون ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

عرب کے فلسفی ابوالعلاء معرّی نے زمانہ کا پورا پھیلاؤ تین دنوں کے اندر سمیٹ دیا تھا: کل جو گزر چکا؛ آج جو گذر رہا ہے؛ کل جو آنے والا ہے:

ثلاثة ايام، هي الدهر كله

وما هن، الامس واليوم والغد

وما القمر الا واحد غيرانه

يغيب و يأتي بالضياء المجدد[1]

لیکن تین زمانوں کی تقسیم میں نقص یہ تھا کہ جسے ہم "حال،، کہتے ہیں، وہ فی الحقیقت ہے کہاں؟ یہاں وقت کا جو احساس بھی ہمیں میسّر ہے وہ یا تو "ماضی،، کی نوعیت رکھتا ہے یا مستقبل کی، اور انہی دونوں زمانوں کا ایک اضافی تسلسل ہے، جسے ہم "حال،، کے نام سے پکارنے لگتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ "ماضی" اور "مستقبل" کے علاوہ وقت کی ایک تیسری نوعیت بھی ہمارے سامنے آتی رہتی ہے لیکن وہ اس تیزی کے ساتھ آتی اور نکل جاتی ہے کہ ہم اسے پکڑ نہیں سکتے۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہیں، لیکن ادھر ہم نے پیچھا کرنے کا خیال کیا، اور ادھر اس نے اپنی نوعیت بدل ڈالی۔ اب یا تو ہمارے سامنے "ماضی" ہے جو جا چکا، "یا مستقبل" ہے جو ابھی آیا ہی نہیں۔ لیکن خود "حال" کا کوئی نام و نشان دکھائی نہیں

دیتا۔ جس وقت کا ہم نے پیچھا کرنا چاہا تھا وہ ''حال'' تھا اور جو ہماری پکڑ میں آیا ہے وہ ''ماضی'' ہے۔

نکل چکا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے [۲]

شاید یہی وجہ ہے کہ ابوطالب کلیم کو انسانی زندگی کی پوری مدت دو دن سے زیادہ نظر نہیں آئی:

(۴۲۳)

بدنامیِ حیات دو روزے نبود بیش
واں ہم کلیم باتو چگویم، چساں گزشت
یک روز صرفِ بستنِ دل شد باین وآں
روزے دگر بکندنِ دل زین وآں گزشت [۳]

ایک عرب شاعر نے یہی مطلب زیادہ ایجاز و بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہے

(۴۲۴)

ومتی یسا عدنا الوصال و دھرنا
یومان، یوم لوئ و یوم صدود

اور اگر حقیقت حال کو اور زیادہ نزدیک ہو کر دیکھیے تو واقعہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کی پوری مدت ایک صبح شام سے زیادہ نہیں۔ صبح آنکھیں کھلیں، دوپہر امید و بیم میں گزری، رات آئی تو پھر آنکھیں بند تھیں۔ لَمْ یَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِیَّۃً اَوْ ضُحَاھَا.

(۴۲۵)

شورے شد و ازخوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ، غنودیم [۵]

لیکن پھر غور کیجیے اسی ایک صبح شام کے بسر کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے، کتنے صحراؤں کو طے کرنا پڑتا ہے؛ کتنے سمندروں کو لانگنا پڑتا ہے؛ کتنی چوٹیوں پر سے کودنا پڑتا ہے؟ پھر آتش و پنبہ کا افسانہ ہے، برق و خرمن کی کہانی ہے:

دریں چمن کہ ہوا داغ شبنم آرائی ست
تسلے بہزار اضطراب می بافند [۶]

قلعۂ احمد نگر

۱۶ر ستمبر ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

بچے ربڑ کے رنگین غباروں سے بہت خوش ہوتے ہیں، مُجھے بھی بچپنے میں ان کا بڑا شوق تھا۔ والد مرحوم کے مریدوں میں ایک شخص غلام رحمٰن تھا، جو انگریزی ٹوپیوں کے بنانے کا کاروبار کرتا تھا۔ وہ مجھے یہ غبارے لا کر دیا کرتا اور میں اس سے بہت ہل گیا تھا۔ یہ غبارے ویسے ہی ہوتے ہیں، جیسے منہ سے پھونکنے کے ہوتے ہیں لیکن ان میں گیس بھر دی جاتی ہے اور وہ انہیں اوپر کی طرف اڑائے رکھتی ہے۔ ایک مرتبہ مجھے خیال ہوا اسے چھید کے دیکھنا چاہیے اندر سے کیا نکلتا ہے؟ سہسرام کی ایک مغلانی امانی نام ہمارے گھر میں سلائی کا کام کیا کرتی تھی۔ میں نے امانی کے سلائی کے بکس میں سے ایک سوئی نکالی اور غبارے میں چبھودی۔ اس واقعہ پر سینتالیس (۴۷) برس گزر چکے لیکن اس وقت بھی خیال کرتا ہوں تو اس سنسنی کا اثر صاف صاف دماغ میں محسوس ہونے لگتا ہے جو اس وقت اچانک گیس کے نکلنے اور ایک لمبی "سی آ" کی سی آواز پیدا ہونے سے مجھ پر طاری ہوگئی تھی۔ گیس باہر نکلنے کے لیے کچھ ایسی بے تاب تھی کہ سوئی کا ذرا سا چھید پاتے ہی فوراً فوارہ کی طرح مضطربانہ اچھلی اور دو تین سیکنڈ بھی ابھی نہیں گزرے تھے کہ غبارہ خالی ہو کے سکڑ گیا اور زمین پر گر گیا۔

یقین کیجیے، آج کل بعینہٖ ایسا ہی حال اپنے سینہ کا بھی محسوس کر رہا ہوں۔

غبارے کی طرح اس میں بھی کوئی پُر جوش عنصر ہے جو بھر گیا ہے اور نکلنے کے لیے بیتاب ہے۔ اگر کوئی ہاتھ ایک سوئی اٹھا کر چبھو دے تو مجھے یقین ہے اس میں سے بھی ویسا ہی جوش اُمنڈ کر اچھلے گا جیسا غبارہ سے ایک مضطرب چیخ کے ساتھ اُچھلا تھا:

شدآں کہ اہلِ نظر بر کنارہ می رفتند
ہزار گونہ سخن بردہان و لب خاموش
بابانگ چنگ بگوئیم آں حکایت ہا !
کہ از نہفتنِ آں دیگِ سینہ می زد جوش[1]

کل رات ایک عجیب طرح کی حالت پیش آئی۔ کچھ دیر کے لیے ایسا محسوس ہونے لگا کہ سوئی چبھ رہی ہے اور شاید دل کی بھاپ پانی بن کر بہنا شروع ہو جائے لیکن یہ محض ایک سانحہ تھا، جو آیا اور گذر گیا اور طبیعت پھر بند کی بند رہ گئی۔ دیگ نے جوش کھایا لیکن پھوٹ کر بہہ نہ سکی۔

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا ![2]

میرے ساتھ لاسلکی کا ایک سفری (پورٹیبل) سیٹ سفر میں رہا کرتا تھا۔ جب بمبئی میں گرفتار کر کے یہاں لایا گیا تو سامان کے ساتھ وہ بھی آ گیا۔ لیکن جب سامان قلعہ کے اندر لایا گیا تو اس میں سیٹ نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ باہر روک لیا گیا ہے۔ جیلر سے پوچھا تو اُس نے کہا کمانڈنگ آفیسر کے حکم سے روکا گیا ہے اور اب گورنمنٹ سے اس بارے میں دریافت کیا جائے گا۔ بہر حال جب یہاں اخباروں کا آنا روک دیا گیا تھا تو ظاہر ہے کہ لاسلکی کے سیٹ کی اجازت کیونکر دی جا سکتی تھی؟ تین ہفتہ کے بعد اخبار کی روک تو اٹھ گئی مگر سیٹ پھر بھی نہیں دیا گیا۔ وہ چیتہ خاں کے آفس میں مقفل پڑا رہا۔ اب میں نے چیتہ خاں کو دے دیا ہے کہ اپنے بنگلہ میں لگا کر کام میں لائے، کیونکہ اب وہ جس بنگلہ میں منتقل ہوا ہے، اس میں لاسلکی سیٹ نہیں ہے۔

لیکن آج کل کوئی فوجی افسر ہمارے احاطہ کے قریب قلعہ میں فروکش ہے، اس کے پاس لاسلکی سیٹ ہے۔ کبھی کبھی اس کی آواز یہاں بھی آ نکلتی ہے۔ کل رات بہت صاف

آنے لگی تھی۔ غالباً بی، بی، سی کا پروگرام تھا اور کوئی وایولین (Violin) بجانے والا اپنا کمال دکھا رہا تھا۔ لَے ایسی تھی، جیسی کہ (Mendelssohn)[3] کے مشہور قطعہ "نغمہ بغیر لفظ" (سوانگس ود آؤٹ ورڈز) کی سننے میں آئی تھی:

(۴۲۸)
حدیثِ عشق کہ از حرف وصوت مستغنی ست
بہ نالہ دف و نَے در خروش و ولولہ بود![4]

ناگہاں ایک مغنّیہ خوش لہجہ کی صدائے درد انگیز اُٹھی اور اس نے ساز کے زیر و بم کے ساتھ مل کر وہ عالم پیدا کر دیا جس کی طرف خواجہ شیراز نے اشارہ کیا ہے۔

(۴۲۹)
چہ راہ می زندایں مطرب مقام شناس
کہ درمیانِ غزل قولِ آشنا آورد[5]

پہلے طبیعت پر ایک فوری اثر پڑا، ایسا محسوس ہوا، جیسے پھوڑا پھوٹنے لگا ہے لیکن یہ حالت چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہی۔ پھر دیکھا تو بدستور انقباضِ خاطر واپس آ گیا تھا:

(۴۳۰)
یا مگر کاوشِ آں نشترِ مژگاں کم شد
یا کہ خود زخمِ مرا لذّتِ آزار نماند[6]

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ایک زمانے میں مجھے فنِ موسیقی کے مطالعہ اور مشق کا بھی شوق رہ چکا ہے۔ اس کا اشتغال کئی سال تک جاری رہا تھا۔ ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ ۱۹۰۵ء میں جب تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور طلباء کو پڑھانے میں مشغول تھا تو کتابوں کا شوق مجھے اکثر ایک کتب فروش خدا بخش کے یہاں لے جایا کرتا تھا جس نے ویلزلی اسٹریٹ میں مدرسہ کالج کے سامنے دکان لے رکھی تھی اور زیادہ تر عربی اور فارسی کی قلمی کتابوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے فقیر اللہ سیف[7] خاں کی راگ درپن کا ایک نہایت خوش خط اور مصور نسخہ مجھے دکھایا اور کہا کہ یہ کتاب فن موسیقی میں ہے۔ سیف خاں عالمگیری عہد کا ایک امیر تھا اور ہندوستان کی موسیقی کے علم و عمل کا ماہر تھا۔ اس نے سنسکرت کی ایک کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا جو راگ درپن کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ نسخہ جو خدا بخش کے ہاتھ لگا تھا آصف جاہ[8] کے لڑکے ناصر جنگ[9] شہید کے کتب خانہ کا تھا اور نہایت اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا تھا۔ میں ابھی اس کا دیباچہ دیکھ رہا تھا کہ مسٹر ڈینسن راس[10] آ گئے جو

اِس زمانے میں مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل تھے اور ایرانی لہجہ میں فارسی بولنے کے بہت شائق تھے۔ یہ دیکھ کر کہ ایک کمسن لڑکا فارسی کی ایک قلمی کتاب کا غور وخوض سے مطالعہ کر رہا ہے، متعجب ہوئے اور مجھ سے فارسی میں پوچھا "یہ کس مصنف کی کتاب ہے" ؟ میں نے فارسی میں جواب دیا کہ سیف خاں کی کتاب ہے اور فن موسیقی میں ہے۔ انہوں نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا کہ ہندوستان کا فن موسیقی بہت مشکل فن ہے۔ کیا تم اس کتاب کے مطالب سمجھ سکتے ہو؟ میں نے کہا جو کتاب بھی لکھی جاتی ہے، اسی لیے لکھی جاتی ہے کہ لوگ پڑھیں اور سمجھیں۔ میں بھی اسے پڑھوں گا تو سمجھ لوں گا۔ انہوں نے ہنس کر کہا: تم اسے نہیں سمجھ سکتے، اگر سمجھ سکتے ہو تو مجھے اس صفحہ کا مطلب سمجھاؤ۔ انہوں نے جس صفحہ کی طرف اشارہ کیا تھا، اس میں مبادیات کی تقسیموں کا بیان تھا۔ میں نے الفاظ پڑھ لیے مگر مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ شرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا اور بالآخر کہنا پڑا کہ اس وقت اس کا مطلب بیان نہیں کر سکتا بغور مُطالعہ کرنے کے بعد بیان کر سکوں گا۔

میں نے کتاب لے لی اور گھر آ کر اسے آوّل سے آخر تک پڑھ لیا لیکن معلوم ہوا کہ جب تک موسیقی کی مصطلحات پر عبور نہ ہو اور کسی ماہر فن سے اس کی مبادیات سمجھ نہ لی جائیں، کتاب کا مطلب سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ طبیعت طالب علمی کے زمانے میں اس بات کی خوگر ہو گئی تھی کہ جو کتاب بھی ہاتھ آئی، اس پر ایک نظر ڈالی اور تمام مطالب پر عبور ہو گیا۔ اب جو یہ رکاوٹ پیش آئی تو طبیعت کو سخت اُلجھن ہوئی اور خیال ہوا کہ کسی واقف کار سے مدد لینی چاہیے لیکن مدد لی جائے تو کس سے لی جائے؟ خاندانی زندگی کے حالات ایسے تھے کہ اس کوچہ سے رسم وراہ رکھنے والوں کے ساتھ ملنا آسان نہ تھا۔ آخر خیال مسیتا خان کی طرف گیا۔ اس پیشہ کا یہی ایک آدمی تھا جس کی ہماری یہاں گذر تھی۔

اس مسیتا خاں کا حال بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ سونی پت ضلع انبالہ کا رہنے والا تھا اور پیشہ کا خاندانی گویا تھا۔ گانے کے فن میں اچھی استعداد بہم پہنچائی تھی اور دہلی اور جے پور کے استادوں سے تحصیل کی تھی۔ کلکتہ میں طوائفوں کی مُعلّمی کیا کرتا تھا۔

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے[!!]

یہ والد مرحوم کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ اس

طرح کے لوگوں کو مرید نہیں کرتے تھے لیکن اصلاح وتوجہ کا دروازہ بند بھی نہیں کرتے۔ فرماتے، بغیر بیعت کے آتے رہو دیکھو، خدا کو کیا منظور ہے۔ اکثر حالتوں میں ایسا ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد لوگ خود بخود اپنا پیشہ چھوڑ کر تائب ہو گئے۔ چنانچہ مسیتا خاں کو بھی یہی جواب ملا۔ والد مرحوم جمعہ کے دن وعظ کے بعد جامع مسجد سے مکان آتے تو پہلے کچھ دیر دیوان خانہ میں بیٹھتے، پھر اندر جاتے؛ خاص خاص مرید پالکی کے ساتھ چلتے ہوئے آجاتے اور اپنی اپنی معروضات پیش کر کے رخصت ہو جاتے۔ مسیتا خاں بھی ہر جمعہ وعظ کے بعد حاضر ہوتا اور دور فرش کے کنارے دست بستہ کھڑا رہتا۔ کبھی والد مرحوم کی نظر پڑ جاتی تو پوچھ لیتے مسیتا خاں کیا حال ہے؟ عرض کرتا، حضور کی نظرِ کرم کا امیدوار ہوں۔ فرماتے ہاں اپنے دل کی لگن میں لگے رہو۔ وہ بے اختیار ہو کر قدموں پر گر جاتا اور اپنے آنسوؤں کی جھڑی سے انہیں تر کر دیتا۔ ہا، ذوق نے کیا خوب کہا ہے: [۱۲]

ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت اس قدر آستین و دامن
کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

کبھی عرض کرتا: "رات کے دربار میں حاضری کا حکم ہو جائے۔" یعنی رات کی مجلس خاص میں جو مریدوں کی تعلیم و ارشاد کے لیے ہفتہ میں ایک بار منعقد ہوا کرتی تھی۔ اسے والد مرحوم ٹال جاتے مگر ان کے ٹالنے کا بھی ایک خاص طریقہ تھا؛ فرماتے: اچھی بات ہے دیکھو ساری باتیں اپنے وقت پر ہو رہیں گی۔" وہ جاں باختۂ امید و بیم، اتنے ہی میں نہال ہو جاتا اور رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے گھر کی راہ لیتا۔ خواجہ حافظ ان معاملات کو کیا ڈوب کر کہہ گئے ہیں: [۱۳]

بحاجب درِ خلوت سرائے خاص بگو
"فلاں ز گوشہ نشینانِ خاکِ درگہِ ماست"

لیکن بالآخر اس کا عجز و نیاز اور صدق طلب رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ والد مرحوم نے اسے مرید کر لیا تھا اور حلقہ میں بیٹھنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ اسے بھی کچھ ایسی توفیق ملی کہ طوائفوں کی نوچیوں کی مُعلّمی سے تائب ہو گیا اور ایک بنگالی زمیندار کی ملازمت پر قناعت کر لی۔ والد مرحوم کو میں نے ایک مرتبہ یہ کہتے سنا تھا کہ مسیتا خاں کا حال دیکھتا ہوں

تو پیر چنگی [۱۴] کی حکایت یاد آ جاتی ہے یعنی مولانا روم والے پیر چنگی کی:

پیر چنگی کے بود مردِ خُدا
حبّذا اے سرِّ پنہاں ، حبّذا [۱۵]

(۴۳۲)

بہر حال میرا خیال اسی مسیتا خاں کی طرف گیا اور اس سے اس معاملہ کا ذکر کیا۔ پہلے تو اسے کچھ حیرانی سی ہوئی لیکن پھر جب معاملہ پوری طرح سمجھ میں آ گیا تو بہت خوش ہوا کہ مرشد زادہ کی نظر توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی ہے لیکن اب مشکل یہ پیش آئی کہ یہ تجویز عمل میں لائی جائے تو کیسے لائی جائے؟ گھر میں جہاں ہدایہ اور مشکوٰۃ [۱۶] کے پڑھنے والوں کا مجمع رہتا تھا، سارا گاما کی سبق آموزیوں کا موقع نہ تھا اور دوسری جگہ بالالتزام جانا اشکال سے خالی نہ تھا۔ بہر حال اس مشکل کا ایک حال نکال لیا گیا اور ایک رازدار مل گیا جس کے مکان میں نشست و برخاست کا انتظام ہو گیا۔ پہلے ہفتہ میں تین دن مقرر کیے تھے پھر روز سہ پہر کے وقت جانے لگا۔ مسیتا خاں پہلے سے وہاں موجود رہتا اور دو تین گھنٹے تک موسیقی کے علم و عمل کا مشغلہ جاری رہتا:

عشق می ورزم و امید کہ ایں فن شریف
چوں ہنر ہائے دگر موجبِ حرماں نشود! [۱۷]

مسیتا خاں نے تعلیم کا صرف ایک ہی ڈھنگ رٹا ہوا تھا جو اس فن کے استادوں کا عام طریقہ ہوتا ہے۔ وہی اس نے یہاں بھی چلایا، لیکن میں نے اسے روک دیا اور کوشش کی کہ اپنے طریقے پر معلومات مرتب کروں۔ موسیقی کے آلات میں زیادہ تر توجہ ستار پر ہوئی اور بہت جلد اس سے انگلیاں آشنا ہو گئیں۔ اب سوچتا ہوں تو حسرت ہوتی ہے کہ وہ بھی کیا زمانہ تھا اور طبیعت کے کیا کیا ولولے تھے۔ میری عمر سترہ برس سے زیادہ نہ ہو گی لیکن اُس وقت بھی طبیعت کی افتاد یہی تھی کہ جس میدان میں قدم اٹھائیے، پوری طرح اُٹھائیے اور جہاں تک راہ ملے بڑھتے ہی جائیے۔ کوئی کام بھی ہو لیکن طبیعت اس پر کبھی راضی نہیں ہوئی کہ اُدھورا کر کے چھوڑ دیا جائے۔ جس کوچہ میں بھی قدم اُٹھایا اسے پوری طرح چھان کر چھوڑا۔ ثواب کے کام کیے تو وہ بھی پوری طرح کیے، گناہ کے کام کیے تو انہیں بھی ادھورا نہ چھوڑا۔ رندی کا کوچہ ملا تھا تو اس میں بھی سب سے آگے رہے تھے، پارسائی کی راہ ملی تو اس

میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ طبیعت کا تقاضا ہمیشہ یہی رہا کہ جہاں کہیں جایئے ناقصوں اور خام کاروں کی طرح نہ جایئے۔ رسم وراہ رکھیے تو راہ کے کاملوں سے رکھیے۔ شیخ علی حزیں نے میری زبانی کہا تھا:

تا دسترسم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ نہ دارم [۱۸]

چنانچہ اس کوچہ میں بھی قدم رکھا تو جہاں تک راہ مل سکی، قدم بڑھائے جانے میں کوتاہی نہیں کی۔ ستار کی مشق چار پانچ سال تک جاری رہی تھی۔ بین سے بھی انگلیاں نا آشنا نہیں رہیں لیکن زیادہ دل بستگی اس سے نہ ہو سکی۔ پھر اس کے بعد ایک وقت آیا کہ یہ مشغلہ یک قلم متروک ہو گیا اور اب تو گزرے ہوئے وقتوں کی صرف ایک کہانی باقی رہ گئی ہے۔ البتہ انگلی پر سے مضراب کا نشان بہت دنوں تک نہیں مٹا تھا:

اب جس جگہ کہ داغ ہے، یاں پہلے درد تھا! [۱۹]

اس عالم رنگ و بو میں ایک روش تو مکھی کی ہوئی کہ شہد پر بیٹھتی ہے تو اس طرح بیٹھتی ہے کہ پھر اٹھ نہیں سکتی:

کہ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند ترے [۲۰]

اور ایک بھنورے [۲۱] کی ہوئی کہ ہر پھول پر بیٹھے، بو باس لی اور اُڑ گئے:

تک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور چل نکلے [۲۲]

چنانچہ زندگی کے چمنستان ہزار رنگ کا ایک پھُول یہ بھی تھا۔ کچھ دیر کے لیے رُک کر بو باس لے لی اور آگے نکل گئے۔ مقصود اس اشتغال سے صرف یہ تھا کہ طبیعت اس کوچہ سے نا آشنا نہ رہے کیونکہ طبیعت کا توازن اور فکر کی لطافت بغیر موسیقی کی ممارست کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب ایک خاص حد تک یہ مقصد حاصل ہو گیا تو پھر مزید اشتغال نہ صرف غیر ضروری تھا بلکہ موانع کار کے حکم میں داخل ہو گیا تھا۔ البتہ موسیقی کا ذوق اور تاثر جو دِل کے ایک ایک ریشے میں رچ گیا تھا، دل سے نکالا نہیں جا سکتا تھا اور آج تک نہیں نکلا:

جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا [۲۳]

حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں، حسن ہے اور حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔ افسوس اس محروم ازلی پر جس کے بے حس دل نے اس مطالبہ کا جواب دینا نہ سیکھا ہو!

سینۂ گرم نداری مطلب صحبتِ عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ ات، عُود مخر [۲۴]
﴿۴۳۵﴾

میں آپ سے ایک بات کہوں! میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے۔ میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آوازِ خوش میرے لیے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے:

روئے نکو معالجۂ عمر کوتہ است
ایں نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ اند [۲۵]
﴿۴۳۶﴾

مجھے اگر آپ زندگی کی رہی سہی راحتوں سے محروم کر دینا چاہتے ہیں تو صرف اس ایک چیز سے محروم کر دیجیے آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ یہاں احمد نگر کے قید خانے میں اگر کسی چیز کا فقدان مجھے ہر شام محسوس ہوتا ہے تو وہ ریڈیو سیٹ کا فقدان ہے:

لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی! [۲۶]

جس زمانے میں موسیقی کا اشتغال جاری تھا، طبیعت کی خود رفتگی اور محویت کے بعض ناقابل فراموش احوال پیش آئے۔ جو اگرچہ خود گزر گئے لیکن ہمیشہ کے لیے دامنِ زندگی پر اپنا رنگ چھوڑ گئے۔ اسی زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ آگرہ کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اپریل کا مہینہ تھا اور چاندنی کی ڈھلتی ہوئی راتیں تھیں۔ جب رات کی پچھلی پہر شروع ہونے کو ہوتی تو چاند پردۂ شب ہٹا کر یکایک جھانکنے لگتا۔ [۲۷] میں نے خاص طور پر کوشش کر کے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ رات کو ستار لے کر تاج چلا جاتا اور اس کی چھت پر جمنا کے رخ بیٹھ جاتا۔ پھر جونہی چاندنی پھیلنے لگتی ستار پر کوئی گیت چھیڑ دیتا اور اس میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریب تخیل کے کیسے کیسے جلوے انہی آنکھوں کے آگے گذر چکے ہیں:

گدائے میکدہ ام، لیک وقتِ مستی بیں
کہ ناز برفلک و حکم برستارہ کُنم ![28]

رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات، چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے، برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں، بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا، نیچے جمنا کی رُوپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اُوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے:

زخمہ بر تارِ رگِ جاں می زنم
کس چہ داند تا چہ دستاں می زنم[29]

کچھ دیر تک فضاء تھمی رہتی۔ گویا کان لگا کر خاموشی سے سن رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا۔ چاند بڑھنے لگتا۔ یہاں تک کہ سر پر آ کھڑا ہوتا۔ ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے۔ درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آ آ کر جھومنے لگتیں۔ رات کے سیاہ پردوں کے اندر سے عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی دیتیں۔ بارہا تاج کی برجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ منارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے برجیوں سے باتیں کی ہیں اور جب کبھی تاج کے گنبد خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے تو اس کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے!

تو مپندار کہ ایں قصہ زخودمی گویم
گوش نزدیکِ لبم آر کہ آوازے ہست[30]

اِس زمانے کے کچھ عرصہ بعد لکھنؤ جانے اور کئی ماہ تک ٹھہرنے کا اتفاق ہوا......
آپ بھولے نہ ہوں گے کہ سب سے پہلے آپ سے وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ نے قلمی کتابوں کے تاجر عبدالحسین سے کلیاتِ صائب کا ایک نسخہ خریدا تھا اور مجھے یہ کہہ کر دکھایا تھا

کہ قلمی کتابوں کا بھی آپ کو کچھ شوق ہے؟

﴿۴۴۰﴾ ایں سخن را چہ جواب ست، تو ہم میدانی [۴۱]

اسی قیام کے دوران میں مرزا محمد ہادی [۴۲] مرحوم سے شناسائی ہوئی۔ وہ موسیقی میں کافی دخل رکھتے تھے اور چونکہ علم و فن کی راہوں سے آشنا تھے اس لیے علمی طریقہ پر اسے سمجھتے اور سمجھا سکتے تھے۔ مجھے ان سے اپنی معلومات کی تکمیل میں مدد ملی۔ افسوس وہ بھی چل بسے:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس، تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی [۴۳]

اس زمانے میں کرسچین کالج کے سامنے پانچ روپے ماہوار کرایہ کا ایک مکان لے رکھا تھا۔ وہی ان کی دنیا تھی۔ علم ہیئت کے شوق نے نجاری کے مشغلہ سے آشنا کر دیا تھا۔ جب کالج سے آتے تو مکان کی چھت پر لکڑی کے دوائر قطر اور نصف اور ثلث بنانے میں مشغول ہو جاتے اور اس طرح اپنی رصد بندیوں کا سامان کرتے۔ چھت کی سیڑھی ٹوٹی ہوئی تھی؛ جست لگا کر اُوپر پہنچتے اور ساری رات ستاروں کی ہم نشینی میں بسر کر دیتے۔

﴿۴۴۱﴾ کہ با جام و سبو ہر شب قرین ماہ و پروینم [۴۴]

کئی برس کے بعد پھر لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا تو انہیں ایک دوسرے ہی عالم میں پایا۔ ایک رشتہ دار کے انتقال سے کالپی کی کچھ جائداد ورثہ میں مل گئی تھی اور اب جوانی کی محرومیوں کا بڑھاپے کی ذوق اندوزیوں سے کفارہ کرنا چاہتے تھے۔

﴿۴۴۲﴾ وقتِ عزیز رفت ، بیا تا قضا کنیم
عمرے کہ بے حضورِ صراحی و جام رفت [۴۵]

یہ گرمجوشیاں چونکہ موسیقی کے ذوق کے پردے میں ابھری تھیں اس لیے شاہدانِ نغمہ پرداز سے صحبتیں گرم رہتی تھیں اور بعض استادانِ فن سے بھی مذاکرہ جاری رہتا۔ اس مرتبہ اگرچہ میرا قیام بہت مختصر رہا لیکن جتنے دن رہا موسیقی کے مذاکرات ہوتے رہے۔ اسی زمانے کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے معارف النغمات [۴۶] کی ترتیب میں مدد دی جو چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

بچپنے میں حجاز کی مترنّم صداؤں سے کان آشنا ہو گئے تھے۔ صدرِ اوّل کے زمانے سے لے کر جس کا حال ہم کتاب الاغانی اور عقد الفرید [۳۷] وغیرہ میں پڑھ چکے ہیں، آج تک حجازیوں کا ذوقِ موسیقی غیر متغیّر رہا۔ یہ ذوق ان کے خمیر میں کچھ اس طرح پیوست ہو گیا تھا کہ اذان کی صداؤں تک کو موسیقی کے نقشوں میں ڈھال دیا۔ آج کل کا حال معلوم نہیں لیکن اس زمانے میں حرم شریف کے ہر منارہ پر ایک مؤذن متعیّن ہوتا تھا اور اُن سب کے اوپر شیخ المؤذنین ہوتا۔ اس زمانے میں شیخ المؤذنین شیخ حسن تھے اور بڑے ہی خوش آواز تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رات کی پچھلی پہر [۳۸] میں ان کی ترحیم ☆ کی نوائیں ایک سماں باندھ دیا کرتی تھیں۔ ہمارا مکان قدوہ میں باب السّلام کے پاس تھا۔ کوٹھے کی کھڑکیوں سے مناروں کی قندیلیں صاف نظر آتی تھیں اور صبح کی اذان اس طرح سنائی دیتی جیسے چھت پر کوئی اذان دے رہا ہو۔ جب عراق اور مصر وشام کے سفر کا اتفاق ہوا تو موجودہ عربی موسیقی کی جستجو ہوئی۔ معلوم ہوا کہ قدماء کی بہت سی مصطلحات جو ہمیں کتاب الاغانی اور خوارزمی [۳۹] وغیرہ میں ملتی ہیں، اب کوئی نہیں جانتا۔ تعبیر و تقسیم کے اسماء و رموز تقریباً بدل گئے ہیں اور عربی کی جن مصطلحات نے ایران پہنچ کر فارسی کا جامہ پہن لیا تھا، وہ اب پھر عربی میں واپس آ کر معرب ہو گئی ہیں۔ البتہ فن کی پرانی بنیادیں ابھی تک متزلزل نہیں ہوئیں۔ وہی بارہ راگنیاں اب بھی اصل و بنیاد کا کام دے رہی ہیں جو یونانی موسیقی کی تقلید میں وضع ہوئی تھیں۔ آسمان کے بارہ برجوں کی طرف اب بھی انہیں اسی طرح منسوب کیا جاتا ہے جس طرح قدماء نے کیا تھا۔ آلاتِ موسیقی میں اگرچہ بہت سی تبدیلیاں ہو گئیں لیکن عود کے پردے ابھی تک خاموش نہیں ہوئے ہیں اور ان کے زخموں سے وہ نوائیں اب بھی سنی جا سکتی ہیں جو کبھی ہارون الرشید [۴۱] کی شبستان طرب میں اسحاق موصلی [۴۲] اور ابراہیم [۴۳] بن مہدی کے مضراب سے اُٹھا کرتی تھیں:

ایں مطرب از کجاست کہ سازِ "عراق" ساخت
وآہنگ باز گشت ز "راہ" حجاز کرد [۴۴]

☆ صبح کی اذان سے پہلے مختلف کلماتِ ادعیہ ایک خاص لحن میں دہرائے جاتے ہیں، اسے "ترحیم" کہتے ہیں۔ کم سے کم سو برس پہلے بھی یہ رسم جاری تھی، کیونکہ ملّا علی قاری [۴۵] اور صاحب الباعث نے اسے بھی بدع ومحدثات میں سے شمار کیا تھا۔

''عراق'' اور ''حجاز'' دوراگنیوں کے نام ہیں اور ''راہ'' یعنی سُر

مطرب نگاہ دار ہمیں ''رہ'' کہ میزنی [45]

اس زمانے میں شیخ احمد سلامہ [46] حجازی کا جوق مصر میں بہت مشہور اور نامور تھا ''جوق'' وہاں منڈلی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں منڈلی کے لیے ''طائفہ'' کا لفظ اختیار کیا تھا پھر اس کی جمع طوائف ہوئی اور رفتہ رفتہ طوائف کے لفظ نے مفرد معنی پیدا کر لیے، یعنی زنِ رقاصہ ومغنّیہ کے معنی میں بولا جانے لگا۔ شیخ سلامہ کا جوق قاہرہ کے اوپیرہ ہاؤس میں اکثر اپنا کمال دکھایا کرتا تھا اور شہر کی کوئی بزم طرب بغیر اس کے بارونق نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مجھے بارہا اس کے سننے کا اتفاق ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ عربی موسیقی آج کل جیسی کچھ اور جتنی کچھ بھی ہے وہ اس کا پورا ماہر تھا۔ ایک دوست کے ذریعہ اس سے شناسائی پیدا کی تھی اور موجودہ عربی موسیقی پر مذاکرات کیے تھے۔

اسے زمانے میں مصر کی ایک مشہور ''عالمہ'' [47] طاہرہ نامی باشندۂ طنطا تھی۔ ''عالمہ'' مصر میں مغنّیہ کو کہتے ہیں یعنی موسیقی کا علم جاننے والی۔ ہمارے علماء کرام کو اِس اصطلاح سے غلط فہمی نہ ہو۔ یورپ کی زبانوں میں یہی لفظ (Alma) ہوگیا ہے۔ شیخ سلامہ بھی اس عالمہ کی فن دانی کا اعتراف کرتا تھا۔ وہ خود بھی بلائے جان تھی، مگر اس کی آواز اس سے بھی زیادہ آفتِ ہوش وایمان تھی۔ میں نے اس سے بھی شناسائی بہم پہنچائی اور عربی موسیقی کے کمالات سنے۔ دیکھیے اس خانماں خراب شوق نے کن کن گلیوں کی خاک چھنوائی:

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگور کو میں ! [48]

جس زمانے کے یہ واقعات لکھ رہا ہوں، اس سے کئی سال بعد مصر میں اُم کلثوم [49] کی شہرت ہوئی اور اب تک قائم ہے۔ میں نے اس کے بے شمار ریکارڈ سنے ہیں اور قاہرہ، انگورہ، [50] طرابلس الغرب، [51] فلسطین اور سنگاپور کے ریڈیو اسٹیشن آج کل بھی اس کی نواؤں سے گونجتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس شخص نے اُم کلثوم کی آواز نہیں سنی ہے وہ موجودہ عربی موسیقی کی دلآیزیوں کا کچھ اندازہ نہیں کرسکتا۔ اس کے مشہور

انشادات میں سے ایک نشید عُلَیّہ بنت[52] المھدی کا مشہور نسیب ہے:

وحبّب ، فان الحبّ داعیۃ الحب
وکم من بعید الدار مستوجب القرب

البتہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ قدیم یونانی موسیقی کی طرح عربی موسیقی بھی نسبتاً سادہ اور دِقّتِ تالیف کی کاوشوں سے خالی ہے۔ ہندوستان نے اِس معاملہ کو جن گہرائیوں تک پہنچا دیا، حق یہ ہے کہ قدیم تمدنوں میں سے کوئی تمدّن بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ حسنِ تقسیم اور دقّتِ ترتیب یہاں کی ہر فنی شاخ کی عام خصوصیت رہی ہے۔

لیکن جہاں تک نفسِ فن کی دقیقہ سنجیوں کا تعق ہے، اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یورپ کا موجودہ فن موسیقی جس کی بنیاد نشأۃ ثانیہ (Renascence) کے باکمالوں نے رکھی تھی منتہائے کمال تک پہنچا دیا گیا ہے اور گو ذوق سماع کے اختلاف سے ہمارے کان اس کی پوری قدر شناسی نہ کرسکیں لیکن دماغ اس کی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دراصل اشیاء و معانی کے تمام مرکب مزاجوں کی طرح موسیقی کا مزاج بھی ترکیبی واقع ہوا ہے اور سارا معاملہ مفرد اصوات والحان کی تالیف سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ ان مفرد اجزاء کی ترکیب کا تسویہ اور تناسب جس قدر دقیق اور نازک ہوتا جائے گا، موسیقی کی گہرائیاں اتنی ہی بڑھتی جائیں گی۔ اس اعتبار سے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے یورپ کا فنِ موسیقی فکر انسان کی دقّت آفرینیوں کا ایک غیر معمولی نمونہ ہے اور جرمنی کے باکمالانِ فن نے تو اس باب میں بڑی ہی سحر کاری کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موسیقی اور شاعری ایک ہی حقیقت کے دو مختلف جلوے ہیں اور ٹھیک ایک ہی طریقہ پر ظہور پذیر بھی ہوتے ہیں۔ موسیقی کا مؤلف الحان کے اجزا کو وزن و تناسب کے ساتھ ترکیب دے دیتا ہے۔ اسی طرح شاعر بھی الفاظ و معانی کے اجزاء کو حسن ترکیب کے ساتھ باہم جوڑ دیتا ہے:

(۴۴۶) تو حنا بستی و من معنی رنگیں بستم![53]

جو حقائق شعر میں الفاظ و معانی کا جامہ پہن لیتے ہیں وہی موسیقی میں الحان و ایقاع کا بھیس اختیار کرلیتے ہیں۔ نغمہ بھی ایک شعر ہے لیکن اسے حرف و لفظ کا بھیس نہیں ملا۔

اس نے اپنی رُوح معنی کے لیے نواؤں کا بھیس طیار کرلیا۔

(۴۴۷) والاذن تعشق قبل العین احیانا [۵۴]

یہ کیا بات ہے کہ بعض الحان دَرد والم کے جذبات برانگیختہ کر دیتے ہیں، بعض کے سُننے سے مسّرت وانبساط کے جذبات اُمنڈنے لگتے ہیں؛ بعض کی لَے ایسی ہوتی ہے جیسے کہہ رہی ہو کہ زندگی اور زندگی کے سارے ہنگامے ہیچ ہیں۔ بعض کی لَے ایسی محسوس ہوتی ہے، جیسے اشارہ کررہی ہو کہ:

(۴۴۸) یاراں! صلائے عام است گرمی کنید کارے! [۵۵]

یہ وہی معانی ہیں جو موسیقی کی زبان میں اُبھرنے لگتے ہیں۔ اگر یہ شعر کا جامہ پہن لیتے تو کبھی حافظ [۵۶] کا ترانہ ہوتا، کبھی خیام [۵۷] کا زمزمہ، کبھی شیلے [۵۸] (Shelley) کی ماتم سرائیاں ہوتیں، کبھی ورڈز ورتھ [۵۹] (Wordsworth) کی حقائق سرائیاں:

(۴۴۹) دریں میدان پُر نیرنگ حیران ست دانائی
که یک هنگامه آرائی و صد کشور تماشائی! [۶۰]

یہ عجیب بات ہے کہ عربوں نے ہندوستان کے تمام علوم وفنون میں دلچسپی لی لیکن ہندوستان کی موسیقی پر ایک غلط انداز نظر بھی نہ ڈال سکے۔ ابوریحان البیرونی [۶۱] نے کتاب الہند میں ہندوؤں کے تمام علوم وعقائد پر نظر ڈالی ہے اور ایک باب "فی کتبھم فی سائرِ العُلوم" پر بھی لکھا ہے، مگر موسیقی کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ ڈاکٹر اڈورڈ سخاؤ [۶۲] (Sachau) نے الآثار الباقیہ کے مقدمہ میں البیرونی کا ایک مکتوب درج کیا ہے جس میں اُس نے اپنی تمام مصنّفات کا بہ تفصیل ذکر کیا تھا، لیکن اس میں بھی اس موضوع پر کوئی تصنیف نظر نہیں آتی۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے نائیک سلطان محمود [۶۳] اور سلطان مسعود [۶۴] کے درباروں میں اپنے کمالاتِ فن کی نمائشیں کرنے لگے تھے اور ہندوستان کے ڈھول اور باجے غزنین کے گلی کوچوں میں بجائے جارہے تھے۔ غالبًا اس تغافل کی وجہ کچھ تو یہ ہوگی کہ علوم عقلیہ کے شوق واشتغال نے اس کی بہت کم مہلت دی کہ فنون لطیفہ کی طرف توجہ کرتے اور کچھ یہ بات بھی ہوگی کہ عربوں کا ذوقِ سماع ہندوستان کے ذوقِ سماع سے اس درجہ مختلف تھا کہ ایک کے کان دوسرے کی نواؤں سے بہ مشکل آشنا

ہو سکتے تھے۔

ہندوستان کی موسیقی کی طرح ہندوستان کے ڈراموں سے بھی عرب مصنف یک قلم نا آشنا رہے۔ البیرونی نے سنسکرت کی شاعری اور فنِ عروض کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے لیکن ناٹک کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ یونانی ادبیات کی طرح سنسکرت ادبیات کی بھی ایک خاص اور ممتاز چیز ناٹک ہے۔

خود یونان کے فنونِ ادبیہ کے ساتھ بھی عربوں نے ایسا ہی تغافل برتا؛ یونان کی شاعری اور ڈراموں کی انہیں بہت کم خبر تھی۔ ہومر[۶۵] اور سوفاکلیس[۶۶] وغیرہما کے نام انہیں ارسطو[۶۷] کے مقالات اور افلاطون[۶۸] کی جمہوریت سے معلوم ہو گئے تھے لیکن اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ کر سکے۔ ابنِ رشد[۶۹] نے کامیڈی[۷۰] اور ٹریجڈی[۷۱] کی جو تعریف اپنی شرح میں کی ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یونانی ڈرامہ کی حقیقت سے اُس کا دماغ کس درجہ نا آشنا تھا۔ وہ کامیڈی کو ہجو اور ٹریجڈی کو مدح سے تعبیر کرتا ہے۔

یہ بات بھی صاف نہیں ہوئی کہ یونانی فنِ بلاغت سے آئمہ بلاغتِ عرب کہاں تک متاثر ہوئے تھے؟ بظاہر انہوں نے اسے قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ ارسطو کے مقالات، خطابت اور شاعری پر عربی میں منتقل ہو گئے تھے اور ابنِ رشد نے اپنی شروح میں انہیں بھی شامل کیا لیکن عرب آئمہ فن نہ تو اس کی روح سمجھ سکے اور نہ بلاغت عربی کی سرگرانیوں نے اس کی مہلت دی کہ سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ارسطو نے اپنے دونوں مقالوں میں جو کچھ لکھا ہے، وہ تمام تر یونانی خطابت اور شاعری کے نمونوں پر مبنی ہے اور عربی دماغ ان سے آشنا نہ تھا۔ آپ نے ابنِ قدامہ[۷۲] کی نقد الشعر کا ضرور مطالعہ کیا ہوگا۔ چوتھی صدی کے بغداد کے علمی حلقہ میں اُس کا نشو و نما ہوا تھا اور وہ نسلاً رومی تھا۔ چند سال ہوئے اسکوریال[۷۳] (اسپین) کے کتب خانہ میں ایک کتاب کا سراغ ملا، جس کی لوح پر ''نقد النثر'' درج تھا مگر مصنف کا نام مٹا ہوا تھا۔ بہت غور کرنے سے ابو جعفر ابنِ قدامہ سے ملتے جلتے حروف دکھائی دینے لگے۔ جب اس نام کی کتاب دنیا کے کتب خانوں کی فہرستوں میں ڈھونڈھی گئی تو معلوم ہوا کہ کوئی دوسرا نسخہ اس کا موجود نہیں۔ اسکوریال کے کتب خانہ میں زیادہ تر وہی کتابیں ہیں جو سترھویں صدی میں سلطان مراکش کے دو جہازوں کی لوٹ سے اسپین

کے ہاتھ آئی تھیں۔ چونکہ اس زمانے میں اسلامی ذخیروں کو تباہ کرنے کی مسیحی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ چکی تھیں، اس لیے انہیں ضائع نہیں کیا گیا اور اسکوریال کی خانقاہ میں رکھ دی گئیں۔ یقیناً یہ نسخہ بھی اسی لوٹ میں آ گیا ہوگا۔ پچھلے دنوں جامع مصریہ کے ادارہ نے اس کا عکس حاصل کیا اور ڈاکٹر منصور[۴] اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین[۵] کی تصحیح و ترتیب کے بعد چھپ کر شائع ہو گیا۔ دونوں نے اس پر الگ الگ مقدّمے بھی لکھے ہیں۔ بظاہر اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ یہ رسالہ بھی نقد الشعر کے مصنف ہی کے قلم سے نکلا ہے۔[۶] رسالہ کے اسلوب بیان میں منطقی طریق بحث و تحلیل صاف نمایاں ہے جو آگے چل کر فن بلاغت پر بالکل چھا گیا، لیکن اصول فن خالص عربی ہیں اور امثال و نظائر میں بھی باہر کے اثرات کی کوئی پرچھائیں دکھائی نہیں دیتی۔ البتہ بلاغت کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے یونان اور ہندوستان کے بعض اقوال جاحظ[۷] کے حوالہ سے نقل کر دیے ہیں اور وہ سب نے نقل کیے ہیں۔

لیکن عربوں نے جو تغافل یونانی ادبیات سے برتا تھا، وہ اس کے فن موسیقی سے نہیں برت سکتے تھے کیونکہ خود عربوں کا فن موسیقی کچھ نہ تھا اور جتنی کچھ عمارت بھی انہوں نے اُٹھائی تھی، اس کا تمام تر مواد ایران کی ساسانی موسیقی کے کھنڈروں سے حاصل کیا گیا تھا۔

(۴۵۰) نوائے باربد ماندست و دستاں![۸]

چنانچہ کافی تصریحات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یونان کے فنِ موسیقی پر عربی میں کتابیں لکھی گئیں اور ریاضی کی ایک شاخ کی حیثیت سے اس کا عام طور پر مطالعہ کیا گیا۔ یونانیوں نے آسمان کے بارہ فرضی برجوں کی مناسبت سے راگنیوں کی بارہ بنیادی تقسیمیں کی تھیں اور ہر راگنی کو کسی ایک برج کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ عربوں نے بھی اسی بنیاد پر عمارت اٹھائی۔ یونان اور روم کے آلات میں قانون اور ارغنون (آرگن) عام طور پر رائج ہو گئے تھے۔ ابونصر فارابی[۹] نے قانون پر ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے۔ اخوان الصفا[۱۰] کے مصنفوں کو بھی موسیقی سے اعتناء کرنا پڑا۔

سندھ کے نو آباد عرب ہندوستان کی موسیقی سے جو ان اطراف میں رائج ہو گی ضرور آشنا ہوئے ہوں گے لیکن تاریخ میں سندھ کے عربی عہد کے حالات اتنے کم ملتے ہیں

کہ جزم کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ چھٹی صدی ہجری سے شمالی ہند اور دکن کے نئے اسلامی دوروں کا جو سلسلہ شروع ہوا ان سے ہم مسلمانوں کے ذوق اور اشتغال کے نتائج بآسانی نکال لے جا سکتے ہیں۔ اب ہندوستان کے علوم وفنون مسلمانوں کے لیے غیر ملکی نہیں رہے تھے بلکہ خود ان کے گھر کی دولت بن گئے تھے۔ اس لیے ممکن نہ تھا کہ ہندوستانی موسیقی کے علم وذوق سے وہ تغافل برتتے۔ چنانچہ ساتویں صدی میں امیر خسرو جیسے مجتہد فن کا پیدا ہونا اس حقیقت حال کا واضح ثبوت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اب ہندوستانی موسیقی ہندوستانی مسلمانوں کی موسیقی بن چکی تھی اور فارسی موسیقی غیر ملکی موسیقی سمجھی جانے لگی تھی۔

سازگری، ایمن اور خیال تو امیر خسرو[81] کی ایسی مجتہدانہ اختراعات ہیں کہ جب تک ہندوستانیوں کی آواز میں رس اور تار کے زخموں میں نغمہ ہے، دنیا ان کا نام نہیں بھول سکتی۔ مثنوی قران السعدین میں خود کہتے ہیں[82]

زمزمۂ ''سازگری'' در ''عراق''
کردہ بگلبانگ عراق اتفاق

(۲۵۱)

قول، ترانہ، سوہلہ تو گانے کی ایسی عام چیزیں بن گئی ہیں کہ ہر گویّے کی زبان پر ہیں، حالانکہ یہ سب اسی عہد کی اختراعات ہیں۔ کلاسیکل موسیقی ان سے آشنا نہ تھی۔

غالباً مسلمان بادشاہوں سے بھی پہلے مسلمان صوفیوں نے اس کی سرپرستی شروع کر دی تھی۔ ملتان، ایودھن، گور اور دہلی کی خانقاہوں میں وقت کے بڑے بڑے باکمال حاضر ہوتے تھے اور برکت وقبولیت کے لیے اپنا اپنا جوہر کمال پیش کرتے تھے۔ جہاں تک سلاطین ہند کا تعلق ہے خلجی[83] اور تغلق[84] کے درباروں میں ہندوستانی موسیقی کی مقبولیت اور قدردانیوں کے واقعات تاریخ میں موجود ہیں لیکن جس شاہی خاندان نے ہندوستانی موسیقی سے بہ حیثیت ایک فن کے خاص اعتنا کیا، وہ غالباً جونپور کا شرقی خاندان[85] تھا۔ چنانچہ اسی عہد میں خیال عام طور پر مقبول ہوا اور دھرپد کی جگہ اس سے اہل فن اعتنا کرنے لگے۔ اِسی عہد کے لگ بھگ دکن کے بہمنی[86] اور نظام شاہی[87] خاندانوں کا اور پھر بیجا پوری[88] بادشاہوں کا شوق وذوق نمایاں ہوتا ہے۔ چونکہ اس زمانے میں دکن اور مالوا کی سرزمین موسیقی کے علم وعمل کا تخت گاہ بن گئی تھی، اس لیے یہ قدرتی بات تھی کہ مسلمان

پادشاہوں کی سرپرستی اسے حاصل ہو جاتی۔ ابراہیم[89] عادل بادشاہ تو بقول ظہوری[90] کے اس اقلیم کا جگت گورو تھا اور اس کے شوقِ موسیقی نے بیجاپور کے گھر گھر میں وجد و سماع کا چراغ روشن کر دیا تھا۔ ظہوری اس کی مدح میں کیا خوب کہہ گیا ہے:

۴۵۲

مروّت کردہ شہبابر تو سیر بام و درلازم
نمی باشد چراغے خانہ ہائے بے نوایاں را

مالوا، بنگال اور گجرات کے پادشاہوں کے ذاتی اشتغال و ذوق کے واقعات تاریخ میں بکثرت ملتے ہیں۔ گور کے سلاطین ملکی زبان اور ملکی موسیقی، دونوں کے سرپرست تھے۔ چنانچہ بنگالی زبان کی قدیم شاعری نے تمام تر انہی کی سرپرستی میں نشو ونما پائی۔ مالوا کے باز بہادر[91] کو تو روپ متی کے عشق نے ہندی کا شاعر بھی بنا دیا تھا اور موسیقی کا ماہر بھی۔ آج تک مالوا کے گھروں سے اس کے دُہروں کی نوائیں سنی جا سکتی ہیں۔

اکبر کی قدر شناسیوں سے اس فن کو جو عروج ملا اس کا حال عام طور پر معلوم ہے۔ ابوالفضل نے اُن تمام باکمالوں کا ذکر کیا ہے جو فتح پور اور آگرہ میں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔ جہانگیر[92] نے اپنی توزک میں جابجا ایسے اشارے کیے ہیں جن سے اس کے ذاتی ذوق اور اشتغال کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی حسن پرست طبیعت کا لازمی تقاضہ یہی تھا کہ فنونِ لطیفہ کا قدر شناس ہو۔ چنانچہ شاعری، مصوّری اور موسیقی تینوں کا دلدادہ اور اعلیٰ درجہ کا کمال شناس تھا۔ اس کے دربار میں جس درجہ کے شاعر، مصور اور گویّے جمع ہو گئے تھے، پھر ہندوستان کی تاریخ میں جمع ہونے والے نہ تھے۔ اس کے دربار کے ایک مصوّر نے انگلستان[93] کے سفیر کو اپنا کمال دکھا کر حیران کر دیا تھا۔ اس کے شاعرانہ ذوق کے لیے اس کا یہ ایک شعر کفایت کرتا ہے:

ازمن متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس
یک دل شکستنِ تو بصد خوں برابر ست[94]

اسی عہد میں یہ بات ہوئی کہ موسیقی کا فن بھی فنونِ دانشمندی میں داخل ہو گیا اور اس کی تحصیل کے بغیر تحصیلِ علم اور تکمیلِ تہذیب کا معاملہ ناقص سمجھا جانے لگا۔ اُمراء اور شرفاء کی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لیے جس طرح تمام فنونِ مدراس کی تحصیل کا اہتمام کیا

جاتا تھا اسی طرح موسیقی کی تحصیل کا بھی اہتمام کیا جاتا۔ ملک کے ہر حصّہ سے باکمالانِ فن کی مانگ آتی تھی اور دہلی، آگرہ، لاہور اور احمد آباد کے گوّیے بڑی بڑی تنخواہوں پر اُمراء اور شُرفاء کے گھروں میں ملازم رکھے جاتے تھے۔ جو نوجوان تکمیلِ علم کے لیے بڑے شہروں میں آتے، وہ وہاں کے عالموں اور مدرّسوں کے ساتھ وہاں کے باکمالانِ موسیقی کو بھی ڈھونڈتے اور پھر ان کے حلقۂ تعلیم میں زانوئے تحصیل تہہ کرتے۔ دکن میں احمد نگر، بیجاپور اور برہان پور کے اہلِ فن مشہور تھے۔ دوآبہ میں دہلی اور آگرہ کے اور پنجاب میں لاہور، سیالکوٹ اور جھنگ کے۔

اس عہد میں ایران اور توران سے جو افاضل و اشراف آتے وہ ہندوستانی موسیقی کے فہم و مناسبت کی ضرورت فوراً محسوس کر لیتے تھے اور چند سال بھی گزرنے نہیں پاتے کہ اس کے مقام شناس بن جاتے تھے۔ محمد قاسم [95] فرشتہ صاحبِ تاریخ کا باپ مازندران سے آکر احمد نگر میں مقیم ہوا تھا اور فرشتہ کی ولادت مازندران کی تھی لیکن اسے ہندوستانی موسیقی سے اِس قدر شغف ہوا کہ اس موضوع پر ایک پوری کتاب تصنیف کر دی۔ یہ کتاب میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ علاء الملک تونی [96] جو جلوسِ شاہجہانی کے ساتویں سال ہندوستان آیا اور فاضل خاں کے خطاب سے مخاطب ہوا اور پھر اورنگ زیب کے عہد میں عہدۂ وزارت پر فائز ہوا ہندوستانی موسیقی کا ایسا ماہر سمجھا جاتا تھا کہ وقت کے اساتذہ اس سے استفاضہ کرتے تھے۔

اس عہد کے کتنے ہی مقدس علماء ہیں جن کے حالات پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ گو موسیقی کے اشتغال سے دامن بچائے رہے لیکن فن کے ماہر اور نکتہ شناس تھے۔ ملّا مبارک کے حالات میں خصوصیت کے ساتھ اس کی تصریح ملتی ہے کہ ہندوستانی موسیقی کا عالم و ماہر تھا۔ اکبر نے اسے تان سین کا گانا سنایا تو صرف اتنی داد ملی کہ "ہاں گا لیتا ہے"! [97]

ملّا عبد القادر بدایونی [98] جیسا متشرع اور متصلّب شخص بھی بین بجانے میں پُوری مہارت رکھتا تھا اور فیضی نے ضروری سمجھا تھا کہ اکبر کی خدمت میں اسکی سفارش کرتے ہوئے اس مشّاقی کا ذکر کر دے [99]۔ علامہ سعد اللہ شاہجہانی [100] جن کی فضیلت علمی

اور ثقاہت طبع کا تمام معاصر اعتراف کرتے ہیں، موسیقی اور سنگیت کی ہر شاخ پر نظر رکھتے تھے اور ماہرانہ رائے دے سکتے تھے۔ ان کے استاد ملا عبدالسلام لاہوری [۱۰۱] تھے۔ ان کے حلقۂ درس کی عالمگیریوں نے سمرقند اور بخارا تک کو مسخر کر لیا تھا اور جب شاہجہان نے شہزادوں کی تعلیم کے لیے تمام علمائے مملکت پر نظر ڈالی تھی تو نظرِ انتخاب نے انہی کی سفارش کی تھی۔ لیکن ان کے ذوقِ موسیقی کا یہ حال تھا کہ جس طرح ''ہدایہ'' اور ''بزودی'' کے مقامات حل کیا کرتے تھے اسی طرح موسیقی کی مشکلات بھی حل کر دیا کرتے تھے۔ شیخ معالی خاں [۱۰۲] جو ملا طاہر پٹنی [۱۰۳] محدث گجرات کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور قاضی القضاۃ شیخ عبدالوہاب [۱۰۴] گجراتی کے پوتے تھے، ان کے حالات میں صاحب مآثرالامراء نے لکھا ہے کہ موسیقی کے شیفتہ اور اس کی باریکیوں کے دقیقہ سنج تھے۔ ملا شفیعائے یزدی [۱۰۵] مخاطب بہ دانشمند خاں کہ سر آمد علمائے عصر تھا اور شاہجہان کے دربار میں اس کا مباحثہ ملا عبدالحکیم [۱۰۶] سیالکوٹی سے معلوم و مشہور ہے، ہندوستان آتے ہی ہندوستانی موسیقی میں ایسا باخبر ہو گیا کہ وقت کے باکمالان فن کو اُس کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا پڑا۔ حکیم برنیر فرنساوی [۱۰۷] صاحب سفرنامہ ہند اسی دانشمند خان کی سرکار میں ملازم تھا اور غالباً اسی کی صحبت کا یہ نتیجہ تھا کہ حکمائے فرنگ کا اسے ہم مشرب لکھا گیا ہے۔ شیخ علاؤالدین [۱۰۸] جو اپنے عہد کے مشہور صوفی گزرے ہیں اور جن کی ایک غزل سماع کی مجلسوں میں بکثرت گائی جاتی ہے: [۱۰۹]

نہ دانم آں گُلِ رعنا چہ رنگ و بو دارد
کہ مُرغ ہر چمنے گفتگوئے اُو دارد
نشاطِ بادہ پرستاں بہ منتہی برسید
هنوز ساقیِ ما بادہ در سبو دارد

ان کے حالات میں سب سے لکھتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی کے ماہر اور آلاتِ موسیقی کے غیر معمولی مشاق تھے۔

شیخ جمالی [۱۱۰] صاحب سیر العارفین [۱۱۱] اور اُن کے لڑکے شیخ گدائی، [۱۱۲] دونوں کا فنِ موسیقی میں توغل معلوم ہے۔ دورِ آخر میں مرزا مظہرِ جانجاناں [۱۱۳] اور خواجہ میر درد [۱۱۴]

(فن موسیقی کے) ایسے ماہر تھے کہ وقت کے بڑے بڑے کلاونت اپنی چیزیں بغرض اصلاح پیش کرتے اور ان کے سر کی ایک ہلکی سی جنبش کو بھی اپنے کمالِ فن کی سند تصور کرتے۔

شیخ عبدالواحد[۱۱۵] بلگرامی شیر شاہی عہد کے ایک عالی قدر بزرگ تھے۔ سلوک وتصوف میں اُن کی کتاب سنابل[۱۱۶] مشہور ہو چکی ہے۔ بدایونی ان کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ہندی موسیقی میں نقش آرائیاں کرتے تھے اور وجد وحال کی مجلسیں ان سے گرم ہوتی تھیں۔

بیرم خاں[۱۱۷] موسیقیٔ ہند کا بڑا قدر شناس تھا اور اس کے لڑکے عبدالرحیم[۱۱۸] خانخاناں کی قدر شناسیاں تو اس درجہ تک پہنچ گئی تھیں کہ اکبر اور جہانگیر کی شاہانہ فیاضیاں بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ عبدالباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی کے خاتمہ میں جہاں ان علماء وشعراء کا ذکر کیا ہے جو خانخاناں کی سرکار سے وابستہ تھے، وہاں موسیقی کے باکمالوں کے نام بھی گنوائے ہیں۔ ان میں ایرانی اور ہندوستانی، ہندو اور مسلمان دونوں[۱۱۹] تھے۔ شاہنواز خاں صفوی کے حالات میں صاحب مآثر الامراء نے لکھا ہے کہ "شیفتۂ موسیقی بود وخوانندہ ہا وسازندہ ہا کہ پیش خود جمع کردہ بود نظیر نہ داشتند۔" قریب قریب یہی الفاظ ہوں گے۔ حافظہ سے لکھ رہا ہوں اور کتاب دیکھے ہوئے سالہا سال گذر گئے[۱۲۰]۔ زین خاں کوکہ کا علوم درسیہ میں شغف معلوم ہے۔ پنجاب کی صوبیداری کے زمانے میں بھی اس نے درس و تدریس علوم کا مشغلہ بالالتزام جاری رکھا تھا۔ لیکن اس کے حالات میں بھی سب لکھتے ہیں کہ "بہ کبت وراگ شغفے داشت، وسازہا بہ کمال حسن وخوبی می نواخت۔"[۱۲۱] اس کا لڑکا مغل خاں بھی اس باب میں اپنے باپ کا جانشین[۱۲۲] تھا۔ خانِ کلاں میر محمد جو شمس الدین اتکہ کا بھائی تھا، موسیقیِ ہند کے علم ومہارت میں ممتاز[۱۲۳] سمجھا جاتا تھا۔ مرزا غازی خاں بن جانی بیگ حاکمِ سندھ وقندھار کی نسبت سب لکھتے ہیں کہ نغمہ پردازی، طنبور نوازی اور تمام سازوں کے بجانے میں بے نظیر تھا[۱۲۴]۔ ملا مرشد یزدجردی نے اسی کی مدح میں یہ رباعی کہی تھی۔[۱۲۵]

گر نغمہ سازت بہ سکوں می آید
رمزے ست بگویمت کہ چوں می آید

از بسکہ بہ گردِ زخمہ ات می گردد
پیچیدہ زطنبور بروں می آید

خانِ زماں میر خلیل [۱۲۶] نے جو یمین الدولہ آصف خاں کا داماد تھا، اس فن میں ایسی مہارت بہم پہنچائی تھی کہ لوگ اپنے اختلافات اس کے آگے فیصلہ کے لیے پیش کرتے۔ سَرس بائی [۱۲۷] جو شہزادہ مراد بخش کی محبوبہ تھی، خیال گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی مگر خود شہزادہ کی فن دانی کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ وہ اس کی شاگردی پر ناز کرتی اورنگ زیب نے جب مراد کو قید کیا تو سَرس بائی بھی تیار ہوگئی کہ اس کے ساتھ قید و بند کی سختیاں گوارا کرے۔ چنانچہ مراد کے ساتھ قلعہ گوالیار میں عرصہ تک محبوس رہی۔ [۱۲۸]

مرزا عیسیٰ خاں ترخاں [۱۲۹] جس نے جانی بیگ کی وفات کے بعد سندھ میں بڑی شورش برپا کی تھی، نغمہ سنجی اور سازنوازی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔

اب اس وقت حافظہ کی گرہیں کھلنے لگی ہیں تو بے شمار واقعات سامنے آ رہے ہیں۔ شہزادہ خرم کی ماں مان متی [۱۳۰] جو راجہ اودے سنگھ کی بیٹی تھی، جب جہانگیر کے محل میں آئی تو اس کے گانے کا محل میں شہرہ ہوا۔ جہانگیر چونکہ خود ماہر فن تھا، اس لیے اس نے امتحان لیا اور جب دیکھا کہ امتحان میں پوری اُتری تو بہت خوش ہوا اور خوش آواز خواصوں کا ایک حلقہ اس کے سپرد کر دیا کہ اپنی تعلیم و تربیت سے انہیں طیار کرے۔ خود خرم یعنی شاہجہاں کے ذوق و مناسبت فن کا یہ حال تھا کہ تان سین کا جانشین لال خاں [۱۳۱] اس کا نام لے کر کان پکڑتا تھا۔ دھرپد میں شاہجہان کے رسوخ ذوق کا مؤرخوں نے خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

نظام الملک آصف جاہ [۱۳۲] کے لڑکے ناصر جنگ شہید [۱۳۳] کو موسیقی کے شوق نے سنسکرت زبان کی تحصیل کا شوق دلایا تا کہ کلاسیکل موسیقی کی قدیم کتابوں کا براہ راست مطالعہ کر سکے۔ اس کے حالات میں صاحب شہادت نامہ لکھتے ہیں کہ زبانِ سنسکرت سے واقف اور موسیقی اور سنگیت میں ماہر تھا۔

اس عہد میں ایک ایک امیر کی فیاضیاں ترقی فن کے لیے شاہانہ فیاضیوں سے کم نہیں ہوتی تھیں۔ شیخ سلیم چشتی [۱۳۴] کا پوتا اسلام خاں [۱۳۵] جب جہانگیر کے عہد میں

بنگال کا صوبیدار ہوا تو اس کی سرکار میں اسی ہزار روپیہ ماہوار راگ اور رقص کے طائفوں پر خرچ کیا جاتا تھا۔ صاحب مآثر الامراء [۱۳۶] لکھتے ہیں کہ اس کے دستر خوان پر ایک ہزار لنگریاں ☆ کمال تکلف و اہتمام سے دونوں وقت چنی جاتی تھیں مگر خود اس کا یہ حال تھا کہ جوار کی روٹی اور ساٹھی کا خشکہ ساگ کے ساتھ کھاتا اور کسی دوسرے کھانے میں ہاتھ نہ ڈالتا۔ یہ بھی لکھا ہے [۱۳۷] کہ وہ عمر بھر جامۂ خاصہ کے نیچے گاڑھے کا کرتا پہنتا رہا اور پگڑی کے نیچے بھی گاڑھے کی طاقیہ ☆☆ اوڑھتا۔

اورنگ زیب کے فقیہانہ تقشف سے اگرچہ فنون لطیفہ کی گرم بازاری سرد پڑگئی، مگر یہ جو کچھ ہوا صرف دربار شاہی تک محدود تھا۔ پچھلی آب پاشیوں نے ملک کے ہر گوشہ میں جو نہریں رواں کردی تھیں وہ اتنی تنک مایہ نہ تھیں کہ شاہی سرپرستی کا رخ پھرتے ہی خشک ہونا شروع ہوجاتیں۔ بلاشبہ عالمگیری عہد میں شاہی سرکار کے کارخانے بند ہوگئے تھے لیکن ملک کے ہزاروں لاکھوں گھروں کے کارخانے کون بند کرسکتا تھا؟ میں نے اس مکتوب کی ابتدا میں فارسی کی کتاب راگ درپن کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب فقیر اللہ سیف خاں [۱۳۸] نے مرتب کی تھی جو اسی عالمگیری عہد کا ایک امیر اور ناصر علی سرہندی کا ممدوح [۱۳۹] تھا۔ شیر خاں لودھی صاحب مراۃ الخیال بھی اسی عہد میں تھا جس نے ایرانی موسیقی اور ہندوستانی موسیقی ، دونوں میں دستگاہ پیدا کی اور پھر دونوں پر ایک مبسوط کتاب لکھی۔ تذکرہ مراۃ الخیال میں بھی ایک فصل موسیقی پر لکھی ہے اور اپنے ذوق فن کا ذکر کیا ہے۔ موسیقی پر اس کی کتاب میری نظر سے گذر چکی ہے۔ اس کا ایک خوشخط نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اس سلسلہ میں خود اورنگ زیب کی زندگی کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے:

☆ "لنگری" لکڑی کی روغن کی ہوئی سینی کو کہتے ہیں، جو لکڑی کے طشت کی طرح بہت بڑی ہوتی تھی اور ایک مسلم گوسفند بریاں اس میں رکھا جاسکتا تھا۔

☆☆ "طاقیہ" ہلکی ٹوپی کو کہتے ہیں، جو گھر میں سر پر رکھ لیتے۔ آج کل بھی عرب میں اس ٹوپی کو طاقیہ ہی کہتے ہیں۔

برہان پور کے حوالی میں ایک بستی زین آباد کے نام سے بس گئی تھی۔ اسی زین آباد کی رہنے والی ایک مغنیہ تھی جو "زین آبادی" کے نام سے مشہور ہوئی اور اس کے نغمہ و حسن تیرافگنیوں نے اورنگ زیب کو زمانہ شہزادگی میں زخمی کیا۔ صاحب مآثر الامراء نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے [۱۴۰] کیا خوب شعر لکھا ہے:

عجب گیرندہ دامے بود در عاشق ربائی ہا
نگاہِ آشنائے یار پیش از آشنائی ہا [۱۴۱]

اورنگ زیب کے اس معاشقہ کی داستان بڑی ہی دلچسپ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اولوالعزمیوں کی طلب نے اسے لوہے اور پتھر کا بنا دیا تھا لیکن ایک زمانہ میں گوشت و پوست کا آدمی بھی رہ چکا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ

گزر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی [۱۴۲]

ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہم یمین الدولہ کے داماد میر خلیل خان زمان کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اس خان زمان کی بیوی اورنگ زیب کی خالہ ہوتی تھی۔ ایک دن اورنگ زیب برہان پور کے باغ آہو خانہ میں چہل قدمی کر رہا تھا اور خان زمان کی بیوی یعنی اس کی خالہ بھی اپنی خواصوں کے ساتھ سیر کے لیے آئی ہوئی تھی۔ خواصوں میں ایک خواص زین آبادی تھی جو نغمہ سنجی میں سحر کار اور شیوۂ دلربائی و رعنائی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ سیر و تفریح کرتے ہوئے یہ پورا مجمع ایک درخت کے سائے میں سے گزرا جس کی شاخوں میں آم لٹک رہے تھے۔ جونہی مجمع درخت کے نیچے پہنچا زین آبادی نے نہ تو شہزادہ کی موجودگی کا کچھ پاس لحاظ کیا، نہ اس کی خالہ کا، بے باکانہ اچھلی اور ایک شاخ بلند سے ایک پھل توڑ لیا۔ خان زمان کی بیوی پر یہ شوخی گراں گزری اور اس نے ملامت کی تو زین آبادی نے ایک غلط انداز نظر شہزادہ پر ڈالی اور پشواز سنبھالتے ہوئے آگے نکل گئی۔ یہ غلط انداز نظر کچھ ایسی قیامت کی تھی کہ اُس نے شہزادہ کا کام تمام کر دیا اور صبر و قرار نے خدا حافظ کہا:

بالا بلند عشوہ گر سروِ نازِ من
کوتاہ کرد قصّۂ زہد درازِ من، [۱۴۳]

صاحب مآثر الامراء [۱۴۴] نے لکھا ہے کہ "بکمال ابرام و ساجت زین آبادی راز

خالۂ محترمہ خود گرفتہ، باآں ہمہ زہد خشک و تفقہ سخت، شیفتہ و دلدادہ اُوشد، قدحِ شراب بدستِ خود پُر کردہ می داد، گویند روزے زین آبادی ہم قدح بادہ پر کردہ، بہ دست شہزادہ دادو تکلیف شرب نمود" یعنی بڑی منت والحاح کر کے اپنی خالہ سے زین آبادی کو حاصل کیا اور باوجود اس زہد خشک اور خالص تفقہ کے جس کے لیے اس عہد میں بھی مشہور ہو چکا تھا اس کے عشق و شیفتگی میں اس درجہ بے قابو ہو گیا کہ اپنے ہاتھ سے شراب کا پیالہ بھر بھر کر پیش کرتا اور عالم نشہ و سُرور کی رعنائیاں دیکھتا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن زین آبادی نے اپنے ہاتھ سے جام لبریز کر کے اورنگ زیب کو دیا اور اصرار کیا کہ لبوں سے لگا لے۔ دیکھیے عرفی کا ایک شعر کیا موقعہ سے یاد آ گیا ہے اور کیا چسپاں ہوا ہے:

ساقی توئی، و سادہ دلی ہیں کہ شیخ شہر
باور نمی کند کہ ملک مے گسار شد [۱۴۵]

شہزادہ نے ہر چند عجز و نیاز کے ساتھ التجائیں کی کہ میرے عشق و دل باختگی کا امتحان اس جام کے پینے پر موقوف نہ رکھو۔

مے حاجت نیست مستیم را
در چشم تو تا خمار باقیست [۱۴۶]

لیکن اس عیار کو رحم نہ آیا:

(۴۶۰)

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد
مسلمانی میاموز آن دو چشمِ نامُسلماں را [۱۴۷]

ناچار شہزادہ نے ارادہ کیا کہ پیالہ منہ سے لگا لے۔ گویا وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَ هَمَّ بِهَا کی پوری روداد پیش آ گئی:

(۴۶۱)

عشقش خبر ز عالمِ مدہوشی آورد
اہلِ صلاح را بقدح نوشی آورد [۱۴۹]

لیکن جونہی اس فسوں ساز نے دیکھا کہ شہزادہ بے بس ہو کر پینے کے لیے آمادہ ہو گیا ہے، فوراً پیالہ اس کے لبوں سے کھینچ لیا اور کہا۔ "غرض امتحان بود نہ کہ تلخ کامی شما" [۱۵۰]

ایں جور دیگر ست کہ آزارِ عاشقاں

چنداں نمی کند کہ بہ آزار خوکنند [151]

رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ شاہجہان تک خبریں پہنچنے لگیں اور وقائع نویسوں [152] کے فردوں میں بھی اس کی تفصیلات آنے لگیں۔ دارا شکوہ [153] نے اس حکایت کو اپنی سعایت وغمازی کا دست مایہ بنایا۔ وہ باپ کو بار بار توجہ دلاتا، "ببینید ایں مزوّر ریائی چہ صلاح وتقویٰ ساختہ است [154]؟" ہا، فیضی نے کیا خوب کہا ہے: [155]

چہ دست مے بری اے تیغ عشق اگر دادست

(۴۶۳) ببر زبان ملامت گر زلیخارا!

نہیں معلوم، اس قضیہ کا غنچہ کیونکر گل کرتا، لیکن قضاءً وقدر نے خود ہی فیصلہ کر دیا یعنی عین عروج شباب میں زین آبادی کا انتقال ہو گیا۔ اورنگ آباد میں بڑے تالاب کے کنارے اس کا مقبرہ آج تک موجود ہے۔

خود رفتہ ایم و کُنجِ مزارے گرفتہ ایم

(۴۶۴) تا بارِ دوشِ کس نشود استخوانِ ما [156]

آپ نے عاقل خاں رازی کے حال میں یہ واقعہ پڑھا ہو گا کہ زمانۂ شہزادگی میں اورنگ زیب کو ایک پرستارِ خاص کی موت سے سخت صدمہ پہنچا تھا لیکن اسی دن شکار کے اہتمام کا حکم دیا گیا۔ اس بات پر وابستگانِ دولت کو تعجب ہوا کہ سوگواری کی حالت میں سیر و تفریح اور شکار کا کیا موقع تھا۔ جب اورنگ زیب شکار کے لیے محل سے نکلا تو عاقل خاں نے کہ میر عسکر تھا، تنہائی کا موقع نکال کر عرض کیا۔ "اس غم واندوہ کی حالت میں شکار کے لیے نکلنا کسی ایسی ہی مصلحت پر مبنی ہو گا جس تک ہم ظاہر بینوں کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔"

اورنگ زیب نے جواب میں یہ شعر پڑھا:

نالہ ہائے خانگی دل را تسلی بخش نیست

(۴۶۵) در بیاباں می تواں فریاد خاطر خواہ کرد

اس پر عاقل خاں کی زباں سے بے ساختہ یہ شعر نکل گیا:

عشق چہ آساں نمود، آہ چہ دشوار بود

(۴۶۶) ہجر چہ دشوار بود، یار چہ آساں گرفت

اورنگ زیب پر رِقّت کا عالم طاری ہوگیا۔ دریافت کیا کہ یہ شعر کس کا ہے؟ عاقل خاں نے کہا: اس شخص کا ہے جو نہیں چاہتا کہ اپنے آپ کو زمرۂ شعرا میں محسوب کرائے۔ اورنگ زیب سمجھ گیا کہ خود عاقل خاں کا ہے۔ بہت تعریف کی اور اس دن سے اس کی سرپرستی اپنے ذمہ لے لی[۱۵۷]۔ اس حکایت میں جس "پرستار خاص" کی موت کا ذکر آیا ہے اس سے مقصود یہی "زین آبادی" ہے۔

صاحب مآثر الامراء نے خان زماں کے حال میں لکھا ہے کہ فنِ موسیقی میں پوری مہارت رکھتا تھا اور کاروبارِ منصب کے انہماک کے ساتھ راگ ورنگ کی مشغولیتیں بھی برابر جاری رہتی تھیں۔ پری چہرگان خوش آواز اور مغنیاتِ عشوہ طراز اس کی سرکار میں ہمیشہ جمع رہتی تھیں۔ انہی میں "زین آبادی" بھی تھی جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی مدخولہ تھی۔[۱۵۸]

خود اورنگ زیب بھی موسیقی کے فن سے بے خبر نہ تھا کیونکہ تمام شہزادوں کی طرح اس نے بھی اس کی تحصیل کی ہوگی۔ البتہ آگے چل کر اس کی طبیعت کی افتاد نے دوسری راہ اختیار کی، اس لیے اس کے اشتغال وذوق سے کنارہ کش ہوگیا اور سلطنت پر قبضہ پانے کے بعد تو سرے سے یہ کارخانہ ہی بند کردیا۔ گویوں نے موسیقی کا جنازہ نکالا تو اس نے کہا کہ اِس طرح دفن کرنا کہ پھر قبر سے نہ اُٹھ سکے۔[۱۵۹]

لیکن اورنگ زیب کے سارے منصوبوں کی طرح سلطنت کا یہ پرہیزی مزاج بھی زیادہ دنوں تک نہ چل سکا اور اس کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ جس طرح انگلستان میں پیوریٹین[۱۶۰] (Puritan) عہد کی خشک مزاجیاں اعادۂ حال کے ساتھ ہی ختم ہوگئی تھیں، اسی طرح یہاں بھی اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت کا مزاج پھر لوٹ آیا۔ فرخ سیر[۱۶۱] اور محمد شاہ[۱۶۲] کے عہد کی تر دماغیاں دراصل اسی عالمگیری خشک مزاجیوں کا ردِّعمل تھا۔ سیّد عبدالجلیل[۱۶۳] محدّث بلگرامی نے فرخ سیر کی شادی کی تبریک میں جو مثنوی لکھی ہے، اس سے اس عہد کی عشرت مزاجیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔[۱۶۴]

ہندوستان کے قدمائے فن نے موسیقی اور رقص کی ایک خاص قسم ایسی قرار دی ہے جس کی نسبت ان کا خیال تھا کہ صحرائی جانوروں کو بے خود کرکے رام کرنے میں

خصوصیت کے ساتھ مؤثر ہے۔ اکبر کے زمانے میں رقص اور گانے کی یہ قسم شکار قمرغہ کے سرو سامان میں داخل ہوئی اور اس کے طائفے باکمالانِ فن کی نگرانی میں طیار کرائے گئے۔ آنند رام مخلص[۱۶۵] نے مراۃ المصطلحات میں اس طریق شکار کی بعض دلچسپ تفصیلات لکھی ہیں وہ لکھتا ہے کہ جب شکار قمرغہ کا اہتمام کیا جاتا تھا تو یہ طائفے شکار گاہ میں بھیج دیئے جاتے تھے اور رقص وسرود شروع کر دیتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد آہستہ آہستہ چاروں طرف سے ہرن سر نکالنے لگتے اور پھر رقص وسرود کی محویت انہیں بالکل طائفے کے قریب پہنچا دیتی۔ جہانگیر نے ایک مرتبہ شکار قمرغہ کا قصد کیا اور اسی رقص وسرود کا جال بچھایا۔ جب ہرنوں کے غول ہر طرف سے نکل کر سامنے آ کھڑے ہوئے تو نور جہاں کی زبان پر بے اختیار امیر خسرو کا یہ شعر طاری ہو گیا۔

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف
به اُمید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

﴿۴۶۷﴾

یہ شعر سن کر جہانگیر کی غیرت مردمی نے گوارا نہ کیا کہ شکار کے لیے ہاتھ اٹھائے دل گرفتہ واپس آ گیا۔

یہ خیال کہ جانور گانے سے متاثر ہوتے ہیں دنیا کی تمام قوموں کی قدیمی روایتوں میں پایا جاتا ہے۔ تورات[۱۶۶] میں ہے کہ حضرت داؤد کی نغمہ سرائی پرندوں کو بے خود کر دیتی تھی۔ یونانی روایات میں بھی ایک سے زیادہ اشخاص کی نسبت ایسا ہی عقیدہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے قدمائے فن نے تو اسے ایک مسلمہ حقیقت مان کر اپنی بے شمار عملیات کی بنیادیں اسی عقیدہ پر استوار کی تھیں۔ سانپ، گھوڑے اور اونٹ کا تاثر عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ حُدی کی لے اگر رُک جاتی ہے تو محمل کی تیز رفتاری بھی رُک جاتی ہے:

حُدی را تیز تر میخواں چو محمل را گراں بینی[۱۶۷]

﴿۴۶۸﴾

البیرونی نے کتاب الہند میں راگ کے ذریعے شکار کرنے کے طریقوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ خود اپنا مشاہدہ نقل کرتا ہے کہ شکاری نے ہرن کو ہاتھ سے پکڑ لیا تھا اور ہرن میں بھاگنے کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ہندوؤں کا یہ قول بھی نقل کرتا ہے کہ اگر ایک شخص اس کام میں پوری طرح ماہر ہو تو اسے ہاتھ بڑھا کر پکڑنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئے۔ وہ

صید کو جس طرف لے جانا چاہے صرف اپنے راگ کے زور سے لگائے لے جائے۔ پھر لکھتا ہے، جانوروں کی اس محویت و تسخیر کو عوام تعویز اور گنڈے کا اثر سمجھتے ہیں حالانکہ یہ محض گانے کی تاثیر ہے۔ پھر ایک دوسرے مقام میں، جہاں جزیرہ سرندیپ کا ذکر کیا ہے، لکھتا ہے: یہاں بندر بہت ہیں۔ ہندوؤں میں مشہور ہے کہ اگر کوئی مسافر ان کے غول میں پھنس جائے اور رامائن کے وہ اشعار جو ہنومان کی مدح میں لکھے گئے ہیں پڑھنے لگے تو بندر اس کے مطیع ہو جائیں گے اور اسے کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔ پھر کہتا ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کی تہہ میں بھی وہی گانے کی تاثیر کام کرتی ہوگی۔ یعنی رامائن کے اشعار کے مطالب کا یہ اثر نہ ہوگا، اشعار کی لَے اور نغمہ سرائی کی تاثیر ہوگی۔ پہلی تصریح غالباً اس باب میں ہے جو "**فی ذِکر علوم لھم کا سرۃ الاجنحۃ علی افق الجھل**" کے عنوان سے ہے اور دوسری تصریح اس کے بعد کے باب میں ملے گی جو "**فی معارف شتی من بلادھم و انھارھم**" کے عنوان سے لکھا ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ زمانہ حال کا علم الحیوان اِس خیال کی واقعیت تسلیم نہیں کرتا اور تاثرات کے مشاہدات کو دوسری علتوں پر محمول کرتا ہے۔ سانپ کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ اس میں سرے سے سماعت کا حاسہ ہی نہیں ہے۔

والہ داغستانی صاحب[168] ریاض الشعراء قزلباش خاں امید[169]، میر معز فطرت موسوی[170]، موتمن الدولہ خان شوستری[171]، وہ سب تازہ ولایت ایرانی تھے لیکن ہندوستان کی صحبتوں سے آشنا ہوتے ہی انہوں نے محسوس کیا کہ موسیقیٔ ہند سے واقفیت پیدا کیے بغیر اپنی دانش و شائستگی کی مسند نہیں سنبھال سکتے۔ اس لیے اس کی تحصیل ناگزیر ہے۔ قزلباش خاں امید کی مجالس طرب کا حال قاضی مُحمد خاں اختر[172] نے اپنے مکاتیب میں لکھا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس فن میں کس درجہ دستگاہ اسے حاصل ہو گئی تھی[173]۔ شیخ علی حزیں ایرانی[174] موسیقی سے پوری طرح باخبر تھے لیکن ہندوستان میں انہوں نے ہندوستانی موسیقی کی بھی تحصیل کی۔ پٹنہ کے قیام کے زمانے میں ان کا یہ دستور تھا کہ ہفتہ کے دو دن موسیقی کی صحبت کے لیے مخصوص کر دیئے تھے۔ شہر کے باکمال حاضر ہوتے اور فن کی باریکیوں کے نمونے پیش کرتے۔

اودھ کی نوابی کے دور میں تفضل حسین خاں علامہ [175] کے علم و فضل کی بڑی شہرت ہوئی۔ شوستری [176] صاحب تحفۃ العالم [177] کلکتہ میں ان سے ملا تھا جب وہ اودھ کی سفارت کے منصب پر مامور تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ تمام علوم عقلیہ کے ساتھ موسیقی میں بھی درجۂ اجتہاد رکھتے ہیں اور شوق و ذوق کا یہ حال ہے کہ جب تک ساز پر راگ چھیڑا نہیں جاتا ان کی آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوتیں۔ ایک ماہر فن سازندہ صرف اس کام کے لیے ملازم ہے کہ شب کو خوابگاہ میں خواب آور گت چھیڑ دیا کرے۔ [178]

لکھنؤ کے علماء فرنگی محل میں سے بحر العلوم [179] کی نسبت ان کے بعض معاصروں نے لکھا ہے کہ فن موسیقی میں ان کا رسوخ عام طور پر مسلّم تھا۔ [180]

البتہ یہ ظاہر ہے کہ قوموں کے عروج و ترقی کے زمانے میں جو اشتغال تحسین فکر اور تہذیب طبع کا باعث ہوتا ہے، وہی دور تنزل میں فکر کے لیے آفت اور طبیعت کے لیے مہلکہ بن جاتا ہے۔ ایک ہی چیز حسن استعمال اور اعتدالِ عمل سے فضل و کمال کا زیور ہوتی ہے، اور سُوءِ استعمال اور افراط و تفریط عمل سے بداخلاقی اور صد عیبی کا دھبہ بن جاتی ہے۔ موسیقی کا ایک شوق [181] تو اکبر کو تھا کہ اپنی یلغاروں کے بعد جب کمر کھولتا تو مجلس سماع و نشاط سے ان کی تھکن مٹاتا اور پھر ایک شوق محمد رنگیلے کو تھا کہ جب تک محل کی عورتیں اسے دھکیل دھکیل کر پردہ سے باہر نہ کر دیتیں، دیوان خانہ میں قدم نہیں رکھتا۔ صفدر جنگ [182] جب دیوان کی مہمات سے تھک جاتا تو موسیقی کے باکمالوں کو باریاب کرتا۔ اسی کی نسل میں واجد علی شاہ [183] کا یہ حال تھا، کہ جب طبلہ بجاتے بجاتے تھک جاتا تو تازہ دم ہونے کے لیے اپنے وزیر علی نقی [184] کو باریابی کا موقع دیتا۔ موسیقی کا شوق دونوں کو تھا مگر دونوں کی حالتوں میں جو فرق تھا، وہ محتاجِ بیان نہیں۔

سارت مشرّقۃً و سرت مغربا
شتان بین مشرقٍ و مغرب

اس بات کی عام طور پر شہرت ہوگئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنون لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرمات شرعیہ میں داخل ہے حالانکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ فقہا نے سدِّ وسائل کے خیال سے اِس بارے میں تشدد کیا اور یہ تشدد بھی باب قضاء

سے تھا نہ کہ بابِ تشریع سے۔ قضاء کا میدان نہایت وسیع ہے؛ ہر چیز جو سوءِ استعمال سے کسی مفسدہ کا وسیلہ بن جائے، قضاءً روکی جاسکتی ہے لیکن اس سے تشریع کا حکم اصلی اپنی جگہ سے نہیں ٹل جاسکتا۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ [185] لیکن یہ مبحث میں یہاں نہیں چھیڑنا چاہتا۔ یہاں جس زاویہ نگاہ سے معاملہ پر نظر ڈالی جارہی ہے، وہ دوسرا ہے۔

مومن! آ، کیشِ محبت میں کہ سب کچھ ہے روا
حسرتِ حرمت صہبا و مزامیر نہ کھینچ [186]

دیکھیے بات کیا کہنی چاہتا تھا اور کہاں سے کہاں جا پڑا؟ اب لکھنے کے بعد صفحوں پر نمبر لگائے تو معلوم ہوا کہ فل سکیپ کے چھبیس ۲۶ صفحے سیاہ ہو چکے ہیں۔ بہر حال اب قلم روکتا ہوں:

حرفِ نامنظورِ دل یک حرف ہم بیش ست وبس
معنیٔ دلخواہ گر صد نسخہ باشد ہم کم ست [187]

از

مالک رام

دیباچہ

صفحہ	شمار	
۳۶	۱	میر عظمت بیخبر بلگرامی، سیّد العارفین میر سیّد لطف اللہ حسینی واسطی بلگرامی المعروف شاہ لدھا کے صاحبزادے، صوفی صافی اور شاعرِ حقائق گو تھے۔ ''غبارِ خاطر'' کے علاوہ ایک کتاب ''گرامی نامہ'' بھی اُن سے یادگار ہے۔ شعرائے فارسی کے حالات میں ایک تذکرہ ''سفینۂ بیخبر'' قلم بند کیا تھا۔ ان کے دیوان میں تقریباً سات ہزار شعر ہونگے۔ روزِ دوشنبہ ۲۴ ذی القعدہ ۱۱۴۲ھ /۱۶ جون ۱۷۳۰ کو دلّی میں میں انتقال ہوا اور جوار حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ میں دفن ہوئے۔ (سروِ آزاد: ۳۱۵۔۳۲۵ : نزہۃ الخواطر: ۶: ۱۸۲۔۱۸۳)
	۲	حسّان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اُن علماو شعراء میں سے ہیں، جن کے وجود پر اس ملک کو بجا ناز ہوسکتا ہے۔ ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ /۱۸ جون ۱۷۰۴ء بلگرام میں پیدا ہوئے۔ مختلف علوم میں تعلیم پائی اور درجۂ استناد حاصل کیا۔ سفرِ حج کے بعد اورنگ آباد دکن میں مقیم رہے اور نظام الدین ناصر جنگ شہید سے تعلق پیدا کیا، اور ان کے انتقال کے بعد آزاد رہے۔ متعدد فارسی اور عربی کی تصانیف ان سے یادگار ہیں۔ عربی میں ان کے سات دیوان ہیں۔ سروِ آزاد، ید بیضا، خزانۂ عامرہ، روضۃ الاولیا، سبحۃ المرجان ، مآثر الکرام متعدد تذکرے لکھے۔ جمعہ ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۰۰ھ /۱۵ ستمبر ۱۷۸۶ء کو انتقال ہوا۔ ''غلام علی آزاد'' تاریخ ہے۔ خلد آباد (مہاراشٹر) میں مدفون ہیں۔ (سروِ آزاد :۲۹۱۔ ۳۰۷: مآثر الکرام ;۱۶۱۔ ۱۶۴: نزہۃ الخواطر ،۶: ۲۰۱۔ ۲۰۵: اتحاف النبلا : ۳۳۵)
	۳	سراج الدین علی خان آرزوؔ۔ حضرت شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کی اولاد میں ۱۱۰۱ھ /۱۶۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں میر عبدالصمد سخن اور غلام علی احسنی گوالیاری سے مشورہ رہا۔ بعہد فرخ سیر دلّی آئے، اور حملۂ نادری کے نتائج سے پریشان ہو کر اواخرِ محرم ۱۱۶۸ھ /۱۱ اکتوبر ۱۷۵۴ء میں شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد پہنچے۔ جہاں سالار جنگ کی سفارش پر تین سو مشاہرہ مقرر ہوگیا۔ ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ /۲۶ جنوری ۱۷۵۲ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ پہلے اماناً فیض آباد میں دفن ہوئے، بعد کو ان کی وصیت کے مطابق لاش دلّی آئی اور یہیں مدفون ہیں۔ سروِ آزاد: ۲۲۷۔ ۲۳۱: خزانۂ عامرہ: ۱۲۶: سفینۂ خوشگو: ۳۱۲۔۳۲۱: سفینۂ ہندی: ۵۔۶)

صفحہ	شمار	
	۴	آنندرام مخلص۔ سوہدرہ (ضلع گوجرانوالہ۔ پاکستان) کے رہنے والے تھے، لیکن تقریباً ساری عمر شاہجہان آباد میں بسر ہوئی، جہاں وہ دربارِ شاہی میں اعتماد الدولہ قمر الدین خاں اور سیف الدولہ عبدالصمد خاں ناظم صوبۂ لاہور کے وکیل رہے۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اپنے معاصر سیاسی حلقوں میں اُن کا کیا مرتبہ ہوگا۔ انھیں 'رائے رایان' کا خطاب ملا تھا۔ ابتداء میں بیدل سے اصلاح لیتے رہے، اُن کے بعد خان آرزو سے مشورہ رہا۔ ۱۱۶۴ھ / ۱۷۵۰۔۱۷۵۵ء میں بعارضۂ نفث الدم انتقال کیا۔ (خزانۂ عامرہ: ۴۲۵، شمع انجمن: ۴۳۴؛ ۴۳۴، سفینۂ خوشگو: ۳۳۱۔۳۳۸: سفینۂ ہندی: ۱۹۶۔۱۹۷)
	۵	محمد اجمل خان فروری ۱۸۹۷ء میں یوپی کے قصبے گوتنی (ضلع پرتاپ گڑھ) میں پیدا ہوئے۔ ایم اے، ایل ایل بی تک تعلیم پائی۔ کچھ دن وشو بھارتی میں مدرس رہے۔ ۱۹۳۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے انھیں اپنا سکریٹری مقرر کیا: اور وہ مرحوم کے یومِ آخر تک اسی حیثیت سے اُن سے وابستہ رہے۔ خود بھی مصنف تھے: متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں، جن میں سب سے اہم حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانحعمری ہے، جو قرآن سے اخذ کی گئی ہے۔ مولانا آزاد کی وفات کے بعد انھیں راجیہ سبھا کا رکن نامزد کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنی وفات تک یہاں رہے۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۹ء کی صبح ولنگڈن اسپتال، نئی دلی میں انتقال ہوا: اور اسی دن سہ پہر کو بستی نظام الدین (غربی) میں احاطۂ خاندان خواجہ حسن نظامی میں دفن ہوئے۔
	۶	کلیاتِ غالب (فارسی (: ۲۷۵۔ مطبوعہ دیوان میں مصرع اولیٰ میں "نسخہ" کی جگہ "قصہ" ہے اور یہی ٹھیک ہے۔
		خط۔ ا
۳۷	۱	خواجہ حافظ شیرازی کے مصرع پر نیا مصرع لگا کر مولانا نے اسے اپنا لیا ہے۔ حافظ کا دوسرا مصرع یوں تھا: می گویمت دعا و ثنا می فرستمت (دیوان کامل خواجہ حافظ شیرازی: ۵۱)

صفحہ	شمار	
		پہلی تینوں اشاعتوں میں یہاں اس خط کے بعد نواب صدر یار جنگ کا مندرجہ ذیل خط چھپا تھا:

حبیب گنج (علی گڈھ)

۱۱ر جولائی ۱۹۴۵ء

صدیق حبیب!

جس دن بدرِ کامل گہن سے نکلا تھا، دل نے محسوس کیا تھا کہ نورِ عظمت جہانتاب ہوگا ہوا، اور کس شان سے ہوا۔ ۲۷ جون کو پہاڑ کی چوٹیوں کا ایک ہنگامہ ایک گروپ کی شکل میں سامنے آیا۔ اس میں ایک پیکر محبوب بھی تھی۔ قینچی لی، مجمع اغیار سے اسے جدا کیا۔ دیکھا شیراز کی طرف سے صدا آئی:

(۴۷۱)
روشن از پر تو رویت نظرے نیست کہ نیست
منتِ خاک درت بصرے نیست کہ نیست

اس غزل کا ایک اور شعر شاید بے موقع نہ ہو:

(۴۷۲)
مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفلِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

خیر، یہ تو ترانۂ شیراز تھا۔ کان لگاتا ہوں، تو شملہ کی چوٹیوں سے دوسرا ترانۂ محبت سامعہ نواز ہو رہا ہے:

(۴۷۳)
اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل
می بینمت عیان و دعامی فرستمت!

جو کان نے سُنا، تیسرے دن نقوش دل افروز کے پردے پر آنکھوں نے دیکھ لیا اجازت ہو تو دوسرا مصرع میں بھی دُہرادوں!

می بینمت عیان و دعامی فرستمت!

نیاز کیش

حبیب الرحمٰن

نواب صاحب مرحوم کے خط میں تینوں شعر خواجہ حافظ شیرازی کے ہیں۔ اس کے بعد پھر نواب صاحب ہی کا مندرجۂ ذیل نامۂ منظوم چھپا تھا:

حبیب گنج (علی گڑھ)

صفحہ	شمار	
		۶ رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ محو نظارۂ گل مرغ نگارے دارم / کز خیالش بہ دلِ زار بہارے دارم اے نسیم سحری گز بحضورش گذری / عرضہ دہ شوق کا درجانِ نگارے دارم در بپر سد کہ "مگر شوقِ پیام دارد؟" / سرفرود آرو زمن گوئے کہ "آرے دارم" دُوردستاں را بہ نعمت یاد کردن ہمت است ورنہ ہر نخلے بہ پائے خود ثمری افگند اسیر آزاد حبیب اس کے پہلے تینوں شعر نواب صاحب کے اپنے ہیں۔ وہ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے: چوتھا شعر صائب تبریزی کا ہے (کلیات صائب: ۵۰۳) چھپے ہوئے نسخے میں البتہ پہلے مصرع میں 'نعمت' کی جگہ ٹھیک 'احساں' ہے۔
		خط ۲:
۳۸	۱	ا۔ بتغیر الفاظ یہ مصحفی کا مصرع ہے (جواہر سخن، ۲: ۶۴۹)۔ پورا شعر یوں چھپا ہے: سراغ قافلۂ اشک لیجیے کیونکر نکل گیا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے لیکن رضا لائبریری، رام پور میں مصحفی کے دیکھے ہوئے خطی دیوانِ اول میں دوسرا مصرع یوں ہے: گیا ہے دُور نکل وہ دیارِ حرماں سے
	۲	فیضی کے مشہور قصیدے کا مطلع ہے، جو اس نے اکبر کی مدح میں کہا تھا۔ (شعر العجم، ۳: ۳۹) صحیح 'می کشد' کی جگہ 'می کند' ہے۔

صفحہ	شمار	
۳۹	۳	دیوان کلیم کاشانی: ۳۲۶۔ مصرع ثانی میں مطبوعہ روایت 'از انیم'، کی جگہ 'بہ آنیم' ہے۔
	۴	کلیاتِ غالب: ۳۶۰
	۵	اس شعر کا قائل مجہول ہے، لیکن یہ شعر کئی کتابوں میں ملتا ہے، مثلاً سمط اللآلی، ۱: ۴۱؛ شرح التعرف لمذہب التصوف، ۱: ۶۲؛ ایضاً، ۲: ۷۱ وغیرہ

خط: ۳

صفحہ	شمار	
۴۰	۱	صبری اصفہانی کا شعر ہے (بہترین اشعار: ۲۹۴) پژمان کے نسخے میں مصرع اول میں 'درد'، کی جگہ 'حال' ہے۔
	۲	پہلے ایڈیشن میں 'پھیلی ہوئی ہے'، کی جگہ، 'پھیلتی گئی ہے'، تھا۔
	۳	دیوان حافظ: ۳۴۸ مطبوعہ نسخے میں 'می نوشیم' کا جگہ 'می گیریم' ہے۔
۴۱	۴	دیوان نظیری: ۱۵۰۔ دیوان میں دونوں مصرعوں میں اختلاف ہے: پہلے مصرعے میں ''رسم وراہ'' کی جگہ ''رسمہائے'' اور دوسرے میں ''نہ بود'' کی جگہ ''نہ شد۔''
	۵	اس سے مولانا آزاد مرحوم کی بیگم کے انتقال کی طرف اشارہ مقصود ہے (دیکھیے نیچے مکتوب ۲۱، ص: ۲۳۴۔۲۴۲)
۴۲	۶	کلیاتِ غالب: ۵۲۵۔ صحیح 'دلِ گم گشتہ' ہے، اگرچہ بعض مطبوعہ نسخوں میں ''سرگشتہ'' بھی ملتا ہے۔ پہلا مصرع ہے: بگوشم می رسد از دور آوازِ درا امشب۔
	۷	دیوان حافظ: ۱۶۶ مطبوعہ نسخے میں مصرع ثانی میں 'این' کی جگہ 'آن' ہے۔
۴۳	۸	دیوان غالب: ۱۶۲ شعر یوں ہے: ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں
	۹	۹۔ کلیاتِ غالب: ۴۲۹۔ پورا شعر ہے: دوش کز گردشِ بختم گلہ بر روئے تو بود چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود
	۱۰	۱۰۔ پہلی اشاعت میں یہاں صرف 'موثر' تھا۔

صفحہ	شمار	
	5	۱۱۔ پہلی اشاعت میں آخر میں یہ لفظ زاید تھے: 'جواب وہیں مرحمت ہو'۔

خط: ۴

صفحہ	شمار	
۴۴	۱	دیوان غالب، :۱۳۹۔ ٹھیک مصرع اولیٰ میں 'سر ہے' کی جگہ 'ہے سر' ہے۔
	۲	دیوان غالب: ۱۲۵۔
۴۵	۳	آقا رضی مسرور قزوینی کا شعر ہے۔ (شمع انجمن: ۴۳۳؛ بہترین اشعار: ۵۶۶) شمع انجمن مصرع اولیٰ میں 'بہ بیند' ہے یہ سہوِ کتابت ہے۔
	۴	Coupe ریل گاڑی کا بند ڈبہ جس میں صرف دو آدمیوں کے لیے جگہ ہوتی ہے؛ یہ عام طور پر اہم شخصیتوں کے استعمال کے لیے ہوتا ہے۔
	۵	دیوان حافظ: ۱۴۱
	۶	فیضی کا شعر ہے (شعر العجم، ۳: ۷۰) شعر العجم میں 'منزلِ آخر' کی جگہ 'منزل اوّل' ہے۔
	۷	کلیاتِ بیدل، ۴ (عنصر دوم): ۱۳۲ کلیات کے تینوں مصرعوں میں ''زندگی'' کی جگہ ''ہستیم'' ہے۔
۴۶	۸	طبع اول میں 'یہ' سے 'موجود نہیں ہے۔
	۹	Alarum کی Time Piece وہ گھڑی جس کی ایک خاص سوئی کو کسی گھنٹے پر جما کر اسے کوک دیا جائے، تو وقت پر اس سے گھنٹی بجنے لگتی ہے۔
	۱۰	گلستان (باب اول) کا شعر ہے (کلیات سعدی: ۱۵)
	۱۱	میرزا عبدالقادر بیدل کا مصرع ہے (کلیات ;۱: ۸۷۸) پورا شعر ہے: نہ بنقشِ بستہ مشوشم، نہ بحرف ساختہ سرخوشم نفسے بیاد تو سرکشم، چہ عبارت و چہ معانیم
۱۴	۱۲	یہ شعر ابو نُو اس کا نہیں، نہ اس کے دیوان میں ملا، اگرچہ ابوالقاسم الزعفرانی نے بھی اسے ابونواس ہی کا بتایا ہے۔ اس کے برخلاف راغب اصفہانی نے محاضرات الادبا (۱: ۸۵ نیز ۲: ۷۱۲) میں اور ابن خلکان نے وفیات الاعیان (۱: ۲۰۸) میں اسے صاحب بن عباد سے منسوب کیا ہے، اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ محاضرات میں مصرع

صفحہ	شمار	
		اوّل میں ''رقت'' کی جگہ ''راقت'' ہے۔
	۱۳	قاآنی کا مصرع ہے (دیوان قاآنی: ۱۴۸) دوسرا مصرع ہے: لذہ برد، غم بشکرد، شادی دہد، جاں پرورد
	۱۴	دیوانِ فیضی: ۱۷۴۔
۴۸	۱۵	دیوان حافظ: ۱۴۵۔ نسخہ مطبوعہ میں 'درقلم' کی جگہ ''برقلم'' ہے: اور یہی درست ہے۔
	۱۶	بیدل کا مصرع ہے (کلیات، ۱: ۱۱۷۷) پہلا مصرع ہے۔ منِ بیدل حریف سعیِ بیجا نیستم زاہد !
	۱۷	دیوان حافظ: ۳۶۲۔ مصرع ثانی میں 'بفسق' کی جگہ 'زفسق' چاہیے۔
	۱۸	خواجہ الطاف حسین حالی کی رباعی کا آخری مصرع ہے (ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی: ۱۸؛ نیز کلیات نظم حالی، ۲: ۳۷۵) تذکرہ ''صبح گلشن'' (۱۱۷۔۱۱۸) میں بھی یہ ٹھیک حالی ہی کے نام سے درج ہے۔ البتہ تذکرۂ ''روز روشن'' (ص ۶۰۳) میں اسے رائے کانجی سہارے متین الہ آبادی سے منسوب کر دیا گیا ہے' جو غلط ہے۔ پوری رباعی یوں ہے: سرمفراز' خاک پائے ہمہ باش دلہا مخراش' دررضائے ہمہ باش با خلق نیامیختن' از خامیِ تست ترک ہمہ گیر و آشنائے ہمہ باش
	۱۹	دیوان درد: ۵۲
۴۹	۲۰	کلیات عرفی: ۲۹۵۔ 'صحِ اقلیم' کی جگہ 'جیحون' ہے۔
	۲۱	دیوان ذوق (مرتبہ آزاد): ۱۲۲؛ ایضاً (مرتبہ ویران): ۵۸۔ مصرع اولیٰ دونوں جگہ مختلف ہے۔ ویران کے نزدیک یہ ہے ''پوشیدہ ان نگاہوں میں سرخوش ہیں رات دن۔'' آزاد لکھتے ہیں: پردہ میں چشم مست کے سرخوش ہیں جو مدام۔
	۲۲	ابونواس کا شعر ہے۔ (دیوان ابی نواس: ۲۸)
	۲۳	پہلی اشاعت میں یہ دونوں حاشیے موجود نہیں۔
	۲۴	سب اشاعتوں میں یہاں 'اپنے' چھپا ہوا تھا۔ ظاہراً یہ کتابت کی غلطی ہے' کیونکہ توبہ بالاتفاق مؤنث ہے' مثلاً گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا (غالب) اسی لیے متن میں تصحیح کر دی گئی ہے۔
	۲۵	ملا محمد رضا نوعی خبوشانی کا مصرع ہے (روز روشن: ۷۲۳) مصرع اولیٰ ہے: ''خمارِ بادہ ام از توبہ گر پشیماں کرد۔'' ماثر رحیمی (۳: ۶۷۷) میں مصرع اوّل یوں ہے: خمارِ بادہ

صفحہ	شمار	
		گر از تو بہ ام پشیماں کرد۔"
۵۰	۲۶	یہاں سہو قلم معلوم ہوتا ہے۔ 'نشاط' مذکر نہیں' بلکہ مؤنث ہے۔ نوازش لکھنوی کا شعر ہے: باتیں جو تم نے آج یہ چھیڑیں ملال کی پھر کیا رہی نشاط تمھارے وصال کی
	۲۷	دیوان نظیری: ۴۶۔ مطبوعہ نسخے میں 'دردی وصافی' ہے۔
	۲۸	خاقانی کا مصرع ہے (کلیات' ۲: ۹۶۷) پورا شعر ہے: قضائے بنوشت خاقانی قلم ایں جارسید سربشکست گویا مولانا آزاد کے ہاں 'واؤ' زائد ہے۔

خط: ۵

صفحہ	شمار	
۵۱	۱	کلیات بیدل، ۱: ۱۲۳
	۲	میر ضیاالدین حسین الملخاطب بہ اسلام خان متخلص بہ والا بدخشی کا شعر ہے (خزانہ عامرہ: ۱۷۷؛ شمع انجمن: ۵۱۷)
	۳	محسن کاکوروی کا مصرع ہے (کلیات نعت مولوی محمد حسن: ۲۰۴) ٹھیک شعر یوں ہے: حالت نہ پوچھیے مرے شیب و شباب کی دو کروٹیں تھیں عالم غفلت میں خواب کی یعنی مصرع ثانی میں 'ہیں' کی جگہ 'تھیں' ہے۔
۵۲	۴	محمد جان قدسی کا رباعی کا آخری مصرع ہے (بزم ایران: ۵۲۹) پوری رباعی ہے: ہر کار کہ در جہاں میسر گردد ہر گاہ بہ پایاں رسد' ابتر گردد نیکو نبود ہیچ مرادے بکمال چوں صفحہ شد، ورق برگردد
	۵	حافظ کے 'ساقی نامہ' کا شعر ہے (دیوان کامل خواجہ حافظ شیرازی: ۳۵۸)
	۶	طبع اول: ورکینگ
	۷	کلیات میر (دیوان اول): ۲۰۸

صفحہ	شمار	
	۸	صاحب مکان سے مراد شری بھولا بھائی ڈیسائی ہیں؛ جن کے ساتھ مولانا ٹھہرا کرتے تھے۔ان کا ۶رمئی ۱۹۴۶ء کو دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔آخری عمر میں وہ کچھ دماغی پریشانیوں کا شکار رہنے لگے تھے۔
	۹	یہ صاحب مولانا آزاد کے حقیقی بھانجے تھے؛ محمد طاہر خان نام تھا۔ان کی ولادت یکم جنوری ۱۹۰۰ء کو ہوئی۔شروع میں چند ماہ ملازمت کی لیکن بعد کو اسے ترک کر دیا۔ان کا باندرہ میں قیام تھا۔بمبئی میں ان کا اچھا خاصا درآمد کا تجارتی کاروبار تھا۔ حکومتِ وقت کے بھی معتمد علیہ تھے؛ خان صاحب کا خطاب ملا تھا؛ M.B.E بھی ہوئے۔پھر کانگریس میں شامل ہوگئے۔انتخاب میں کامیاب ہوئے؛ تو MLC اور MLA بنے۔اور کچھ زمانہ آنریری مجسٹریٹ اور J.P (جسٹس آف پیس) بھی رہے۔ لکھنؤ میں ۲۱ جنوری ۱۹۶۳ء جنوری ۱۹۶۳ء کو انتقال ہوا اور وہیں دفن کیے گئے۔اولاد میں دو لڑکے اور ایک صاحبزادی جسمانی یادگار چھوڑے۔بڑے لڑکے محمد عارف انجینئر بمبئی میں مقیم ہیں (خطوط سیّد حامد علی صاحب بمبئی)
۵۳	۱۰	دیوان حافظ: ۱۴۷۔دوسرا مصرع یوں چھپا ہوا ملتا ہے: بود آیا کہ فلک زیں دوسہ کارے بکند
	۱۱	دیوان حافظ: ۲۳۴ پہلا مصرع ہے: جائے کہ تخت و مسندِ جم می رود بباد
	۱۲	طالب علی عیشی کا مصرع ہے (جواہر سخن ۲: ۸۱۸) پہلا مصرع ہے: کہاں ہم اور کہاں یہ نکہتِ گل
	۱۳	اس سے بھولا بھائی ڈیسائی کے صاحبزادے دھیرج لال ڈیسائی مراد ہیں۔ان کا بعارضہ قلب بعمر ۴۳ سال ۲۱ مارچ ۱۹۵۱ء کو انتقال ہوا۔
	۱۴	دیوان حافظ: ۵۸۔پہلا مصرع ہے: سحر کرشمۂ وصلش بخواب می دیدم
۵۴	۱۵	کہا جاتا ہے کہ یہ مصرع نظام ششم نواب محبوب علی خان والی حیدر آباد کا ہے۔۱۹۰۰ء کے لگ بھگ ریاست کے بعض اعلیٰ افسروں نے ان کے خلاف کوئی سازش کی تھی؛ اس موقع پر انھوں نے اطلاع ملنے پر متعلقہ کاغذات طلب کیے کہ دیکھیں؛ کن لوگوں نے اس سازش میں حصہ لیا ہے؛ اور یہ مصرع کہا۔بعد کو اس پر پیش مصرع لگا کر شعر یوں پورا

صفحہ	شمار	
		کردیا: لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی (ہماری زبان، علی گڈھ، یکم جولائی ۱۹۶۶ء، ص ۹) لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہ مصرع کسی اور کا ہے۔
	۱۶	بتغیر الفاظ غالب کا مصرع ہے (کلیات غالب: ۴۹۴) پورا شعر ہے: پست بر کوہ ست طاقت تکیہ تا بر رحمتست کار دشوارست و مابرخویش آساں کردہ ایم
	۱۷	دیوان حافظ: ۱۴۵
	۱۸	Terminus کسی ریلوے لائن کا آخری اسٹیشن۔ اب اور گاڑیوں کے لیے بھی استعمال ہونے لگا ہے۔
	۱۹	ریسٹوران کار (Restaurant Car) ریل گاڑیوں کا وہ ڈبہ جس میں کھانا تیار کرکے مسافروں کو کھلایا پلایا جاتا ہے۔
	۲۰	میر انشا کا مصرع ہے (کلام انشا: ۱۵۳)؛ پورا شعر ہے: کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں بہت آگے گئے؛ باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
۵۵	۲۱	کلّیات غالب: ۴۰۰
	۲۲	دیوان حافظ: ۳۱۹۔ مطبوعہ نسخے میں شعر یوں ہے: بنوش مَے کہ سبکروحی لطیف مدام علی الخصوص درآں دم کہ سرگراں داری
	۲۳	غالب کی مشہور غزل کا مصرع ہے (دیوان غالب: ۱۹۰) پہلا مصرع ہے: یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں طبع اوّل میں 'نُور' تھا اور طبع ثالث میں 'سوز'؛ درست 'نُور' ہی ہے۔
	۲۴	دیوان درد: ۳۱۔ دراصل 'جی' کی جگہ 'دل' ہے۔
۵۶	۲۵	دیوان حافظ: ۱۵۷
	۲۶	ایضاً: ۲۵۔ مصرع اولیٰ ہے: مراد منزلِ جاناں چہ امن و عیش، چوں ہر دم
	۲۷	شروح سقط الزند' (شروح' ۳: ۱۲۲۸) دیوان میں مصرع اولیٰ میں 'بالخیف' کی جگہ

صفحہ	شمار	
		'بالحزن' ہے۔
۵۷	۲۸	طبع اوّل: گانوں۔
	۲۹	ملک احمد نظام الملک۔ نظام شاہی خاندان کا بانی ۸۹۵ھ تا ۹۱۵/ ۱۴۹۰ء تا ۱۵۰۹ء حکمران رہا۔ اُس کا باپ ملک حسن نو مسلم تھا؛ اُس کا اصلی نام تما بھٹ اور اُس کے باپ کا نام بھیر تھا۔ (فرشتہ ۲: ۱۸۰) اسی بھیر کی نسبت سے وہ بھیری کہلاتا ہے' اور اسی سے بعض لوگوں نے بحری بنالیا ہے۔ (اس سلسلے میں مآثر رحیمی اور منتخب اللباب کے متعلقہ مقامات بھی دیکھے جائیں)۔
	۳۰	تاریخ فرشتہ' ۲: ۱۸۸۔ ۱۸۹
	۳۱	برہان نظام شاہ اوّل: ۹۱۵۔ ۹۶۰ھ/ ۱۵۰۹۔ ۱۵۵۳ء
	۳۲	شبلی نعمانی کا شعر ہے (کلیات شبلی: ۳۵)
	۳۳	چاند بی بی یا چاند سلطانہ' حسین نظام شاہ والی احمد نگر کی بیٹی' مرتضیٰ نظام شاہ کی ہمشیرہ اور بیجاپور کے حکمران علی عادل شاہ کی ملکہ تھی۔ علی عادل کی وفات (۱۵۸۰ء) پر اس کا نابالغ بھتیجا ابراہیم عادل اس کا جانشین ہوا؛ اور ملکہ چاند سلطانہ اس کی سر پرست مقرر ہوئی۔ ۱۵۹۵ء میں اکبری فوجوں نے شاہزادہ مراد کی سرکردگی میں احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ چاند سلطانہ نے جس ہوشیاری اور بہادری سے دفاع کا انتظام کیا اور اپنی فوجوں کی کمان کی' وہ تاریخ ہند کا روشن باب ہے۔ مراد کو منہ کی کھانا پڑی اور وہ صلح نامے پر دستخط کر کے آگرے کو سدھارا۔ چار برس بعد ۱۵۹۹ء میں دوبارہ اکبر نے دھاوا بول دیا۔ اب کے نہ صرف شاہی افواج کا پلّہ بھاری تھا' بلکہ ملکہ کے ساتھیوں نے بھی غداری کی۔ چیتہ خاں خواجہ سرا نے اہلِ قلعہ سے سازش کر کے سلطانہ کو قتل کر ڈالا اور قلعہ اکبر کے قبضے میں آ گیا۔
	۳۴	دیوان حافظ: ۹۹ مطبوعہ نسخے میں مصرع اولیٰ میں 'بیفشاں' کی جگہ 'بیفگن' ہے۔
۵۸	۳۵	عبدالرحیم خانخاناں (بن بیرم خان خانخاناں) عہد اکبری و جہانگیری کے مشہور امیر' خود صاحب علم اور اہلِ علم کے قدر شناس اور مربی؛ فارسی' ترکی' ہندی تینوں زبانوں پر یکساں قدرت تھی۔ اکبر کی فرمائش پر توزک بابری کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ فارسی اور ہندی میں کلام موجود ہے۔ ان کی شجاعت اور جنگی قابلیت کے واقعات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ ۱۴ صفر ۹۶۴ھ / ۱۷ دسمبر ۱۵۵۶ء کو لاہور میں پیدا ہوئے اور ۱۹ جمادی الاول (۲۰ جمادی الثانی ۱۰۳۶ھ / ۲۶ جنوری (۲۶ فروری' ۱۶۲۷ء کو ۷۲ سال

صفحہ	شمار	
		کی عمر میں دلّی میں انتقال ہوا۔ بستی نظام الدین، دلّی میں ایک خاص مقبرے میں آسودۂ خواب ابدی ہیں (مآثر الامراء ۱: ۶۹۳-۷۱۳؛ مآثر رحیمی ۲: ۱۰۳؛ مفتاح التواریخ: ۲۳۲)
	۳۶	ملّا عبدالباقی نہاوندی، عہدِ اکبری و جہانگیری کے مشہور مصنف جنھوں نے عبدالرحیم خانخاناں کے حالات میں مآثر رحیمی لکھی۔ یہ کتاب ۱۰۲۵/۱۶۱۶ء میں مکمل ہوئی تھی۔ شمس العلماء مولانا ہدایت حسین کی تصحیح و تحشیہ کے بعد ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی طرف سے تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ (۱۹۳۰-۱۹۳۱ء)
	۳۷	صمصام الدولہ شاہنواز خان جن کی کتاب مآثر الامرا مرتبہ مرزا اشرف علی و مولوی عبدالرحیم تین جلدوں میں کلکتے سے شائع ہوئی ہے۔ (۱۸۸۸-۱۸۹۰)۔
	۳۸	مآثر الامراء ۱: ۱۰۷ 'است' اور 'ما' کے لفظ 'مآثر الامرا' سے اضافہ کیے گئے ہیں۔ 'شکست' کی جگہ متن میں 'حادثہ' تھا؛ یہ درستی بھی اصل کتاب پر مبنی ہے۔
	۳۹	یہ ابو فراس الحمدانی کا شعر ہے (دیوان ابی فراس: ۱۶۱۔
	۴۰	یہ مصرع حکیم کاظمائے تونی کا ہے (خریطہ جواہر: ۱۴۴) پورا شعر ہے ہر چند سیر کردم، جائے چو دل ندیدم با یک جہاں کدورت، بازایں خرابہ جاست تذکرۂ شمع انجمن (ص ۴۰۰) کی روایت میں مصرع ثانی یوں ہے: باصد جہاں کدورت، بازایں خرابہ جائیست
	۴۱	یہ سہو قلم ہو گا کیونکہ 'موز' مؤنث نہیں' بلکہ مذکر ہے۔
۵۹	۴۲	کلیات عرفی: ۳۱۷ پہلے مصرع میں 'گشتن' کی جگہ 'رفتن' چاہیے۔
	۴۳	کلیات سودا، ۱: ۲۔
	۴۴	شیخ ابو الفضل، شیخ مبارک کے بیٹے، اکبر کے دربار کے مایۂ ناز اور درخشندہ رتن، ۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں جہانگیر کے ایماء پر قتل ہوئے (حالات کے لیے دیکھیے آئین اکبری: ۲۶۲ - ۲۶۸؛ توزک جہانگیری ۹-۱۰۔ (دیباچہ)؛ مفتاح التواریخ ۲۰۴-۲۰۶؛ دربار اکبری ۵۲۱-۵۸۴)
	۴۵	Tank: بکتر بند فوجی گاڑی۔
	۴۶	کلیات بیدل ۱: ۶۷۷
۶۰	۴۷	دیوان غالب: ۲۳۴

صفحہ	شمار	
	۴۸	شاد عظیم آبادی کا مصرع ہے' اس فرق کے ساتھ کہ دراصل 'یہیں' کی جگہ 'وہیں' ہے (کلامِ شاد:۱۳۹) پورا شعر ہے: کمند پھینک کے جا قصرِ یار پر، اے شوق ! وہیں ملیں گے تجھے نالۂ بلند ترے اس کی دوسری روایت یہ ہے: کمند پھینک کے جا اس کے قصر پر' اے دل ! چھپے ہوئے ہیں کہاں نالۂ بلند ترے (کلیاتِ شاد ۲:۲۱۳)
	۴۹	امیر مینائی کا مصرع ہے (مرآۃ الغیب:۲۰۱) شعر ہے: نہ کر اے یاس !یوں برباد میرے خانۂ دل کو اسی گھر میں جلایا ہے چراغ آرزو برسوں
۶۱	۵۰	دیوان غالب:۲۳۸
	۵۱	پہلی اشاعت میں یہاں 'چائے دم دی' کی جگہ 'چائے بنائی' تھا۔
	۵۲	دیوان نظیری:۳۰۷
	۵۳	کلیات یغمائے جندقی:۱۷۴؛ مطبوعہ دیوان میں مصرع اولیٰ یوں ہے: چرا گویند درخُم صوفی فروکردی
۶۲	۵۴	ایضاً۔ البتہ مصرع اولیٰ میں 'شیخ' کی جگہ 'شحنہ' چھپا ملتا ہے۔
	۵۵	ایضاً۔ اسی غزل کے مطلع کا مصرع ہے؛ مصرع اولیٰ ہے: بہار ار بادہ در ساغر نمی کردم' چہ می کردم
	۵۶	غالب کا پورا شعر یوں ہے (دیوان:۵۶) یہ جانتا ہوں کہ، تو اور پاسخِ مکتوب ! مگر، ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

خط:۶

صفحہ	شمار	
۶۳	۱	دیوان نظیر نیشاپوری:۲۲۔ شعر ہے:

صفحہ	شمار	
		خضر صد منزل بہ پیشم آمد و نشنا ختم بازمی باید زسرگیرم رہ بیہودہ را یعنی 'خواہم' کی جگہ 'باید' ہونا چاہیے۔
	۲	احکامِ عشرہ تورات کی کتاب استثنا (۵: ۷-۲۱) میں بیان ہوئے ہیں۔ یوم سبت کا حکم آیات ۱۲-۱۵ میں یوں آیا ہے: تو خداوند اپنے خدا کے حکم کے مطابق سبت کے دن کو یاد کر کے پاک ماننا۔ چھ دن تک تو محنت کر کے اپنا سارا کام کاج کرنا؛ لیکن ساتویں دن خداوند تیرے خدا کا سبت ہے' اس میں نہ تو کوئی کام کرے' نہ تیرا بیٹا' نہ تیری بیٹی...... الخ۔
	۳	دیوان حافظ: ۳۰۴ مطبوعہ نسخے میں 'ہمہ سال' کی بجائے 'ہمہ سالہ' ہے۔
۶۴	۴	دیوان نظیری: ۱۷۲
	۵	طبعِ اول: کوٹھڑی
	۶	کلیات غالب (فارسی): ۳۸۸
	۷	دیوان غالب (اردو): ۲۳۵
۶۵	۸	دیوان غالب: ۱۱۹ صحیح 'دوگز' کی جگہ 'سوگز' ہے۔
۶۶	۹	کلیلہ ودِمنہ عربی کی مشہور کتاب ہے' جو دراصل 'پنچ تنتر' (سنسکرت) کا ترجمہ ہے۔ پہلے اس کا ترجمہ پہلوی میں ہوا اور اسی سے عربی ترجمہ عبداللہ ابن مقفع نے دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر عبداللہ منصور کے زمانے میں کیا۔ اس کتاب کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔
	۱۰	پہلے ایڈیشن میں یہاں مندرجہ ذیل حاشیہ تھا: "سائنس اب "ثابت شدہ حقیقت" اور "طبعیاتی جبریت" کی متاع سے بھی تہی دست ہو چکا ہے اور جس "حقیقت" کے سراغ میں نکلا تھا' وہی یک قلم اس پر مشتبہ ہوگئی ہے۔"
	۱۱	کلیات سودا: ۵۴
۶۷	۱۲	دیوان نظیری: ۱۷۔ مطبوعہ نسخے میں مصرع اول میں 'کوچہ' کی جگہ 'کوئے' ہے۔
	۱۳	بیدل کے مطلع کا مصرع ہے (کلیات '۱: ۸۷۸) پورا شعر یوں ہے: تو کریم مطلق و من گدا، چکنی جز ایں کہ نخوانیم در دیگرم بنما کہ من بکجا روم' چوبرانیم
	۱۴	یہ انگریزی شاعر لارڈ ٹینی سن کی 'ان میموریم' (In Memorium) کے پہلے بند کے

صفحہ	شمار	
		دو مصرعے ہیں، جو حضرت یسوع مسیح علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہے گئے ہیں۔ پورا بند یوں ہے۔ Strong son of God, Immortal Love Whom We, that have not seen thy Face By Faith, and Faith Alone, Embrace Believing Where we cannot prove "In Memorium" (The Poems and Plays of Tennyson:23)
۶۸	۱۵	دیوان غالب: ۱۳۰
	۱۶	اس شعر کے قائل کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ ثعالبی نے التمثیل والمحاضرہ (ص ۲۰۴) میں اسے نقل کیا ہے، اور کسی سے منسوب نہیں کیا۔ یہ الحماسۃ البصریہ (۲:۴:۱۷۴) میں بھی ملتا ہے، وہاں بھی شاعر کا نام نہیں ہے۔
۶۹	۱۷	کلیات عرفی: ۲۷۷
	۱۸	کلیات فیضی: ۴۹۲۔ اس شعر کی ایک دوسری روایت میں مصرع ثانی میں 'زاہیست' کی جگہ 'راہست' ملتا ہے؛ 'زاہیست' بہتر ہے۔
	۱۹	دیوان وحشی بافقی: ۲۰ : دیوان کا مطبوعہ شعر ہے: تا بغایت ماہنر پنداشتیم عاشقی خود عیب و عارے بودہ است اس کے بعد (ص ۲۸) پر یہی غزل دوبارہ چھپی ملتی ہے، وہاں مصرع ثانی میں 'خود عیب' کی جگہ 'خود ننگ' ہے۔
	۲۰	نظیری کا مصرع ہے (دیوان نظیری: ۴۶) پہلا مصرع ہے: بغیر دل ہمہ نقش و نگار بے معنی ست
۷۰	۲۱	نظیری نیشاپوری کا شعر ہے (دیوان: ۴۷) بعض جگہ مصرع اولیٰ یوں بھی دیکھا گیا ہے: بر چہرۂ حقیقت ما ماند پردۂ
	۲۲	فیضی: ۳۷۶۔ صحیح شعر یوں ہے: جلوۂ کاروانِ مانیست بناقہ و جرس شوقِ تو راہ می برد، دردِ تو زادمی دہد

صفحہ	شمار	
۷۱	۲۳	غالباً عرفی کا شعر ہے (شعر العجم ۲: ۱۳۱) قابل ذکر بات یہ ہے کہ اگرچہ کلیات کے نسخۂ مطبوعۂ ایران میں اس زمین میں غزل موجود ہے' لیکن اس میں یہ شعر نہیں ملتا۔
	۲۴	میرزا خاضع، میرزا صائب کے شاگرد اور سید عبدالجلیل بلگرامی کے ہمنشین تھے' اُن کی زبانی منقول ہے کہ ایک دن میں نے میرزا صائب کے سامنے یہ مصرع پڑھا: دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن مصرع بالکل مہمل تھا یعنی چند غیر متعلق چیزیں جمع کر دی تھیں۔ میرزا نے اس پر دوسرا مصرعہ لگا کر عجیب فلسفیانہ مضمون پیدا کر دیا۔ (ید بیضا: ۱۰۶(ب)) دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن بقدرِ ہر سکوں راحت بود، بنگر تفاوت را مولانا شبلی نے نقل میں مصرعوں کی جگہ بدل دی ہے (شعر العجم ۳: ۱۷۹)
	۲۵	اس مصرعے سے متعلق جہانگیر نے عجیب واقعہ لکھا ہے۔ لکھتا ہے کہ ایک دن کسی نے کہا' سپہ سالار اتالیق خانخاناں نے اس مصرع بہر یک گل زحمتِ صد خاری باید کشید پر غزل کہی ہے اور بعض دوسرے شعرائے دربار نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس پر فی البدیہہ یہ شعر میرے ذہن میں آیا: ساغرِ مے بر رخ گلزار می باید کشید ابر بسیار است، مے بسیار می باید کشید پھر تو بہت لوگوں نے اس پر غزلیں کہ کر گزرانیں۔ معلوم ہوا کہ یہ مصرع مولانا جامی کا ہے، ان کی پوری غزل ملاحظہ سے گذری' اس ایک مصرعے کے سوا جو زبان زدِ خاص و عام ہے' پوری غزل میں اور کوئی چیز کام کی نہ نکلی (توزک جہانگیری: ۲۳۲۔۲۳۳) لطیفہ یہ ہے کہ اب مطبوعہ دیوان میں نہ یہ مصرع ملا' نہ اس زمین میں غزل ملی۔
	۲۶	نشاط اصفہانی کا شعر ہے (ریاض العارفین: ۵۳۵) مطبوعہ شعر یوں ہے: طالباں را خستگی در راہ نیست عشق خود راہ ست وہم خود منزل ست
۷۲	۲۷	شیخ علی حزیں کا شعر ہے (کلیات: ۶۰۳) مطبوعہ کلیات میں پہلے مصرع میں 'ناصح' کی جگہ 'زاہد' ہے
	۲۸	مصرع ثانی میں سرمد غالباً غلط ہے! یہ سرمد کے کسی مجموعے میں بھی شامل نہیں ہے۔ یہ

صفحہ	شمار	
		رباعی متعدد جگہوں پر بیدل کے نام سے درج ہے اور ٹھیک شاید یوں ہے: زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد صوفی بے شبانہ ربطے دارد بیدل ہمہ را بحال خود می بینم ہر کس بخیال خویش خبطے دارد اگرچہ کلیات بیدل میں بھی تلاش کرنے پر نہیں ملی۔
	۲۹	تیسرے ایڈیشن میں یہاں ”کاربرداریوں“ ملتا ہے اور پہلے ”کاربرآریوں“ ٹھیک 'کاربرآریوں' ہی ہے اور یہی یہاں اختیار کیا گیا ہے۔
	۳۰	کلیات عرفی شیرازی: ۳۲ (اضافات) دیوان میں شعر یوں ہے: نہ داغ تازہ می خارد، نہ زخم کہنہ می کاود بدہ یارب! دلے کاین صورت بیجاں نمی خواہم
	۳۱	کلیات بیدل ۱: ۶۱۰
	۳۲	مفتی صدرالدین خان آزردہ کا شعر ہے (خم خانۂ جاوید ۱: ۵۹)
۷۳	۳۳	دیوان کلیم: ۲۹۴۔ مطبوعہ دیوان میں پہلے مصرعے میں 'آویزش' کی جگہ 'آمیزش' ہے اور دوسرا مصرع یوں ہے: روز و شب بامن و پیوستہ گریزاں ازمن
	۳۴	دیوان درد: ۵۳۔ مصرع ثانی ٹھیک یوں ہے: جیتا رہے گا کب تئیں ' اے خضر! مر کہیں
	۳۵	دیوان نظیری: ۱۷۹
۷۴	۳۶	کلیم کاشانی کا شعر ہے (دیوان: ۳۲۶) فرق صرف اتنا ہے کہ مطبوعہ نسخے میں مصرع ثانی میں ”ازانیم“ کی جگہ ”بہ آنیم“ ہے۔
	۳۷	کلیات غالب (فارسی): ۳۴۳۔
	۳۷	نظیری کا مصرع ہے، اس تفاوت کے ساتھ کہ 'لختے' کی جگہ 'حرفے' چاہیے۔ (دیوان نظیری: ۳۰۸) مصرع اول ہے: تحقیق حال ما زنگہ می تواں نمود
	۳۹	دیوان نظیری: ۱۰

خط: ۷

صفحہ	شمار	
۷۵	۱	طالب آملی کا شعر ہے (دیوان: ۱۱۳۳)
	۲	دیوان حافظ: ۶۲
	۳	ایضاً: ۱۲۴
۷۶	۴	Warder جیل خانے کا پہریدار
	۵	کلیات مومن ۱:۲۵۳
	۶	دیوان نظیری: ۱۴۵
	۷	طبع اول میں 'میٹھی نیند' کی جگہ 'خواب شیریں' تھا۔
	۸	شیخ سعدی کا شعر ہے (متن کامل دیوان سعدی شیرازی: ۳۹۳) دیوان میں یوں ملتا ہے: خلق رابیدار باید بود ز آبِ چشم من ویں عجب کاں وقت می گریم کہ کس بیدار نیست
	۹	ملا درکی قمی کا مصرع ہے (خریطۂ جواہر: ۱۰۸) مصرع اول ہے: زندہ در عالم تصویر ہمیں نقاش ست
۷۷	۱۰	دیوان حافظ: ۳۹
	۱۱	کلیات عرفی: ۳۸۶
	۱۲	مولانا آزاد کے والد کا نام مولانا محمد خیر الدین تھا۔ ان کے جستہ جستہ حالات اسی کتاب میں اور کچھ ''تذکرہ'' میں بھی ملتے ہیں۔ ان کا بروز شنبہ ۱۷ رجب ۱۳۲۶/۱۵ اگست ۱۹۰۸ء کو کلکتہ میں بعمر ۷۷ سال انتقال ہوا۔ دبدبۂ سکندری (۴۴: ۲۹: ۷) میں تاریخ وفات ۱۷ اگست ۱۹۰۸ء چھپی تھی' جو ٹھیک نہیں۔ یہ غلطی غالباً اس وجہ سے ہوئی کہ کلکتہ سے غلط خبر آئی یا دیر سے موصول ہوئی۔ تاریخ وفات ہے: قضا کرد اُف مولوی خیرِ دیں فقیہ زماں' اہلِ جوش و خروش سنِ فوت چوں خواستم از خرد بگفتا : ''فضایل پناہ ' اہل ہوش''

صفحہ	شمار	
		(۱۲۲۶ھ) کلکتے ہی میں مانک تلا کے قبرستان میں آسودۂ خواب ابدی ہیں۔ اذکار الابرار المشہور بہ تذکرۃ الاقطاب) پہلے ہر سال ۱۷ رجب کو ان کے مُرید عُرس کیا کرتے تھے؛ بوجوہ ۱۹۶۴ء کے بعد یہ نہیں ہوسکا۔ ان کی دو کتابیں ''درج الدُرَ البہیہ فی ایمان الآباء والا مہات المصطفویہ'' (مطبع توفیق' کلکتہ۔ ۱۳۱۲ھ) اور ''السعتہ العضروریہ فی المعارف الخیوریہ'' (مطبع معدن الرموز مسمّی بالکنز' کلکتہ) نظر سے گذریں۔ ان کی بعض اور کتابوں کے نام یہ ہیں: اسباب الترٗ ور لاصحاب الخیور (مطبع ہادی' بمبئی' ۱۳۱۸ھ)۔ حفظ المتین عن لصوص الدین (دربارۂ اطلاق لفظ خدا بر غیر خدا و ردّ شبہات منکرین، خیر الامصار مدینۃ الانصار (درفضیلت مدینہ منورہ)' الاوراد الخیوریہ سلالتہ الادعیہ الماثوریہ' لیکن یہ میری نظر سے نہیں گذریں۔ شعر بھی کہتے تھے۔ خیوری تخلص تھا۔ (ان کے مفصّل حالات کے لیے دیکھیے، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: ۶۶۔۱۷۷)
	۱۳	سب اشاعتوں میں یہاں 'کی' چھپا ہے۔ یہ غالبًا کاتب اول کی غلطی ہے' 'کا' کی جگہ 'کی' لکھ گیا۔ 'پہر' مذکر ہے' امیر مینائی کا شعر ہے (صنمخانۂ عشق: ۱۹۵) ایک ایک گھڑی روز قیامت سے بڑی ہے کس طرح کٹیں چار پہر ہجر کی شب کے
	۱۴	مفتی صدر الدین خانؒ دورِ آخر کی مشہور شخصیت ہیں۔ اصلاً کشمیری اور مولداً دہلوی تھے ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۹ میں پیدا ہوئے (''چراغ'' تاریخ ہے) شاہی میں ممتاز تھے اور انگریزی عہد میں بھی معزز رہے' صدر الصدوری کا عہدہ پایا۔ اردو' فارسی' عربی تینوں زبانوں پر یکساں قدرت تھی۔ عہد شاہجہانی کا مدرسۂ دار البقا' زندہ کیا تھا؛ اور طلبہ کو پڑھانے کے علاوہ اُن کے جملہ اخراجات کے بھی کفیل تھے۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ/ ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کو بعارضۂ فالج انتقال ہوا۔ ''چراغ دو جہاں'' سے تاریخ نکلتی ہے۔ درگاہ 'شاہ چراغ دہلی' میں دفن ہوئے تھے۔ (تذکرہ علمائے ہند: ۹۳۔۹۴)
	۱۵	رکن المدرسین سے مولانا منور الدّین مراد ہیں جو مولانا خیر الدین کے نانا تھے۔
	۱۶	حضرت شاہ عبد العزیزؒ دہلوی، حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی کے فرزند رشید ۲۵ رمضان ۱۱۵۹ھ/ ۳۰ ستمبر ۱۷۴۶ء کو پیدا ہوئے۔ نوے برس کی عمر تھی؛ جب شوال ۱۲۳۹ھ/ جون

صفحہ	شمار	
		۱۸۲۴ء میں رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ دلی دروازے کے باہر مہندیان (قبرستان) میں آسودۂ خواب ہیں۔ آخری دَور کے مشہور عالم اور منبع رُشد و ہدایت تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ (حالات عزیزی' تذکرہ' عزیزیہ)
	۱۷	یہاں 'پچھلی' کی جگہ 'پچھلے' ٹھیک ہوگا۔
۷۸	۱۸	دیوان حافظ: ۱۰۰
	۱۹	کلیاتِ بیدل، ۱: ۸۴۔ دوسرے شعر میں دراصل 'خجستہ بُو' کی جگہ 'رمیدہ بُو' ہے۔
۷۸	۲۰	دیوان حافظ: ۲۴۵۔ مصرع اولیٰ ہے: ایں کہ می گویند' آں بہتر ز حسن
	۲۱	مثلاً شمع انجمن: ۵۶؛ خزانہ عامرہ: ۱۲۲؛ مآثر الامرا' ۳: ۵۷۷ وغیرہ۔
	۲۲	Detention Camp (ڈیٹنشن کیمپ) وہ عارضی قید خانہ یا فوجی چھاؤنی جہاں لوگوں کو نظر بند کر دیا جاتا ہے۔
۸۰	۲۳	مہری کی رباعی کا آخری مصرع ہے (آتشکدۂ آذر: ۳۶۰) پوری رباعی ہے: حل ہر نکتہ کہ بر پیر خرد مشکل بود آزمودیم ' بیک جرعۂ مے حاصل بود گفتم ' از مدرسہ پُرسم سبب حرمت مے در ہرکس زدم ' بیخود ولا یعقل بود چوتھے مصرعے میں اختلاف ظاہر ہے۔
	۲۴	امیر الامرا شریف خان شیرازی کا شعر ہے (توزک جہانگیری: ۱۱۱) جہانگیر لکھتا ہے کہ جب یہ شعر میرے سامنے پڑھا گیا' تو بے اختیار میری زبان پر یہ شعر آ گیا: از من متاب رُخ کہ نیم بے تو یک نفس یک دل شکستن تو بصد خوں برابر ست اس پر دربار کے سب موزوں طبعوں نے ایک ایک شعر کہہ کے پیش کیا۔ ان میں ملا علی احمد مُہر کن کا یہ شعر بھی تھا: اے محتسب زگریۂ پیر مغان بترس یک خم شکستن تو بصد خوں برابرست
	۲۵	Inspector General of Prisons یعنی حوالاتوں اور جیل خانوں کا داروغہ۔

صفحہ	شمار	
	۲۶	سب اشاعتوں میں 'طیار' (طا کے ساتھ) چھپا ہے؛ چونکہ مولانا مرحوم نے ''تذکرہ'' میں خود اس لفظ کو کاٹ کر 'تیار' کر دیا ہے' اس لیے یہاں بھی تصحیح کر دی گئی ہے۔ پوری کتاب میں یہی صورت ہے۔
	۲۷	یادگار داغ: ۲۵۳
	۲۸	اگرچہ یہ شعر کلیات صائب مطبوعہ تہران میں نہیں ملتا لیکن ہے غالباً صائب ہی کا۔ (دیوان صائب: ۳۳۱)
۸۱	۲۹	مرزا احسن اللہ مخاطب بہ ظفر خان احسن کا شعر ہے' اس فرق کے ساتھ کہ مصرع اولیٰ میں 'زتیغ' کی جگہ 'بہ تیغ' ہے' جو ٹھیک اور بہتر ہے (شمع انجمن: ۵۴ کلمات الشعرا: ۵)
	۳۰	مفتی صدر الدین آزردہ کا شعر ہے۔ (آثار الصنادید: ۵۳۹)
	۳۱	دیوان حافظ: ۱۲۰۔۱۲۱

خط: ۸

صفحہ	شمار	
۸۲	۱	کلیات بیدل، ۱: ۵۲ مطبوعہ دیوان میں شعر دوم کے دوسرے مصرع میں ز آتشے کی جگہ 'با تشے' ملتا ہے۔
	۲	دیوان غالب: ۲۲۲ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے مصرع میں ''شکایت'' ہونا چاہیے اور دوسرے میں ''حکایت''۔
	۳	شیخ ناصر علی سرہندی عہد شاہجہانی و عالمگیری کے مشہور قادر الکلام شاعر، سرہند میں پیدا ہوئے؛ وہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ مختلف اوقات میں امرائے شاہی کے دامن سے وابستہ اور اسی سلسلے میں الہ آباد، بیجاپور، کرناٹک وغیرہ میں مقیم رہے' آخری عمر میں دلی میں رہنے لگے تھے۔ یہیں ۲۰ رمضان ۱۱۰۸ھ / ۲۱ اپریل ۱۶۹۷ء کو تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ سلطانجی میں دفن ہوئے تھے۔ (سرو آزاد: ۱۲۹، ۱۳۱)
	۴	لیکن یہ شعر کلیات عرفی کے کسی نسخے میں نہیں ملتا۔ البتہ یہ روایت سرخوش نے اپنے تذکرے کلمات الشعرا (ص ۷۳) میں بیان کی ہے۔ خدا معلوم کس کا شعر ہے! مولانا شبلی نے بھی اسے عرفی ہی سے منسوب کیا ہے (شعر العجم: ۲: ۱۱۹) غالباً انھوں نے بھی سرخوش پر اعتماد کر کے یہ لکھ دیا:

صفحہ	شمار	
۸۳	۵	کلیات عرفی: ۲۸۳:۳۔ ٹھیک شعر یوں ہے: منکر نشوی گر بغلط دم زنم از عشق ایں نشہ مرا گر نبود ' بادگرے ہست
	۶	I.M.S مخفف ہے Indian Medical Service: کا۔ ہندوستان کی سب سے اعلیٰ طبّی ملازمت۔
	۷	فرشتہ (۲: ۳۲۳) میں چیتہ خاں کا ذکر ملتا ہے (اگر چہ وہاں جیتا خاں چھپا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواجہ سرا تھا اور اتنا صاحبِ رسوخ کہ چاند سلطانہ کے تمام فوجی مشوروں میں شریک رہتا تھا۔ وہاں یہ نہیں لکھا کہ یہ قلعہ دار تھا۔
	۸	متن میں سہو کتابت سے حضرات چھپا ملتا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں ٹھیک 'حضرت' ہی تھا۔
	۹	نواب یوسف علی خاں ناظم اولی رام پور کا مصرع ہے (کلیات ناظم: ۸۸) پورا شعر ہے: اب لکھیں گے شکوۂ بیداد ہم دل کھول کر نام اُن کا آسماں ٹھہر الیا تحریر میں
	۱۰	کلیاتِ سعدی: ۴۰۹ پورا شعر ہے: در سوختن پنہاں نتواں داشتن آتش ما ہیچ نگفتیم و حکایت بدر افتاد
	۱۱	میرزا عبدالقادر بیدل کا مصرع ہے (کلیات بیدلؔ: ۶۶۳) پورا شعر یوں ہے: نمی خواہد کسے خود را غبار آلودِ بیدردی اگر مادردِ دل داریم، زاہد درد دیں دارد
۸۴	۱۲	یعنی "ہندوستان کے کسی مقام سے جب مسکن کو صیغۂ راز میں رکھنا مقصود ہو، تو سرکاری ڈاک (خاص طور پر فوجی) میں اس طرح لکھتے ہیں۔
	۱۳	کلیات ناسخ (دیوان دوم): ۹:
	۱۴	جنگ بوئر۔ ٹرانسوال (جنوبی افریقہ) اور آرنج فری اسٹیٹ نے مل کر انگریزوں کے خلاف ۱۲ را کتوبر ۱۸۹۹ء کو جنگ کا اعلان کر دیا تھا؛ اس کا مقصد انگریزوں کے اقدام کو روکنا اور اپنی آزادی کو برقرار رکھنا تھا۔ اس میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی اور ویرن کنگ کے صلح نامے پر جنگ کا خاتمہ ہوا (۳۱ مئی ۱۹۰۲ء) (بوئر ان ولندیزوں (ہالینڈ کے باشندے) کو کہتے تھے جنھوں نے جنوبی افریقہ میں یہ نو آبادیاں قائم کی تھیں)
	۱۵	دیوان خاقانی: ۱۹۲۔ دیوان میں 'سبق' کی بجائے رقوم' ملتا ہے۔

صفحہ	شمار	
	۱۶	دیوان ذوق (مرتبہ آزاد): ۵۲
	۱۷	دیوان غالب: ۱۷۷
۸۶	۱۸	کلیات مومن، ۱: ۱۶۵
	۱۹	حافظ شیرازی کا مصرع ہے (دیوان حافظ: ۱۷۳) مصرع اولیٰ ہے: زہرہ سازی خوش نمی سازد، مگر عودش بسوخت
	۲۰	غالب کا مصرع ہے (کلیات غالب: ۵۲۸) پہلا مصرع ہے: چگویم از دل و جانے کہ در بساطِ منست
۸۷	۲۱	دیوان نظیری: ۸۲
	۲۲	بیدل کا مصرع ہے (کلیات' ۱: ۹۴) شعر ہے بہ بیسا مانیم وقت است، اگر شور جنوں گرید کہ دستے گر کنم پیدا، نمی یا بم گریباں را مولانا کے ہاں دوسرے مصرعے کا متن قدرے بدل گیا ہے۔
	۲۳	دیوان حافظ: ۱۱۰
	۲۴	جامی کا مصرع ہے' صرف اتنے فرق کے ساتھ کہ' آخر آمد' کی جگہ دراصل' آمد آخر' ہے۔ دیوان جامی: ۳۰۳) پہلا مصرع ہے: للہ الحمد کہ آن نقش کہ خاطر می خواست غالب کا مصرع ہے؛ البتہ' ہی' کی جگہ' بھی' چاہیے۔ (دیوان غالب: ۴۵) پورا شعر ہے: تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
۸۸	۲۶	کلیات مومن' ۱: ۲۷ یہاں خفیف سا لفظی اختلاف ہے۔ پورا شعر ہے: ہمارے خوں بہا کا غیر سے دعویٰ ہے قاتل کو یہ بعدِ انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا
	۲۷	یہ حافظ کی سرِ دیوان غزل کا مصرع ثانی ہے' جس سے اس نے یزید بن معاویہ کے مصرع کی تضمین کی ہے۔ یزید کا شعر ہے: اَنَـا الْـمَسْـمُـوْمُ وَمَـا عِنْدِیْ بِتِرْیَاقٍ وَّلَا رَاقِ اَلَایَـا اَیُّهَـا السَّـاقِـیْ اَدِرْ کَـاسًـا وَّ نَـاوِلْهَـا
	۲۸	حضرت امیر خسرو کا مصرع ہے (شعر العجم' ۲: ۱۵۳) ٹھیک پورا شعر یوں ہے:

صفحہ	شمار	
		خسرو است و شب افسانہ و یار و ہربار قدرے می گرید و پس برسرِ افسانہ رود مصرع اولیٰ یوں بھی ملتا ہے: خسرو ست و شب و افسانہ یار و ہربار (خریطہ جواہر:۱۰۳)
۸۹	۲۹	کلیات مومن' ۱:۱۶۹۔ مصرع اولیٰ ہے: رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام
	۳۰	تفصیل کے لیے دیکھیے' خزانہ عامرہ:۳۳۶۔۳۴۶
	۳۱	ایضاً:۳۳۸
	۳۲	دیوان حافظ:۱۱۷
	۳۳	پورا نام آرتھر شوپن ہور، ۲۲ فروری ۱۷۸۸ء کو ڈینزگ میں ایک تاجر کے گھر میں پیدا ہوئے۔ مشہور فلسفی ہیں۔ وہ اپنے پیشرو کانٹ سے بہت متاثر ہوئے، لیکن اُنھوں نے اُن کی اندھا دھند پیروی نہیں کی، بلکہ ان کی تنقید بھی کی۔ کانٹ کے علاوہ افلاطون اور شیلنگ کا بھی ان پر اثر ہے۔ وہ انگریزی فلسفیوں، خاص طور پر لاک اور ہیوم کی عظمت کے بھی معترف تھے۔ ۱۲ستمبر ۱۸۶۰ء کو جرمنی کے شہر فرنکفورٹ میں انتقال ہوا۔
	۳۴	دیوان حافظ:۴۷
۹۰	۳۵	حافظ کا مصرع ہے (دیوان حافظ:۲۰۳): پہلا مصرع ہے: اے دل! اندر بند زلفش از پریشانی منال
	۳۶	مصحفی کا مصرع ہے (جواہرِ سخن' ۲:۶۴۹) پورا شعر یوں ہے: سراغ قافلۂ اشک لیجیے کیونکر نکل گیا ہے یہ کوسوں دیارِ حرماں سے اس سلسلے میں دیکھیے' حاشیہ (۱) خط (۲)
	۳۷	یہ مومن کی غزل کے مطلع کا مصرع ثانی ہے (کلیات مومن' ۱:۷۹) مطلع ہے: پنجۂ شانہ سے تو زلفِ گرہ گیر نہ کھینچ دل سے دیوانے کو مت چھیڑ یہ زنجیر نہ کھینچ
	۳۸	دیوان غالب:۲۶۴۔ اصلی شعر میں 'پہلے' اور 'پیچھے' کی آپس میں جگہ بدلی ہوئی ہے؛ اور 'امید' کی جگہ 'اوقات' ہے۔

خط: ۹

صفحہ	شمار	
۹۱	۱	کلیاتِ عرفی: ۲۹۵۔ ٹھیک 'اقلیم' کی جگہ 'جیحون' ہے۔
	۲	ایضاً: ۲۹۴
	۳	دیوانِ نظیری: ۳۲۰۔ اصل میں 'موج بحر' کی بجائے 'موج آب' ہے۔ دوسرے مصرع میں بھی 'چوگرداب' کی جگہ 'بگرداب' چاہیے۔
۹۲	۴	غالب کا مصرع ہے: (کلیاتِ غالب: ۲۰۶) البتہ مطبوعہ دیوان میں ''وقست'' کی بجائے 'خواہم کہ' ہے۔ پہلا مصرع ہے: آوارۂ غربت نتواں دید صنم را
	۵	دیوانِ نظیری: ۸۷
	۶	دیوانِ حافظ: ۶۹۔۷۰
	۷	مولانا شبلی نعمانی کا مصرع ہے (کلیات: ۲۷) پورا شعر ہے: عقل را نیست سرِ عربدہ ایں جا بالفعل پنبہ را آشتی ایں جابہ شرار افتاد است
۹۳	۸	دیوانِ نظیری: ۱۹۷
	۹	دیوانِ حافظ: ۵۳
	۱۰	کاک ٹیل مختلف قسم کی شرابوں کی آمیزش سے یہ مشروب تیار کیا جاتا ہے۔ بالعموم اسے بھوک کو تیز کرنے کے لیے کھانے سے پہلے پیتے ہیں۔
	۱۱	دیوانِ حافظ: ۱۸۰۔ دراصل مصرع اولیٰ یوں ہے: ازیں افیوں کہ ساقی درمئے افگند بعض نسخوں میں 'ازیں' کی جگہ 'ازاں' بھی ملتا ہے۔
	۱۲	ورموتھ اور جن دو مختلف قسم کی شرابیں ہیں' جو بالعموم کاک ٹیل تیار کرنے میں استعمال کی جاتی ہیں۔
	۱۳	مثنوی رومی دفتر پنجم: ۱۹۶۔ دونوں مصرعوں میں 'آں' کی جگہ 'او' چاہیے۔
۹۴	۱۴	گلزارِ داغ: ۲۵۳۔ دراصل پہلے مصرع میں 'جو' کی جگہ 'تو' ہے۔
	۱۵	سورۃ الذاریات ۵۱: ۲۱ اس کے معنی ہیں: اور تم اپنے نفسوں کا محاسبہ کیوں نہیں کرتے؟

صفحہ	شمار	
	۱۶	استاد ذوقؔ کا شعر ہے۔ (دیوان مرتبہ آزاد: ۶۳) مصرع ثانی میں 'پایا' کی جگہ 'دیکھا' چاہیے۔
	۱۷	طبع اول میں 'پر کھول دے گا' کی جگہ 'پروں کو کھول دے گا' تھا۔
	۱۸	بیدلؔ کا شعر ہے (کلیات' ۱: ۱۱۹۶) مطبوعہ نسخے میں مصرع ثانی میں 'جوشد' کی جگہ 'بالد' ہے۔
۹۵	۱۹	دیوان غالب: ۵۰
	۲۰	طبع اول: کوٹھری
	۲۱	دیوان نظیریؔ: ۲:۷
	۲۲	دیوان درد: ۹۶۔ اصلی متن میں 'جائے' کی جگہ 'جاوے' ہے اور یہی درست ہے۔
۹۶	۲۳	یہ دولت خاں قاقشال سمرقندی کا شعر ہے (روزِ روشن: ۲۲۳) لیکن یہاں پہلےمصرع میں 'پیرم' کی جگہ 'مردم' لکھا ہے' جو غلط معلوم ہوتا ہے۔ ٹھیک 'پیرم' ہی ہوگا جیسا کہ تذکرۂ منتخب اللطائف (قلمی) میں بھی ہے۔ (ورق ۸۸ ب)
	۲۴	متن میں یہاں سہوِ کاتب سے 'دمیدش' لکھا ملتا ہے' صحیح 'دیدمش' ہے؛ طبع اول میں ٹھیک 'دیدمش' ہی تھا۔
	۲۵	یہاں متن میں 'داں دراں' لکھا تھا' جو بداہتہً غلط ہے؛ یہی طبع اول میں بھی تھا۔ دیوان سے تصحیح کی گئی۔
	۲۶	دیوان حافظؔ: ۱۳۶
	۲۷	دیوان حافظؔ: ۲۸۱
	۲۸	Champagne فرانس کے اسی نام کے شہر (شامپین) کی بنی ہوئی شراب؛ عموماً سفید رنگ کی اور چمکدار ہوتی ہے۔
	۲۹	Bordeaux (بوردو) فرانس کا ایک اور مشہور شہر جہاں کی ساختہ شراب بھی اسی نام سے مشہور ہو گئی ہے۔
۹۷	۳۰	دیوان حافظؔ: ۲۷
	۳۱	ایضاً: ۲۸۵
	۳۲	ایضاً: ۲۰۹۔ مولانا کا متن مطبوعہ نسخے سے کچھ مختلف ہے۔ مثلاً پہلا مصرع دراصل یوں ہے: شرابِ تلخ می خواہم کہ مرد افگن بود زورش۔ تیسرے مصرع میں 'جام مَے' کی جگہ 'جام جم' ہونا چاہیے۔ چوتھے مصرع کے آخری الفاظ ہیں: 'نہ بہرام ست و نہ گورش'۔

صفحہ	شمار	
۹۸	۴۳	دیوان نظیری: ۶۳، صحیح 'کلبہ' کی جگہ 'خانہ' ہے۔
	۴۴	دیوان حافظ: ۲۸۵
	۴۵	ایضاً: ۱۲۸
	۴۶	ایضاً: ۱۲۶۔ مصرع ثانی یوں ہونا چاہیے: کہ دردِ سرکشی جاناں گرت مستی خمار آرد
	۴۷	آندرے ژید۔ پورا نام (Andre' Paul Guillaume Gide)؛ فرانسیسی زبان کا مشہور ناول نگار، ڈراما نگار، ڈراما نویس، انشائیہ نویس، نقاد...... ۲۱ نومبر ۱۸۶۹ء کو پیرس میں پیدا ہوا۔ اس کی تمام تحریریں ۱۵ جلدوں میں شائع ہوئی ہیں (۱۹۳۲ء۔ ۱۹۳۹ء) وہ پہلے کیمونسٹ تھا، لیکن ۱۹۳۶ء میں روس کی سیاحت سے واپس آ کر اس نے اس طرز فکر کو ترک کر دیا، اور اُس کے بعد اپنی مشہور کتاب ''روس سے مراجعت'' تصنیف کی (۱۹۳۷ء)۔ یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۱۴ء سے پہلے اس کی کوئی خاص شہرت نہیں تھی، لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا نے اُسے اپنے زمانے کے بلند پایہ مصنفوں میں تسلیم کر لیا؛ اور یہ درست ہے کہ اُس نے اپنے معاصرین کو بہت متاثر کیا۔ چونکہ وہ مذہباً پروٹسٹنٹ تھا، اور مزید برآں آزاد خیال بھی، اس لیے خود فرانس میں اس کی اتنی قدر دانی نہیں ہوئی؛ جتنی بیرونی دنیا میں۔ ۱۹۴۷ء میں اُسے ادب کا عالمی نوبل انعام ملا تھا۔ ۱۹ فروری ۱۹۵۱ء کو پیرس میں انتقال ہوا۔ اس کے بیشتر ناولوں کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے۔ اس کی ڈائری کی تین جلدیں بھی انگریزی میں شائع ہو گئی ہیں (۱۹۴۷۔۱۹۴۹ء)۔
۹۹	۴۸	اس کا پہلا مصرع ہے: 'در محفلِ خود راہ مدہ ہمچو منے را': حسابی نظیری کا شعر ہے۔ (سفینۂ علی حزیں) حزیں نے مصرع ثانی 'کا زردہ دل آزرہ کند انجمنے را' لکھا ہے۔ بعض لوگوں نے اس شعر کو مخلص خاں مخلص سے منسوب کیا ہے (مثلاً بہترین اشعار: ۵۶۱)
	۴۹	کلیاتِ عرفی: ۲۱۳۔ مصرع اول میں 'باہم' کی جگہ 'دایم' چاہیے۔
۱۰۰	۵۰	قاآنی کے محمد شاہ کے قصیدۂ مدحیہ کا شعر ہے' (دیوان قاآنی: ۳۲۱)
	۵۱	نظامی گنجوی کا شعر ہے۔ دیکھیے شعر العجم ۱: ۳۰۴ مصرعِ اولیٰ میں 'جملہ بہ آفاق' کی جگہ 'جملۂ آفاق' چاہیے۔
۱۰۱	۵۲	کلیات صائب تبریزی: ۶۲۴۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کلیات میں پہلے شعر کے مصرع ثانی میں 'راز ہائے مستاں' کی جگہ صحیح 'رازِ مے پرستاں' ملتا ہے۔

خط: ۱۰

صفحہ	شمار	
۱۰۲	۱	نظیری نیشاپوری کا شعر ہے (دیوان: ۱۵۰) ٹھیک یوں ہے: ایں رسمہائے تازہ زحرمان عہد ماست عنقا بروزگار کسے نامہ برنشد ایک نسخے میں مصرع اولیٰ میں 'تازہ حرماں' بھی ملتا ہے۔
	۲	بیدل کا مصرع ہے (کلیات '۱:۱۱) مصرع اولیٰ ہے: رمیدی از دیدہ بے تامل گذشتی آخر بصد تغافل مطبوعہ دیوان میں مصرع ثانی میں 'بود' کی جگہ 'داشت' ملتا ہے۔
	۳	کلیات بیدل، ۴ (نکات بیدل):۸۱
	۴	یہ حاشیہ پہلی دونوں اشاعتوں میں نہیں تھا۔
۱۰۳	۵	یہ مصرع غالب کا ہے (دیوان غالب: ۴۵) پورا شعر ہے احباب چارہ سازئ وحشت نہ کر سکے زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا
	۶	بیدل کا شعر ہے (کلیات بیدل '۱:۶۵۱)
	۷	پہلی دونوں اشاعتوں میں یہاں اس کے بعد ایک فقرہ ملتا ہے: "اس طرح کا ادھورا انقطاع فی الحقیقت انقطاع نہیں ہوسکتا، کیونکہ نہ تو باہر............ الخ۔" تیسری اشاعت میں یہ فقرہ حذف کر دیا گیا ہے۔
	۸	دیوان غالب: ۲:۷۷۔ دراصل مصرع اولیٰ یوں ہے قید میں ہے ترے وحشی کو، وہی زلف کی یاد
	۹	سورہ کہف ۱۸:۱۱۔ اس کے معنی ہیں: پس ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر کئی سال تک تھپکی دی۔
۱۰۴	۱۰	عمرو بن الحارث بن عمرو بن مضاض الاصغر کا شعر ہے (السیرۃ لابن ہشام، ۱:۱۸۲؛ معجم البلدان، ۵:۱۸۶؛ وفیات الاعیان، ۱:۳۰۱؛ المحاضرات للراغب، ۱:۱۴۷)
	۱۱	مومن کا مصرع ہے (کلیات مومن، ۱:۶۰؛ پہلا مصرع ہے: سجدے پہ سر قلم ہو، دعا پر زبان کٹے

صفحہ	شمار	
	۱۲	طبع اول میں یہاں 'ہوگیا ہو' تھا۔
	۱۳	مآثر الامرا، ۳: ۶۴۴
	۱۴	دیوان غالب: ۱۱۹۔ جیسا کہ اوپر بھی ذکر ہوا، مصرع ثانی میں 'دوگز' کی جگہ ٹھیک 'سوگز' ہے۔
۱۰۵	۱۵	سورۃ الحدید ۵۷: ۱۳۔ اس کے معنی ہیں: اس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور بیرونی طرف عذاب۔
	۱۶	کلیاتِ غالب: ۳۴۰
	۱۷	اسکوئر یعنی Square (میدان) کلکتے کی مشہور سیرگاہ ہے۔
	۱۸	(Bench) لکڑی کی بیٹھنے کی لمبی جگہ جس کے نیچے پائے ہوتے ہیں۔
	۱۹	فروغی بسطامی کا شعر ہے (دیوان: ۱۴۴) دیوان میں پہلے مصرعے میں 'بو' کی جگہ 'بودہ' اور دوسرے مصرعے میں 'حیف وصد حیف' ملتا ہے۔
۱۰۶	۲۰	قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ شعر صائب سے بھی منسوب ہے۔ (دیوان صائب: ۵۷۲)
	۲۱	ضمیری اصفہانی کا شعر ہے (بہترین اشعار: ۳۱۲) پہلا مصرع ہے: علاج درد ضمیری نہ شد، نمی دانم (متن میں دراصل 'مبادا' چھپا تھا جو صریحاً سہو کتابت تھا' اس لیے درست کیا گیا)
	۲۲	کلیاتِ عرفی: ۳۹۹
۱۰۷	۲۳	دیوان غالب: ۱۳۰
	۲۴	دیوان فیضی فیاضی: ۵۶۔ مطبوعہ نسخے میں 'کانجا' کی جگہ 'کاینجا' ہے (نیز دیکھیے شعر العجم، ۲: ۷۰)
	۲۵	یہ فقرہ، ''میرا معاملہ سیاسی زندگی...... ساتھ ہوا تھا'' پہلی دونوں اشاعتوں میں نہیں ملتا۔
	۲۶	کلیاتِ غالب: ۳۵۹
۱۰۸	۲۷	کلیاتِ عرفی: ۲۹۷۔ مصرع ثانی میں 'کیں' کی جگہ 'ایں' چاہیے۔
	۲۸	طبع اول: کوٹھری۔
	۲۹	دیوان غالب: ۱۸۴
	۳۰	طبع اول میں یہ فقرہ یوں تھا: ''نہ اسے کوئی حسن وخوبی کی بات سمجھتا ہوں۔''
	۳۱	دیوان نظیری: ۴۲۶۔ 'صافی' اور 'دردی' کی آپس میں جگہ بدل گئی ہے۔
	۳۲	کلیاتِ بیدل، ۴ (عنصر سوم): ۲۳۷۔

صفحہ	شمار	
۱۰۹	۳۳	یہاں لغزش قلم ہے؛ غنیمت کی جگہ نام غنی لکھا گیا ہے۔ کلمات الشعرا (ص ۸۲) میں یہ شعر غنیمت کنجاہی کے نام ہی سے درج ہے؛ دیوان غنیمت (ص ۹۱) میں بھی موجود ہے۔ مطبوعہ نسخے میں ''چوں گرد نمنا کم نماند''؛ اور دوسرے مصرعے میں ''خلق می داند'' ہے۔
	۳۴	دیوان غالب: ۵۹
	۳۵	کلیات بیدل، ۱: ۵۷۶۔ صحیح مصرع ثانی میں 'غبار' کی جگہ 'غرور' ہے: بمبئی کے مطبوعہ کلیات میں پہلے مصرع میں 'وصلش' کی جگہ 'وصلت' ہے۔
۱۱۰	۳۶	دیوان حافظ: ۳۱۸۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مطبوعہ نسخے میں 'خوش فرش' کی بجائے 'خوش وقت' ہے۔
	۳۷	کلیات بیدل، ۱: ۹۳
	۳۸	کلیات غالب (فارسی): ۳۴۰
	۳۹	دیوان غالب: ۲۲۶۔ صحیح مصرع اولی میں ''بے کاری جنوں کو'' ہے۔
	۴۰	Mess (میس): فوجیوں یا جہازیوں کے کھانے پینے کی جگہ۔ اب عمومی سکونت کا وہ مکان بھی مراد لیا جاتا ہے، جہاں کھانے کا بھی انتظام ہو۔
۱۱۱	۴۱	کلیات مومن، ۱: ۱۹۷۔ دیوان میں مصرع اول یوں چھپا ملتا ہے: ہے ایک خلق کا خوں سر پہ اشک خوں کے مرے
	۴۲	کلیات بیدل، ۱: ۴۶۶۔ مطبوعہ کلیات میں مصرع ثانی یوں ہے: وسعت ہوس بدامن صحرائی رسد یقیناً 'ہوس' بہتر روایت ہے۔
	۴۳	دیوان حافظ: ۱۹۹۔ مصرع اولیٰ ہے: ماقصہ سکندر و دارا نخوانده ایم
	۴۴	مآثر الامرا، ۲: ۶۲۹؛ نیز روز روشن: ۳۴۵
	۴۵	دیکھیے توزک جہانگیری: ۱۱۲، جہاں یہ واقعہ بیان ہوا ہے۔ (نیز دیکھیے، حاشیہ ۲۰، خط ۷)

خط: ۱۱

صفحہ	شمار	
۱۱۲	۱	دیوان حافظ: ۵۱۔ اصل میں دوسرے شعر کے مصرع اول میں 'راہ عشق' تھا، جسے مرحوم نے موقع کی مناسبت سے 'راہ دوست' میں تبدیل کر دیا۔

صفحہ	شمار	
۱۱۳	۲	حکیم مسیح الزماں صدرا شیرازی کا شعر ہے (مآثر الامرا، ۱: ۵۷۹)
	۳	آفتاب عالمتاب شعرائے فارسی کا تذکرہ، قاضی محمد صادق خاں اختر کی تالیف تھا۔ افسوس کہ یہ تذکرہ ناپید ہو گیا اور باوجود تلاش بسیار کسی کتابخانے میں اس کا سراغ نہیں ملا۔ بھوپال کے تذکرے اسی پر مبنی ہیں۔ (اب ایک جگہ اس کی موجودگی کی خبر ملی ہے)
۱۱۴	۴	کلیات عرفی: پہلا مصرع ہے: سبک زجاش نگیری کہ بس گراں گہرست
۱۱۵	۵	ایضاً
	۶	حافظ شیرازی کا شعر ہے (دیوان کامل خواجہ حافظ شیرازی: ۴۹ اس شعر کی بیشتر روایت یہ ہے کہ دونوں مصرعوں میں 'کوئے' اور 'سوئے' کی جگہ 'راہ' ہے (مثلاً شعر العجم، ۲: ۲۸۳)
	۷	میر عبدالرحمٰن گرامی کا شعر ہے (روز روشن: ۵۸۴) مصرع ثانی میں 'کردم' ملتا ہے اور یہی غزل کی ردیف ہے۔
	۸	فیضی کا شعر ہے (شعر العجم '۳: ۶۹؛ کلیات فیضی: ۲۴۸)
	۹	غالب کا شعر ہے، (کلیات غالب: ۳۵۸)
۱۱۶	۱۰	کلیات عرفی: ۳۱۴۔ مطبوعہ نسخے میں 'رشتہ بانگشت' کی جگہ 'رشتہ باریک'؛ اور مصرع اولیٰ یوں ہے: ایما واشارت نہ باندازۂ راز ست ایک دوسرے نسخے میں شعر یوں ہے: (کلیات اضافات) :۹ بیداد گرا اروئے تو اندازۂ راز ست ایں رشتہ بانگشت نپیچی کہ دراز ست
	۱۱	عدی بن زید کا مصرع ہے (جمہرۃ اشعار العرب: ۱۰۳) پورا شعر ہے: عن المرء لاتسئل و سل عن قرینہ فکل قرین بالمقارن یقتدی
	۱۲	دیوان حافظ: ۶۴۔ فرق صرف اتنا ہے کہ 'عجیب' اور 'غریب' کا محل باہم بدل گیا ہے۔
۱۱۹	۱۳	طبع اول میں 'کچھ نہیں' کی جگہ 'کچھ نہیں ہے' تھا
	۱۴	گلستان کا مصرع ہے (کلیات سعدی: ۱۱۸) مکمل قطعہ یوں ہے:

صفحہ	شمار	
		اے بلبلِ بلند بانگ! در باطن ہیچ بے توشہ چہ تدبیر کنی وقت بسیچ روئے طمع از خدف بپیچ، ار مردی تسبیح ہزار دانہ، بر دست مپیچ
	۱۵	سیّد جمال الدین اسد آبادی افغانی: پچھلی صدی کی دنیائے اسلام کی عجیب وغریب بلکہ بڑی پُر اسرار شخصیت ہیں۔ کابل کے نواحی قصبے اسد آباد میں ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸۔۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل اور پھر ہندوستان اور حجاز کے سفر کے بعد امیر دوست محمد خان والیِ افغانستان کی ملازمت میں داخل ہوگئے؛ لیکن امیر کی وفات کے بعد جانشینی کا قضیہ کھڑا ہوگیا اور اس کے نتیجے میں انھیں وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ اس پر وہ قسطنطنیہ چلے گئے، لیکن شیخ الاسلام کی مخالفت اور ریشہ دوانیوں کے باعث انھیں یہاں سے بھی کوچ کرنا پڑا۔ وہ اسلامی ممالک کی اندرونی اصلاح اور ''پان اسلام ازم'' کے زبردست حامی، اور یورپی حکومتوں کی مسلسل سازش اور ان کے مشرقی ملکوں پر اقتدار قائم رکھنے کے شدید مخالف تھے۔ اسی مقصد سے انھوں نے جلاوطنی کے ایام میں پیرس سے اپنا مشہور عربی اخبار ''عُروَۃ الوثقی'' نکالا، جس کے ایڈیٹر ان کے شاگرد (رشید اور رفیق کار) محمد عبدہ مصری تھے۔ سب سے آخر میں وہ قسطنطنیہ میں نظربند کردیے گئے تھے۔ یہاں وہ قصر یلدیز کے جوار میں نشانتاش میں پانچ برس مقیم رہے۔ یہیں ۹ر مارچ ۱۸۹۷ء کو بعارضۂ سرطان انتقال ہوا اور نشانتاش میں دفن ہوئے۔ دسمبر ۱۹۴۴ء میں نعش کابل لائی گئی اور ۶ جنوری ۱۹۴۵ء کو اس مقبرے میں دفن ہوئے، جو اب کابل یونیورسٹی کے احاطے میں ان کی خوابگاہِ ابدی ہے۔
	۱۶	شیخ محمد عبدہ: مصر کے مشہور مفکر اور مذہبی اور سیاسی رہنما، ۱۸۴۲ء/۱۲۵۸ء میں قریہ محلۃ نصر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اور طنطا کے مذہبی مدرسے میں پائی اور اس کے بعد الازہر (قاہرہ) میں داخلہ لے لیا، جہاں سے درجۂ عالمیت کی سند حاصل کی۔ ۱۸۷۱ء میں ان کی سیّد جمال الدین افغانی سے ملاقات ہوئی جن سے نقطۂ نظر اور طریقہ کار کے جزوی اختلاف کے باوجود ان کے تعلقات آخر تک بہت دوستانہ رہے۔ بالآخر انھیں سیاسی سرگرمیوں کے باعث جلاوطن ہونا پڑا؛ لیکن واپس آئے تو اوّل شرعی عدالت کے جج اور آخر میں مفتی دیارِ مصریہ مقرر ہوئے اور ۱۹۰۵ء میں اپنے انتقال تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ ان کی ساری عمر دین کی اصلاح اور اسے خرافات سے صاف

صفحہ	شمار	
		کرنے میں گذری۔ مرنے کے قریب انھوں نے دو شعر کہے تھے، جو اُن کے اسی رجحان کے شاہد عادل ہیں۔ فرمایا: وَلَسْتُ اُبَالِی اَنْ یّقَالَ مُحَمَّدُ اَبَلَّ اَوْ اَلْتَظَّتْ عَلَیْہِ الْمَآتَم وَلٰکِنْ دِیْنًا اَرَدْتُ صَلَاحَہُ اَحَافُ اَنْ تَقْضِیَ عَلَیْہِ الْعَمَائِمُ (مجھے اس کی پروا نہیں کہ کوئی کہے)، محمد (عبدہ) بیماری سے صحت یاب ہوگیا یا اس کے جنازے پر لوگوں کا ہجوم ہے۔ لیکن ایک دین (اسلام) البتہ ضرور ایسی چیز ہے، جس کی بہتری میرے پیش نظر رہی ہے اور جس سے متعلق مجھے اندیشہ تھا کہ مبادا یہ بڑے بڑے عمامے (یعنی مُلا) اسے برباد کردیں) چند رسائل بھی لکھے تھے جن میں زیادہ مشہور 'رسالۃ التوحید' ہے۔ ایک کتاب میں اسلام اور عیسائیت کا موازنہ کیا ہے۔ تفسیر قرآن بھی لکھنا شروع کی تھی، جو پوری نہ ہوسکی؛ اس کی تکمیل ان کے شاگرد شیخ محمد رشید رضا (صاحب المنار) نے کی۔
۱۲۰	۱۷	اس سے ابونصر غلام یٰسین آہ مراد ہیں۔ یہ مولانا سے دو برس بڑے تھے؛ سال ولادت ۱۸۸۶ء ہے۔ عین عالم شباب میں وسط ۱۹۰۶ء/ ۱۳۲۴ھ میں انتقال ہوا۔ کلکتے میں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہیں۔ ان کی وفات پر سید مقبول حسین وصل بلگرامی نے ایک شذرہ اپنے رسالے عالمگیر کے شمارۂ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں لکھا تھا: ان کے مزید حالات کے لیے دیکھیے، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: ۱۷۸۔۱۸۵؛ تماہی تحریر (دلی)، ۲:۲، (اپریل/جون ۱۹۶۸ء)
	۱۸	شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی (۱۷۰۳ء/ ۱۱۱۴ھ .... ۱۷۶۲ء/ ۱۱۷۶ھ) دورِ آخر کے فاضلِ اجل، صاحبِ اجتہاد و تجدید، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اُن کی سی جامعیت کے بہت کم عالم پیدا ہوئے ہیں۔ دلی دروازے کے باہر قبرستان مہندیان میں آسودۂ خوابِ ابدی ہیں۔
	۱۹	اصلی متن میں یونہی چھپا ہے، لیکن ایمانذ کرٓ ہے۔ ذوقؔ دہلوی کا شعر ہے (دیوان ذوق مرتبہ آزاد: ۲۰۴)

صفحہ	شمار	
		واں ملے ابرو، یہاں پھیری گلے پر ہم نے تیغ بات کا ایسا بھی پانا، کوئی ہم سے سیکھ جائے
۱۲۱	۲۰	دیوان کلیم کاشانی: ۲۶۸
۱۲۲	۲۱	راقم مشہدی کا شعر ہے (شعر العجم، ۵: ۲۰۲) شعر العجم میں 'از آنکہ' کی جگہ 'زبسکہ' ملتا ہے۔
	۲۲	امیر خسرو کا مصرع ہے (شعر العجم '۲: ۱۵۴) پہلا مصرع ہے: جاں ز تن بُردی و در جانی ہنوز
	۲۳	دیوان حافظ: ۱۰۹
	۲۴	یہ شعر ابن قیم کی کتاب ''اغاثۃ اللھفان من مصاید الشیطان '(۱: ۹۲) میں ملتا ہے۔ اور یہیں غالباً اسے دیکھا ہوگا؛ یہ ابن قیم کی دوسری کتاب 'الداء والدواء' (ص ۲۲۵) میں بھی ہے۔
۱۲۳	۲۵	اوحدی اصفہانی صاحب ''جام جم'' کا شعر ہے (شعر العجم: ۵: ۱۱۶)
	۲۶	طبع اوّل میں یہاں 'حلقۂ صحبت کے اثرات' تھا۔
	۲۷	غالباً حافظ شیرازی کا شعر ہے۔ پہلے مصرعے کی مختلف روایات ہیں مثلاً کارِ زلفِ تست مشک افشانیِ عالم، ولے یا کارِ زلفِ تست مشک افشانیٔ امّا حالیا ایک قلمی نسخے میں ہے: کارِ زلف تست عیّاری و مشک افشاندلی؛ مصرع ثانی میں البتہ 'آہوئے چیں' کی جگہ 'نافۂ چیں' ہے (نسخہ ہائے مملوکہ نواب رحمت اللہ خان شیروانی) لیکن دیوان کے ایرانی نسخوں میں یہ شعر نہیں ملا، بلکہ اس زمین میں سرے سے کوئی غزل ہی موجود نہیں ہے۔
	۲۸	دیوان نظیری: ۵۰۲۔ مطبوعہ دیوان میں شعر ثانی کا مصرع اولیٰ یوں ہے: عجب ار نبودہ باشد خضرے بجست وجویم
۱۲۴	۲۹	ایضاً: ۲۹۳
	۳۰	دیوان حافظ: ۱۹۰
	۳۱	کلیات میر (دیوان اوّل): ۲۰۸۔ صحیح مصرع ثانی میں 'تو' تو کی جگہ 'ہی' ہے
	۳۲	کلیات بیدل، ۱: ۹۳

صفحہ	شمار	
	۳۳	دیوان کلیم: ۱۲۳۔ بعض نسخوں میں پہلے مصرعے میں 'طبعے' کی جگہ 'وضعے' بھی ملتا ہے۔
۱۲۵	۳۴	کلیات غالب (فارسی): ۴۹۴۔ یہاں کچھ لفظی تفاوت ہے؛ پورا شعر ہے: پشت بر کوہست طاقت تکیہ تابر رحمتست کار دشوار ست و مابر خویش آساں کردہ ایم
	۳۵	کلیات عرفی: ۳۳۳۔ مصرع اولیٰ میں 'گر' کی بجائے 'چوں' چاہیے۔
	۳۶	دیوان غالب: ۲۵۷۔ مصرع اولیٰ ہے: صبح آیا جانب مشرق نظر
	۳۷	متن میں یہاں عید الضحیٰ چھپا ہے جو غلط ہے؛ عید الضحیٰ ہو یا عید الاضحیہ۔ طبع اول میں ٹھیک عید اضحیٰ ہی ہے۔
	۳۸	صحاح میں اس موضوع سے متعلق متعدد حدیثیں ہیں۔ مثلاً حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عید الفطر کے دن جب تک چند کھجوریں نہ کھا لیتے، اس وقت تک نماز کے لیے عیدگاہ تشریف نہیں لے جاتے تھے۔ حضرت انسؓ ہی سے ایک اور روایت ہے کہ کھجوروں کی تعداد طاق ہوا کرتی تھی، یعنی تین، پانچ، سات وغیرہ۔ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں: حدثنا .... انس قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیھم و سلم لایغد و یوم الفطر حتی یاکل تمرات ...... ویاکلھن وترا (صحیح بخاری الجمعہ '۴:۱) عید الاضحیہ کے دن دستور اس کے برعکس تھا۔ براء بن عازب سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید اضحیٰ کے دن نماز کے بعد خطبے میں فرمایا کہ جس نے نماز سے پہلے قربانی کی' اس نے گویا قربانی کی ہی نہیں۔ مَنْ نَسَکَ قَبلَ الصّلٰوۃِ فَاِنّہ قُبلَ الصّلٰوۃ ولانُسُکَ لہ۔ (صحیح بخاری، کتاب الجمعہ '۵:۲)
	۳۹	یہ غالب کے ایک قصیدے (بستمین قصیدہ) در مدح بہادر شاہ ظفر کے دونوں شعر ہیں۔ پہلا مطلع ہی ہے (کلیات: ۲۳۲ دوسرا درمیان سے لیا گیا ہے (ص ۲۳۳) دوسرے شعر کے مصرع اولیٰ میں غبار خاطر کی تمام اشاعتوں میں 'روا گیر' چھپا ہے؛ لیکن دیوان میں دوا گیر' ملتا ہے، 'روا گیر' بہتر قرأت ہے؛ اور عین ممکن ہے کہ دیوان میں سہو کتابت ہو۔

خط: ۱۲

صفحہ	شمار	
۱۲۶	۱	فیضی کا شعر ہے (شعر العجم '۳: ۶۶)

صفحہ	شمار	
	۲	عرفی شیرازی کا مصرع ہے (کلیات: ۲۹۵) اصل میں 'اینکہ' کی جگہ 'آنچہ' ہے۔ پہلا مصرع ہے: بادہ خواہی، باش، تا ازخُم بروں آرم کہ من
۱۲۷	۳	داستان نل ودمن: ۴۲
	۴	مولانا شبلی نعمانی کا مصرع ہے (کلیات شبلی: ۵۳)۔ مصرع اولیٰ ہے: بادہ فرستم بحریفاں دگر
	۵	بابا فغانی شیرازی کا شعر ہے (دیوان فغانی: ۴۳)
۱۲۸	۶	اگر پردہ اٹھ جائے، جب بھی میرا یقین اس سے زیادہ نہیں ہوگا۔ یہ قول حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہے (دیکھیے شرح نہج البلاغہ: ۳۲: نیز حلیۃ الاولیا، ۱: ۷۲)
	۷	متن میں 'ہوئی' یہ مقام 'ہوگی' کا ہے؛ یہی طبع اول میں تھا۔
۱۲۹	۸	کلیم کا مصرع ہے (دیوان کلیم: ۱۱۹)؛ پورا شعر ہے: ماز آغاز وز انجام جہاں بیخبریم اوّل و آخرِ ایں کہنہ کتاب افتاد ست
	۹	دیوان حافظ: ۹۷
	۱۰	رباعیات عمر خیام: ۱۲۱
	۱۱	متن میں صرف 'کھڑے ہوتے'، لیکن سیاق یہاں 'ہیں' کے اضافے کا مقتضی ہے؛ پہلے ایڈیشن میں 'ہیں' موجود بھی ہے۔ یہ تیسرے ایڈیشن کا تب کا سہو معلوم ہوتا ہے۔
	۱۲	دیوان نظیری نیشاپوری: ۳۶۸
۱۳۰	۱۳	آئن سٹائن؛ پورا نام البرٹ آئن سٹائن۔ ۱۸۷۹ء میں جرمنی کے شہر اُلم کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہ پندرہ برس کے تھے جب ان کا خاندان نقلِ مکان کر کے اٹلی چلا گیا۔ آئن سٹائن کی تعلیم سوئٹزرلینڈ میں ہوئی اور اس کی تکمیل کے بعد وہیں ملازم ہو گئے اور اسی ملک کی قومیت اختیار کر لی۔ اس کے بعد بھی انھوں نے اپنی تعلیمی اور تصنیفی سرگرمیاں جاری رکھیں اور متعدد تحقیقی مقالے اور کتابیں لکھیں۔ مشہور 'نظریہ اضافیت' انھیں کی دریافت ہے جس پر انھیں ۱۹۲۱ء میں فزکس کا عالمی نوبل انعام ملا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں وہ امریکہ چلے گئے اور وہیں ۱۸ اپریل ۱۹۵۵ء کو پرنس ٹن میں انتقال ہوا۔

صفحہ	شمار	
	۱۴	شرلاک ہومز انگلستان کے مشہور مصنف سر آرتھر کانن ڈایل (ف جولائی ۱۹۳۰ء) نے اپنی جاسوسی کہانیوں میں ایک فرضی کردار شرلاک ہومز (Sherlock Holmes) پیدا کیا ہے جو جرائم کی تحقیق و تفتیش میں حیرتناک ذہانت و استدلال کا مظاہرہ کرتا ہے۔
	۱۵	ڈی مقراطیس، یونان کے شہر 'ابڈیرا' کے رہنے والے، غالباً یونان کے سب سے بڑے طبیعیاتی فلسفی ہوئے ہیں۔ انھوں نے حصول علم کی خاطر یورپ، ایشیا، افریقہ میں طویل سفر کیے۔ ان کے ملک نے بھی ان کی پوری قدر کی.......... جابجا ان کے بُت کھڑے کیے اور ان کی خدمت میں ایک گراں قدر تھیلی پیش کی گئی؛ نیز قانون منظور کیا گیا کہ ان کے جنازے کے تمام مصارف حکومت کی طرف سے ادا کیے جائیں گے۔ ایٹم (سالمہ) انھی نے دریافت کیا تھا اور کہا کہ یہ فنا نہیں کیا جاسکتا۔ کہکشاں کی ہیئت بھی انھی نے معلوم کی تھی۔ ۱۰۹ سال کی عمر میں ۳۶۱ قبل مسیح فوت ہوئے۔
	۱۶	دیوان کلیم: ۲۹۴۔ صحیح 'آویزش' کی جگہ 'آمیزش'، 'دمبدم' کی جگہ 'روز و شب' اور 'ہر لحظہ' کی جگہ 'پیوستہ' ہے۔ حکیم مومن خاں دہلوی نے اس غزل کی تضمین کی ہے (کلیاتِ مومن ۱: ۳۳۲۔۳۳۳)
۱۳۱	۱۷	جوڈ (Cyril Edwin Mitchinson Joad) ۱۲/ اگست ۱۸۹۱ء کو لندن میں پیدا ہوئے، تعلیم آکسفرڈ میں پائی۔ ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک سرکاری ملازمت میں رہے، لیکن پھر مستعفی ہو کر لندن یونیورسٹی میں فلسفے اور نفسیات کے استاد ہو گئے۔ متعدد کتابیں لکھیں، اپنی سوانحعمری 'پانچویں پسلی کے نیچے' Under the fifth Rib کے نام سے ۱۹۳۲ء میں شائع کی: اسے وہ 'جارحانہ سوانحعمری' کہا کرتے تھے۔ بعد کو (تورات کی کتابوں کی تقلید میں) اس کا نام بدل کر Book of Joad یعنی کتاب جوڈ رکھ دیا تھا۔ ۹/ اپریل ۱۹۵۳ء کو لندن میں انتقال ہوا۔
	۱۸	برٹرنڈ رسل۔ پورا نام برٹرنڈ آرتھر ولیم رسل (Bertrand Arthur William Russell) خاندانی امیر' ۱۸/ مئی ۱۸۷۲ء کو پیدا ہوئے۔ مشہور فلسفی اور ریاضی داں تھے اور ان علوم میں ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جنگ کے مخالف (یعنی امن پسند) کی حیثیت سے عالمگیر شہرت رکھتے تھے؛ اس کی پاداش میں قید و بند کی سزا بھی بھگتنا پڑی۔ نومبر ۱۹۵۰ء میں انھیں ادب کا عالمی نوبل انعام ملا تھا۔ ۲/۳ فروری ۱۹۷۰ء کی درمیانی شب میں (تقریباً ساڑھے بارہ بجے) اپنے آبائی مکان

صفحہ	شمار	
		پنری وودرت (ویلز انگلستان) میں انتقال ہوا۔ دنیا کے مسلمہ فلسفیوں میں ان کا مقام ہے۔
	۱۹	پہلی اشاعتوں میں 'حل ملتا نہیں' کی جگہ 'حل نہیں ملتا' تھا۔
۱۳۲	۲۰	عرفی کا شعر ہے (کلیات، اضافات: ۱۶) مطبوعہ نسخے میں 'چنداں کہ' کی جگہ 'ہر چند' ملتا ہے۔
۱۳۳	۲۱	عرفی کا مصرع ہے (کلیات: ۳۱۱)؛ پورا شعر ہے: حدِ حُسن تو باوراک نشاید دانست ایں سخن نیز باندازۂ ادراک منست
۱۳۴	۲۲	کلیاتِ عرفی: ۲۸۹
	۲۳	دیوانِ حافظ: ۳۳۷
۱۳۵	۲۴	پہلی اشاعتوں میں 'نہیں ہوئی' کی جگہ 'نہیں ہو سکتی' تھا۔
	۲۵	پہلی اشاعتوں میں 'چال چلا نہیں سکتا' کی جگہ 'چال نہیں چلا سکتا' تھا۔
۱۳۶	۲۶	رگ وید' ہندو دھرم کی بنیادی الہامی کتاب؛ یہ دنیا کی قدیم ترین کتابوں میں سے ہے۔
	۲۷	حتی۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے کی ایک قوم جو تقریباً ۲۰۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۱۲۰۰ ق م تک ایشیائے کوچک اور شام کے علاقے پر حکمران تھی۔ جرمنی کے مشہور ماہر اسیریات ہیوگو ونکلر نے ۱۹۰۶۔۱۹۰۷ء میں اور پھر ۱۹۱۱۔۱۹۱۲ء میں ترکیا کے شہر بوغاز کوئ میں جو اثری کھدائی کی ہے، اس سے ثابت ہو گیا ہے کہ یہ شہر حتی قوم (اور سلطنت) کا صدر مقام تھا۔ بوغاز کوئ، انقرہ سے ۱۴۵ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ مدتوں حتیوں کی مصریوں اور اسیریوں اور بابلیوں کے ساتھ جنگ رہی؛ ان کا ذکر تورات میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔
	۲۸	عیلامی۔ تورات میں عیلام' ایران کے اس صوبے کا نام تھا، جو بعد کو اپنے دار الخلافے صوصہ کی وجہ سے صوصیانہ کہلایا۔ صوصہ دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ مدتوں بابل اور صوصہ کی باہمی آویزش رہی اور دونوں ایک دوسرے پر تسلط حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بابل قدیم کے مشہور بادشاہ حمور بی کے قوانین کا متن صوصہ ہی کی اثری کھدائی میں دستیاب ہوا تھا۔
	۲۹	کالڈیا (Chaldea) بابل قدیم کا نام ہے، چنانچہ تورات میں جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے، وہاں اس سے مراد بابل ہی ہے۔ شروع میں یہ جنوبی میسوپوٹیمیا (عراق) میں دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقے کا نام تھا؛ بعد کو وسیع ہو کر عراق کے اکثر حصے پر اس کا

صفحہ	شمار	
		اطلاق ہونے لگا۔ اس کا دا الخلافہ اُور تھا، جہاں کے حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے (اُور کے اصلی معنی شہر کے ہیں)
	۳۰	کلیاتِ صائب: ۷۵۰
	۳۱	ابوالفضل اکبری عہد کے مشہور عالم اور اکبر کے مصاحب و وزیر، ۶ محرم ۹۵۸ھ / ۱۴ جنوری ۱۵۵۱ء کو آگرے میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے کی سیاست میں بہت دخیل رہے۔ اکبر نے جو 'دینِ الٰہی' رائج کرنے کی کوشش کی تھی، اس میں بھی ان کا بہت ہاتھ تھا۔ شاہزادہ سلیم (جہانگیر) ان سے ناراض رہتا تھا۔ اُس نے انھیں دکن سے ایک مہم سے واپس آتے ہوئے رستے میں قتل کروا دیا۔ یہ ۴ ربیع الاول ۱۰۱۱ھ / ۱۲ راگست ۱۶۰۲ کا واقعہ ہے۔ ان کی سب سے مشہور کتاب اکبر نامہ (مع آئین اکبری) ہے؛ اس کے علاوہ اور کتابیں بھی ہیں۔ (آئین اکبری: ۲۴۳۔۲۶۵)؛ طبقات اکبری: ۲: ۴۵۸؛ توزکِ جہانگیری: ۱۰۔۱۱؛ درباری اکبری: ۵۲۱۔۵۸۴)۔
	۳۲	یہ دونوں شعر خیالی بخاری (شاگرد ملا عصمت اللہ بخاری) کے ہیں۔ ان میں سے پہلا شعر تذکرہ شمع انجمن (ص ۱۱۸) میں ملتا ہے لیکن وہاں شاعر کا تخلص غلطی سے خیالی کی جگہ حیاتی لکھا گیا ہے۔ سفینۂ علی حزیں (ص ۲۶) میں بھی تخلص حیاتی دیا ہے۔ صحیح خیالی ہی ہے، جیسا کہ روزِ روشن (ص ۳۰۷) میں نشاندہی کی گئی ہے۔

خط: ۱۳

صفحہ	شمار	
۱۳۷	۱	پہلی اشاعتوں میں شخصی تصور کی جگہ 'مشخص تصور' ملتا ہے۔
	۲	دیوان نظیری: ۴۷۔ مصرع اولیٰ یوں بھی ملتا ہے: بر چہرۂ حقیقتِ ما ماند پردۂ
۱۳۸	۳	دیوان بابا فغانی شیرازی: ۱۱۰
	۴	استاد ذوق کا شعر ہے (دیوانِ ذوق (مرتبہ آزاد): ۲۴۸) مطبوعہ نسخے کا متن یوں ہے: کرے کعبہ میں کیا، جو سرِ بتخانہ سے آگاہ ہے یہاں تو کوئی صورت بھی، وہاں اللہ ہی اللہ ہے

صفحہ	شمار	
	۵	طبع اول میں اس لفظ کا املا 'چہیتی' کی جگہ 'چاہیتی' تھا۔
۱۳۹	۶	قرآن، سورۃ النساء ۴: ۴۸ نیز ۱۱۶۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس بات کو نہیں بخشتا کہ کوئی اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے علاوہ دوسرے گناہ، جو چاہتا ہے؛ بخش دیتا ہے۔
	۷	احکام عشرہ کے لیے دیکھیے، تورات کتاب استثنا، باب ۵، آیات ۷ تا ۲۱ یہاں آیت ۸ کی طرف اشارہ کیا ہے۔
	۸	خیام کی رباعی کا شعر ہے (رباعیات: ۱۳۴)؛ پوری رباعی ہے: ناکردہ گناہ درجہاں کیست، بگو وانکس کہ گنہ نکرد، چوں زیست، بگو من بدکنم و تو بدمکافات دہی پس فرق میانِ من و تو چیست، بگو
	۹	سورۃ الشوریٰ ۴۲: ۱۱۔ یعنی اس کی طرح کا سا کوئی نہیں ہے۔
	۱۰	سورۃ النحل ۱۶: ۷۴۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر مثالیں چسپاں نہ کرو۔
	۱۱	سورۃ الانعام ۶: ۱۰۳۔ یعنی اُسے (خدا کو) آنکھیں نہیں پاسکتیں، نہیں دیکھ سکتیں۔
	۱۲	سورۃ الاعراف ۷: ۱۴۳۔ یعنی (خداوند تعالیٰ نے موسیٰ سے کہا) تو مجھے ہرگز نہیں دیکھے گا، لیکن پہاڑ کی طرف دیکھ۔
	۱۳	کلیات عرفی: ۲۸۴۔ مطبوعہ نسخے میں 'اشارت' کی جگہ 'کنایت' ہے۔
۱۴۰	۱۴	سورۃ الاعراف ۷: ۱۸۰ یعنی اللہ تعالیٰ کے سب نام اچھے ہیں؛ اُسے انھیں سے پکارو۔
	۱۵	سورۃ المائدۃ ۵: ۶۴۔ یعنی اُس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔
	۱۶	سورۃ الفتح ۴۸: ۱۰۔ یعنی اُن کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔
	۱۷	سورۃ الانفال ۸: ۱۷۔ یعنی جب تم نے (مٹھی بھر کنکریاں) پھینکیں، تو یہ تم نے نہیں پھینکی تھیں، بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔
	۱۸	سورۃ طٰہٰ ۲۰: ۵۔ یعنی وہ بے حد مہربان خدا عرش پر قائم ہوا۔
	۱۹	سورۃ الفجر ۸۹: ۱۴۔ یعنی یقیناً تیرا رب گھات میں لگا ہے۔
	۲۰	سورۃ الرحمٰن ۵۵: ۲۹ یعنی ہر روز اس کی ایک شان ہے۔
	۲۱	دیوان غالب: ۹۱۔ صحیح مصرع اول میں 'حق میں' کی جگہ 'حق کی' ہے۔
	۲۲	کلیات عرفی: ۳۲۱۔ یہاں متن شعرالعجم (۳: ۱۲۰) کے مطابق ہے۔ کلیات میں ہے:

صفحہ	شمار	
		آوہ ازیں حوصلۂ تنگ و ازآں حُسنِ بلند کہ دلم را طلبِ شربتِ دیدارِ تو نیست
	۲۳	سورۃ الفجر ۸۹:۱۴
	۲۴	سورۃ البقرہ ۲:۱۸۶
	۲۵	اوحدی اصفہانی کا شعر ہے (شعر العجم ۵:۱۱۶)
۱۴۱	۲۶	یہ موضوع حدیثوں میں سے ہے۔ ملا علی قاری لکھتے ہیں: لیس عن کلام النبی صلی الله علیه وسلم ولا یعرف له سند صحیح ولا ضعیف، لکن معناه صحیح مستفاد من قوله تعالیٰ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ای لیعرفون کما فسّره ابن عباس (موضوعات کبیر: ۶۴) یعنی یہ قول حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں ہے۔ اس کی کوئی سند معلوم نہیں، نہ صحیح، نہ ضعیف۔ لیکن یہ قول معنوں کے لحاظ سے ٹھیک ہے اور مبنی ہے اس آیت پر وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ یہاں لِيَعْبُدُوْن کے معنی لِيَعْرِفُوْن ہیں، جیسا کہ حضرت ابنِ عباس کی تفسیر میں وارد ہوا ہے۔
	۲۷	بیدل کا شعر ہے (کلیات بیدل ۱:۳۸۸)
	۲۸	اگرچہ یہ مضمون تفسیر سورۂ فاتحہ میں جستہ جستہ اور جگہ بھی آیا ہے، لیکن مسلسل ترجمان القرآن جلد اوّل (ساہتیہ اکادمی ایڈیشن) کے ص ۳۱۲-۳۶۲ میں دیکھا جا سکتا ہے۔
	۲۹	سورۃ النحل ۱۶:۴۷ (ترجمان القرآن ۴:۱۹۷-۲۰۵)
	۳۰	دیوانِ حافظ: ۲۶۶
۱۴۲	۳۱	نظیری کا مصرع ہے (دیوان نظیری نیشاپوری: ۶۶) مصرع اولیٰ ہے: پایم بہ پیش از سرِ ایں کو نمی رود
۱۴۴	۳۲	یہ جس نے چکھا نہیں، اسے کیا معلوم!
۱۴۵	۳۳	ظہوری ترشیزی کا شعر ہے (دیوان نورالدین ظہوری: ۴۶)
	۳۴	تیسرے ایڈیشن کے متن میں یہاں 'یقینی' چھپا ملتا ہے، جو یقیناً سہوِ کتابت ہے؛ پہلے ایڈیشن سے تصحیح کی گئی ہے۔
	۳۵	پہلے ایڈیشنوں میں 'داخلی ذہنیت' کی جگہ 'داخلیت' تھا؛ اور یہی بہتر بلکہ یہاں ٹھیک بھی ہوگا۔
	۳۶	اوحدی مراغی کا شعر ہے (شعر العجم '۵: ۳۷)

خط: ۱۴

صفحہ	شمار	
۱۴۶	۱	ژاں ژُوواین ویل قوم کا فرانسیسی تھا؛ ۱۲۲۴ء میں پیدا ہوا۔ وہ پانچویں صلیبی جنگ میں (۱۲۴۸ تا ۱۲۵۴ء) لوئی نہم شاہ فرانس کے ساتھ تھا۔ اس نے اپنی عمر کے آخری زمانے یعنی ۱۳۰۹ء میں ایک کتاب فرانسیسی زبان میں قلم بند کی تھی، جس میں ان چھ برس کے حالات بیان کیے ہیں۔ اُس سے پہلے ایک فرانسیسی زبان میں قلم بند کی تھی؛ جس میں ان چھ برس کے حالات بیان کیے ہیں۔ اُس سے پہلے ایک اور فرانسیسی شخص جافری ڈویل ہارڈوائین نے چوتھی صلیبی جنگ سے متعلق اپنے چشم دید حالات لکھے تھے۔ ان دونوں یادداشتوں کا انگریزی ترجمہ (Memoirs of the Crusades) کے عنوان سے ایوری مینس لائبریری (Everyman's Library) نے شائع کیا ہے۔ کتاب نمبر ۳۳۳ میرے سامنے ۱۹۵۵ء کا چھپا ہوا نسخہ رہا ہے؛ یہاں حوالے اسی سے درج کیے گئے ہیں۔
	۲	صلیبی جنگوں پر بلا مبالغہ سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان سے ایک مختصر سا کتاب خانہ مہیا ہوسکتا ہے۔ مختصراً یہ اُن جنگوں کا نام ہے، جو مغربی یورپ کی مختلف حکومتوں نے عیسائیت کے مقامات مقدسہ کو مسلمانوں کے قبضے اور تسلط سے آزاد کرانے کے لیے ۱۰۹۶ء سے لے کر ۱۲۹۱ء تک لڑیں۔ اس موضوع پر ایک بہت اچھی کتاب A History of the Crusades کے نام سے پانچ جلدوں میں 'پن سلوانیا' یونیورسٹی، فلاڈیلفیا (امریکہ) شائع کر رہی ہے۔ اس کا مطالعہ کتنی ضخیم کتابوں سے مستغنی کر دے گا؛ تمام واقعات مستند ماخذوں سے پوری تفصیل سے دے دیے گئے ہیں۔ لوئی نہم کی جنگوں کا حال اس سلسلے کی دوسری جلد میں آیا ہے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ اصولی طور پر لوئی والی جنگ 'ساتویں صلیبی جنگ' تھی۔
	۳	لوئی نہم شاہ فرانس (۱۲۱۴۔۱۲۷۰ء) اپنے والد لوئی ہشتم کی وفات پر ۱۲۶۲ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے شروع ہی سے مذہبی معاملات سے بہت دلچسپی کا اظہار کیا اور بالآخر ۱۲۶۸ء میں وہ صلیبی جنگ کے لیے روانہ ہوگیا۔ یہاں مصر کے شہر منصورہ میں اس کی فوج کو شکست فاش ہوئی اور لوئی خود گرفتار کرلیا گیا۔ وہ ۱۲۵۴ء وہ تازہ مہم پر روانہ ہوا لیکن اب کے وہ مقامات مقدسہ یا مصر کی بجائے تیونس کے شہر قرطاجنہ (کارتھیج) پہنچ

صفحہ	شمار	
		گیا۔ دراصل یہاں کی موت اس کی قسمت میں لکھی تھی۔ ایک مہینے کے اندر اندر گرمی اور وبا نے اس کی فوج کو لاشوں کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا؛ اسی میں وہ خود بھی لقمۂ اجل ہو گیا (۲۵ اگست ۱۲۷۰ء) ۱۲۹۷ء میں پوپ نے اسے ولی کا درجہ عطا کیا؛ چنانچہ اب وہ سینٹ لوئی کے نام سے مشہور ہے۔ ژاں دُزوائن ویل نے اپنی کتاب میں اس کے حالات خاصی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔
	۴	دمیاط۔ شمالی مصر کا شمالی قدیم شہر، قاہرہ سے تقریباً ۱۲۵ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس وقت آبادی ساٹھ ہزار کے لگ بھگ ہو گی لیکن جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں' یہ پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ کسی زمانے میں بڑا شاندار مرکز تجارت تھا۔
	۵	عربی میں اس موضوع سے متعلق مندرجہ ذیل کتابیں زیادہ اہم ہیں: ابوشامہ: کتاب الروضتین۔ قاہرہ ۱۸۷۰۔۱۸۷۱ء الملک المؤید اسماعیل ابوالفدا: المختصر فی اخبار البشر۔ قاہرہ، ۱۳۲۵ھ تقی الدین احمد بن علی المقریزی: السلوک لمعرفة دول الملوک۔ قاہرہ، ۱۹۵۸ء جمال الدین محمد بن سالم بن واصل: مفرج الکروب فی اخبار بنی ایوب۔ (اس کا صرف ایک حصہ ۶۱۵ھ تک کے واقعات پر مشتمل ڈاکٹر جمال الدین الشیال کی تصحیح کے بعد شائع ہوا ہے؛ بقیہ ہنوز دارالکتب المصریہ' قاہرہ میں مخطوطے کی شکل میں موجود ہے)۔ جمال الدین یوسف ابن تغری بردی: النجوم الزاہرہ فی ملوک مرو القاہرہ ابن اثیر: تاریخ الکامل۔ ایک نئی کتاب دکتور سعد عبدالفتاح عاشور کی الحرکتہ الصلیبیہ (قاہرہ' ۱۹۶۳ء) بھی مفید مطلب ہے۔ دارالکتب المصریہ، قاہرہ میں اس موضوع پر ایک اور خطی کتاب عقد الجمان فی تاریخ اھل الزمان بدرالدین محمود العینی کی تالیف بھی موجود ہے۔
	۶	عکّہ۔ مشرقی بحیرہ روم میں اسرائیل کی بندرگاہ۔ اب تو اس شہر کی زیادہ اہمیت نہیں رہی، چند ہزار کی آبادی ہو گی؛ لیکن کسی زمانے میں یہ فنیقیا اور فلسطین کے اہم ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ مشرق اور مغرب کے درمیان جو تجارتی قافلے کاروبار کرتے تھے۔ ان کا یہ مغربی صدر مقام تھا۔ تورات میں اس کا متعدد مقامات پر ذکر ہے (مثلاً کتاب القضاۃ، ۱:۳۱ وغیرہ) اب اس کی اہمیت اس پہلو سے بھی ہے کہ بہائی مذہب کے بانی

صفحہ	شمار	
		مرزا حسین علی نوری المعروف بہ بہاء اللہ (ف ۲۹ مئی ۱۸۹۲ء) اسی کے مضافات میں البہجہ کے مقام پر دفن ہیں۔
۱۴۷	۷	ڈوائین وِیل: ۳۲۷
۱۴۸	۸	ڈوائین وَیل: ۲۴۶
	۹	رابعہ بصریہ۔ اصلی نام رابعہ العدویہ، بصرہ کے ایک غریب گھرانے میں ۹۵ھ /۱۳۱۷-۱۴ء میں پیدا ہوئیں۔ بچپن میں کوئی اٹھا لے گیا اور اس نے اُنھیں قیس بن عدی کے قبیلہ العتیق کے پاس فروخت کر دیا۔ ان کی نیکی اور تقویٰ نے آزادی دلائی۔ اس کے بعد یہ پہلے آبادی سے دور اور اس کے بعد بصرے میں گوشہ نشیں ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ ان کے زہد و اتقا کا شہرہ ہوا اور لوگ ان کے پاس تعلیم و استفادہ اور صلاح و مشورہ کے لیے آنے لگے؛ ان میں مالک بن دینار، رباح القیس، سفیان الثوری، شقیق بلخی وغیرہ کے نام خاص طور پر مشہور ہیں۔ حضرت رابعہ کا انتقال ۱۸۵ھ /۸۰۱ء میں بصرے میں ہوا؛ اور وہیں دفن ہیں۔ تذکرۃ الاولیا، ۱: ۵۹؛ الطبقات الکبریٰ: ۵۶؛ نفحات الانس: ۶۱۶-۶۱۷)
	۱۰	ابوالقاسم القشیری: الرسالہ: ۸۶، ۱۷۳، ۱۹۲
	۱۱	ابوطالب مکی: قوت القلوب، ۱: ۱۰۳، ۱۵۶
	۱۲	فریدالدین عطار: تذکرۃ الاولیا، ۱: ۵۹
	۱۳	الشعرانی: الطبقات الکبریٰ: ۵۶
۱۵۰	۱۴	پہلے یہ جملہ یوں تھا: بعض متجسّس طبائع ایسے پیدا ہو گئے تھے: اسی لیے آگے 'ملتیں' کی جگہ 'ملتے' اور کرتیں کی جگہ 'کرتے' تھا۔
	۱۵	شیخ شیرازی نے یہ واقعہ گلستان میں بیان کیا ہے (کلیات: ۵۳) اسی قید کے زمانے میں ان کی ملاقات حلب کے ایک رئیس سے ہوئی تھی، جس نے دس دینار ادا کر کے انھیں رہا کرایا اور گھر لا کر سو دینار مہر پر اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دے دی۔ عورت تھی لڑاکا اور زبان دراز؛ شیخ اس سے عاجز آ گئے۔ ایک دن اس نے طعنہ دیا کہ تم وہی تو ہو جسے میرے باپ نے دس دینار پر قید فرنگ سے خریدا تھا۔ شیخ نے برجستہ جواب دیا: ہاں، تم نے سچ کہا؛ دس دینار میں خرید کر سو پر تمہارے ہاتھ بیچ ڈالا۔
	۱۶	ڈوآں وِیل: ۲۴۶-۲۴۷
۱۵۱	۱۷	ایضاً: ۲۴۶

صفحہ	شمار	
	۱۸	پہلے یہاں 'برائی' کی جگہ لفظ 'گناہ' تھا۔
۱۵۲	۱۹	Apocrypha تورات اور انجیل میں جتنی کتابیں ملتی ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں لوگوں میں رائج تھیں، جنھیں وہ عقیدت وارادت اور ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ مولانا مرحوم کی تحریر کا مفاد یہ ہے کہ یہ سب 'جعلی نوشتے' تھے، حالآنکہ یہ صحیح نہیں۔ ان کے مصنف یا مرتب بھی اس زمانے کے لوگ تھے، جب تورات اور انجیل لکھی گئیں ہے یوں کہ جب ان دونوں کتابوں کو آخری شکل میں مرتب کیا گیا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ مذہبی اور اعتقادی یکسانیت پیدا کرنے کے لیے جو کتابیں ترک کی گئی ہیں، ان کا مطالعہ بھی ممنوع قرار دیا جائے۔ اسی لیے ان کا نام Apocrypha رکھا گیا اور مذہبی حلقوں میں ان کا پڑھنا پڑھانا جرم قرار پایا؛ ورنہ وہ کتابیں بھی اتنی ہی اصلی اور مصدقہ تھیں، جتنی وہ جو اب دونوں کتابوں میں شامل ہیں۔
	۲۰	امام احمد حنبل۔ چار فقہی مذاہب میں سے حنبلی طریقے کے بانی، ربیع الاول ۱۶۴ھ / نومبر ۷۸۰ء میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ عراق، شام، حجاز، یمن کے اساتذۂ عہد سے حدیث اور امام شافعی سے فقہ واصول کی تعلیم پائی۔ مسئلہ خلق قران پر ان کا بھی مامون الرشید سے اختلاف ہوا جس پر قید و بند کی سختیاں جھیلنا پڑیں؛ بغداد ہی میں ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ / ۳۱ جولائی ۸۵۵ء کو انتقال ہوا؛ وہیں قبرستان 'مقابر الشہدا' میں دفن ہوئے تھے۔
	۲۱	ابن حنبل کا یہ قول مسند میں نہیں ملا، لیکن اس کی طرف ایک جدید تالیف 'دفاع عن الحدیث النبوی' میں اشارہ ملتا ہے۔
	۲۲	پہلی اشاعتوں میں 'دستانسرائی' چھپا ملتا ہے۔
۱۵۳	۲۳	ملا معین واعظ کاشفی۔ یہ سہو قلم ہے۔ ملا معین ہروی بیٹے تھے مولانا محمد فراہی کے اور ان کا تخلص کاشفی نہیں، بلکہ معین اور معینی تھے؛ اور عرف ملا مسکین۔ مشہور فقیہ ہیں۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب کنز الدقائق (از نسفی) کی شرح اور معارج النبوۃ فی مدارج الفتوۃ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ۹۰۷ھ / ۱۵۰۱ء (حبیب السیر، ۴: ۲۲۸) یا ۹۵۴ھ / ۱۵۴۷ء میں انتقال ہوا (معجم المؤلفین، ۱۲: ۳۱۲ نیز کشف الظنون: ۱۷۲۳)
	۲۴	رابعہ شامیہ، یہ احمد بن ابی الحواری کی بیوی تھیں۔ احمد کہتے ہیں کہ کبھی ان پر عشق ومحبت کا غلبہ ہوتا تھا، کبھی اُنس کا اور کبھی خوف کا۔ صاحبہ کشف تھیں۔ ہارون الرشید (۸۰۹ء) اور مامون الرشید (ف ۸۳۳ء) کی معاصر تھیں (نفحات الانس: ۷۱۹۔ ۷۲۰)

صفحہ	شمار	
	۲۵	ڈوائین ویل: ۲۴۸
	۲۶	متن میں 'التموت' چھپا تھا؛ صحیح 'الموت' ہے، اس لیے اصلاح کردی گئی ہے بعض لوگوں نے 'الموط' بھی لکھا ہے، مثلاً اقبال کا مصرع ہے: ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔
	۲۷	حسن بن صباح۔ اس شخص کے ابتدائی حالات تاریکی میں ہیں۔ تاریخوں میں کچھ ایسی متضاد روایات ملتی ہیں کہ ان میں سے کسی پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اتنا معلوم ہے کہ فاطمی امام مصر المستعصر کی وفات (۱۰۹۴) کے بعد وراثت سے متعلق اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ اس زمانے میں ایران میں عبدالملک بن عطاش اصفہانی فاطمیوں کا داعی تھا؛ اس نے المستعصر کے بیٹے نزار کا ساتھ دیا؛ مصری دوسرے بیٹے المستعلی کے طرف دار تھے۔ یہ گویا ایرانی اسمٰعیلیوں کے الگ نظام کی ابتداء تھی۔ ان لوگوں نے ایران کے مختلف قلعوں پر قبضہ کرلیا، جو اس سے پہلے سلجوقیوں کے زیر تسلط تھے (سلجوقی مذہباً سنّی تھے) منجملہ ان کے الموت کا پہاڑی قلعہ حسن بن صباح نے ۱۰۹۰ء میں فتح کرلیا تھا۔ حسن پہلے ابن عطاش کے ماتحت ایک داعی تھا۔ اس کے بعد یہ قلعہ اسمٰعیلیوں کی تمام سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ حسن بن صباح ہی 'شیخ الجبال' کے لقب سے معروف تھا؛ 'باطنیہ' فرقے کا بانی بھی وہی ہے۔ یہ لوگ اپنے مخالف کو بے دریغ قتل کردیتے تھے (ان کا عربی لقب حشیشیہ ہی انگریزی میں جاکر Assassin بن گیا ہے) مدتوں باطنیہ نے مغربی ایشیا کے مختلف ملکوں میں قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ حسن بن صباح کا ۵۱۸ھ / ۱۱۲۴ء میں انتقال ہوا، اور روحانی میں ابوعلی داعی الدعاۃ اول۔ آغا خاں انھیں اسمٰعیلیوں کے وارث اور نام لیوا ہیں۔ انگریزی میں اس موضوع پر بہترین کتاب ہاگرڈسن کی Order of the Assassins (لائیڈن، ۱۹۵۵ء) ہے اور عربی میں دکتور محمد کامل حسین کی طائفۃ الاسماعیلیہ (قاہرہ)۔
	۲۸	ٹمپلر۔ یہ knight Templar یا Poor Knights of Jesus) کہلاتے تھے۔ اس طرح کی تین تنظیمیں تھیں۔ خاص یہ تنظیم بارھویں صدی میں دو آدمیوں نے شروع کی تھی؛ پھر لوگ آآ کر شامل ہوتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ دراصل یہ صلیبیوں ہی کا فوجی ادارہ تھا اور اس کا مقصد ان زائرین مقامات مقدسہ کی مدد اور حفاظت کرنا تھا، جو پہلی صلیبی جنگ کے بعد سے یروشلم میں جمع ہوگئے تھے۔ بالڈون

صفحہ	شمار	
		ثانی شاہ یروشلم نے اپنے محل ہی کا ایک حصہ ان کے حوالے کر دیا تھا؛ یہ قدیم مسجد اقصیٰ کے نواح میں تھا۔ چونکہ اس کا کلیسائی نام Temple of Soloman (ہیکل سلیمانی) تھا، اس لیے ان لوگوں کا نام ٹمپلر پڑ گیا۔
		رفتہ رفتہ یہ ادارہ کلیسا میں ایک نیا فرقہ تسلیم کر لیا گیا (۱۱۲۸ء) اور تقریباً ایک سو برس تک اپنے تموّل اور رسوخ کے باعث بہت ممتاز رہا۔ انھوں نے ایشیائے کوچک کے تمام اہم مقامات میں اپنے مرکز قائم کر لیے تھے اور صلیبی جنگوں کے دوران میں وہ عیسائی فوجوں کی ہر طرح مدد کرتے رہے۔ چودھویں صدی کے شروع میں (۲ مئی ۱۳۱۲ء) پوپ نے خاص حکم کے ذریعے سے اس فرقے کو ختم کر دیا۔
	۲۹	ہاسپٹلر۔ چھٹی صدی عیسوی کے اختتام پر پوپ گریگوری نے یروشلم میں ایک ہسپتال قائم کیا تھا جس کا نام ہاسپٹل آف سینٹ جون Hospital of St. John تھا۔ جو لوگ اس ادارے سے متعلق اور اس کے منتظم تھے، اسی باعث ان کا نام ہاسپٹلر مشہور ہو گیا۔ یہ دراصل فوجی راہب تھے اور شروع میں انھیں فوج یا جنگ سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ان کی یہ حیثیت بتدریج بارھویں صدی میں مکمل ہوئی۔ جب مسلمانوں نے یروشلم پر قبضہ کر لیا، تو یہ عکّہ چلے گئے اور پھر انھیں وہاں سے بھی نکل کر قبرص میں پناہ لینا پڑی۔ چودھویں صدی میں انھوں نے روڈس پر قبضہ کر لیا۔ جب ۱۵۲۲ء میں ترکوں نے یہ جزیرہ فتح کر لیا، تو یہ لوگ مالٹا پہنچے، جہاں کی حکومت ۱۷۹۸ء تک ان کے ہاتھ میں رہی۔ مالٹا سے انھیں نپولین نے نکالا تھا۔
	۳۰	فریڈرک ثانی (۱۱۹۴۔۱۲۵۰ء) شہنشاہ سلطنت روما) ۲۶ دسمبر ۱۱۹۴ء کو پیدا ہوئے: اور اپنے والد کی وفات کے بعد کمسنی ہی میں مئی ۱۱۹۸ میں تخت نشین ہو گئے۔ وہ سب سے پہلے ۱۲۲۷ء کی صلیبی جنگ میں شامل ہوئے تھے لیکن فوج میں وباء پھوٹ پڑی اور انھیں واپس جانا پڑا۔ جب حالات معمول پر آ گئے تو وہ دوبارہ مقامات مقدسہ پہنچے اور اب کے فروری ۱۲۲۹ء میں انھوں نے 'شاہ یروشلم' کا لقب اختیار کر لیا۔
		بہت قابل شخص تھے۔ یورپ کی چھ زبانوں میں پوری مہارت حاصل تھی؛ اس کے علاوہ ریاضی، فلسفہ، طب، معماری سے خاص شغف تھا۔ مقنن بھی تھے، ان کے مدوّنہ قوانین شارلمین کے بعد مکمل ترین مجموعہ کہے جا سکتے ہیں؛ یہ صحیح معنوں میں ان کی شخصیت کا مظہر ہیں۔ ناپلز کی یونیورسٹی انھیں نے قائم کی تھی۔ مغرب میں عربی (ہندی) اعداد کا استعمال بھی انھیں نے شروع کیا۔ پرندوں اور جانوروں سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ ایک

صفحہ	شمار	
		چڑیا گھر بنایا اور پرندوں سے متعلق کتاب لکھی۔
		۱۱ان کی ساری عمر کلیسا اور پوپ سے اختلاف اور جنگ میں گذری۔ ۱۳ دسمبر ۱۲۵۰ء کو وفات پائی۔
	۳۱	ژوائیں: ۲۴۸
۱۵۵	۳۲	ایضاً
۱۵۶	۳۳	ایضاً: ۲۴۹
۱۵۷	۳۴	ایضاً: ۲۲۰، ۲۳۱۔ یہ رقم آٹھ لاکھ طلائی سکّے بیزان (Bezants کے) برابر تھی۔
	۳۵	ایضاً: ۲۴۹
	۳۶	طبع اوّل میں یہاں 'ایک ماہ' تھا۔
۱۵۸	۳۷	ژوائیں ویل: ۲۴۹
	۳۸	ایضاً: ۲۵۱
	۳۹	ایضاً: ۲۵۰
۱۵۹	۴۰	ایضاً
	۴۱	اس کا پورا نام رکن الدین خورشاہ تھا لیکن خورشاہ ۶۵۳ھ/۱۲۵۵ء میں حکمران ہوا۔ اس سے پہلے اس کا باپ علاء الدین محمد ثالث (ف ۶۵۳ھ) حاکم تھا۔ لوئی نہم اسی کا معاصر تھا؛ اس لیے یہ خط و کتابت اور سفارتی تبادلہ بھی اسی کے عہد میں ہوا ہوگا، نہ کہ خورشاہ کے زمانے میں۔
۱۶۰	۴۲	ژوائیں ویل: ۱۸۶
۱۶۱	۴۳	ایضاً: ۱۸۶۔۱۸۷
	۴۴	نپولین بونا پارٹ۔ مشہور شہنشاہِ فرانس ۱۵ اگست ۱۷۶۹ء کو جزیرۂ کورسیکا میں پیدا ہوا۔ بتدریج مئی ۱۸۰۴ء میں فرانس کا شہنشاہ بن گیا۔ ۱۸۱۵ء میں انگریزوں نے دوسری یورپی حکومتوں کے ساتھ مل کر اسے واٹرلو (بلجیم) کے میدان جنگ میں شکست دی۔ اس کے بعد نپولین نے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا؛ انھوں نے اسے پابجولاں جزیرہ سینٹ ہلینا بھیج دیا۔ یہیں قید کی حالت میں ۵ مئی ۱۸۲۱ء کو انتقال ہوا۔ ۲۰ سال بعد ۱۸۴۰ء میں نعش پیرس لائی گئی، جہاں اب یہ ایک خاص مقبرے (Invalides) میں مدفون ہے۔
	۴۵	نپولین نے مصر پر حملہ جولائی ۱۷۹۸ء میں کیا تھا، اس نے فوجیں اسکندریہ کی مشہور

صفحہ	شمار	
		بندرگاہ میں اتاری تھیں۔ اس وقت قاہرہ میں دو شخصوں کی مشترکہ حکومت تھی: اسمٰعیل بک، شیخ البلد اور مراد بک امیر الحج (بک کا تلفظ بے ہے)۔ ان کی فوجوں کا نپولین سے مقابلہ اہرام کے نواح میں قریۂ امبابہ میں ہوا؛ اسی لیے یہ جنگ امبابہ کہلاتی ہے۔ انھیں شکست ہوئی اور مراد بک جنوبی مصر کی طرف بھاگ گیا۔ نپولین کے ایک فوجی دستے نے اس کا پیچھا کیا، لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا۔ غالباً وہ بھی یکم مارچ ۱۸۱۱ء کے اس قتل عام میں ختم ہو گیا، جب محمد علی پاشاہ نے تمام مملوک سرداروں کو قاہرہ کے قلعے میں دعوت میں بلا کر تلوار کے گھاٹ اتروا دیا تھا۔
	۴۶	الجبرتی نے اس واقعے سے متعلق یہ لکھا ہے:
		وَقد کانت العماء عند توجه مراد یجتمع بالا زہر کل یوم و یقرؤن البخاری وغیرہ من الدعوات (عجائب الاٰثار فی التراجم والاخبار، ۳:۶) یعنی جب مراد فرانسیسیوں کے مقابلے کے لیے جاتا، تو علما (نیک فالی کے لیے) از ہر میں جمع ہو کر صحیح بخاری پڑھتے اور دوسری دعاؤں کا ورد کرتے تھے۔
	۴۷	شیخ عبدالرحمٰن الجبرتی، الجبرت کی نسبت حبشہ (ابی سینیا) میں ایک قصبے یا شہر سے ہے، جہاں سے ان کے اجداد ہجرت کر کے مصر میں آ رہے تھے۔ شیخ عبدالرحمٰن ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء میں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم اپنے والد کی زیر نگرانی ہوئی اور خود اُن سے انھوں نے مذہب کے علاوہ ادب، ریاضی اور ہیئت کی تعلیم پائی اور پھر اپنے طور پر اتنی استعداد پیدا کر لی کہ اپنے زمانے کے علماء میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ۱۲۰۳ھ میں ایک مصری عالم سید مرتضیٰ نے بارھویں صدی ہجری کے مشاہیر کا تذکرہ مرتب کرنے کی داغ بیل ڈالی۔ انھوں نے اس مفید کام میں عبدالرحمٰن الجبرتی سے معاونت کی درخواست کی، جسے انھوں نے قبول کر لیا۔ بدقسمتی سے سید مرتضیٰ کا اس کے بعد جلد ہی انتقال ہو گیا۔ اس خیال سے کہ ساری محنت اکارت نہ جائے، الجبرتی نے مرحوم کا تمام کتاب خانہ اور مسوّدات خرید لیے حالانکہ ان میں کا بہت سا حصہ خود انہی کا لکھا ہوا تھا۔ اب یہ کام انھوں نے خود آگے بڑھایا اور بالآخر اپنی مشہور تاریخ مرتب کر لی جس کا پورا نام عجائب الاثار فی التراجم والاخبار ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے (المطبعۃ العامرۃ الشرقیہ، قاہرہ۔ ۱۳۲۲ھ)

صفحہ | شمار

خط:۱۵

۳ | ۱ | دیوان غالب:۲۲۱

۲ | میرزا کاظم قتی کا شعر ہے(خریطہ جواہر:۱۴۴)؛شمع انجمن:۴۰۰)

۳ | غالباً یغما جندقی کی راعی کا چوتھا مصرع ہے(دیوان:۲۳۱)پوری رباعی ہے:

آں ظلمتِ محض کا ٓمداز خطۂ نور
زنہار بنامِ او نگردی مغرو
چوں سگ نجس است، طاہرش میخوانند
برعکس نہندنام زنگی کافور

(یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چوتھا مصرع کسی اور کا ہو جسے یغما نے تضمین کیا ہے)

۴ | دیوان بابا فغانی:۷۹

۱۶۴ | ۵ | قدسی

۶ | کلیات غالب(فارسی):۲۳۳

۷ | میرزا سعدالدین محمد راقم مشہدی کا شعر ہے(شعرالعجم،۵:۲۰۲)شعرالعجم میں البتہ مصرع اولیٰ یوں ہے:

زبسکہ پیروِیِ خلق گمرہی آرد

۸ | ذوق کا مصرع ہے(دیوان ذوق(مرتبہ آزاد):۲۳۹)۔پہلا مصرع ہے:

زباں پیدا کروں جوں آسیا سینہ میں پیکاں سے

۱۶۵ | ۹ | دیوان حافظ:۴۱

۱۰ | گلستاں(باب اول)کا ٹکڑا ہے(کلیات سعدی:۲۶)البتہ یہاں کچھ لفظی تغیر ہوگیا ہے،اصلی عبارت یوں ہے:

'بنیادِ ظلم در جہاں اندکے بودہ است۔ ہر کہ آمد، برومزیدے کرد تا بدیں غایت رسید'

۱۱ | نواب مرزا خان داغ دہلوی کا مصرع ہے(گلزار داغ:۱۵۱)پورا شعر ہے:

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں واعظ
ہائے، کمبخت !تونے پی ہی نہیں

۱۲ | دیوان حافظ:۱۱۴۔پہلا مصرع ہے:

صفحہ	شمار	
		غیر تم گشت کہ محبوبِ جہانی ، لیکن
	۱۳	ایضاً،ص ۱۴۳
۱۶۶	۱۴	دیوان حافظ: ۱۱۹۔ مصرع اولیٰ ہے: جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
	۱۵	دیوان غالب: ۱۳۴
	۱۶	مفتی صدر الدین آزردہ کا شعر ہے (گلستان سخن: ۱۱۴)
	۱۷	کسی غنی تخلص کے شاعر کا مصرع ہے (گلستان مسرت: ۸۸) پہلا مصرع ہے بگردِ کعبہ ہندو شد، مسلماں گشت بے ایماں
۱۶۷	۱۸	دیوان حکیم سنائی: ۳۳۹
	۱۹	میرزا عبد القادر بیدلؔ کی رباعی ہے (کلیات بیدل، ۲ (رباعیات): ۳۹) صحیح مصرع اوّل میں 'خلق' کی جگہ 'غیر' ہے اور مصرع ثانی یوں ہے۔ واگرد بدل دلیل، توفیق انیست
	۲۰	گلستان (باب پنجم) کا شعر ہے (کلیات سعدی: ۸۹)
	۲۱	ابو فراس الحمدانی کا مصرع ہے (دیوان ابی فراس الحمدانی: ۳۵) پہلا مصرع ہے: ومن مذهبی حب الدیار لاهلها
	۲۲	یہ حدیث کسی معتبر مجموعے میں نہیں ملی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس حدیث سے متعلق ایک عجیب روایت بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں (ترجمہ عربی) میرے والد نے مجھ سے ذکر کیا کہ میں نے سنا ہے کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انا املح واخی یوسف اصبح یعنی میں ملیح ہوں اور میرا بھائی یوسف صبیح ہے۔ میں اس حدیث کے معنوں کا خیال کر کے متعجب ہوا کیونکہ ملاحت صباحت کی بہ نسبت عاشقوں کو زیادہ بے قرار کرتی ہے؛ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں بیان ہوا ہے کہ زنان مصر نے انھیں دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، اور بعض لوگ ان (کے جمال) کو دیکھ کر مر گئے تھے، اور (اس کے بالعکس) ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسی کوئی روایت نہیں۔ (اس کے بعد) میں نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور اس سے متعلق سوال کیا، تو آپ نے فرمایا: اللہ عزوجل نے غیرت سے میرا حسن لوگوں سے پوشیدہ رکھا ہے۔ اگر یہ ظاہر ہو

صفحہ	شمار	
		جائے تو لوگ اُس سے کہیں زیادہ کریں، جو انھوں نے یوسف کو دیکھ کر کیا تھا۔" (الدُّر الثمین فی مبشرات النبی الامین:۷) حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کتاب میں چالیس ایسی حدیثوں کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے خواب میں براہ راست حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دو واسطہ سے سنی تھیں۔ یہ بیسویں حدیث ہے۔
	۲۳	دیوان کامل خواجہ حافظ شیرازی:۷۲، مصرع اول ہے: زاں یار دل نوازم شکریست باشکایت بعض جگہ یہ مصرع یوں ملتا ہے: گر نکتہ دان عشقی، بشنو تو ایں حکایت
۱۶۸	۲۴	مولانا شبلی نعمانی کا شعر ہے (کلیات شبلی:۸۷)
	۲۵	یہ حاشیہ طبع اول میں نہیں تھا۔
	۲۶	دیوان ذوق (مرتبۂ آزاد):۲۳۹؛ ایضاً (مرتبۂ ویران):۱۲۷
	۲۷	چندر بھان برہمن کا شعر ہے (کلمات الشعرا:۱۸)
	۲۸	دیوان حافظ:۸۱۔ مصرع اولی ہے: زیں قصہ ہفت گنبدِ افلاک پُر صداست
۱۶۹	۲۹	انشا کا مصرع ہے (کلام انشا:۵)؛ پہلا مصرع یوں ہے: نزاکت اس کے یہ مکھڑے کی دیکھیو انشا!
	۳۰	کلیات غالب:۲۷۱
۱۷۰	۳۱	تذکرۂ شمع انجمن (ص ۳۸۸) اسے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کا کیؒ سے منسوب کیا گیا ہے اور پورا شعر ہے: من بجہدیں آشنائی می خورم خونِ جگر آشنا را حال این ست، وائے بر بیگانہ لیکن حضرت علیہ الرحمتہ کا شاعر ہونا ہی مشتبہ ہے۔ چونکہ مقطع مندرجۂ شمع انجمن میں تخلص قطب ہی ملتا ہے، اس لیے اسی تخلص کے کسی اور شاعر کا ہوگا۔
۱۷۱	۳۲	مومن کا مصرع ہے (کلیات مومن،۱:۱۵۷) مصرع اولی ہے: میں گِلہ کرتا ہوں اپنا، تو نہ سُن غیروں کی بات
	۳۳	بیدل کا مصرع ہے (کلیات بیدل،۱:۸۳۶) ٹھیک شعر یوں ہے:

صفحہ	شمار	
		سازِ تحقیق ندارد، چہ نگاہ و چہ نفس سرِایں رشتہ بجا نیست کہ من میدانم
	۳۴	تیسرا ایڈیشن (یعنی ہمارے متن) میں یہاں 'کے' چھپا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ محل 'سے' کا ہے؛ یہی پہلے ایڈیشن میں بھی ہے۔ ظاہرا کتابت کی غلطی ہے، لہٰذا اصلاح کر دی گئی ہے۔
	۳۵	دیوان حافظ: ۳۲۵۔ یہاں کچھ لفظی تبدیلی ہو گئی ہے۔ پورا شعر یوں ہے: گر مسلمانی از این است کہ حافظ دارد آہ، اگر از پیِ امروز بود فردائے!
۱۷۲	۳۶	دیوان حافظ: ۸۵۔ مصرع اول ہے: شرحِ شکن زلف خم اند خمِ جاناں
	۳۷	دیوان حافظ: ۵۹۔ مصرع اولیٰ ٹھیک یوں ہے: دوائے دردِ خود اکنوں ازاں مفرّح جوئے
	۳۸	جرنیل چنگ کائی شک (Chiang Kai-Shek) ۳۱/اکتوبر ۱۸۸۷ء کو پیدا ہوئے۔ چین اور جاپان میں فوجی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مشہور انقلابی رہنما ڈاکٹر سن یات سن (Sun yat -sen) کی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹ء۔۱۹۴۵ء) کے دروان میں چینی حکومت کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ فروری ۱۹۴۲ء میں ہندوستان تشریف لائے تھے (جس کی طرف متن میں اشارہ ہے)۔ جب چین میں کمیونسٹ برسر اقتدار آئے، تو وہ فورموسا میں آزاد حکومت کے سربراہ بن گئے۔ جسے اب تائیوان کہتے ہیں۔ ۵ اپریل ۱۹۷۵ء کو انتقال ہوا۔
	۳۹	میڈم چنگ۔ ڈاکٹر سن یات سن کی صاحبزادی۔ ان کا دوشیزگی کا نام میلنگ سونگ (Mayling Soong) تھا۔ ۱۹۲۷ء میں ان کی شادی جرنیل چنگ کائی شک سے ہوئی۔ یہ بھی اپنے نامی شوہر کے ساتھ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان آئی تھیں۔ متعدد کتابوں کی مصنف ہیں۔
	۴۰	کلیات غالب: ۴۰۲
	۴۱	کلیات عرفی: ۲۸۷۔ دراصل 'رازِ صبا' کی جگہ 'بادِ صبا' ہے۔
۱۷۳	۴۲	حضرت امیر خسرو کا شعر ہے (شعر العجم ۲، ۱۶۸):

صفحہ	شمار	
	۴۳	دیوان حافظ: ۳۳۰۔ مطبوعہ دیوان میں مصرع ثانی میں 'ئے می چشی' ہے۔
	۴۴	ایضاً: ۲۷۳۔ دراصل 'تا' کی جگہ 'چوں' ہے۔ مصرع اولی ہے: اے نور چشمِ من ! سخنے ہست، گوش کن
۱۷۴	۴۵	دیوان حالی: ۱۰۰
	۴۶	لیپچو (Lopchu) عام چائے کا ایک تاجرانہ نام ہے؛ 'ویچو' تابع مہمل ہے۔
	۴۷	کلیات غالب: ۴۳۳۔ دراصل 'عرضہ' کی جگہ 'عرض' ہے۔
	۴۸	کلیات غالب: ۴۹۴۔ 'ہیں' کی جگہ 'ہی' چاہیے۔
۱۷۵	۴۹	کلیات غالب: ۴۸۳
	۵۰	Restaurant: وہ جگہ جہاں کھانا یا ہلکا ناشتہ مہیا کیا جاتا ہے۔
	۵۱	دیوان نظیری: ۶۰۔ مصرع اول ہے: یکے بگورِ عزیزانِ شہر سیرے کن
	۵۲	دیوان حافظ: ۵۷
	۵۳	گلستاں (باب دوم) کا شعر ہے (کلیات سعدی: ۶۲)
۱۷۶	۵۴	کلیات بیدل، ۱: ۴۰۷۔ مطبوعہ دیوان میں پہلے شعر کے مصرع اولیٰ میں 'شبستان' کی جگہ 'مخمستان' ملتا ہے اور دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں 'کز' کی جگہ 'اگر'۔
		۵۵۔ دیوان غالب: ۲۳۷
	۵۶	کلیات سعدی: ۴۵۰۔ فرق صرف یہ ہے کہ کلیات میں 'چہ داند' کی جگہ 'نداند' ملتا ہے۔
	۵۷	آصف خاں جعفر بیگ امرائے مغلیہ میں سے تھے' ان کا شعر ہے
۱۷۷	۵۸	غالب کا مصرع ہے (دیوان غالب: ۴۲) پورا شعر ہے: تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسد ! سرگشتہ خمارِ رسوم و قیود تھا'
	۵۹	دیوان ذوق (مرتبہ آزاد): ۲۱۶۔ پہلا مصرع ہے: نگہ کا اور تھا دل پر، پھڑ کنے جان لگی
	۶۰	دیوان غالب: ۱۳۹۔ اگرچہ بیشتر اشاعتوں میں یہ شعر اسی طرح لکھتا ملتا ہے، لیکن صحیح مصرع اولی میں 'سر ہے' کی جگہ 'ہے سر' ہے۔
	۶۱	کلیات بیدلؔ، ۱: ۹۴۔ مصرعے میں 'اگر دستے' کی جگہ 'کہ دستے گر' چاہیے۔ مصرع اولیٰ ہے:

صفحہ	شمار	
		بہ بیسا نیم وقت است، اگر شور جنوں گرید
	۶۲	دیوان کلیم کاشانی: ۲۴۷۔ پہلے مصرعے میں ''حدیثِ شوق'' کی جگہ 'بیان عشق' چاہیے۔

خط: ۱۶

صفحہ	شمار	
۱۷۸	۱	دیوان حافظ: ۳۳۸۔۳۳۹۔ یہاں مطبوعہ متن سے کچھ اختلاف ہے، مثلاً پہلے شعر کے مصرع ثانی میں 'بزن' کی جگہ 'بدہ' ہے۔ آخری شعر کا پہلا مصرع یوں ہونا چاہیے تھا: ساقی ! بہ بے نیازیِ رنداں کہ مَے بدہ
۱۷۹	۲	طبعِ ثالث میں 'سے' نہیں تھا؛ طبع اول سے اضافہ کیا گیا۔
	۳	عبدالرحیم خانخاناں کے قصیدۂ مدحیہ کا مصرع ہے (کلیات عرفی: ۲۰۰) پورا شعر ہے: زبسکہ لعل فشاندم بنزدِ اہل قیاس یکے است نسبتِ شیرازی و بدخشانی
	۴	فیضی۔ اصلی نام ابوالفیض تھا۔ پہلے تخلص فیضی تھا، آخر میں فیاضی کر لیا تھا۔ ۹۵۴ھ / ۱۵۴۷۔۱۵۴۸ء میں پیدا ہوئے۔ قران کی تفسیر عربی میں 'سواطع الالہام' کے نام سے صنعتِ غیر منقوطہ میں لکھی۔ خمسۂ نظامی کا جواب لکھنا شروع کیا تھا، لیکن مکمل نہ ہو سکا اور موت کا بلاوا آ گیا۔ دیوان (طباشیر الصبح) چھپ چکا ہے۔ ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ / ۵ / اکتوبر ۱۵۹۵ء کو آگرے میں وفات پائی (آئین اکبری: ۲۴۳۔۶۲۵؛ منتخب التواریخ، ۳: ۲۹۹۔۳۱۰؛ مآثر الکرام، ۱: ۱۹۸۔۲۰۰)
	۵	میرزا فرصت شیرازی کے حالات کے لیے دیکھیے، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: ۲۳۲۔۲۳۵
	۶	مصرع حسن سجزی دہلوی مرحوم کا ہے (دیوان حسن سجزی: ۳۸۴)؛ صحیح 'خرسندم' کی جگہ 'خشنودم' ہے۔ پہلا مصرع ہے: اے سروتبو شادم، شکلت بفلاں ماند
	۷	یعنی گھر کا مالک زیادہ جانتا ہے کہ اس کے اندر کیا ہے۔
	۸	'محی نگر' اس لیے کہ اورنگ زیب عالم گیر کا اصلی نام 'محمد محی الدین' تھا۔
۱۸۰	۹	۲۰ فروری ۱۷۰۷ء کو
	۱۰	دیوان بابا فغانی: ۷۹

صفحہ	شمار	
	۱۱	غالب کے مطلع کا مصرع ثانی ہے (کلیات غالب: ۳۹۳) مطلع ہے: یار در عہد شبابم بکنار آمد ورفت ہمچو عیدے کہ درایام بہار آمد ورفت
۱۸۱	۱۲	دیوان حافظ: ۳۶۲۔ مطبوعہ نسخے میں 'غلق' کی جگہ 'ہردم' ہے۔
	۱۳	دیوان غالب: ۱۵۳۔ مصرع ثانی میں۔ صحیح غالباً 'تری' کی جگہ 'ترا' ہے۔
	۱۴	Heater: بجلی کا پانی یا کمرے کو گرم کرنے کا آلہ۔
	۱۵	کلیات عرفی شیرازی: ۳۸۶
۱۸۲	۱۶	دیوان نظیری نیشاپوری: ۳۰۷
	۱۷	متن میں یہاں 'واقعہ' چھپا تھا، طبع اول سے اصلاح کی گئی۔
	۱۸	کلیات عرفی: ۲۹۵۔ صحیح مصرع اولیٰ میں اقلیم کی بجائے 'جیحون' ہے۔
	۱۹	متنبی کا شعر ہے (دیوان ابی الطیب المتنبی: ۱۶۶) دیوان میں عقاب لُبنان اور وھو الشتاء ہے۔
	۲۰	یہ سفر اگست ۱۹۰۸ء کے بعد پیش آیا تھا۔ اسی مہینے مولانا آزاد کے والد مولانا خیرالدین مرحوم کا انتقال ہوا، اور وہ اس کے بعد سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہ ان کا دوسرا سفر عراق تھا۔ پہلی مرتبہ غالباً ۱۹۰۵ء کے شروع میں گئے تھے۔ مولانا مرحوم کے سفر عراق سے متعلق شبہہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے پہلے دبے لفظوں میں (معارف، ۵۷،۶: ۴۰۳) اور پھر برملا عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اسے 'افسانہ' قرار دیا (معارف، ۶۶،۶: ۴۰۴/۷۔۴۰۴) ان کی تقلید میں کچھ اور اصحاب نے بھی لمبے لمبے مقالے لکھے۔ لیکن ان سب شبہات کی تردید فرانس کے مشہور صوفی مستشرق موسیو لوئی ماسینوں (Louis Massignon) کے اس مضمون سے ہو جاتی ہے، جو پروفیسر ہمایوں کبیر کی مرتبہ تذکاری کتاب مولانا ابوالکلام آزاد میں شامل ہے (ص ۲۷۔۲۹)۔ اس میں انھوں نے ۱۹۰۸ء میں مولانا آزاد سے بغداد میں اپنی ملاقات، صحبت اور شیخ آلوسی سے استفادہ کا ذکر کیا ہے۔ میں خود اپریل ۱۹۶۱ء میں موسیو ماسینوں سے پیرس میں ملا تھا۔ اس موقع پر انھوں نے دوبارہ میرے دریافت کرنے پر اس کی تصدیق کی۔
۱۸۳	۲۱	'ستی' میں یائے تو ظاہر ہے کہ فاعلیت کی ہے 'ست' دراصل تحریف ہے سیدہ' کی؛ گویا صحیح لفظ ہوگا: 'سیدتی'۔

صفحہ	شمار	
	۲۲	سہو کاتب سے 'یہ' 'کا' طبع ثالث میں نہیں ملتا؛ طبع اول سے اضافہ کیا گیا۔
	۲۳	سَرائچی یعنی سرائے کا مالک۔
۱۸۴	۲۴	Short: وہ پاجامہ جس میں پوری ٹانگیں نہیں ہوتیں: اسے عام طور پر 'نکر' کہتے ہیں۔
	۲۵	بوستان کا شعر ہے (کلیات سعدی: ۱۷۴)
	۲۶	یہ حدیث صحیح مسلم (کتاب البر والصلہ والآداب: ۱۳۸) نیز (کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها: ۴۸) میں ہے۔ اس کا آخری حصہ میں اور کئی مجموعوں میں بھی ملتا ہے مثلاً بخاری (کتاب الصلح: ۸؛ کتاب الجهاد: ۱۳ وغیرہ)؛ ترمذی (کتاب صفة الجهنم: ۱۳؛ کتاب المناقب: ۵۴)؛ نسائی (کتاب القسام: ۱۷، ۱۸) ابوداؤد (کتاب الدیات: ۲۸)؛ ابن ماجہ (کتاب الدیات: ۱۶؛ کتاب الزهد: ۱۴)؛ مسند حنبل (۳: ۱۲۸، ۱۴۵ وغیرہ، ۴: ۳۰۶؛ ۵: ۴۰۷)
	۲۷	کلیات غالب: ۴۳۲
۱۸۵	۲۸	القرآن: ق، ۵۰: ۳۰
	۲۹	دیوان نظیری: ۲۳۹
	۳۰	دیوان بابا فغانی: ۳۲ دیوان میں 'می خری' کی جگہ 'می دہی' چھپا ہے۔ لیکن یہ محل 'می خری' ہی کا ہے۔ الا یہ کہ مصرع یوں ہو: اے کہ می گوئی : 'چرا جانے بجاے می دہی دوسرے مصرع میں میں بھی 'ما' کی جگہ 'من' ملتا ہے۔
	۳۱	یہ لفظ صحیح 'خونابہ' ہے؛ اسے 'خوننابہ' لکھنا درست نہیں؛ اسی لیے متن میں تصحیح کر دی گئی ہے۔
۱۸۶	۳۲	دیوان حافظ: ۱۵۴

خط: ۱۷

صفحہ	شمار	
۱۸۷	۱	طبع اول میں یہاں 'ایغو' کی جگہ 'ایجو' تھا۔ بیشتر عرب ممالک میں 'ج' کا تلفظ 'گ' کی طرح ہے؛ پس یہ پڑھا 'ایگو' ہی جائے گا۔
	۲	معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس کا شعر ہے۔ کشف المحجوب (ص ۳۸۲) میں ملتا ہے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ جنیدؒ اسے بڑے ذوق شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ (وفیات الاعیان، ۱: ۳۲۴)

صفحہ	شمار	
		کشف المحجوب میں 'تقلقلت' کی جگہ 'اذا قلت' ہے، اور وفیات الاعیان میں 'ان قلت'
۱۸۸	۳	المعرّی کا شعر ہے (شروح سقط الزند ۲: ۵۱۹)
	۴	دیوان ابی فراس الحمدانی: ۱۵۷۔
	۵	دیوان ابن سناء الملک: ۱:۵۔ دیوان میں پہلے شعر کے مصرع ثانی میں 'علی الرغم' کی جگہ 'علی الکرہ' ہے، اور دوسرے شعر کے مصرع اوّل میں 'النی' کی جگہ 'ادنیٰ'۔
	۶	فردوسی کے شاہنامہ کا شعر ہے۔
	۷	یہ اشعار مثنوی نل دمن میں کسی جگہ مسلسل نہیں، مختلف جگہ سے جمع کر دیے گئے ہیں۔ سارے دس شعروں کے لیے دیکھیے: داستان نل ودمن، صفحات: ۴۱، ۴۲، ۱۷۳، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۱، ۱۷۲۔ مطبوعہ مثنوی (ص ۱۷۲) میں چھٹے شعر کے مصرع ثانی میں 'حرف' کی جگہ 'برف' ملتا ہے: یہ بہتر ہے۔
۱۸۹	۸	روح انیس: ۱۴۴۔ اصلی متن میں 'مضامین نو کا' ہے، اگرچہ بعض جگہ 'کے' بھی چھپا ملتا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں یہ شعر اور اس سے پہلے کا نثری جملہ نہیں ملتا۔
	۹	کلیات بیدل ۱۴ (عنصر سوم (: ۲۳۲۔ مصرع اولیٰ ہے: توگر خود رانہ بینی، نیست عالم غیرِ دیدارش مطبوعہ مصرع ثانی میں 'محروم' کی جگہ 'محرومی' ہے۔
۱۹۰	۱۰	کلیات بیدل، ۱: ۹۳
۱۹۱	۱۱	عبدالرزاق فیاض کا شعر ہے (کلمات الشعرا، ۸۸) بعض نسخوں میں مصرع اولیٰ کی دوسری روایت 'درد اشتیاق' کی بجائے 'جوشِ اشتیاق' ہے۔
	۱۲	دیوان ابی الطیب المتنبی: ۳۶۱
۱۹۲	۱۳	ملک الشعرا فیضی کا شعر ہے، (شعر العجم ۳: ۶۶؛ کلیات فیضی: ۲۱۵)
	۱۴	سینٹ آگسٹائن (St.Aurelius Augustine) ۳۵۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتداء اپنے میں زمانے کی عام فضا کی طرح ان کی اخلاقی حالت بھی کچھ قابل فخر نہیں تھی ؛ لیکن ۳۳ سال کی عمر میں عیسائیت قبول کر لینے کے بعد ان کی کایا پلٹ ہوگئی۔ اس کے بعد وہ ۴۳ برس اور زندہ رہے اور انھوں نے متعدد (فلسفیانہ اور دینی کتابیں لکھیں، جو عیسائی حلقوں میں بہت شہرت یافتہ ہیں ؛ لیکن ان کی کتاب اعترافات (Confessions) نفسیاتی پہلو سے عجیب وغریب تحریر ہے۔ ۴۳۰ء میں انتقال ہوا۔

صفحہ	شمار	
	۱۵	روسو (Jean Jacques Rousseau) فرانسیسی فلسفی، ۲۸ جون ۱۷۱۲ء کو جنیوا میں پیدا ہوئے۔ ان کا فرانسیسی انقلاب کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ معاہدۂ عمرانی (Social Contract) ان کی مشہور کتاب ہے؛ اس کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی اور متعدد کتابیں ہیں، جن میں ایک خود نوشت سوانحعمری (Confessions) بھی ہے۔ ۲ رجولائی ۱۷۷۸ء کو انتقال ہوا۔
	۱۶	اسٹرنڈبرگ (August John Strindberg) سویڈن کے سب سے بڑے ڈراما نگار، ناول نویس اور سویڈی جدید ادب کے سرخیل اور رہنما۔ ۲۲ جنوری ۱۸۴۹ء کو اسٹوک ہالم میں پیدا ہوئے۔ انھیں 'سویڈن کا شیکسپیئر' کہا جاتا ہے۔ اپنے ناولوں کی وجہ سے ان کی بہت مخالفت ہوئی جس کے باعث انھیں مجبوراً کئی سال جلا وطنی کی زندگی بسر کرنا پڑی۔ دماغ میں بھی کچھ فتور تھا اور اس کے دورے تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد ساری عمر پڑتے رہے۔ اگرچہ ان کے بیشتر ڈراموں اور ناولوں میں آپ بیتی کا نمایاں حصہ ہے، لیکن ان کے ناول اینسم (Einsam) کا غالب حصہ ان کے اپنے حالات پر مشتمل ہے۔ خود نوشت سوانحعمری بھی چاکر پوت (The Son of a Servant) کے عنوان سے لکھی تھی۔ ۱۴ مئی ۱۹۱۲ء کو سٹوک ہالم ہی میں سرطان کے مرض سے انتقال ہوا۔
	۱۷	ٹالسٹائی (Leo Nikolayevich Tolstoy) مشہور مصنف' ناول نگار، فلسفی، ایک کھاتے پیتے روسی گھرانے میں ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوئے۔ اپنی سہل انگاری اور آرام پسندی کے باعث وہ تعلیم ختم نہیں کر سکے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے خاندانی زمینداری کی دیکھ بھال کا مشغلہ اختیار کیا؛ لیکن چونکہ اس کام کا کوئی تجربہ نہیں تھا، اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ اب انھوں نے موسکو میں امیرانہ عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنا شروع کی۔ چار پانچ برس میں اس سے بھی بددل ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۸۵۱ء میں فوج میں نام لکھوالیا، لیکن چھ برس بعد ۱۸۵۷ء میں اس سے بھی مستعفی ہو گئے۔ انھوں نے ۱۸۴۷ء میں اپنا روزنامچہ لکھنا شروع کیا تھا؛ اسی دوران میں وہ افسانے بھی لکھنے لگے۔ ان کے سب سے اہم اور شہرہ آفاق دو ناول ہیں: جنگ اور امن (War and Peace) اور انا کارینینا (Anna Karenina) جو بجا طور پر عالمی ادب کا حصہ اور شاہکار تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ ۱۸۷۶ء کے قریب انھوں نے روحانی بے چینی محسوس کی اور عیسائیت سے اپنے

صفحہ	شمار	
		اختلاف اور عدم تسکین کا اظہار کیا۔ متّی کی انجیل کے ان الفاظ: لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے، دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ (۳۹:۵) نے ان کی زندگی کا رخ پھیر دیا۔ انھوں نے اپنی عدم تشدّد کی تعلیم کی بنیاد اسی پر رکھی۔ آہستہ آہستہ وہ عیسائیت کی رسمی شکل سے بہت دور ہو گئے۔ اب انھوں نے گوشت، شراب، مُسکرات، تنباکو وغیرہ کے خلاف پرچار شروع کر دیا۔ کلیسا نے بھی ان سرگرمیوں سے جل کر ۱۹۰۱ء میں انھیں اپنے حلقے سے خارج کر دیا۔ ان کی زندگی کے آخری چند برس اپنے اہل خاندان سے شدید اختلاف کی وجہ سے بہت ذہنی پریشانی میں گذرے۔ نومبر ۱۹۱۰ء میں ان کا اپنے گاؤں یسنا پولیانا (Yasna Polyana) میں انتقال ہوا۔ مہاتما گاندھی نے خود اعتراف کیا ہے کہ ان پر ٹالسٹائی کی تحریروں اور فلسفے کا بہت اثر پڑا تھا۔ ٹالسٹائی کی کتاب اعترافات (Confessions) ۱۸۷۹ء میں لکھی گئی تھی۔ تین برس بعد ۱۸۸۲ء میں انھوں نے اس پر نظر ثانی کی اور ۱۸۸۴ء میں یہ پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔
	۱۸	اناطول فرانس۔ یہ ان کا قلمی نام تھا؛ اصلی نام ژاک اناطول تھیبو (Jacques Anatole Thibaut) تھا۔ ۱۶/اپریل ۱۸۴۴ء کو پیرس میں پیدا ہوئے۔ یہ گویا کتابوں میں پیدا ہوئے کیونکہ ان کے والد کتابوں کا کاروبار کرتے تھے۔ انھوں نے روزِ اوّل سے اپنے اردگرد کتابیں ہی دیکھیں اور اس طرح مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ افسانہ، ناول، تاریخ، نقد، انشائیہ، شعر...... غرض ہر صنف ادب سے دلچسپی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں ادب کا عالمی نوبل انعام پایا۔ وہ اپنے زمانے ہی میں علم و ادب کے میدان میں سند تسلیم کر لیے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس میں والٹیر کے بعد ان کے برابر کوئی صاحب کمال مصنف پیدا نہیں ہوا۔ ۱۲۹۶ء میں وہ فرانسیسی اکاڈیمی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۳ (یا ۱۲) اکتوبر ۱۹۲۴ء کو انتقال ہوا، تو ان کا جنازہ قومی سطح پر اٹھایا گیا؛ یہ اعزاز وکٹر ہیوگو کے بعد پہلی مرتبہ انھیں کو نصیب ہوا۔
	۱۹	آندرے ژید۔ ان کے حالات کے لیے دیکھیے حاشیہ ۳۷، خط (۹) (ص ۳۱۷)۔
	۲۰	غزالی۔ ابو حامد محمد بن محمد الطوسی ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں طوس کے مضافات کے ایک دیہات غزالہ میں پیدا ہوئے۔ امام الحرمین جوینی (ف ۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء) کے شاگردوں میں تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد چندے نظام الملک طوسی (ف ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) وزیر ملک شاہ سلجوقی (ف ۴۸۵ھ/۱۰۹۲) کے دربار سے وابستہ رہے اور پھر

صفحہ	شمار	
		انھیں کی وساطت سے ۴۸۴ھ /۱۰۹۱ء میں نظامیہ، بغداد میں مدرسی کا عہدہ پایا، جب کہ ان کی عمر صرف ۲۴ سال کی تھی۔ یہاں وہ تین برس تک رہے اور اس کے بعد سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خانہ بدوش درویش بن گئے۔ یہ حالت کم وبیش ۴۹۹ھ /۱۱۰۵ء تک رہی۔ اس کے بعد انھوں نے نظامیہ، نیشا پور میں مدرسی قبول کر لی لیکن جلد ہی اس سے جی اُچاٹ ہوگیا اور اس سے دست بردار ہو کر اپنے وطن طوس چلے آئے۔ یہیں ۱۴/ رجمادی الثانی ۵۰۵ھ /۱۹ دسمبر ۱۱۱۱ء کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔ متعدد قیمتی تصنیفات ان سے یادگار ہیں جن کی تعداد ۹۹ تک بتائی جاتی ہے۔ ان میں احیاء العلوم الدین، سب سے زیادہ مشہور اور ضخیم ہے۔ اسلام میں ان کے سے وسیع العلم اور صاحب فکر و نظر بہت کم اصحاب پیدا ہوئے ہیں۔
	۲۱	ابن خَلدُون: اس کنیت سے دو بھائی مشہور ہیں، لیکن یہاں صاحب مقدمہ ولی الدین ابوزید عبدالرحمٰن بن محمد مراد ہیں۔ یہ ۷۳۲ھ /۱۳۳۲ء تونس میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد فاس چلے گئے تھے جہاں قاضی مقرر ہوگئے۔ اس کے بعد ممالکِ عربیہ کی سیاحت کرتے رہے۔ اسی دوران میں سلطان مصر برقوق نے انھیں (۸۰۱ھ /۱۳۶۹ء میں) مصر کا قاضی بنا دیا۔ تیمور لنگ کے حملۂ شام میں یہ بھی مصری فوجوں کے ساتھ تھے۔ انھوں نے اپنے وسیع علم اور گوناگوں تجربات کا نچوڑ اپنی تاریخ کے مشہور مقدمے میں شامل کر دیا ہے، اسی کتاب کے آخر میں اپنے حالات بھی لکھے ہیں۔ ۸۰۸ھ /۱۴۰۵ء میں قاہرہ میں انتقال ہوا۔
	۲۲	بابر، ظہیر الدین محمد نام تھا۔ یوم الجمعہ ۶ محرم ۸۸۸ھ /۱۴ فروری ۱۴۸۳ء کو فرغانہ میں پیدا ہوئے اور پیر کے دن ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کو آگرے میں انتقال کیا۔ پہلے آرام باغ، آگرہ میں امانۃً دفن ہوئے؛ اس کے بعد لاش کابل گئی اور وہاں باغ بابر میں دفن ہوئے۔ اب مقبرے کی حالت کچھ اچھی نہیں۔ ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے بانی بابر ہی تھے۔ ان کی خود نوشت سوانحعمری توزک بابری مشہور و معروف کتاب ہے۔
	۲۳	جہانگیر۔ نورالدین محمد جہانگیر۔ اکبر اعظم کے سب سے بڑے بیٹے ۱۴/ ذی القعدہ ۹۱۳ھ /۶ مارچ ۱۵۰۸ء کو پیدا ہوئے۔ اکبر کی وفات پر ۱۶۰۵ء میں تخت پر بیٹھے اور ۲۹ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو کشمیر سے واپس آتے ہوئے راہی ملک عدم ہوئے۔ لاہور کے قریب شاہدرہ میں مدفن ہے۔ ان کی کتاب توزک جہانگیری شائع شدہ موجود ہے۔
	۲۴	ملا عبدالقادر بدایونی۔ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کی نسل میں ملوک شاہ کے بیٹے، ۱۷/ ربیع

صفحہ	شمار	
		الثانی ۹۴۷ھ/۲۱ اگست ۱۵۴۰ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ متعدد علمائے عصر سے تعلیم پائی، جن میں ملا مبارک ناگوری (والد فیضی وابوالفضل) کا نام سب سے نمایاں ہے۔ شروع میں حسین خان حاکم بدایوں کی ملازمت میں رہے اور بالآخر ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء میں جلال خان قورچی کی سفارش پر اکبر کے دربار میں پہنچے۔ یہاں تالیف و ترجمہ کا کام ان کے سپرد ہوا۔ رامائن، مہابھارت، اتھروید اور متعدد اور سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے میں شریک رہے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، قادری تخلص تھا۔ ان کی سب سے مشہور اور مفید کتاب منتخب التواریخ (۳) جلد ہے، جو تاریخ بدایونی بھی کہلاتی ہے۔ اس میں اسلامی عہد کے ہندوستان کے حالات ابتداء سے لے کر اکبر کے زمانے تک قلم بند کیے ہیں۔ اسی میں جستہ جستہ اپنے حالات بھی لکھے ہیں۔ ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء میں انتقال ہوا۔ بدایوں کے باہر جانب شرق عطا پور گاؤں میں مدفن ہے۔ (تذکرۃ الواصلین: ۲۰۷۔۲۲۰؛ دربار اکبری: ۴۷۲۔۵۲۱) مآثر الکرام، ۱: ۳۹۔۴۰؛ خزانہ عامرہ: ۳۲۳۔۳۲۴)
۱۹۴	۲۵	یہ لفظ متن میں نہیں ہے، بلکہ لیکن سیاق وسباق اس کا مقتضی ہے، اس لیے اضافہ کیا گیا ہے۔
	۲۶	پہلے ایڈیشن میں یہاں بھی 'ابجو' تھا۔
	۲۷	فارابی یعنی ابونصر محمد بن محمد بن ترخان الفارابی۔ تقریباً ۸۷۰ء میں فاراب میں پیدا ہوئے۔ نسل کے ترک تھے۔ خراسان اور بغداد میں عمر کا طویل زمانہ بسر کیا؛ اس کے بعد سیف الدولہ بن حمدان حلبی کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ فلاسفۂ اسلام میں ان کا شمار ہوتا ہے اور معلم ثانی کے لقب سے مشہور ہیں۔ عربی کے علاوہ یونانی اور بعض دوسری زبانیں بھی جانتے تھے۔ فلسفے کے موضوع پر بہت سی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ دمشق میں ۹۵۰ء میں انتقال ہوا۔ (اعلام، ۷: ۲۴۲) مزید حالات، وفیات الاعیان، ۲: ۷۶؛ تاریخ حکماء الاسلام: ۳۰؛ البدایہ والنہایہ، ۱۱: ۲۲۴؛ اخبار الحکما: ۱۸۲ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔
	۲۸	ابن رشد۔ ابوالولید محمد بن نصر بن محمد بن رُشد ۱۱۶۲ھ میں قرطبہ (اسپین) میں پیدا ہوئے۔ سلاطین الموحدین کے دربار سے وابستہ تھے۔ فلسفی، ہیئت دان، طبیب، فقیہ کی حیثیت سے بہت کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ انھیں کے مصنفات کے تراجم سے یہ علوم یورپ میں رائج ہوئے۔ ارسطو کی کتاب الحیون کی شرح لکھی تھی۔ پہلے اشبیلیہ میں اور

صفحہ	شمار	
		اس کے بعد قرطبہ میں قاضی رہے۔ قرطبہ ہی میں ۱۱۹۸ء میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔
	۲۹	طبع اول میں یہاں بھی 'ابجو' ہی تھا۔

خط:۱۸

صفحہ	شمار	
۱۹۵	۱	غالب کا مصرع ہے(دیوان غالب:۴۵) پورا شعر ہے: تالیفِ نسخہائے وفا کر رہا تھا میں مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
	۲	یہ شعر بھی غالب ہی کا ہے (کلیاتِ غالب (فارسی):۴۹۱)
	۳	سیّد محمود، کانگریس کے پرانے اور مشہور لیڈر: ۱۸۸۹ء میں غازی پور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم علی گڈھ، لندن اور کیمبرج میں پائی، چندے جرمنی میں بھی رہے۔ مدتوں بہار میں وکالت کی۔ اس کے بعد راجیہ سبھا کے رکن رہے۔ چند کتابیں بھی انگریزی میں لکھی تھیں۔ طویل علالت کے بعد ولنگڈن اسپتال نئی دلّی میں ۲۸ ستمبر ۱۹۷۱ء کو انتقال کیا اور دلّی دروازہ، دلّی کے باہر مشہور قبرستان مہندیان میں سپرد خاک ہوئے۔
		۴۔ ابوالفیض فیضی کا مصرع ہے (شعر العجم، ۳:۶۹؛ کلیات فیضی:۳۳۶) شعر ہے: خاک بیزانِ رہِ فقر بجائے نروند گوہی، ایں طائفہ اینجا گہرے یافتہ اند
	۵	اس کا پہلا مصرع ہے: شربنا واھرقنا علی الارض فضلۃ: یہ شعر متعدد کتابوں میں ملتا ہے مثلاً فیہ مافیہ: ۷۰؛ مکاتیب سنائی: ۴؛ جمہرۃ الامثال، ۲:۱۶۶؛ احیاء علوم الدین، ۴:۱۷ وغیرہ۔ لیکن شاعر کا نام نہیں معلوم ہوسکا۔
۱۹۶	۶	دیوانِ حافظ: ۲۲۲
	۷	امیر مینائی کا مصرع ہے (مراۃ الغیب:۱۹۱) ٹھیک پورا شعر یوں ہے: کہاں تک آئینے میں دیکھ بھال ادھر دیکھو کہ اک نگاہ کے امیدوار ہم بھی ہیں
	۸	دیوانِ غالب: ۲۱۸۔ دوسرے مصرعے میں 'کھنچتا' کی جگہ صحیح 'کھچتا' ہے۔
	۹	نظیری کا مصرع ہے (دیوان نظیری: ۳۲۴) پورا شعر ہے:

صفحہ	شمار	
		بمحشر ہرکس وکارے وہریارے وبازارے من وآہوئے صحرائی کہ دایم می رمید از من
۱۹۷	۱۰	میر تقی میر کا مصرع ہے (کلیات میر، دیوان اول: ۲۰۲) پورا شعر ہے: فقیرانہ آئے، صدا کر چلے کہ میاں! خوش رہو، ہم دعا کر چلے
	۱۱	حافظ کا مصرع ہے (دیوان حافظ: ۳۱۳) مصرع اولیٰ ہے: صوفی! پیالہ پیما، ساقی! قرابہ پُر کن
	۱۲	دیوان غالب: ۲۵۳۔ پورا شعر ہے: ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے
	۱۳	حافظ شیرازی کا مصرع ہے (دیوان حافظ: ۳۲۷) لیکن 'عام' کی جگہ 'عشق' چاہیے۔ پہلا مصرع ہے: شہریست پُر ظریفاں وز ہر طرف نگارے۔
	۱۴	دیوان حافظ: ۲۸۴۔ پہلا مصرع ہے: درحق من لبت ایں لطف کہ می فرماید
۱۹۸	۱۵	دیوان نظیری: ۱۴۸۔ مصرع اولی ہے: زمہر بلہوس گردِ دلت عاشق نمی گردد
	۱۶	کلیات صائب: ۵۰۳
	۱۷	مولانا شبلی نعمانی کی مثنوی صبح امید کا شعر ہے؛ دیکھیے کلیات شبلی (اردو): ۷
	۱۸	سودا کا مصرع ہے (کلیات سودا، ۱: ۲۰۷) مصرع اولیٰ ہے: گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
۱۹۹	۱۹	کلیات مومن، ۲: ۶۳۔ مصرع اول صحیح یوں ہے: محتسب! آپ کے آنے سے ہوئے دیر خراب
	۲۰	دیکھیے اوپر حاشیہ (۱۰) متعلقہ صفحہ ۱۹۱۔ صحیح مصرع 'کہ: میاں! خوش رہو، ہم صدا کر چلے'، ہے۔
	۲۱	غالب کا مصرع ہے، جس کا فعل موقع کی مناسبت سے حال کی جگہ ماضی کر دیا گیا ہے۔ (دیوان غالب: ۲۳۶) پورا شعر ہے:

صفحہ	شمار	
		آمد بہار کی ہے، جو بلبل ہے نغمہ سنج اُڑتی سی اک خبر ہے، زبانی طیور کی
	۲۲	سلمان ساوجی کا مصرع ہے (دیوان:۱) مصرع الٹ گیا ہے۔ پورا شعر ہے: بہارِ عالمِ حسنت دل و جاں تازہ می دارد برنگ اصحابِ صورت را، بہ بوار باب معنی را
	۲۳	ناسخ کا مصرع ہے (دیوان ناسخ دوم: ۱۷۱) لیکن صحیح 'دل کے' کی جگہ 'میرے' ہے پورا شعر ہے: بھول کر، او چاند کے ٹکڑے! اِدھر آجا کبھی میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی
۲۰۰	۲۴	دیوان حافظ: ۱۰۱ متن میں سہو کتابت سے 'کند' کا لفظ ساقط ہو گیا تھا؛ پہلے ایڈیشن میں ٹھیک چھپا تھا۔
	۲۵	دیوان حافظ: ۳۲۸۔ اب اس شعر میں اتنی تبدیلی ہو گئی ہے کہ اسے مولانا کا اپنا ہی کہنا چاہیے۔ حافظ کا شعر یوں تھا: جوہرِ جامِ جم از کانِ جہانے دگرست تو تمنا ز گلِ کوزہ گراں میداری
	۲۶	دیوان حافظ: ۱۴۴
	۲۷	سہو کتابت سے ایک 'متن' ساقط ہو گیا تھا؛ طبع اوّل سے اضافہ کیا گیا۔
	۲۸	کلیاتِ غالب: ۴۹۲
۲۰۱	۲۹	Mess: اصلی معنی تو غالباً 'خوراک' کے تھے، لیکن اب اس جگہ کے لیے بھی کہتے ہیں، جہاں فوجی یا جہازی لوگ اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔
	۳۰	یہ گویا مولانا مرحوم کا اپنا شعر ہے۔
	۳۱	آصف علی دلّی کے مشہور وکیل اور کانگریسی لیڈر؛ یہ بھی اس زمانے میں کانگریس کی مجلس عاملہ کے رکن تھے اور اسی لیے نظر بند کر دیے گئے تھے۔ نظم و نثر دونوں لکھتے تھے۔ ان کا ایک مجموعہ "ارمغانِ آصف" ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔ ایک کتاب "پرچھائیاں" بھی چھپ چکی ہے۔ کچھ مسودات ہنوز غیر مطبوعہ پڑے ہیں۔ آزادی کے بعد ہندوستان کے سفیر ہو کر سوئیٹزر لینڈ بھیجے گئے تھے بعمر ۶۴ سال ۲/ اپریل ۱۹۵۳ء کو بعارضہ قلب وہیں برن میں انتقال ہوا۔ لاش دلّی آئی اور بستی نظام الدین (ویسٹ) میں سپرد خاک ہوئی۔

صفحہ	شمار	
	۳۲	مولانا مرحوم یہ لفظ ہمیشہ 'ڈ' سے یعنی ڈسمبر لکھتے تھے؛ چنانچہ طبع اول میں ڈسمبر ہی چھپا تھا۔ طبع ثالث (یعنی متن) میں دسمبر (دال کے ساتھ) چھپا ہے؛ یہ غالبًا کاتب کا تصرف ہے، اسی لیے یہاں 'ڈ' سے لکھا جا رہا ہے اور سب جگہ بھی 'ڈسمبر' بنا دیا گیا ہے۔
۲۰۲	۳۳	دیوان حافظ: ۱۵۴۔۱۵۵
	۳۴	نورالدین ترخان کا شعر ہے (روز روشن: ۱۳۰) تذکرے کی روایت کے مطابق مصرع اولیٰ میں 'وصلش' کی جگہ 'وصلت' اور مصرع ثانی میں 'شکستہ' کی جگہ 'کشیدہ' ہونا چاہیے۔
	۳۵	کلیم کاشانی کا شعر ہے (دیوان کلیم: ۱۴۵)
	۳۶	کلیات آتش: ۲۹۹
۲۰۳	۳۷	دیوان غالب: ۵۰ پہلا مصرع ہے: رنگ شکستہ، صبحِ بہار نظارہ ہے
	۳۸	اکبر الہ آبادی کا مصرع ہے (کلیات، ۳: ۳۵۲) پورا شعر ہے: بہت رہا ہے کبھی لطفِ یار ہم پر بھی گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی
	۳۹	صائب تبریزی کا مصرع ہے (کلیات: ۱۷) پورا شعر ہے: دلم بپاکیِ دامانِ غنچہ می لرزد کہ بلبلاں ہمہ مستند و باغباں تنہا
	۴۰	میر رضی دانش مشہدی کا شعر ہے (شعر العجم ۲: ۱۶۸)
۲۰۴	۴۱	حضرت امیر خسرو کا شعر ہے (ایضاً)
	۴۲	یہ مصرع خواجہ الطاف حسین حالی کا ہے (دیوان حالی: ۱۱۰؛ کلیات نظم حالی، ۱: ۱۵۴) مطلع ہے: اہلِ معنی کو، ہے لازم سخن آرائی بھی بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں، تماشائی بھی مرحوم نے موقع کی مناسبت سے فعل کو ماضی کر لیا ہے۔
۲۰۵	۴۳	ظہوری ترشیزی کا شعر ہے (دیوان ملا نورالدین ظہوری: ۱۱۳) دیوان میں پوری غزل 'ماندست' چھپی ہے (بغیر ہائے ہوز)
	۴۴	کلیم کاشانی کا شعر ہے، دیکھیے، دیوان کلیم: ۲۶۸
	۴۵	دیکھیے، سرو آزاد: ۱۴۷

صفحہ	شمار	
	۴۶	دیوان کلیم: ۱۴۰۔ مطبوعہ دیوان میں 'روپس' کی جگہ 'رویش' ملتا ہے۔ دونوں ٹھیک ہو سکتے ہیں۔
۲۰۶	۴۷	سب اشاعتوں میں یہاں لفظ 'پیار' ملتا ہے؛ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ سیاق سے ظاہر ہے کہ ٹھیک 'پیالہ' ہوگا۔
	۴۸	دیوان غالب: ۱۶۰۔ مصرع اولیٰ ہے: بے عشرت کی خواہش، ساقیِ گردوں سے کیا کیجیے
	۴۹	ایضاً: ۱۶۲۔ پہلا مصرع ہے: ہماری سادگی تھی، التفاتِ ناز پر مرنا
	۵۰	طبع اول میں 'سرخ مرچ' تھا؛ بعد کو 'سرخ' حذف کر دیا۔
	۵۱	یہ ضرب المثل مصرع میرزا عبدالقادر بیدل کا ہے (کلیات، ۱: ۳۷۵)۔ پورا شعر ہے: عنقا سرو برگیم، مپرس از فقرا ہیچ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ
۲۰۷	۵۲	دیوان حافظ: ۱۶۶۔ صحیح 'بار' کی جگہ 'بارہ' ہے۔
	۵۳	دیوان حافظ: ۱۳۴۔ مطبوعہ نسخے میں مصرع ثانی میں 'ز بلبل' کے بجائے 'بہ بلبل' ہے؛ اور 'کے' کی جگہ 'کہ'؛ اور یہی درست ہے۔
	۵۴	دیوان حافظ: ۱۱۰
۲۰۸	۵۵	ایضاً: ۱۱۲۔ دوسرے مصرع میں 'درآں' کی جگہ ٹھیک 'برآں' ہے
	۵۶	ایضاً: ۳۳۸
	۵۷	ایضاً: ۱۳۷
	۵۸	یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ جہانگیر نے اپنی توزک میں کوئل سے متعلق بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں (توزک جہانگیری: ۲۲۶)۔
۲۰۹	۵۹	دیوان حافظ: ۳۱۸۔ البتہ کچھ خفیف لفظی تغیر ہو گیا ہے۔ پہلے شعر کے مصرع اولیٰ میں 'بشاخ' کی بجائے 'زشاخ' صحیح ہے۔ دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں 'تحقیق' کی جگہ 'توحید' ہونا چاہیے۔
۲۱۰	۶۰	ایضاً: ۱۴۶۔ مطبوعہ نسخے میں پہلے شعر کے مصرع ثانی میں 'نائے ونوش' کی جگہ 'نازونوش' ملتا ہے؛ یہ سہو کتابت ہوگا۔
	۶۱	

صفحہ	شمار	
		متن میں سہو کتابت سے 'یہ' چھپا تھا، طبع اول سے تصحیح کی گئی۔
	۶۲	
	۶۳	دیوان حافظ: ۲۳۶
۲۱۱	۶۴	فیضی کا شعر ہے، دیکھیے شعر العجم ۳: ۳۹ (بعض جگہ دوسرے مصرے میں 'بخطہ' کی جگہ 'بعرصۂ' بھی ملتا ہے) پہلے مصرع میں 'می کھد' کی جگہ ٹھیک 'می کند' ہے۔
		ان میں تیسرا اور چوتھا شعر کامل مبرد (ص ۵۰۴) اور کتاب الحیوان (۳: ۲۰۶) میں نصیب بن رباح سے اور الشریشی کی شرح مقامات (۱: ۱۴) میں عدی بن الرقاع کی طرف منسوب ہیں۔ گمان غالب ہے کہ چاروں شعر عدی بن الرقاع کے ہیں۔

خط: ۱۹

صفحہ	شمار	
۲۱۲	۱	امیر مینائی کا شعر ہے (صنم خانہ عشق: ۳۳۴)
	۲	یہ فردوسی طوسی کا مصرع ہے؛ شاہنامے میں داستانِ سہراب کا مطلع ہے: کنوں رزمِ سہراب و رستم شنو دگرہا شنیدستی، ایں ہم شنو
	۳	بالی گنج کا ذکر اس لیے کیا کہ اس علاقے میں مولانا مرحوم کا سکونتی مکان تھا؛ 'نمبر ۱۹؍ اے، بالی گنج، سرکلر روڈ، کلکتہ' پتا تھا۔
	۴	دیوان غالب: ۱۷۷
۲۱۳	۵	Table: میز
	۶	Jug: آفتابہ
	۷	ارشمیدش۔ سرقوس (صقلیہ) کا رہنے والا مشہور ریاضی دان، اس کی ایجادات شہرۂ آفاق ہیں۔ اس نے شیشے کی ایک ایسی مشین ایجاد کی تھی جس سے اجرام فلکی کی نقل و حرکت ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جاتی تھی۔ سونے میں کھوٹ معلوم کرنے کا طریقہ بھی اس نے بتایا۔ اس کا یہ قول بہت معروف ہے کہ 'مجھے کھڑا ہونے کی جگہ مل جائے، تو میں زمین کو ہلا کے رکھ دوں'۔ اس کی موت ۲۱۲ ق، م میں رومنوں کے سرقوس پر حملے کے دوران میں ہوئی۔
۲۱۴	۸	اس مصرع سے متعلق مشہور ہے کہ یہ فردوسی کے شاہنامے کا ہے، لیکن ولور (Vellur) ایڈیشن میں لکھا ہے کہ یہ شعر ہی سرے سے الحاقی ہے۔ اس کے لفظ ہیں: ایں بیت بدونِ شک الحاقی است (۲: ۶۸۲) پہلے مصرع کی روایت میں بھی اختلاف ہے۔ ولور

صفحہ	شمار	
		کے حواشی میں ہے: چو فرد ابر آید بلند آفتاب۔ دہخدا کے ہاں ہے: نجومیم برایں ینہ آرام وخواب (امثال وحکم ۴:۷۵۱) عام طور پر پیش مصرع یوں ملتا ہے: وگرنہ بامِ من آید جواب (تذکرۃ الشعرا دولت شاہ سمرقندی: ۶۱) چہار مقالہ: ۱۵۷
	۹	دیوان حافظ: ۱۹۲
	۱۰	شاہنامہ، ۱: ۲۸۔ ردیف کنیم چاہیے۔
	۱۱	شاہنامے کے اس مقام کا شعر ہے، جب سکندر قیدانہ اندلس کے دربار میں جاتا ہے۔
۲۱۵	۱۲	یہ شعر غلط طور پر میر کے نام سے مشہور ہو گیا ہے اور پہلے مصرع کے کچھ لفظ بھی بدل گئے ہیں۔ یہ شعر دراصل نواب محمد یار خاں امیر کا ہے (طبقات الشعراء شوق) اور پہلا مصرع یوں ہے: شکست و فتح میاں اتفاق ہے، لیکن
	۱۳	اصلی متن میں سہو کتابت کے نتیجے میں یہاں 'سارہ' چھپا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں ٹھیک 'سارا' ہی ہے۔
	۱۴	طبع اول میں چھپا تھا: حادثہ پیش ہی نہیں آیا۔
۲۱۶	۱۵	معلوم نہیں ہو سکا کہ کس کا شعر ہے، لیکن اس کا پہلا مصرع ہے: خمیرِ مایۂ دکانِ شیشہ گر سنگست' (بہترین اشعار: ۹۰۸)
	۱۶	سعدی شیرازی کا مصرع ہے (کلیات سعدی: ۴۷۳) پورا شعر ہے: بخشم رفتۂ ، مارا کہ می برد پیغام بیا کہ ماسپر انداختیم ، اگر جنگ است
۲۱۷	۱۷	خواجہ فرید الدین عطار کا مصرع ہے؛ دیکھیے: منطق الطیر: ۹۴۔ پورا شعر ہے: خرقہ را زُنّار کردہ است و کند عشق ازیں بسیار کردہ است و کند بعض جگہ 'خرقہ باز نار' بھی ملتا ہے؛ 'خرقہ را زنار' بہتر ہے۔
	۱۸	کلیاتِ عرفی (اضافات): ۲۹۔ مطبوعہ نسخے میں 'قادم' کی جگہ 'کشایم' ملتا ہے۔
	۱۹	دیوان نظیری: ۳۹۰۔ بعض نسخوں میں 'خور وجنت' کی جگہ 'خور رحمت' اور مصرع ثانی کے آخری ٹکڑے کی جگہ 'در شور آورد دیوانہ را' ملتا ہے۔
	۲۰	دیوانِ وحشی بافقی: ۳۶
۲۱۸	۲۱	دیوان نظیری: ۶۶

صفحہ	شمار	
	٢٢	دیوان ملا نورالدین ظہوری: ٦٨
	٢٣	شرف جہاں قزوینی کا شعر ہے (خزانۂ عامرہ: ٢٦؛ نیز شعرالعجم ٣: ١٨) دونوں جگہ مصرع ثانی میں 'ما' کی جگہ 'من' ہے؛ اور یہی ٹھیک ہے۔
٢١٩	٢٤	میرزا عبدالقادر بیدل کا شعر ہے (کلیات بیدل، ١: ١٢)
	٢٥	کلیات غالب: ٣٦٣
	٢٦	خواجہ حافظ کا مصرع ہے (دیوان حافظ: ١٤٤) مصرع اولیٰ ہے: شراب و عیش نہاں چیست ، کار بے بنیاد
	٢٧	پورا شعر ہے: تا سرنہم، پا نکشم از سرِ کویش نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد معلوم نہیں کس کا شعر ہے۔
	٢٨	سید علی محمد شاد عظیم آبادی کا شعر ہے (میخانۂ الہام: ٣٧٧؛ کلیات شاد، ٢: ١٨٤) مصرع ثانی کی ایک روایت یہ بھی ہے: جو خود بڑھ کر
٢٢٠	٢٩	داغ دہلوی کا مصرع ہے (آفتاب داغ: ٤٤) مطلع ہے: راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں
	٣٠	متن میں نام 'عالیہ' چھپا ہے؛ ٹھیک 'عُلَیّہ' ہے، اس لیے اصلاح کر دی گئی۔ یہ شعر عُلَیّہ کے نام سے الاغانی (١٠: ١٧٦) میں ملتا ہے۔
٢٢١	٣١	متنبی کا شعر ہے (دیوان ابی الطیب المتنبی: ٣٢١)
	٣٢	شیخ شیرازی کا شعر ہے (کلیات سعدی: ٦١٤)
	٣٣	متن میں 'میرے بغل' چھپا تھا، طبع اول میں بھی اسی طرح تھا۔ یہ یقیناً سہوِ کتابت ہے، کیونکہ 'بغل' بالاتفاق مؤنث ہے، اس لیے متن میں اصلاح کر دی گئی ہے۔ مثلاً اسیر کا شعر ہے: لحد میں سوئے حسینوں کی لے کے تصویریں پری وشوں سے نہ خالی بغل زمیں میں رہی
٢٢٢	٣٤	دیوان وحشی بافقی: ٢٥
	٣٥	دیوان نظیری نیشاپوری: ٢٦۔ صحیح مصرع اول میں 'وفا' کی جگہ 'ادب' ہے۔

صفحہ	شمار	
		خط: ۲۰
۲۲۳	۱	منطق الطیر، حضرت خواجہ فرید الدین عطارؔ کی مشہور کتاب ہے، جس میں پرندوں کی زبان سے حکمت والٰہیات کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔
۲۲۴	۲	کلیاتِ مومنؔ، ۱: ۳۸۴۔ مصرع اول صحیح یوں ہے جولاں سے ہے اس کو قصدِ پامال
	۳	دیکھیے، منتخب التواریخ، ۳: ۱۸۰
	۴	کلیاتِ سودا، دیوان اول: ۱۰۲
	۵	گلستان (باب اوّل) کا شعر ہے (کلیاتِ سعدی: ۲۵) مطبوعہ نسخے میں 'نازت' کی جگہ 'بارت' ہے؛ اور غالباً یہی درست بھی ہوگا۔
۲۲۵	۶	دیوان وحشی بافقی: ۵۸۔ مصرع ثانی میں صحیح 'نہ شد' کی جگہ 'نہ بود' ہے۔
	۷	حافظ شیرازی کا مصرع ہے (دیوان حافظ: ۲۸) پورا شعر ہے بزیرِ دلق ملمع کمند ہا دارند دراز دستی ایں کوتہ آستیناں بیں
۲۲۶	۸	انگریزی مِس (Miss) اور فرانسیسی ماڈموازیل (Mademoiselle) کے ایک ہی معنی ہیں یعنی دوشیزہ۔
	۹	مادام (Madame) فرانسیسی، میڈم (Madam)، (انگریزی)، میم (اردو): شادی شدہ عورت۔ خاتون
	۱۰	عرفیؔ کا مصرع ہے (کلیاتِ عرفی: ۲۸۹)۔ پہلا مصرع ہے: گو ادب چشم مراباز مپوش از رُخِ دوست
	۱۱	دیوان وحشی بافقی: ۳۷
	۱۲	زکی ہمدانیؔ کا شعر ہے، دیکھیے خریطۂ جواہر: ۱۱۲
	۱۳	حسن سجزی دہلوی کا مصرع ہے (دیوان حسن سجزی دہلوی: ۳۵۲) پورا شعر ہے: از حسن ایں چہ سوالست کہ معشوقِ تو کیست؟ ایں سخن راچہ جوابست، تو ہم میدانی !
۲۲۷	۱۴	کلیاتِ صائبؔ میں یہ شعر نہیں ملا۔ البتہ خریطۂ جواہر: ۱۳۸؛ شمع انجمن: ۲۷۳ میں یہ فصیحی ہروی سے منسوب ہے۔ مولانا مرحوم کو سہو ہوا۔ شمع انجمن میں مصرع اول میں 'زدم' کی

صفحہ	شمار	
		جگہ 'زدیم' ہے۔
	۱۵	کلیات غالب: ۲/ ۳۷۲
	۱۶	طبع اول: دہنے
	۱۷	دیوان قاآنی: ۳۲۲
۲۲۸	۱۸	گلستان کے دیباچے کا مصرع ہے (کلیات سعدی: ۲) پورا قطعہ ہے: اے مرغِ سحر! عشق ز پروانہ بیاموز کاں سوختہ راجاں شدو آواز نیامد ایں مدّعیاں در طلبش بیخبر انند کانرا کہ خبر شد، خبرے باز نیامد
	۱۹	اقبال کا شعر ہے (زبور عجم: ۱۰۱) سید مقبول حسین وصل بلگرامی نے اقبال سے درخواست کی تھی کہ مرقع (وصل کا ماہانہ رسالہ) کے سر ورق پر چھاپنے کے لیے کوئی شعر عنایت فرمایئے۔ اس پر اقبال نے انھیں یہ شعر لکھ بھیجا تھا؛ چنانچہ تین برس تک یہ مرقع کے سرلوح چھپتا رہا۔
	۲۰	ظہوری ترشیزی کا شعر ہے (دیوان: ۴۷)
	۲۱	حافظ شیرازی کا مصرع ہے (دیوان حافظ: ۱۱۲) پہلا مصرع ہے: رسم عاشق کشی و شیوۂ شہر آشوبی
۲۲۹	۲۲	قرآن، سورۃ النساء ۴: ۴۳ (اگر تمھیں وضو کے لیے پانی میسر نہ آئے) تو پاک مٹی ہی سے یہ قصد کرو۔
	۲۳	غالب کا مصرع ہے (دیوان غالب: ۱۳۹) پہلا مصرع ہے: اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!
	۲۴	استاد ذوق کا مصرع ہے (دیوان ذوق (مرتبۂ آزاد: ۲۳۹) مطلع ہے: زباں پیدا کروں جوں آسیا، سینہ میں پیکاں سے دہن کا ذکر کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے
	۲۵	یہ عنوان ہے گلستان کے باب ہفتم کی آخری حکایت کا (کلیات سعدی: ۱۱۷)۔
	۲۶	پورا قطعہ کلیات سعدی (۱۲۱) میں موجود ہے: او در من و من درو فتادہ خلق از پے مادوان و خنداں انگشتِ تعجّب جہانے از گفت و شنیدِ ما بدنداں

صفحہ	شمار	
	۲۷	بتغیر الفاظ داغ کا مصرع ہے (یادگار داغ:۱۱۲) پورا شعر ہے: ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے دل کو تھاما، ان کا دامن تھام کے
۲۳۰	۲۸	آصفی ہروی کا مصرع ہے (امثال وحکم:۲:۸۶۸) پورا شعر ہے: نریخت دُردِ مے و محتسب زدیر گذشت رسیدہ بود بلائے ، ولے بخیر گذشت
	۲۹	دیوان نظیری: ۲۹۳
۲۳۲	۳۰	دیوان کلیم: ۲۴۱
	۳۱	دیوان حافظ: ۳۴۱
	۳۲	علی قلی بیگ انیسی شاملو کا شعر ہے (شمع انجمن:۲۶)
۲۳۳	۳۳	دیوان حافظ: ۳۷

خط:۲۱

صفحہ	شمار	
۲۳۴	۱	شریف تبریزی کا شعر ہے (شمع انجمن : ۲۱۶) مولانا نے حسبِ ضرورت دونوں مصرعوں میں تصرّف کرلیا ہے؛ تذکرے میں شعر یوں ہے: آنچہ دل را بیمِ آں می سوخت دردِ ہجر بود آخر از ناسازیِ جاناں بآں ہم ساختم خریطۂ جواہر میں شاعر کا تخلص شریفی لکھا ہے (ص ۱۱۸) اور مصرع ثانی میں 'جاناں' کی جگہ 'گردوں' ہی ہے، جو مولانا کی روایت ہے۔
	۲	کلیم کاشانی کا شعر ہے (دیوان:۱۰) ٹھیک شعر یوں ہے: دماغ برفلک و دل بزیرِ پائے بتاں زمن چہ می طلبی ، دل کجا، دماغ کجا!
۲۳۵	۳	فیضی کا مصرع ہے (شعرالعجم،۳:۷۰)۔ پورا شعر ہے: کس نمی گویدم از منزلِ اوّل خبرے صد بیاباں بگذشت و دگرے درپیش است بعض جگہ مصرعِ اوّل میں 'اوّل' کی جگہ 'آخر' بھی چھپا ملتا ہے۔

صفحہ	شمار	
	۴	مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی بیگم کا اسمِ گرامی۔
۲۳۶	۵	صبری اصفہانی کا مصرع ہے (بہترین اشعار: ۲۹۴) پورا شعر ہے: ازما مپرس حالِ دل ما کہ یک زماں خودرا بحیلہ پیشِ تو خاموش کردہ ایم
۲۳۸	۶	شیخ علی حزیںؔ کا شعر ہے (کلیات حزیں: ۳۴۷) کلیات میں مصرع ثانی میں 'پشیمنہ' کی جگہ 'صد پارہ' ہے؛ اور یہی درست ہے کیونکہ قافیہ 'نظارہ' 'خارہ' وغیرہ ہے۔
۲۴۰	۷	پورا شعر پہلے گذر چکا ہے (ص ۴۳): نہ داغ تازہ می کارد ، نہ زخم کہنہ می خارد مدہ یارب ! دلے کیں صورتِ بیجاں نمی خواہم
	۸	یہ اوس بن حجر کے اس مرثیے کا مصرع ہے جو اس نے فضالہ بن کلدہ کی موت پر لکھا تھا: (دیوان اوس بن حجر: رقم ۲۰؛ نیز الحماسۃ البصریہ، ۱: ۲۵۴) ٹھیک شعر یوں ہے: ایتھا النفس اجملی جزعا إن ما تحذرین قد وقعا
	۹	'غبار خاطر' کی تمام اشاعتوں میں یہاں 'چھبیں' چھپا ملتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ یہاں 'چھتیس' چاہیے۔ چنانچہ متن میں درستی کر دی گئی ہے۔ یہ یقیناً پہلے کاتب کی غلطی تھی جو بعد کی اشاعتوں میں نقل ہوتی رہی۔
	۱۰	فیضی کا شعر ہے (شعر العجم، ۳: ۶۹)
	۱۱	متمم بن نویرہ کے حالات کے لیے دیکھیے: الاغانی، ۱۴: ۶۳؛ الشعر والشعراء؛ ۲۹۶؛ الاصابہ: ۷۶۹۰، ۱۱، ۷۷۔
۲۴۱	۱۲	یہ شعر ان کتابوں میں ملتے ہیں: الحماسۃ البصریۃ ۱: ۲۱۰؛ الحماسۃ للبحتری: ۲۸۵؛ الحماسہ لابی تمام ۲: ۱۴۸؛ العقد الفرید، ۲: ۱۷۱؛ نہایۃ الارب ۵: ۱۷۷، اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ التبریزی نے لکھا ہے کہ یہ قطعہ متمم بن نویرہ کا نہیں' بلکہ ابن حزل الطعان کا ہے۔
	۱۳	کلیات سودا، دیوان اول : ۱۲۱

خط: ۲۲

صفحہ	شمار	
۲۴۲	۱	دیوان حافظ: ۱۱۱۔ اصلی نسخے میں 'قاصدے' کی جگہ 'محرمے' ہے۔
	۲	یہ حکیم محمد سمیع ذرہ لکھنوی عرف میرزا بچو خلف محمد شفیع اکبر آبادی کی رباعی ہے، جو لکھنؤ میں شجاع الدولہ کی سرکار میں ملازم اور شمس الدین فقیر کے شاگرد تھے۔ (سفینۂ ہندی: ۷۹۔۸۰) شمع انجمن: ۱۶۰۔۱۶۱) اس رباعی کا انتساب سرمد یا کسی اور کی طرف درست نہیں۔ روز روشن (ص ۲۱۱) میں یہ رباعی محمد اکبر خان دانا دہلوی کے نام سے درج ہے؛ یہ بھی غلط ہے۔ یہاں متن 'سفینۂ ہندی' کے مطابق ہے؛ شمع انجمن میں پہلے مصرعے میں 'گرما' اور دوسرے میں 'سرما' ہے؛ اور تیسرے مصرع میں تمام 'سرد و گرم' کی جگہ 'ہزار گرم و سرد' ہے۔
	۳	Warder: قید خانے کا داروغہ
۲۴۳	۴	کلیم کاشانی کا شعر ہے (دیوان کلیم: ۲۶۸)
	۵	یہ بھی کلیم کاشانی کا شعر ہے (دیوان: ۱۲۵)
	۶	دیوان غالب: ۱۷۰
۲۴۴	۷	حاجی محمد جان قدسی کا شعر ہے (دیکھیے، کلمات الشعرا: ۹۲)
	۸	پورا شعر ہے: نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی بگڑنے میں بھی زلف اُس کی بنا کی لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ہے کس کا!
	۹	طبع اول: سر سے پا تک
	۱۰	کلیات عرفی: ۳۷۷
۲۴۵	۱۱	میر غالب علی خان سیّد کا شعر ہے (دیکھیے، گلشن بیخار: ۱۰۶)
	۱۲	ملا نور محمد انوری لاہوری کا شعر ہے (میخانہ: ۵۶۳؛ روز روشن: ۸۰) پہلے مصرع میں تفاوت ہے؛ صحیح یوں ہے: دریں حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش ست
	۱۳	قرآن، سورۃ الرعد ۱۳ : ۱۷

صفحہ	شمار	
		خط: ۲۳
۲۴۶	۱	ابوالعلاء المعرّی کا قطعہ ہے (دیکھیے، شروح سقط الزند: ۲: ۱: ۳۵۰)
۲۴۷	۲	مصحفی کا مصرع ہے (جواہر سخن (۲): ۶۴۹) پورا شعر ٹھیک یوں ہے: سراغ قافلۂ اشک لیجیے کیونکر نکل گیا ہے وہ کوسوں دیار حرماں سے اس سلسلے میں دیکھیے خط (۲) حاشیہ (۱)
	۳	دیوان کلیم: ۱۴۔ پہلے شعر کا مصرع ثانی یوں ہے: گویم کلیم ! باتو کہ آنہم چساں گذشت دوسرے شعر میں 'زین و آں' کی جگہ 'از جہاں' ہے
	۴	سورۃ النازعات ۷۹ : ۴۶
	۵	غزالی مشہدی کا شعر ہے (منتخب التواریخ، ۳: ۱۷۱؛ نیز طبقات اکبری، ۲: ۴۸۴؛ آئینِ اکبری (ص ۱۹۶) میں مصرع یوں ہے: شورے شدہ، از خواب عدم چشم کشودیم بدایونی نے مصرع اولیٰ میں 'چشم' کی جگہ 'دیدہ' لکھا ہے اور یہی بہتر ہے۔
	۶	کلیات بیدلؔ (۱) : ۶۱۰
۲۴۸		**خط: ۲۴**
۲۴۹	۱	دیوان حافظؔ : ۲۰۷
	۲	دیوان غالبؔ: ۸۰
	۳	مندل سون سے فیلکس مندل سون مراد ہیں۔ مشہور جرمن نغمہ نگار اور موسیقار ہیں؛ ۳ فروری ۱۸۰۹ء کو جرمنی کے شہر ہیمبرگ میں پیدا ہوئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ مشہور یہودی فلسفی اور یہودیت کے مفسر اور شارح پنج اسفار موسیٰ اور زبور کے مترجم موسیٰ مندل سون کے پوتے تھے، جنھیں وفات (۴ جنوری ۱۷۸۶ء) پر 'جرمنی' کا سقراط' کہا گیا تھا۔ فیلکس اپنے زمانے کے مشہور ترین نغمہ نگاروں میں سے تھے۔ انھوں نے بارہ برس کی عمر میں اپنا پہلا نغمہ لکھا اور وفات پر تقریباً دو ہزار نغمے اپنی یادگار چھوڑے۔ ۴ نومبر ۱۸۴۷ء کو جرمنی کے شہر لائپزگ میں انتقال ہوا۔

صفحہ	شمار	
۲۵۰	۴	دیوان حافظ : ۱۰۲
	۵	ایضاً : ۱۱۰
	۶	مولانا شبلی نعمانی کا شعر ہے (کلیات : ۹۸) ٹھیک یوں ہے: یا جگر کاوئی آ نشترِ مژگاں کم شد یا کہ خود زخم مرالذتِ آزار نماند
	۷	مشہور عالمگیری امیر، اصلی نام فقیر اللہ ہی تھا، سیف خاں لقب تھا۔ سنسکرت کی فن موسیقی کی مشہور کتاب ''مانک سوہل'' کا ترجمہ ''راگ درپن'' کے نام سے کیا اور اس پر اپنی طرف سے اضافے کیے۔ (مآثر الامرا،۲: ۴۷۹)
	۸	آصف جاہ سے میر قمر الدین نظام الملک آصف جاہ اول بانی سلطنت آصفیہ حیدر آباد (دکن) مراد ہیں۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے ملتا ہے۔ سب سے پہلے ان کے دادا میر عابد خان بعہد شاہجہان ہندوستان آئے؛ ان کا انتقال ۱۰۹۸ھ میں ہوا تھا۔ ان کے بیٹے میر شہاب الدین نے بہت عروج پایا۔ ہفت ہزاری، ہفت ہزار سوار منصب اور غازی الدین خان فیروز جنگ خطاب عطا ہوا۔ آصف جاہ ۱۴ر ربیع الثانی ۱۰۸۲ھ/۱۱ر اگست ۱۶۷۱ء کو پیدا ہوئے اور ۴ر جمادی الثانی ۱۱۶۱ھ/۲۱ر مئی ۱۷۴۸ء کو برہان پور میں انتقال ہوا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے 'متوجہ بہشت' سے تاریخ نکالی۔ طبع موزوں تھی، شعر کہتے تھے اور آصف تخلص کرتے تھے۔ (سروِ آزاد: ۱۷۳۔۱۸۴)؛ انگریزی میں ان کے حالات میں ڈاکٹر یوسف حسین خان کی تصنیف کردہ مفصل کتاب The First Nizam (نظام اوّل) ہے۔ اس کے آخر میں کتابیات کے تحت تمام اہم مآخذ کا ذکر ملتا ہے۔
	۹	ناصر جنگ شہید کا اصلی نام میر احمد خان تھا۔ یہ نظام اول کے دوسرے بیٹے تھے؛ نظام الدولہ ناصر جنگ خطاب تھا۔ صاحب علم و فضل، عامل زہد و ورع، رعایا پرور اور داد گستر تھے۔ شعر میں بہت خوش فکر تھے؛ آفتاب تخلص تھا۔ میر غلام علی آزاد انھیں کے مصاحب تھے۔ کرناٹک کے افغانوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے ۱۷ر محرم ۱۱۶۴ھ/۵ر دسمبر ۱۷۵۰ء کو رہ گرائے عالم فانی ہوئے؛ 'آفتاب رفت' تاریخ ہوئی۔ (سروِ آزاد: ۱۸۴۔۱۹۶)
	۱۰	ڈینی سن راس؛ پورا نام ایڈورڈ ڈینی سن راس تھا؛ ۱۹۱۸ء میں سر کا خطاب ملا، تو سر ایڈورڈ ڈینی سن ہو گئے۔ ۶ر جنوری ۱۸۷۱ء کو انگلستان کے شہر سٹنی میں پیدا ہوئے۔ طالب علم تو

صفحہ	شمار	
		معمولی قسم کے رہے، لیکن انھیں زبانوں سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ معلوم نہیں مشرق و مغرب کی کتنی زبانیں جانتے تھے، اور ان میں بات چیت کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی عمر میں سفر بھی بہت ملکوں کا کیا۔ وہ لندن یونیورسٹی میں فارسی پڑھاتے تھے کہ ۱۹۰۱ میں لارڈ کرزن وائسرائے کی سفارش پر مدرسہ عالیہ، کلکتہ کے پرنسپل ہو کر یہاں آگئے۔ اس عہدے پر وہ ۱۹۱۱ء تک فائز رہے۔ اسی دوران میں چندے مرکزی حکومت ہند کے دفتر خانے کے مہتمم اور محکمۂ تعلیم کے نائب سکتر بھی رہے۔ ۱۹۱۴ء میں وہ برٹش میوزیم، لندن میں ان مخطوطات کو مرتب کرنے پر مقرر ہوئے جو سر آرل اسٹین (ف ۱۹۴۳ء) وسطی ایشیا سے دریافت کر کے لائے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں جب دوسری عالمی جنگ چھڑی تو راس استانبول کے برطانوی سفارت خانے میں تجارتی مشیر مقرر کیے گئے تھے۔ مختصر علالت کے بعد یہیں ۲۰ ستمبر ۱۹۴۰ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی خودنوشت سوانح عمری Both Ends of the Candle ان کی وفات کے بعد ۱۹۴۳ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ راس کے متعدد علمی کارنامے شائع ہو چکے ہیں۔ مکّی کی تاریخ گجرات (ظفر الوالہ) انھیں نے ۲۵ برس کی طویل مدّت میں تیار کر کے تین جلدوں میں شائع کی تھی۔ بابر او رہیرم خاں خانخاں اں کے دیوان بھی شائع کیے تھے اور بھی کئی کتابیں اور مقالے ان سے یادگار ہیں۔
۲۵۱	۱۱	دیوان غالب: ۱۵۹۔ پہلا مصرع ہے: سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوّری
۲۵۲	۱۲	دیوان ذوق (مرتبہ آزاد): ۱۸۷۔ ویران کے نسخے میں بھی اسی طرح ہے (ص ۱۰۹)۔
	۱۳	دیوان حافظ: ۱۸۷-۶۲ متن میں 'زحاجب' چھپا ہے، جو ظاہرا کاتب کا سہو تھا؛ اس لیے اس کی اصلاح کر دی گئی ہے۔
	۱۴	پیر چنگی کی حکایت مثنوی مولانا روم کے دفتر اول میں ہے (ص ۵۰ تا ۵۶)
۲۵۳	۱۵	مثنوی دفتر اول: ۵۶۔ مثنوی میں پہلا مصرع یوں چھپا ملتا ہے: پیر چنگی کے بود خاصِ خدا
	۱۶	ہدیہ اسلامی فقہ میں اور مشکوٰۃ حدیث میں مشہور کتابیں ہیں۔
	۱۷	دیوان حافظ: ۱۵۶
۲۵۴	۱۸	دیکھیے: ص ۲۳۹، حاشیہ ۶

صفحہ	شمار	
	۱۹	کلیات میر (دیوان اوّل): ۴۹ پہلا مصرع ہے: دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
	۲۰	سید علی محمد شاد عظیم آبادی کا مصرع ہے (کلام شاد: ۱۳۹) پورا شعر ہے: کہیں نہ جائیں گے تا حشر تیرے کوچے سے کہ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند ترے مصرع اولیٰ کی دوسری روایت یہ ہے: کہیں نہ جائیں گے اُٹھ کر بجز دیارِ عدم: (کلیاتِ شاد، ۲: ۲۱۴)
	۲۱	متن میں یہ لفظ بھنورے لکھا تھا۔
	۲۲	کلیات نظیر اکبر آبادی: ۲۷۰
	۲۳	دیوان غالب: ۴۵
۲۵۵	۲۴	کلیاتِ عرفی: ۳۸۶
	۲۵	دیوان نظیری: ۲۰۷۔ دراصل نوشتہ اند کی جگہ 'نوشتہ ایم'، اور 'بیاض' کی جگہ 'علاج' ہے۔
	۲۶	میرزا محمد ہادی رُسوا لکھنوی کا شعر ہے، (جن کا تخلص پہلے مرزا تھا) دیکھیے امراؤ جان ادا: ۳۸۲۔
	۲۷	جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے (خط ۷، حاشیہ ۱۰) 'پہر' مذکر ہے، اس لیے یہ فقرہ یوں ہونا چاہیے تھا: جب رات کا پچھلا پہر شروع ہونے کو ہوتا، تو...... الخ۔
۲۵۶	۲۸	دیوان حافظ: ۲۳۳
	۲۹	کلیات غالب: ۳۳۹
	۳۰	دیوان نظیری: ۱۰۱۔ پہلے مصرع میں 'زخود' کی جگہ 'بخود' چاہیے:
۲۵۷	۳۱	امیر حسن علاء سجزی کا مصرع ہے (دیوان حسن سجزی دہلوی: ۳۵۲) شعر ہے: از حسن ایں چہ سوالست کہ، معشوق تو کیست؟ ایں سخن راچہ جوابست، تو ہم میدانی !
	۳۲	میرزا محمد ہادی لکھنؤ میں ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ چونکہ والد کا ان کی کم سنی میں انتقال ہوگیا تھا، اس لیے تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ اس کے بعد ذاتی جدوجہد سے پڑھنے لگے اور بالآخر بی اے کی سند حاصل کی۔ عربی، فارسی، انگریزی زبانیں بھی سیکھ لیں اور متعدد دیگر علوم میں بھی مہارت پیدا کرلی؛ نیز امریکہ کی کسی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی؛ غرض عجیب وغریب ذہن پایا تھا۔ اب کسب معاش کے لیے باقاعدگی سے

صفحہ	شمار	
		ریڈر کرسچین کالج میں اور شبینہ درجوں کے لیے ازابیلا تھابرن کالج میں بھی پڑھانے لگے۔ اسی زمانے میں دارالترجمہ حیدرآباد سے بلاوا آیا تو مترجم ہو کے وہاں چلے گئے۔ امراؤ جان ادا انھیں کا ناول ہے، پھر ناولوں میں پردے کے طور پر رُسوا بھی لکھنے لگے۔ مرثیے میں مرزا دبیر اور ان کے صاجزادے اوج سے مشورہ رہا۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔
	۳۳	کلیاتِ میر (دیوان دوم): ۳۲۷
	۳۴	حافظ کا مصرع ہے (دیوان حافظ: ۲۳۲) یہاں کچھ اختلاف لفظی ہے۔ ٹھیک شعر یوں ہے: رموز عشق و سرمستی زمن بشنو ، نہ از واعظ کہ باجام و قدح ہر شب قریں باماہ و پروینم
	۳۵	دیوان حافظ: ۶۴
	۳۶	معارف النغمات: راجہ محمد نواب علی خان تعلقدار اکبر پورا کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں چھپ چکی ہے (ممتاز المطابع لکھنؤ)۔ موصوف ہندوستانی موسیقی کے ماہر اور سرپرست تھے۔ میرس کالج آف میوزک، قیصر باغ، لکھنؤ جواب بھاتکنڈے یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے، اس کی تشکیل میں بھی ان کا بہت ہاتھ تھا؛ اس کام میں رائے راجیشور بلی نے انھیں بہت مدد دی تھی۔
۲۵۸	۳۷	کتاب الاغانی، ابوالفرج علی بن الحسین بن محمد الاموی الاصفہانی (ف ۳۵۶ھ) کی تالیف ہے جو گانوں اور اس سے متعلق مختلف روایات اور قصص پر مشتمل ہے۔ اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ سب سے بہتر دارالکتب المصریہ، قاہرہ کا ہے۔ العقد الفرید۔ احمد بن محمد بن عبد اللہ الاندلسی (ف ۳۲۸ھ) کی مشہور تصنیف مختلف النوع نوادر و اخبار اسلاف پر مشتمل ہے۔
	۳۸	یہاں بھی 'رات کے پچھلے پہر میں' چاہیے۔
		۳۹۔ اس سے مراد غالباً ابوبکر محمد بن العباس الخوارزمی ہیں، جو مشہور مورخ محمد ابن جریر الطبری کے بھانجے تھے۔ یہ خراسان میں ۳۲۳ھ/۹۳۵ء میں پیدا ہوئے اور بعد کو حلب میں مقیم ہو گئے۔ یہیں ۳۸۳ھ/۹۹۳ء میں انتقال ہوا۔ ان کی کتاب رسائل خوارزمی مشہور ہے۔
	۴۰	ملا علی بن محمد سلطان معروف بہ علی قاری، ہرات میں پیدا ہوئے۔ فقہ و حدیث میں ان کا

صفحہ	شمار	
		پایہ بہت بلند ہے۔ انھوں نے قرآن کریم کی ایک تفسیر بھی لکھی تھی۔ شرح فقہ اکبر اور حزب اعظم ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ شوال ۱۰۴۱ھ / جنوری ۱۶۰۶ میں انتقال ہوا۔ پچاس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ (اعلام ۵:۱۶۶) مزید حالات کے لیے دیکھیے: خلاصہ الاثر ۳:۱۸۵؛ الفوائد البہیہ: ۸؛ البدر الطالع ۱:۴۴۵۔
	۴۱	ہارون الرشید، خاندان عباسیہ کے پانچویں خلیفہ۔ اپنے بڑے بھائی ہادی کی وفات پر ۱۷۰ھ / ۷۸۶ء میں تخت پر بیٹھے۔ ۲۳ برس کی حکومت کے بعد طوس میں ۱۹۳ھ / ۸۰۹ میں انتقال ہوا، اس وقت صرف ۴۵ سال کی عمر تھی؛ طوس ہی میں دفن ہوئے۔
	۴۲	اسحاق بن ابراہیم بن میمون التمیمی الموصلی المعروف بابن الندیم، فارسی الاصل، تین عباسی ...... ہارون، مامون اور واثق ...... کے ندیم خاص اور ماہر موسیقی۔ اس کے علاوہ لغت، تاریخ، کلام وغیرہ میں بھی کامل دستگاہ تھی۔ کتاب النغم والایقاع، اغانی معبد وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ آخری عمر میں بینائی سے محروم ہوگئے تھے۔ ۲۳۵ھ / ۸۴۹ء میں بعمر ۸۰ سال انتقال ہوا۔ (الفہرست ۱:۴۰؛ وفیات الاعیان ۱:۶۵؛ الاغانی ۵: ۲۶۸؛ الاعلام ۱:۱۱۳)
	۴۳	ابراہیم بن محمد المہدی ۱۶۲ھ / جولائی ۷۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ مختلف علوم فنون میں درجہ کمال حاصل تھا، خاص طور پر موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔ ان کے اسحاق موصلی کے ساتھ معرکے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ رمضان ۲۲۴ھ / جولائی ۸۳۹ء میں انتقال ہوا۔
	۴۴	دیوان حافظ: ۱۴۴
۲۵۹	۴۵	حافظ شیرازی کا مصرع ہے (دیوان حافظ: ۳۳۹) پورا شعر ہے: ساقی! بہوش باش کہ غم در کمین ماست مطرب! نگاہ دار ہمیں رہ کہ می زنی
	۴۶	احمد سلامہ حجازی ۱۸۵۲ء میں اسکندریہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مصر کے مشہور ساحلی قصبے رشید میں کھیتی کا کام کرتے تھے۔ احمد مشکل سے تین برس کے ہوں گے کہ والد کے انتقال ہوگیا۔ مقامی مکتب میں معمولی تعلیم پائی اور گھر کے حالات سے مجبور ہو کر کمسنی ہی میں محنت مزدوری کرنے لگے۔ آواز اچھی تھی۔ قرآن خوانوں کی منڈلیوں (منشدین فی الاذکار) کے ساتھ لوگوں کے گھروں میں جانے آنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ایک نائی کی دکان پر بھی ملازمت کرلی۔ اسی زمانے میں (اسلامیہ) بجانے کی مشق کی اور اس میں فی الجملہ مہارت پیدا کرلی۔ اب حالات ایسے ہوگئے تھے کہ نائی کی

صفحہ	شمار	
		نوکری کرنے کی ضرورت نہ رہی اور وہ اپنی خوش الحانی کے باعث اسکندریہ کی دو مشہور مسجدوں (الاباصیری اور ابوالعباس) میں اذان کہنے پر مقرر ہوگئے۔
		یہاں وہ ۱۸۸۳ء تک رہے، یعنی جس سال انگریز جنگی بیڑے نے مصر پر حملہ کیا ہے۔ اس سال وہ رشید چلے گئے، اور یہاں انھوں نے ایک منڈلی (تخت) کی تشکیل کی۔ چند سال بعد وہ مستقل طور پر اسکندریہ منتقل ہوگئے اور یہاں بڑے پیمانے پر ایک ناٹک منڈلی بنالی۔
		اب تک وہ صرف عامی زبان (دارجہ) میں شعر کہتے تھے اور اس میں بھی مزاولت نعتِ رسول اور گیتوں سے تھی۔ تھیٹر کی طرف رُخ کیا، تو یہاں بھی بڑی کامیابی حاصل کی۔ متعدد اوپرا عربی میں ترجمہ کیے جن میں وردی کے عایدہ اور گونو کے رومیو وجولیٹ نے خاص شہرت حاصل کی۔ وہ مصر میں اسٹیج گانوں کے بانیوں میں شمار ہونے اور عام طور پر 'الزعیم الغناء المسرحی' کے سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں قاہرہ میں انتقال ہوا۔ (کتاب تاریخ اعلام الموسیقی الشرقیہ)
	۴۷	پہلی تینوں اشاعتوں میں نام 'طاہرہ' چھپا ہے' لیکن درست 'طائرہ' ہے جیسا کہ خود مولانا نے مہر کے نام ایک خط میں لکھا ہے (نقش آزاد: ۲۱۰) لیکن 'طائرہ' بھی صحیح نام نہیں؛ یہ غالباً فرضی نام ہے، اصلی کچھ اور ہوگا۔ افسوس کہ کوشش کے باوجود اس کے حالات معلوم نہیں ہوسکے۔
	۴۸	دیوان غالب: ۱۲۶
	۴۹	ام کلثوم کا اصلی نام فاطمہ تھا اور ان کے والد کا ابراہیم؛ وہ ۱۸۹۸ء میں مصر کے شہر سنبلا وین کے قریب ایک معمولی قریے (طماوی الزہیرہ) میں پیدا ہوئیں۔ ان کی تعلیم مکتبی تھی۔ آغاز میں انھوں نے قرب وجوار کے دیہات اور شہروں میں اپنی خوش آوازی کا مظاہرہ کیا اور شہرت حاصل کی۔ بالآخر ۱۹۲۰ء میں قاہرہ آئیں اور رفتہ رفتہ نہ صرف مصر کی، بلکہ تمام عرب ممالک کی بہترین خوش گلو مغنیہ تسلیم کرلی گئیں۔ حکومت مصر کی طرف سے انھیں تمغہ (نوط الکمال) ملا تھا۔ ۳ر فروری ۱۹۷۵ء کو قاہرہ میں انتقال ہوا۔ شادی شدہ تھیں؛ ان کے شوہر جلدی بیماری کے ماہر ڈاکٹر حسن سعید الحفناوی تھے۔ بدقسمتی سے اولاد سے محروم رہیں۔ (سیّدۃ الغناء العربی: ام کلثوم)
	۵۰	انقرہ......دارالخلافہ تر کیا
	۵۱	طرابلس (Tripoli) دو ہیں......ایک شام (سوریا) میں، یہ طرابلس الشرق کہلاتا

صفحہ	شمار	
		ہے؛ دوسرا لیبیا میں: یہ طرابلس الغرب کہلاتا ہے؛ اسی طرف یہاں اشارہ ہے۔
۲۶۰	۵۲	یہاں بھی متن میں عالیہ ہی تھا، جس کی جگہ ٹھیک نام علیہ لکھ دیا گیا ہے۔ یہ شعر الاغانی (۱۰:۱۷۶) میں اس سے منسوب ہے۔
	۵۳	غنی کشمیری کا مصرع ہے (دیوان غنی: ۱۹۷) مصرع اولیٰ ہے: جلوۂ حسن تو آورد مرا برسرِ فکر
۲۶۱	۵۴	بشار بن برد کا مصرع ہے (دیوان بشار بن برد: ۲۲۳) پہلا مصرع ہے: يَـا قَـومُ أُذُنِـي لِبَعْضِ الْحَـيِّ عَـاشِقَه
	۵۵	دیوان حافظ: ۳۲۷۔ صحیح 'عام' کی جگہ 'عشق' ہے۔ پہلا مصرع ہے: شہریست پُر ظریفاں وز ہر طرف نگارے
	۵۶	پورا نام و لقب، شمس الدین محمد ہے۔ تاریخ ولادت کا تعین نہیں ہوسکا...... ۷۲۰ھ اور ۷۳۰ھ کے درمیان شیراز میں پیدا ہوئے۔ متعدد علوم میں استادانہ دستگاہ حاصل تھی۔ شیخ ابواسحٰق کے زمانے میں ۷۴۳ھ سے لے کر ۷۵۴ھ تک شاعر دربار رہے۔ ۷۹۲ھ/۱۳۹۰ء میں انتقال ہوا، شیراز ہی میں آسودہ خواب ابدی ہیں۔
	۵۷	خیام یعنی حکیم ابوالفتح عمر بن ابراہیم، فارسی کے مشہور ترین شاعروں اور رباعی گویوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مشرق و مغرب دونوں جگہ ان کی سی شہرت بہت کم لوگوں کو ملی ہے۔ عام طور پر انھیں بطور شاعر تسلیم کیا گیا ہے، لیکن کئی دوسرے علوم مثلاً ریاضی، ہیئت، نجوم، طب وغیرہ میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، چنانچہ رصد خانہ ملک شاہی کی تعمیر میں ان کا بہت ہاتھ تھا۔ ۵۱۷ھ/۱۱۲۴ء میں وفات اور نیشاپور کے باہر دفن ہوئے۔
	۵۸	شیلے پورا نام پرسی بشی شیلی (Percy Bysshe Shelley) مشہور انگریز شاعر، بلکہ انگریزی میں غزلیہ شاعری کے امام ۴/اگست ۱۷۹۲ء کو پیدا ہوئے، اور ۸/جولائی ۱۸۲۲ء کو اٹلی کے شہر ویرجیو کے قریب سمندر میں ڈوب جانے سے انتقال ہوا۔ نظم و نثر دونوں میں کلام موجود ہے۔ جس میں قدم قدم پر باغی اور مصلح کی روح جھانکتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے کلام کے اہم موضوع انسان دوستی اور بالآخر محبت اور سچائی کے ذریعے انسان کی کامرانی ہیں۔
	۵۹	ورڈز ورتھ۔ پورا نام ولیم ورڈز ورتھ (William Words Worth) تھا۔ ۷ اپریل ۱۷۷۰ کو پیدا ہوئے۔ کولرج کے ساتھ انگریزی میں رومانی تحریک کے قافلہ سالار ہیں۔ انگریزی شاعری میں ان کا بہت بلند مقام ہے اور سانیٹ میں وہ ملٹن کے

صفحہ	شمار	
		ہم پلہ خیال کیے جاتے ہیں۔ ان کا نظریہ تھا کہ نظم میں وہ زبان استعمال کرنا چاہیے، جو کوئی عام آدمی جوش یا جذبے کے زیر اثر استعمال کرتا ہے۔
	٦٥	سودے کے انتقال کے بعد ۱۸۴۳ء میں وہ انگلستان کے ملک لشعرا مقرر ہوئے ۲۳/اپریل ۱۸۵۰ء کو انتقال ہوا۔
	٦٠	دیوان نظیری: ۳۶۸۔ دوسری مصرع دراصل یوں ہے: کہ یک ہنگامہ آرائی ست ویک کشور تماشائی
	٦١	البیرونی یعنی ابوریحان محمد بن احمد، خوارزم کے شہر کاث میں ۹۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آئے۔ یہاں سنسکرت سیکھی اور ہندوؤں کے علوم وفنون پر عبور حاصل کیا، جنھیں انھوں نے اپنی کتاب الہند میں مدوّن کیا۔ متعدد علوم مثلاً اقلیدس ، ہیئت، تاریخ، ادب وغیرہ میں ماہرانہ دستگاہ حاصل تھی۔ اتنی جامعت کے بہت کم عالم پیدا ہوئے ہیں۔ ۴۳۰ھ/۱۰۳۹ء میں انتقال ہوا
	٦٢	سخاؤ (Eduard Sachau) ۲۰/جولائی ۱۸۴۵ء کو جرمنی میں پیدا ہوئے۔ متعدد مشرقی زبانیں جانتے تھے۔ مدتوں وی آنا (آسٹریا) اور برلن (جرمنی) کی یونیورسٹیوں میں پڑھاتے رہے۔ ۱۷/ستمبر ۱۹۳۰ء کو برلن میں رحلت کی۔
	٦٣	محمود غزنوی بن سلطان سبکتگین ، ۱۵/دسمبر ۹۷۶ء کو پیدا ہوئے اور ۲۳/ربیع الثانی ۴۲۱ھ/۳۰/اپریل ۱۰۳۰ء کو ۳۱ سال کی حکومت کے بعد وفات پائی۔ اولوالعزم فاتح اور قدردان علم تھے۔ ہندوستان پران کے حملے مشہور ہیں۔
	٦٤	سلطان محمود کی وفات پر ان کا چھوٹا بیٹا محمد ان کا جانشین ہوا تھا لیکن پانچ ماہ بعد اس کے دوسرے بھائی مسعود نے اسے تخت سے اتار کر خود اس پر قبضہ کرلیا (۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) طغرل بیگ سلجوقی نے رمضان ۴۲۹ھ/۱۰۳۵ میں اسے شکست دی۔ مسعود نے اس کے بعد لاہور کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا، لیکن یہاں بھی پاؤں نہ جم سکے۔ فوج نے بغاوت کردی اور اسے قید کرکے اس کے بھائی محمد کو دوبارہ تخت پر بٹھادیا۔ قید ہی میں ۴۳۳ھ/۱۰۴۱ میں قتل کردیا گیا۔
۲٦۲	٦٥	ہومر (Homerus) یونان قدیم کا شہرۂ آفاق شاعر۔ اس کی جائے ولادت یا زمانے کا یقینی علم نہیں، لیکن غالباً وہ حضرت مسیح علیہ السلام سے نوسو برس پہلے گذرا ہے۔ الیڈا اور اوڈیسی اس کی مشہور نظمیں ہیں۔
	٦٦	سوفوکلیس (Sophocles) یونان کا مشہور شاعر اور المیہ ڈرامانگار۔ کہا جاتا

صفحہ	شمار	
		ہے کہ اس نے ۱۲۰ ڈرامے لکھے تھے۔ ان میں سے صرف سات اب دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کا ۹۱ سال کی عمر میں ۴۰۶ قبل مسیح انتقال ہوا۔
	۶۷	ارسطو (Aristotles) یونان کا زندہ جاوید فلسفی ۳۸۴ ق م میں پیدا، اور ۳۲۲ ق م میں فوت ہوا۔
	۶۸	افلاطون (Plato) قراط کا شاگرد رشید اور ارسطو کا استاد، یونان کا مایہ ناز فلسفی۔ یونان کے شہر ایتھنز میں پیدا ہوا۔ ۸۱ برس کی عمر تھی جب تقریباً ۳۴۸ قبل مسیح اس کا انتقال ہوا۔ اس کی متعدد کتابیں ملتی ہیں جو تقریباً سب کی سب مکالمات کے شکل میں ہیں۔ جمہوریت اس کی مشہور کتاب ہے۔ اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔
	۶۹	ابن رُشد۔ ان کے لیے دیکھیے حاشیہ ۲۵ خط ۱۷۔
	۷۰	Comedy: طربیہ۔ وہ ناٹک جس کا خاتمہ بخیر ہو۔
	۷۱	Tragedy: المیہ۔ وہ ناٹک جس کا خاتمہ افسوس ناک اور الم انگیز ہو۔
	۷۲	ابن قدامہ۔ ابوالفرج قدامہ بن جعفر قدامہ بن زیاد البغدادی' عباسی خلیفہ المکتفی باللہ کے معاصر' مشہور ادیب اور نقاد۔ نقد الشعران کی معروف تصنیف ہے۔ اور کتابیں بھی ہیں۔ ان کی کتاب الخراج ابھی پچھلے دنوں ہالینڈ میں چھپی ہے۔ ۳۳۷ھ / ۹۴۸ء میں بغداد میں وفات پائی (معجم الادبا، ۶: ۲۰۳؛ الفہرست: ۱۳۰؛ النجوم الزاہرہ ۳: ۲۹۷؛ المنتظم، ۶: ۲۶۳؛ الاعلام، ۶: ۳۱)
	۷۳	اسکوریال (Escorial) اسپین میں دارالخلافہ میڈورڈ کے شمال مغرب میں ایک گاؤں یہاں ایک بہت بڑا اور خوبصورت راہب خانہ ہے۔ اسپین کے شاہی خاندان کا قبرستان بھی یہیں ہے اسی راہب خانے میں ایک کتاب خانہ ہے۔ جسے اسپین کے بادشاہ فلپ ثانی (۱۵۵۶ا۔۱۵۹۸) نے قائم کیا تھا۔ اس میں چار ہزار خطی نسخے ہیں جن میں بہت سے مصوّر ہیں۔ ان میں بہت بڑی تعداد عربی کے نادر مخطوطات کی ہے ۔ تقریباً چار ہزار ہی قدیم مطبوعہ کتابیں بھی ہیں۔
	۷۴	ڈاکٹر منصور فہمی پاشا مراد ہیں۔ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ مدرسۃ الحقوق الاہلیہ قاہرہ میں تعلیم کی تکمیل کے بعد سوربون (پیرس) سے ۱۹۱۳ء میں پی ایچ ڈی کی سند لی۔ واپسی پر قاہرہ یونیورسٹی میں جو اس وقت مصری یونیورسٹی کہلاتی تھی فلسفے اور اخلاقیات کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا۔
	۷۵	ڈاکٹر طٰہٰ حسین، مصر کے صوبہ المنیا کے ایک گاؤں مغاغہ میں ۱۸۸۹ میں پیدا ہوئے۔

صفحہ	شمار	
		قاہرہ یونیورسٹی میں تعلیم ختم کر کے انھوں نے بھی ۱۹۲۵ء میں سوربون سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی اور واپسی پر ادبیات کے استاد مقرر ہوئے۔ اپنی عمر میں بڑے بڑے عہدوں پر رہے۔ وہ کسی زمانے میں مصر کے وزیر تعلیم تھے۔ پھر مجمع اللغۃ العربیہ کے صدر ہے جو عربی زبان کی سب سے بڑی اکادیمی ہے۔ کم عمری میں چیچک سے آنکھوں سے بصارت ضائع ہوگئی تھی۔ مختلف موضوعات پر کوئی ٦٠ کتابیں شائع کیں ان میں سے بعض دنیا کی اور زبانوں میں بھی ترجمہ ہوئی ہیں۔ اتوار ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو قاہرہ (مصر) میں رحلت کی۔ (متن میں نام 'طاہا حسین' لکھا تھا۔ اسے طٰہٰ حسین کر دیا گیا ہے۔ جس طرح وہ خود لکھتے ہیں)
	۷٦	لیکن علماء کی بہت بڑی جماعت نقد الشعر کو ابن قدامہ کی تصنیف تسلیم نہیں کرتی۔ نیز یہاں مولانا آزاد مرحوم سے سہو ہوا ہے۔ نقد الشعر کو ڈاکٹر منصور اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے شائع نہیں کیا بلکہ طٰہٰ حسین کے ساتھ پروفیسر عبدالحمید العبادی نے مل کر یہ کام کیا تھا۔
	۷۷	ابو عثمان عمر بن بحر بن محبوب مشہور بہ جاحظ ۱٦۳ھ /۷۷۹۔۷۸۰ء میں بصرے میں پیدا ہوئے اور وہیں ۲۵۵ھ /۸٦۹ میں انتقال کیا۔ عربی ادب کے شہرۂ آفاق ادیب اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں کتاب الحیوان بہت مشہور ہے (الاعلام ۵: ۲۳۹)۔ مزید حالات کے لیے ملاحظہ ہو ارشاد الاریب ٦: ۵٦؛ وفیات الاعیان، ۱: ۳۸۸؛ آداب اللغۃ ۲: ۱٦۷؛ لسان المیزان ۴: ۳۵۵؛ تاریخ بغداد، ۱۲: ۲۱۲۔
	۷۸	شریف گرگانی کا مصرع ہے (شعر العجم، ۱: ۲۷) پہلا مصرع ہے: ثنائے رود کی ماندست و مدحش
	۷۹	ابونصر فارابی۔ دیکھیے خط (۱۷) حاشیہ (۲۷)
	۸۰	اخوان الصفاء تیسری اور چوتھی صدی ہجری نویں اور دسویں عیسوی) میں ایران کے بعض علمائے فلسفۂ یونان کو اسلام نے بنیادی اصولوں سے مطابق کرنے کا بیڑا اٹھایا؛ لیکن عملاً انھوں نے کام اس کے الٹ کیا، یعنی وہ اسلامی تعلیمات کو کھینچ تان کر یونانی فلسفے کے مطابق دکھانے لگے۔ یہی گروہ اخوان الصفا کے نام سے مشہور ہوا۔ دراصل یہ اصحاب کسی خاص مذہب کے پیرو اور اس کے اصولوں کے پابند نہیں تھے؛ بلکہ وہ تمام مذاہب کو حق اور ان کی کتابوں کو سچا مانتے تھے۔ ان کے لکھے ہوئے ۵۲ 'رسائل اخوان الصفا' چار حصوں میں منقسم کیے جاسکتے ہیں: (۱) ریاضیات، (۲) طبیعیات وجسمانیات (۳) عقلیات ونفسیات (۴) الٰہیات ومعتقدات۔ دنیا کی اور زبانوں کے علاوہ ان کا

صفحہ	شمار	
		اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ یہ ۱۸۱۲ء میں کلکتہ میں چھپے تھے۔
۲۶۴	۸۱	امیر خسرو دہلوی: ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء میں ضلع ایٹہ کے قصبہ پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے لمبی عمر پائی اور سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ ہندوستان نے ان سے بڑا فارسی کا شعر پیدا نہیں کیا۔ انھوں نے نظامی کے تتبع میں خمسہ لکھا اور اس کا حق ادا کر دیا۔ ان کے علاوہ پانچ دیوان، متعدد مثنویاں اور نثری کتابیں بھی ان سے یادگار ہیں۔ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ کے محبوب مرید تھے۔ مرشد کی وفات کے چھ ماہ بعد ۷۲۵ھ/۱۳۵۲ء میں انتقال ہوا اور انھیں کے پائیں میں دفن ہوئے۔
	۸۲	قران السعدین: ۱۸۲، مطبوعہ نسخے میں مصرع یوں ہے: کردہ با آہنگ عراق اتفاق
	۸۳	خلجی خاندان کا بانی جلال الدین فیروز شاہ تھا۔ یہ خاندان ۶۸۹ھ/۱۲۹۰ء سے لے کر ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء تک حکمران رہا۔
	۸۴	تغلق خاندان کا بانی غیاث الدین تغلق تھا۔ ان کا زمانہ ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء سے لے کر ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء تک ہے۔
	۸۵	جونپور شرقی کی ابتداء خواجہ جہان کے ہاتھوں ۲۹۶ھ/۱۳۹۴ء میں پڑی اور ۸۸۱ھ/۱۴۷۷ء میں اس کا خاتمہ ہوا، جب کہ حکومت دہلی نے اس پر قبضہ جما لیا۔
	۸۶	بہمنی خاندان کا بانی علاء الدین حسین بہمن شاہ تھا جس کے نام پر یہ بہمنی کہلاتے ہیں۔ اس خاندان کا دور دورہ ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء سے ۹۳۴ھ/۱۵۲۰ء تک رہا۔
	۸۷	بہمنی سلطنت کے زوال کے پر پانچ خاندان برسر اقتدار آئے' ان میں سے ایک نظام شاہی تھا؛ اس کا بانی ملک احمد تھا، جس نے ۸۹۵ھ ۱۴۹۰ تک حکومت کی۔ اس خاندان کا دار الخلافہ احمد نگر تھا؛ اس کا خاتمہ ۱۶۳۳ میں ہوا۔
	۸۸	دوسرا بیجا پور کا عادل شاہی خاندان تھا، اس کا بانی یوسف عادل خان تھا۔ یہ خاندان ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب کے ہاتھوں ختم ہوا۔
۲۶۵	۸۹	ابراہیم عادل شاہ اپنے خاندان کا چھٹا بادشاہ تھا اور ابراہیم ثانی کہلاتا ہے۔ ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء سے ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء تک تخت نشین رہا۔ اس کی کتاب 'نورس' موسیقی سے اس کا شغف اور اس میں مہارت کی شاہد عادل ہے؛ بلکہ اس نے دھرپد کا نام نورس رکھ دیا۔ بختر خاں کلاونت جو خیال اور دھرپد کا ماہر کامل کہا جاتا ہے اسی کے دربار سے وابستہ تھا۔ (توزک جہانگیری: ۱۳۳)

صفحہ	شمار	
	۹۰	سہ نثر میں کی پہلی نثر میں جو دراصل کتاب نورس کا دیباچہ لکھتا ہے: از شاہ کن جہاں نشاط آبادست خاک عم از آب نغمہ اش برباداست ارباب ترانہ کہنہ شاگردانند آں کس کہ ازو نوشدہ طرز اوستاد ست
	۹۱	باز بہادر، اصلی نام بایزید، سلطنت مالوہ کا آخری بادشاہ، جس پر اس ملک کی آزادی کا بعہد اکبری خاتمہ ہوا۔ یہ ۹۶۳ھ /۱۵۵۵ء میں تخت پر بیٹھا تھا۔ اس نے مانڈو کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ شروع میں اکبری فوجوں کا مقابلہ کیا، لیکن بالاخر ۹۷۸ھ /۱۵۷۰ء میں ہتھیار ڈال دینا پڑے۔ اکبر نے دو ہزاری منصب دیا۔ روپ متی اس کی محبوبہ تھی جس کی مدح میں اس نے گیت لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں دیکھیے: مآثر الامرا، ۱: ۳۸۹) ۹۲۔ ان کے نام آئین اکبری، ص ۲۰۹ پر دیکھے جاسکتے ہیں۔
	۹۳	ملکہ الزبیتھ اول، انگلستان کی مشہور حکمران؛ ان کی زندگیوں کے اہم سنین یوں ہیں: ولادت ۷ر ستمبر ۱۵۳۲ء؛ تخت نشینی ۱۷ر نومبر ۱۵۵۸ء؛ وفات ۲۴ر مارچ ۱۶۰۳ء
	۹۴	دیکھیے توزک جہانگیری ۱:۱۱۱
۲۶۶	۹۵	محمد قاسم فرشتہ (صاحب تاریخ فرشتہ) کے والد کا نام غلام علی ہندوشاہ تھا۔ کم سنی میں اپنے والد کے ساتھ مرتضیٰ نظام شاہ اول (۹۷۳ھ /۱۵۶۵ء .... ۹۹۵ھ /۱۵۸۶ء) کے عہد میں دکن آیا۔ فرشتہ نے احمد نگر کی سکونت ترک کر کے عادل بادشاہوں سے رشتہ جوڑا اور ابراہیم عادل شاہ (۹۸۸ھ /۱۵۸۰ء .... ۱۰۳۷ھ /۱۶۲۷ء) کے دربار سے منسلک ہوگیا۔ اس نے اپنی مشہور تاریخ اسی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ چنانچہ اس کا ایک نام تاریخ ابراہیمی بھی ہے۔ ۱۶۱۴ء تک یقیناً زندہ تھا۔ تاریخ فرشتہ ۲: ۵۶۷) وفات کا سال متعین نہ ہوسکا۔
	۹۶	ملا علاء الملک تونی مخاطب بفاضل خان ایران میں پیدا ہوئے اور عہد شاہجہانی میں ہندوستان آئے۔ علوم طبیعی و ریاضی میں یکتائے روزگار تھے، اور نجوم اور ہیئت میں خاص مہارت حاصل تھی۔ ۲۷ر ذیقعدہ ۱۰۷۳ھ/۲۴ جون ۱۶۶۳ء کو بعمر حوالی ۷۰ سال انتقال ہوا۔ اس سے صرف ۱۷ روز قبل عہدۂ وزارت پر فائز ہوئے تھے (مآثر الامرا، ۳: ۵۲۴۔۵۳۰)۔
	۹۷	اس کے لیے دیکھیے، منتخب التواریخ، ۲: ۲۶۵۔

صفحہ	شمار	
	۹۸	ملا عبدالقادر بدایونی کے حالات کے لیے دیکھیے: خط (۱۷) حاشیہ (۲۴)
	۹۹	بدایونی نے منتخب التوریخ (۳: ۳۰۳-۳۰۴) میں وہ خط نقل کیا ہے جو فیضی نے ان کی سفارش میں اکبر کو لکھا تھا، اور جس میں اُن کے من جملہ اور کمالات کے بین میں مہارت کا بھی ذکر ہے۔
	۱۰۰	علامی سعد اللہ خان چنیوٹ (پنجاب۔ پاکستان) کے رہنے والے بنوتمیم قریشی تھے۔ صاحب کمال ایسے تھے کہ شاہجہان کے وزیر اعلیٰ اور معتمد خاص رہے ہفت ہزاری، ہفت ہزار سوار کا منصب جلیلہ پایا۔ ۲۲ر جمادی الثانی ۱۰۶۶ھ /۹ر مارچ ۱۶۵۶ء کو انتقال ہوا (مآثر الامرا، ۲: ۴۴۸؛ نزہۃ الخواطر ۵، ۱۵۵-۱۵۶)۔
۲۶۷	۱۰۱	مفتی عبدالسلام لاہوری، فاضل عصر متعدد علوم میں مہارت کاملہ تھی۔ تمام عمر درس و تدریس میں گذری، تصنیف سے رغبت نہیں رکھی۔ صرف تفسیر بیضاوی پر ان کا حاشیہ ملتا ہے۔ ایک عالم نے ان سے فیض پایا۔ تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں ۱۰۳۷ھ /۱۶۲۷ء۔ ۱۶۲۸ء میں انتقال ہوا۔ (مآثر الکرام ۱: ۲۳۶؛ نزہۃ الخواطر ۵: ۲۲۳-۲۲۴)۔
		۱۰۲۔ شیخ معالی خان، قاضی عبدالوہاب کے چھوٹے بیٹے عبدالحق کے فرزند ارجمند تھے۔ بقول صاحب مآثر الامراء خوگر شراب و شیفتۂ راگ بود، وخود نیز بے حجابانہ خواندو بشکار شوقِ کمال داشت۔'' مدتوں ملکا پور (برار) کی فوجداری ان کے پاس رہی۔ مآثر الامرا، ۱: ۲۴۰)
	۱۰۳	ملا محمد طاہر پٹنی مشہور عالم عہدِ اکبری، پٹن (گجرات) کے رہنے والے تھے اور قوم کے بوہرہ تھے۔ حرمین شریفین گئے اور وہاں سے واپسی پر مہدویہ اور تشیع کی تردید میں سعی بلیغ کرتے رہے۔ 'مجمع البحار' ان کی مشہور تصنیف ہے۔ ۹۸۶ھ /۱۵۷۸-۱۵۷۹ء میں قتل ہوئے۔ پٹن میں مدفن ہے (مآثر الامراء ۱: ۳۲۵-۳۲۶؛ مآثر الکرم، ۱: ۱۹۴-۱۹۶؛ نزہۃ الخواطر، ۵: ۲۹۸-۳۰۱)۔
	۱۰۴	شیخ عبدالوہاب انھیں ملا طاہر کے پوتے' فقہ و اصول میں مہارت تامہ کے مالک تھے۔ شاہ جہان کے عہد میں مفتی پٹن رہے اور اورنگ زیب کے دور میں قاضی عسکر کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ انھوں نے بہت مال و دولت جمع کی تھی، جسے ان کے بیٹے نے ترکے میں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ اسے کسب حلال نہیں سمجھتے تھے۔ قاضی عبدالوہاب کا ۱۸ر رمضان ۱۰۸۶ھ /۲۶ر نومبر ۱۶۷۵ء کو دلی میں انتقال ہوا (مآثر الامرا ۱: ۲۳۶-۲۳۷) نزہۃ الخواطر ۵: ۲۶۷-۲۶۸)

صفحہ	شمار	
	۱۰۵	ملا شفیعائی یزدی۔ عہد شاہجہانی و عالمگیری کے سربر آوردہ امرا میں سے تھے؛ دانش مند خان خطاب تھا۔ آخری زمانے میں پنج ہزاری منصب اور میر بخش کا عہدۂ جلیلہ ان کے پاس تھا۔ ۱۳ ربیع اولال ۱۰۸۱ھ/ ۲۱ جولائی ۱۶۷۰ء کو انتقال ہوا۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے ان کا طولانی مباحثہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے واو عاطفہ سے متعلق ہوا۔ علامی سعد اللہ خان وزیر اعظم حَکَم مقرر ہوئے تھے؛ ان کے خیال میں فریقین برابر رہے تھے۔ حکمائے فرنگ کی ہم مشربی کا الزام صاحب مآثر الامرا کے نزدیک نظر بر فضل و کمالش استبعاد دارد۔' (مآثر الامرا، ۲: ۳۰-۳۲)
	۱۰۶	علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی ان کے والد کا نام شمس الدین ہے۔ انھوں نے شیخ کمال الدین کشمیری سے تعلیم پائی اور پھر خود ایسی استعداد پیدا کی کہ بقول صاحب مآثر الکرام "الحق در جمیع فنون درسی مثل اُواز زمین ہند برنخاست۔" شاہ جہان نے انھیں دو مرتبہ چاندی سے تلوایا۔ ہر مرتبہ چھ ہزار روپیہ ہوا اور یہ بھی انھیں انعام میں دے دیا۔ متعدد مشہور تصانیف پر حواشی لکھے، جو عرب و عجم میں رائج ہیں۔ ۱۸ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ/ ۲۵ دسمبر ۱۶۵۶ء کو سیالکوٹ میں رحلت کی اور وہیں دفن ہوئے۔ یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کو سب سے پہلے مجدد الف ثانی انھیں نے کہا تھا (مآثر الکرام، ۱: ۲۰۴؛ نزہۃ الخواطر، ۵: ۲۱۰-۲۱۱)
	۱۰۷	حکیم برنیر فرنساوی سے مشہور ڈاکٹر فرنسوا برنیے (Francois Bernier) مراد ہیں، (فرانسیسی) نام کا تلفظ برنیے ہوگا؛ آخری R تلفظ میں نہیں آئے گا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں مصر و شام کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے وارد ہندوستان ہوئے۔ یہاں دربار شاہی میں رسوخ حاصل کر کے طبیب خاص مقرر ہو گئے۔ واپس وطن پہنچ کر اپنا مشہور سفر نامہ مرتب کیا۔ اس کے علاوہ ان کی بعض اور کتابیں بھی ملتی ہیں، جن میں گسندی (Gassend) کے فلسفے کی تنقید زیادہ اہم ہے۔ پیرس میں ۲۲ ستمبر ۱۶۸۸ء کو انتقال کیا۔
	۱۰۸	علاء الدین الحسینی اوڈی کے نام سے مشہور ہیں۔ سید شریف احمد بغدادی کی نسل سے تھے اور خراسان مسقط الراس تھا؛ وہیں سے ہندوستان آئے۔ شیخ عبدالسلام (ولد سعد الدین بجنوری) کے مرید تھے "ایقاع والنغم" میں مہارت تھی۔ ان کی موت افسوسناک حالات میں ہوئی۔ گھر میں چور گھس آئے؛ حالانکہ ۹۰ سال کی عمر تھی، لیکن اس پیرانہ سالی کے باوجود گرز اٹھا کر مقابلے پر کھڑے ہو گئے اور دو کو مار گرایا۔ اسی معرکے میں

صفحہ	شمار	
		ایک چور کے تیر کا نشانہ ہوئے ؛ یہ ۹۹۸ھ / ۱۵۸۹۔۱۵۹۰ء کا حادثہ ہے۔ ترجیع بند مامقیمان انھیں کے نتائج فکر سے ہے۔ منتخب التواریخ (۳: ۶۱۔۶۳) ؛ روز روشن: ۴۶۴۔۴۶۵) نزہۃ الخواطر، ۴: ۲۳۲)
	۱۰۹	روز روشن (ص ۴۶۵) میں اس غزل کے متعدد شعر ہیں۔ مطلع میں ''رعنا'' کی جگہ ''گل خنداں'' دیا ہے۔ نگارستان سخن (ص ۶۷) میں دوسرا شعر سہو کتابت سے غلط لکھا گیا ہے۔ (نیز اخبار الاخیار: ۲۳۲)
	۱۱۰	شیخ جمالی دہلوی، قوم کے کنبوہ تھے۔ اصلی نام جلال خان اور تخلص جلالی تھا ؛ اپنے پر شیخ سماء الدین (ف ۹۰۱ھ) کے اشارے پر انھیں جمال خان اور جمالی میں تبدیل کرلیا (مفتاح التواریخ : ۱۵۰) لیکن خود شیخ جمالی نے اپنی کتاب سیر العارفین میں اپنا نام حامد بن فضل اللہ لکھا ہے (ص ۲۰۱) اور یہی ٹھیک ہوگا۔ شعر خوب کہتے تھے۔ بابر اور ہمایوں کی مدح میں قصیدے بھی کہے ہیں۔ نعت میں یہ مشہور شعر انہی کا ہے: موسیٰ زہوش رفت بیک پر تو صفات تو عین ذات می نگری در تبسمے ۱۰ رذی القعدہ ۹۴۲ھ / یکم مئی ۱۵۳۶ء کو گجرات میں فوت ہوئے؛ لاش دلی آئی اور قطب صاحب میں اپنے والد کی قبر کے قریب دفن ہوئے۔ (اخبار الاخیار ۲۲۷۔۲۲۹ ؛ تذکرہ علمائے ہند: ۴۳؛ خزانہ عامرہ: ۱۷۷۔۱۷۹)
	۱۱۱	یہاں سیر الاولیا چھپا تھا، لیکن کتاب کا ٹھیک نام سیر العارفین ہے، نہ کہ سیر الاولیا اس لیے متن میں درستی کردی گئی ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے (مطبع رضوی، دہلی بماہ ربیع الاخر ۱۳۱۱ ہجری)
	۱۱۲	شیخ گدائی بڑے بیٹے تھے۔ شیخ جمالی کے۔ ان کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ یہ ہمایوں کے مصاحب خاص تھے، اسی لیے شیر شاہ سوری کے زمانے میں گجرات کی طرف چلے گئے اور پھر وہیں سے حج کو روانہ ہوگئے۔ اکبر کے زمانے میں واپس آئے، لیکن حالات سے مجبور ہوکر دوبارہ حجاز کی راہ لی۔ راستے میں دشمنوں نے ان پر حملہ کردیا۔ جان تو بچ گئی لیکن مدتوں روپوش رہے۔ بالآخر دہلی واپس آگئے اور یہیں ۹۷۶ھ / ۱۵۶۸۔۱۵۶۹ء میں راہی ملک عدم ہوئے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ (منتخب التواریخ، ۲: ۱۱۹؛ ایضاً ۳: ۷۶۔۷۷؛ اخبار الاخیار: ۲۲۹۔۲۳۰)
	۱۱۳	میرزا مظہر جانجاناں، اردو اور فارسی کے مشہور شاعر، ۱۰ رمحرم ۱۱۹۵ھ / ۸ رجنوری ۱۷۸۱ء

صفحہ	شمار	
		کو انتقال ہوا۔ دلی میں محلہ چتلی قبر کے اندرون درگاہ شاہ ابوالخیر میں مزار ہے لیکن کسی تذکرے میں ان کی موسیقی میں مہارت کا ذکر نہیں ملا۔ غالباً مولانا مرحوم کو خواجہ میر درد کے نام کی یکجائی کی وجہ سے سہو ہوا جن کی موسیقی میں غیر معمولی مزاولت معلوم ہے۔ شاعری اور تصوف دو وجہ اشتراک و مماثلت موجود ہی تھیں، ذہن نے موسیقی کا غیر ارادی طور پر بلا وجہ اضافہ کردیا۔
	۱۱۴	خواجہ میر درد، مشہور شاعر، یوم جمعہ ۲۴ جمعہ ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ/ ۶ جنوری ۱۷۸۵ء کو رہگرائے عالم فانی ہوئے۔ ترکمان دروازے کے باہر نئی دلی میں آسودہ خواب ابدی ہیں۔
۲۶۸	۱۱۵	میر عبدالواحد بلگرامی صاحب کمالات وفضائل گوناگوں تھے۔ موسیقی کے علاوہ تصنیف و تالیف وشعر سے بھی شغف تھا؛ شاہدی تخلص کرتے تھے۔ نزہۃ الارواح پر حاشیہ لکھا۔ اصطلاحات صوفیہ میں کئی رسالے لکھے؛ سبع سنابل انھیں میں سے ہے؟ سلوک میں تربیت شیخ حسین (سکندرہ) سے حاصل کی تھی۔ ۳ر رمضان ۱۰۱۷ھ یکم دسمبر ۱۶۰۸ء کو بلگرام میں رحلت کی۔ (منتخب التوریخ، ۳: ۲۲۳ـ۶۶؛ مآثر الکرام: ۱: ۲۵ـ۳۳؛ تذکرہ علمائے ہند: ۱۲۶؛ نزہۃ الخواطر، ۵: ۲۶۳ـ۲۶۴)
	۱۱۶	منتخب التوارخ ، ۳: ۶۵
	۱۱۷	بیرم خان خانخاناں ہمایوں اور اکبر کے عہد کے مشہور امیر تھے۔ بروز جمعہ ۱۴ جمادی الاول ۹۶۸ھ/ ۳۱ر جنوری ۱۵۶۱ء کو پٹن میں قتل ہوئے۔ حالات کے لیے دیکھیے: منتخب التوراخ ، ۳: ۱۹۰ـ۱۹۲)
	۱۱۸	عبدالرحیم خانخاناں، ان کے حالات کے لیے دیکھیے: خط (۵) حاشیہ (۳۵)
	۱۱۹	مآثر رحیمی ۳: ۱۶۸۹ـ۱۶۹۸۔ یہاں ان موسیقی دانوں کے حالات وکوائف دیے ہیں: آقا محمد نامی؛ مولانا اصولی؛ استاد میرزا علی قیچکی۔ ان کے علاوہ محمد مومن فن طنبورہ کے ماہر، اور حافظ نذر خوش خوان اور حافظ شیرہ سادہ خوان، طہماسپ قلی نغمہ سرائے ترکی، حافظ تاج شیرازی، علی بیگ مصنف اصفہانی کا ذکر بھی موسیقی کے ماہرین کے ذیل میں آیا ہے۔
	۱۲۰	مآثر الامرا (۳: ۶۷۵) کے صحیح لفظ یہ ہیں: بسیار شیفتۂ صید شکار بود و ہم دلدادۂ راگ و نغمہ۔ خوانندہ و سازندہ (کہ نزد او فراہم آمدہ بودند) در ہیچ سرکار دراں وقت نبود۔
	۱۲۱	ٹھیک الفاظ یوں ہیں: ”زین خان بطبع وراگ شیفتہ بود۔ اکثر ساز ہا خودمی نواخت و شعر ہم می گفت“ (مآثر الامرا، ۲: ۳۶۹)

صفحہ	شمار	
	۱۲۲	مآثر الامرا، ۳: ۴۹۲ ''گویند شکار دوست بود، و بنغمہ و سرود شیفتگی داشت؛ سازندہ و نوازندۂ بسیار فراہم آوردہ بود۔''
	۱۲۳	مرد صاحب کمال بود، بترکی و فارسی شعری گفت۔ دیوانے مرتب دارد مشتمل بر قصائد و غزلیات: غزنوی تخلص می کرد۔ ودر موسیقی نیز مہارت داست۔ گویند ہیچ گاہ مجلس اُو خالی از فضلا و شعرا نبودہ؛ پیوستہ بسخنانِ رنگین و نغمات دل نشین، حلاوت بخش و طرب افزائے اہل ذوق بود۔'' (مآثر الامرا، ۳: ۲۱۵) (نیز منتخب التواریخ، ۳: ۲۸۷۔ ۲۸۸)
	۱۲۴	مرزا غازی بیگ بسیار مستعد و بصحبت اہل سخن مشغوف بود۔ خود ہم شعری گفت و وقاری تخلص می نمود۔ گویند' در قندھار شاعرے بود بایں تخلص میرزا بیگ ہزار روپیہ و خلعت و اسپ از وایں تخلص خرید کرد، بمناسبتِ تخلص پدر خود (کہ حلیمی بود) ...... میرزا در نغمہ پردازی و طنبورہ نوازی بے نظیر بود۔ ہمہ ساز را خوب می نواخت۔'' (مآثر الامرا، ۳: ۳۴۷)
	۱۲۵	مآثر الامرا، ۳: ۳۴۷
۲۶۹	۱۲۶	''ودر فن موسیقی مہارت تمام داشت و بادوامِ انہماک در کارہائے دنیوی مولع و شیفتۂ راگ و رنگ بود۔ پری چہرگان خوش آواز مغنیات عشوہ ساز در خانہ داشت۔'' (مآثر الامرا، ۱: ۷۹۰)
	۱۲۷	سرس بائی۔ اس کا نام مختلف طور پر لکھا گیا ہے۔ منتخب اللباب (۲: ۱۵۵۔ ۱۵۶) میں سرن بائی ہے: سرکار نے (اورنگ زیب، ۲: ۹۸ میں) سرتی بائی لکھا ہے۔ سرن بظاہر غلط ہے؛ دوسرے دونوں ہوسکتے ہیں۔ سرس گجراتی (اور پنجابی) میں اعلیٰ اور خوبصورت کو کہتے ہیں۔
	۱۲۸	شہزادۂ مراد بخش شاہ جہان کے بعد تخت نشینی کے جھگڑوں کا شکار ہوا۔ جنوری ۱۶۵۶ء میں اورنگ زیب نے اسے گوالیار کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔ بعد کو اس پر علی نقی کے قتل کا مقدمہ قائم ہوا اور ۴ر دسمبر ۱۶۶۱ء کو قاضیوں کے فتوے پر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا: اے وائے بہر بہانہ کشتند، تاریخ ہوئی۔ منتخب اللباب جلد دوم)
		۱۲۹۔ باآں کہ عمر میرزا (عیسی خان ترخان) از صد متجاوز بود، اما قوئی از درجہ طبیعی سقوط نیافتہ۔ باہم جوانانہ داشت و بسیار عیش دوست و شیفتۂ مسکرات و دلدادۂ راگ رنگ بود و در نغمہ خوانی و ساز نوازی خالی از کمال نبود۔ مآثر الامرا ۳۱: ۴۸۸)۔
	۱۳۰	مان متی عرف جگت گوسائیں موٹا راجہ اودے سنگھ کی بیٹی تھی۔ اس کی جہانگیر سے ۱۵۸۶ء میں شادی ہوئی تھی؛ ۸ر اپریل ۱۶۱۹ء کو انتقال ہوا۔ توزک جہانگیری)

صفحہ	شمار	
	۱۳۱	لال خان نہ صرف تان سین کا جانشین بلکہ اس کا داماد بھی تھا۔ 'گن سمدر' (بحر صفات) اس کا لقب یا خطاب تھا۔ دھرپد کا ماہر تھا (بادشاہ نامہ، (۲) ۵۶۔
	۱۳۲	نظام الملک آصف جاہ کے لیے دیکھیے اوپر حاشیہ (۸) خط (۲۴)
	۱۳۳	ناصر جنگ شہید کے لیے دیکھیے حاشیہ (۹) خط (۲۴)
	۱۳۴	شیخ سلیم چشتی، اکبر بادشاہ کو ان سے بہت عقیدت تھی۔ جہانگیر کا نام سلیم تبرکاً انھیں کے نام پر رکھا گیا تھا۔ بعمر ۹۵ سال سلخ رمضان ۹۷۹ھ / ۱۵ر فروری ۱۵۷۲ کو انتقال ہوا۔ منتخب التواریخ، ۳: ۱۱۔۱۵ انزہتہ الخواطر، ۴: ۱۲۶۔۱۲۷)
	۱۳۵	احوال او از نوادر حالات ست۔ صلاح و اتقائے او بمرتبہٗ بود کہ غالباً در مدت العمر بمسکر و مہنی ارتکاب نمود، و باصف آن جمیع طوائف رقاصیہٗ تمام صوبہ بنگالہ را (از لولی وھورکنی وکنچنی وڈومنی) بہشتاد ہزار روپیہ در ماہہ نوکر کردہ) سالے نہ لک وشصت ہزار روپیہ بآنہا می رسانید۔" (مآثر الامرا، ۱: ۱۱۹)۔
۲۷۰	۱۳۶	ایضاً
	۱۳۷	ایضاً
	۱۳۸	"درفن راگ ونغمہ بسیار ماہر بود۔ رسالہ مسمی براگ درپن (کہ بیشتر ترجمہ مانک سوہل کہ نائیکان سابق نوشتہ اند) نمودہ، بافوائد دیگر در تقسیم وقواعد آں تالیف کردہ۔" مآثر الامرا، ۲: ۴۸۴) حالات کے لیے دیکھیے، سروِ آزاد: ۱۲۹۔۱۳۰۔
	۱۳۹	ناصر علی سرہندی (ف ۱۱۰۸ھ / ۱۶۹۷ء) کے قصیدے کی بیت اسم ہے: گفتگوے طوطی از آمیی، نہ می خیزد، علی ! گر نباشید سیف خاں، او رانفس درکار نیست
۲۷۱	۱۴۰	یہ زین آبادی کا پورا واقعہ مآثر الامرا (۱: ۷۹۰۔۷۹۲) میں دیکھا جاسکتا ہے۔
	۱۴۱	محتشم کاشانی کا شعر ہے (دیوان: ۳۲۳) مصرع اول میں 'دامے' کی بجائے 'راہے' ہے
	۱۴۲	اکبر الہ آبادی کا مصرع ہے (کلیات، ۳: ۵۲) پورا شعر ہے: بہت رہا ہے کبھی لطف یار ہم پر بھی گذر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی
	۱۴۳	دیوان حافظ: ۲۷۵۔ مطبوعہ دیوان میں مصرع اولی اس طرح ہے: بالا بلند عشوہ گر نقش بازِ من

صفحہ	شمار	
	۱۴۴	مآثر الامرا، ۱: ۷۹۰۔ یہاں اصلی عبارت سے کچھ تفاوت ہے۔ ٹھیک متن یوں ہے: بکمال ابرام وسماجت، اُوْ را از خالۂ مکرمہ' خود' گرفتہ۔ با آں ہمہ زُہد ورع' خشک وتقشف بحت، شیفتہ و دلدادۂ اُوشد۔ پیالہ شراب بدستِ خود پُر کردہ 'باؤ' می داد۔ گویند روزے 'اؤ' ہم قدحِ بادہ (پُر کدہ) بدست شہزادہ داد وتکلیف (شُرب) نمود۔ یعنی واوین کے درمیان کے الفاظ یہاں بدل گئے ہیں یا حذف ہوگئے ہیں؛ اور خطوط وحدانی کے اندر کے الفاظ سرے سے اصلی متن میں ہیں ہی نہیں۔
۲۷۲	۱۴۵	کلیاتِ عرفی: ۳۴۴۔ دراصل مصرع اوّل میں 'توئی' کی بجائے 'کمال' ہے۔
	۱۴۶	امیر خسرو کا شعر ہے (ردیف 'باقیست' کی جگہ 'باشد' ہے۔ (دیوان کامل امیر خسرو دہلوی: ۱۸۵) پورا شعر ہے: مَے حاجت نیست مستیم را / درچشم تو تا خمار باشد
	۱۴۷	حضرت امیر خسرو کا شعر ہے۔ دیکھیے، شعر العجم، ۲: ۱۵۶
	۱۴۸	سورۂ یوسف ۱۲: ۲۴ (اور یقیناً اس عورت نے اس کا قصد کیا اور اس نے اس عورت کا قصد کیا)
	۱۴۹	حضرت امیر خسرو کا شعر ہے (دیوان کامل اور امیر خسرو دہلوی: ۲۷۴) دیوان میں مصرع اولیٰ میں 'کشمکش' کی جگہ 'کشمکش' اور 'مدہوشی' کی جگہ 'بے ہوشی' ملتا ہے۔
	۱۵۰	مآثر الامرا کے اصلی الفاظ ہیں: ''غرض امتحان محبت بود، نہ تلخ کامی شما۔''
۲۷۳	۱۵۱	شفائی کا شعر ہے (شعر العجم، ۳: ۱۰۷) یہ شعر العجم کے متن میں دوسرے مصرع میں 'آزاد' کی جگہ 'بیداد' ہے اور یہ ہر لحاظ سے بہتر ہے۔
	۱۵۲	تمام ایڈیشنوں میں یہاں 'کے' ملتا ہے، لیکن یہ غالباً کاتب کی مہربانی ہے؛ فرد بمعنی فہرست حساب وغیرہ مؤنث ہے۔

۱۵۳۔ دارا شکوہ، شاہ جہان کا سب سے بڑا بیٹا ۱۹/صفر ۱۰۲۴ھ/۲۰/مارچ ۱۶۱۵ء کو پیدا ہوا۔ ویدانت اور ہندی فلسفے اور تصوف سے بہت شغف تھا۔ اس کی متعدد کتابیں ملتی ہیں۔ جن میں سے سفینۃ الاولیا، سکینۃ الاولیا، مکالمات بابالال' مجمع البحرین، سِرِّ اکبر زیادہ مشہور ہیں۔ وہ شاہ جہان کے بعد جانشینی کے جھگڑے کا شکار ہوا۔ اورنگ زیب نے اس کے خلاف علماء سے فتویٰ لیا، اور ۲۲/ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ/۱۰ستمبر ۱۶۵۹ء کو اسے

صفحہ	شمار	
		پھانسی دے دی گئی۔ (داراشکوہ انگریزی)
	۱۵۴	مآثر الامرا، ۱: ۷۹۱ میں جہاں یہ الفاظ ملتے ہیں، وہاں اس 'این' کی جگہ 'آن' ہے۔
	۱۵۵	کلیات فیضی: ۱۸۰۔
	۱۵۶	بکتاش بیگ اصفہانی کا شعر ہے (روز روشن: ۱۰۱) دونوں مصرعے مقدم و موخر ہو گئے ہیں۔
۲۷۴	۱۵۷	یہ واقعہ خود عاقل خان کے حالات میں صاحب مآثر الامرا نے لکھا ہے (۳: ۸۲۳)
	۱۵۸	دیکھیے: مآثر الامرا، ۱: ۷۹۰ زین آبادی کا اصلی نام ہیرا بائی تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب اورنگ زیب نے اسے اپنے خالو سے لینا چاہا، تو خان زمان نے کہا کہ اورنگ زیب اپنی حرم چتر بائی میرے حوالے کر دے، میں ہیرا بائی اسے دے دیتا ہوں؛ چنانچہ یہ تبادلہ ہو گیا۔ (احکام عالمگیری؛ ۸۰۷)
	۱۵۹	اس واقعے کا ذکر اطالوی سیاح منوچی نے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب اورنگ زیب نے گانے بجانے کی ممانعت کر دی تو "ایک روز جمعہ کے دن، جب اورنگ زیب مسجد کو جا رہا تھا، دلی کے تقریباً ایک ہزار موسیقار جمع ہوئے۔ وہ بیس جنازے اٹھائے تھے جنھیں خوب سجایا گیا تھا اور وہ ان کے ساتھ ساتھ اونچے اونچے نوحہ خوانی کرتے جا رہے تھے۔ اورنگ زیب نے جب دور سے مجمع دیکھا اور ان کا رونا دھونا سنا، تو تعجب کیا اور دریافت کروایا کہ اس جزع فزع کا کیا باعث ہے۔ اس پر ان لوگوں نے اور بھی زور شور سے رونا شروع کر دیا کہ شاید بادشاہ کو کچھ رحم آ جائے۔ پوچھنے پر موسیقاروں نے روتے بسورتے جواب دیا کہ حضرت ظل الٰہی نے موسیقی کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے، ہم اُسے دفن کرنے جا رہے ہیں۔ جب حضرت بادشاہ سلامت نے یہ سنا تو نہایت سکون سے جواب دیا کہ 'اس کی مغفرت کی دعا کرو؛ اور دیکھو اسے خوب گہرا دفن کرنا۔ اس کے باوجود اُمراء چوری چھپے گانا سنتے تھے؛ اور یہ پابندی صرف بڑے شہروں تک محدود رہ گئی تھی۔" سٹوریا ڈو موگر، ۲: ۶؛ نیز منتخب اللباب، ۲: ۲۱۲۔۲۱۳؛ مآثر عالمگیری: ۸۱۔۸۵؛ عالمگیر نامہ، ۳۵۴، ۳۹۱)
	۱۶۰	پیورٹین یعنی "خالص پسند" سولھویں صدی اور سترھویں صدی کے انگلستان کی اصلاحی تحریک، دراصل عیسائیت کے پروٹسٹنٹ فرقے کا زیادہ بارسوخ اور پرجوش طبقہ اس کا بانی اور روح و رواں تھا۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ ملکہ الزبیتھ کے عہد میں عیسائی مذہب کی

صفحہ	شمار	
		جتنی اصلاح ہوئی، یہ کافی نہیں تھی: اسے مکمل کرنا چاہیے۔ یہ گروہ دین و دنیا کے ہر شعبے میں انجیل اور عیسائیت کی تعلیم کے مطابق اصلاح اور تجدید کا حامی تھا۔
	۱۶۱	محمد فرخ سیر، اورنگ زیب کے بیٹے معظم شاہ عالم اول (بہادر شاہ اول) کا پوتا، خاندان مغلیہ کا پندرھواں بادشاہ ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۳ء سے ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء تک تخت پر متمکن رہا۔
	۱۶۲	محمد شاہ، فرخ سیر کا بھائی۔ اسی خاندان کا اٹھارواں بادشاہ اپنی عیش پسندی کے باعث رنگیلا کہلاتا ہے۔ ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء سے ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء تک حکمران رہا۔ نادر شاہ کا حملہ (۱۷۳۹ء) اسی کے عہد میں ہوا تھا۔
	۱۶۳	میر عبدالجلیل الحسنی الواسطی بلگرامی، فاضلِ اجل او رعالم شہیر ۱۳/شوال ۱۰۷۱ھ/۲/جون ۱۶۶۱ کو سید احمد حسین واسطی کے گھر میں پیدا ہوئے۔ تفسیر، حدیث۔ تاریخ، لغت، ادب اور شعران تمام علوم میں مہارت کاملہ حاصل تھی۔ عربی، فارسی، ترکی، ہندی زبانیں جانتے تھے۔ متعدد تصانیف ان سے یادگار ہیں۔ ۲۳/ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ/۱۸/دسمبر ۱۷۲۵ء کو دلی میں انتقال کیا۔ لاش بلگرام گئی اور وہیں دفن ہوئے۔ (خزانۂ عامرہ: ۳۵۲-۳۶۱؛ مآثر الکرام، ۱: ۲۵۷-۲۷۷؛ سبحۃ المرجان: ۷۹-۸۴؛ حدائق الحنفیہ: ۴۳۷؛ تذکرۂ بینظیر: ۹۰-۹۵؛ نزہۃ الخواطر ۶: ۱۳۹-۱۴۰؛ تذکرہ علمائے ہند: ۱۰۸-۱۰۹) مقبول احمد صمدنی نے 'حیات جلیل' کے نام سے ان کی مفصل سوانح عمری لکھی ہے۔
	۱۶۴	ان کی اس مثنوی کا اچھا طویل اقتباس ان کے نواسے سید غلام علی آزاد نے اپنے تذکرے خزانہ عامرہ (ص ۳۵۵-۳۵۹) میں دیا ہے؛ یہ صرف لباس کی صفت سے متعلق ہے۔ اسی سے اور تکلفات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔
۲۷۵	۱۶۵	آنندرام مخلص کے لیے دیکھیے، حاشیہ (۴) دیباچہ۔
	۱۶۶	تورات میں حضرت داؤد سے متعلق یہ روایت نہیں ملی۔
	۱۶۷	عرفی کا مصرع ہے (کلیات عرفی: ۲۱۶) مصرع اولی ہے: نوا را تلخ تر می زن، چو ذوق نغمہ کم یابی
۲۷۶	۱۶۸	والہ داغستانی، علی قلی خان نام، حضرت عباسؓ (عم رسول کریم صلعم) کی اولاد سے صفر ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء میں اصفہان میں پیدا ہوئے۔ نادر شاہی کے ڈر سے ہندوستان چلے آئے اور یہاں بتدریج ہفت ہزاری منصب تک پہنچے۔ ان کا اپنی بنت عم خدیجہ سلطان سے معاشقہ اور اس کا حسرتناک انجام سب تذکروں میں بیان ہوا ہے۔ ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۷ء میں دلی میں فوت ہوئے۔ "ریاض الشعرا" تذکرہ انھیں کی تالیف ہے

صفحہ	شمار	
		(خزانۂ عامرہ: ۴۴۶-۴۵۰؛ نزہتہ الخواطر، ۶: ۱۸۸)
	۱۶۹	قزلباش خان امید۔ اصلی نام میرزا محمد رضا تھا۔ طاہر وحید کے شاگرد تھے۔ جوانی میں بعہد عالمگیری ہمدان سے ہندوستان آئے۔ شاہ عالم اول کے دربار سے قزلباش خان خطاب ملا۔ ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء میں دلی میں انتقال ہوا۔ "جان دادہ قزلباش خان" تاریخ ہے (سروِ آزاد: ۲۰۹-۲۱۰)۔
	۱۷۰	میر معز فطرت موسوی۔ ان ک پورا نام میرزا معز الدین محمد تھا۔ امام ہفتم حضرت موسیٰ کاظم کی اولاد میں ۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۰-۱۶۴۱ء قم میں پیدا ہوئے۔ عالمگیر کے زمانے میں ۱۰۸۲ھ/ ۱۶۷۱-۱۶۷۲ء میں وارد ہند ہوئے۔ یہاں بہت عروج پایا۔ شاہ نواز خان صفوی کی صاحبزادی ان کے حبالہ عقد میں تھیں۔ پہلے عظیم آباد کے دیوان مقرر ہوئے۔ وہاں سے واپس آئے تو موسیٰ خان کے خطاب اور دیوانی تن کے عہدے سے سرفراز ہوئے، اور اگلے ہی برس مجموع ملک دکن کے دیوان مقرر ہوگئے۔ دکن ہی میں ۱۱۰۱ھ/ ۱۶۸۹-۱۶۹۰ء میں رحلت کی۔ پہلے تخلص فطرت تھا، اسے بدل کر موسوی کرلیا۔ خان کا خطاب ملا، تو اسے موسوی پر اضافہ کیا اور اسی لیے موسوی خان کے نام سے مشہور ہوئے۔ (سروِ آزاد: ۱۲۶-۱۲۷)
	۱۷۱	موتمن الدولہ اسحٰق خان شوستری ان کے والد شوستر سے ہندوستان آئے تھے؛ خود یہ دلی میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی نظم ونثر میں صاحب استعداد تھے۔ ۱۱۵۲ھ/ ۱۷۳۹-۱۷۴۰ء میں انتقال کیا۔ (خزانۂ عامرہ: ۱۲۲-۱۲۳)
	۱۷۲	متن میں قاضی محمد خان چھپا تھا، یہ سہو ہے؛ ان کا ٹھیک نام قاضی محمد صادق اور تخلص اختر تھا۔ ہوگلی کے سربرآوردہ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ متعدد علوم میں دستگاہ تھی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ غازی الدین حیدر شاہ اودھ نے انھیں خطاب ملک الشعرا عطا کیا تھا۔ ان کی متعدد تصانیف ملتی ہیں اور ضخیم تذکرۂ شعرا بھی 'آفتاب عالمتاب' کے نام سے لکھا تھا۔ نواب محمد صدیق حسن خان کے زمانہ اقتدار میں جو تذکرے بھوپال سے شائع ہوئے ان میں سے بیشتر اسی پر مبنی تھے۔ لکھنؤ ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا۔ (شمع انجمن: ۶۳؛ روزِ روشن: ۳۷-۳۸)
	۱۷۳	اس سلسلے میں میر غلام علی آزاد بلگرامی اپنے تذکرے سروِ آزاد (ص ۲۰۹) میں لکھتے ہیں: "......خوش خلق، رنگین صحبت بود و موسیقی ہندی، باوصف ولایت زا بودن خوب می دانست و می گفت۔"

صفحہ	شمار	
	۱۷۴	شیخ علی حزیں۔ شیخ محمد علی اصفہانی، ربیع الثانی ۱۱۰۳ھ / ۶ر جنوری ۱۶۹۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب شیخ زاہد گیلانی (مرشد شیخ صفی الدین اردبیلی) تک پہنچتا ہے: شعرو شاعری کے علاوہ دیگر علوم میں بھی دستگاہ کامل تھی۔ بلکہ شاعری ان کے لیے باعث فخر نہیں تھی۔ دورِ نادرشاہی میں ترک وطن پر مجبور ہوئے اور منزل بمنزل دلی آئے۔ یہاں انھوں نے اہل ہند کی ہجو کہی جس پر لوگ بہت برافروختہ ہوگئے۔ اس پر یہ آگرے اور پھر وہاں سے نقل مکان کر کے بنارس پہنچے۔ پہلے ارادہ بنگال جانے کا تھا، لیکن پٹنے سے بنارس واپس آگئے۔ یہیں ۱۱ر جمادی الاول ۱۱۸۰ھ / ۱۷ر اگست ۱۷۶۶ء کو انتقال ہوا۔ اپنی تعمیر کروائی ہوئی قبر واقع فاطمان میں دفن ہوئے۔ (خزانہ عامرہ: ۱۹۳۔۲۰۰؛ نزہۃ الخواطر، ۶: ۳۳۳۔۳۳۵)
۲۷۷	۱۷۵	تفضل حسین خان علامہ، سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ فاضل زمانہ تھے۔ عربی فارسی کے علاوہ انگریزی اور یونانی اور لاطینی بھی جانتے تھے۔ لکھنؤ میں بہت عروج پایا۔ نواب آصف الدولہ کے وکیل اور نواب سعادت علی خان کے اتالیق تھے۔ آصف الدولہ کے وکیل کی حیثیت سے کلکتہ میں مقیم رہے۔ کلکتہ ہی سے لکھنؤ واپس آرہے تھے کہ راستے میں مرشد آباد کے قریب ۱۵ر شوال ۱۲۱۵ھ / یکم مارچ ۱۸۰۱ء کو انتقال ہوا۔ اب ان کے صرف علم ریاضی میں دو تین رسالے ملتے ہیں۔ (مفتاح التواریخ: ۱۷۱۔۱۳۷۔ نزہۃ الخواطر، ۷: ۱۰۹۔۱۱۱) تذکرۂ علمائے ہند: ۳۶۔۳۷؛ تاریخ اودھ: ۳۴۵۔۳۴۹)
	۱۷۶	شوستری سے سید عبداللطیف خان شوستری مراد ہیں۔ یہ دولت آصفیہ کے دیوان میر عالم (ف ۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء) کے چچیرے بھائی تھے۔ ان کے والد کا نام سید ابی طالب تھا (جن کے بھائی سید رضی میر عالم کے والد تھے) وہ ۹ر ذی الحجہ ۱۱۷۲ھ / ۳ر اگست ۱۷۵۹ء کو شوستر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ایران و عراق کے علماء سے پائی اور مختلف علوم میں استادانہ دستگاہ پیدا کی۔ شوال ۱۲۰۲ھ / جولائی ۱۷۸۸ء میں بصرہ سے بذریعہ جہاز روانہ ہوکر محرم ۱۲۰۳ھ / اکتوبر ۱۷۸۸ء میں کلکتہ پہنچے۔ میر عالم ان سے پہلے ہندوستان آچکے تھے اور حیدر آباد میں آصف جاہ ثانی نظام علی خان کے دربار میں انھیں بہت عروج حاصل ہوا تھا۔ اسی زمانے میں وہ نظام کے سفیر بن کر لارڈ کارنوالس کے پاس کلکتہ آئے۔ یہیں ان کی ملاقات شوستری سے ہوئی اور انھوں نے انھیں اپنی جگہ حیدر آباد کا سفیر مقرر کروادیا۔ کلکتہ سے واپسی سے پر میر عالم کا ستارہ زوال میں آگیا۔ شوستری بھی بالآخر حیدر آباد آئے اور جب ریاست کے ابتر حالات دیکھے تو یہاں سے

صفحہ	شمار	
		روانہ ہو کر پورنہ میں مقیم ہو گئے۔ جب میر عالم بعہد سکندر جاہ دوبارہ منصب دیوانی پر فائز ہوئے، تو انھوں نے شوستری کو بھی حیدر آباد بلایا۔ (ماخوذ از تحفۃ العالم) ان کے اس کے بعد کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔
	۱۷۷	تحفۃ العالم۔ شوستری نے وسط جمادی الاول ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء میں مکمل کی، جب وہ ہنوز حیدر آباد میں تھے۔ جب وہ دوسری مرتبہ یہاں آئے تو اس کا تمتہ ذیل التحفہ کے عنوان سے قلم بند کیا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء میں دار الطبع سرکار عالی حیدر آباد میں چھپی تھی؛ دوسری مرتبہ مطبع شوکت الاسلام، حیدر آباد میں چھپی۔
	۱۷۸	دیکھیے، تحفۃ العالم: ۳۳۳ (طبع اول)؛ ص ۲۸۸ (طبع ثانی، شوستری کے الفاظ ہیں: ''نماز عشائین ادا کردہ یکنجے یکہ و تنہا کہ بجز کتب چیزے دیگر نزدیک اُو نبود، بمطالعہ در مسائل دقیقہ مشغول می شد تا اطلوع صبح صادقہ نماز صبح را کردے و بخوابگاہ رفتے و دو سہ کس خوانندہ خوش آواز نوکر داشت۔ ایشاں آمدہ باسہ تار و چہار تار برامشگری و زمزمہ مشغول می شدند، تا بخواب می رفت۔''
	۱۷۹	بحر العلوم سے مراد مولوی عبد العلی ہیں جو درس نظامیہ کے بانی ملا نظام الدین بن ملا قطب الدین سہالوی کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ظاہر ہے کہ علم میں اپنے نامور خاندان کے فخر تھے۔ لکھنؤ میں ایک سال تعزیہ نکلنے پر کچھ فساد ہو گیا) تو شیعی حکومت وقت نے انھیں خارج البلد کر دیا۔ یہ حافظ رحمت خان رئیس بریلی کے پاس چلے گئے اور ان کی زندگی بھر وہیں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ ان کے انتقال کے بعد نواب فیض اللہ خان والی رامپور نے بلا لیا لیکن مشاہرے کی کمی کے باعث یہاں ان کا دل نہ لگا اور یہ منشی صدر الدین کے بلاوے پر بوہار چلے گئے۔ یہاں بہت فراغت حاصل تھی لیکن منشی صدر الدین سے غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ جب ان حالات کی اطلاع نواب والا جاہ محمد علی کو ملی تو انھوں نے بڑے اعزاز و اکرام سے انھیں کرناٹک بلوایا۔ یہاں بہت آرام و آسائش سے بسر ہوئی۔ بحر العلوم خطاب بھی نواب والا جاہ ہی نے دیا تھا۔ ۸۳ برس کی عمر تھی جب ۱۲ رجب ۱۲۲۵/ ۱۳ اگست ۱۸۱۰ء کو مدارس ہی میں انتقال ہوا۔ وہیں مسجد والا جاہی میں مزار ہے (تذکرے علمائے فرنگی محل: ۱۳۷۔۱۴۱؛ تذکرہ علمائے ہند: ۱۲۲۔۱۲۳؛ حدائق الحنفیہ: ۴۶۷؛ نزہۃ الخواطر، ۷: ۲۸۲۔۲۸۷؛ مقالات شبلی ۳: ۱۱۶۔۱۲۵)
	۱۸۰	بحر العلوم ملا عبد العلی کے حالات متعدد تذکروں میں ملتے ہیں کہیں مجمل، کہیں مفصل؛ لیکن کسی جگہ ان کے فن موسیقی میں رسوخ کا خاص طور پر ذکر دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ البتہ

صفحہ	شمار	
		ٹھیک ہے کہ درس نظامی میں ریاضی پر خاص توجہ تھی؛ اور موسیقی بھی اسی کی شاخ ہے۔ شاید اس طرح سے بحر العلوم نے موسیقی میں بھی کچھ درک حاصل کر لیا ہو۔
	۱۸۱	اکبر، خاندان مغلیہ کا گل سر سبد، امر کوٹ کے مقام پر یکشنبہ ۵ر رجب ۹۴۹ھ / ۱۵ر اکتوبر ۱۵۴۲ء کو پیدا ہوا۔ اپنے والد ہمایوں کی وفات کے بعد بعمر ۱۴ سال بروز جمعہ ۲ر ربیع الاول ۹۶۳ھ / ۱۵ر جنوری ۱۵۵۶ء کو تخت پر بیٹھا وار ۶۵ سال کی عمر میں ۱۳ر جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ / ۱۶ر اکتوبر ۱۶۰۵ء کو آگرے میں فوت ہوا؛ سکندرہ میں مدفون ہے۔
	۱۸۲	صفدر جنگ والی اودھ، اصلی نام میرزا مقیم عرف منصور علی۔ برہان الملک سعادت خان کا داماد اور جانشین ہوا۔ ۱۷ر ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ / ۱۷ر اکتوبر ۱۷۵۸ء کو پاپر گھاٹ کے مقام پر انتقال ہوا۔ لاش چندے امانتاً گلاب باڑی فیض آباد میں دفن رہی اور وہاں سے خاص مقبرہ صفدر جنگ، شاہ مرداں، دلی میں لا کر سپرد خاک کی گئی۔ (تاریخ اودھ (جلد سوم)۔
	۱۸۳	واجد علی شاہ، آخری شاہ اودھ، ۱۰ر ذی قعدہ ۱۲۳۸ھ / ۱۸ر اگست ۱۸۲۳ء کو پیدا ہوئے اور اپنے والد امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد ۲۶ر صفر ۱۲۶۳ھ / ۱۳ر فروری ۱۸۴۷ء کو سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ ان کے زمانے میں نظام سلطنت بالکل درہم برہم ہو گیا۔ انگریز بہت پہلے سے اودھ میں اپنے قدم خوب مضبوط کر چکے تھے؛ آخر انھوں نے فروری ۱۸۵۶ء میں انھیں معزول کر کے کلکتے بھیج دیا؛ اور اودھ کا سلطنت انگلشیہ کے ساتھ الحاق ہو گیا۔ واجد علی شاہ کا پندرہ لاکھ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا تھا، لیکن چونکہ عملہ فعلہ بہت بڑا تھا اور عادات مسرفانہ تھیں یہ رقم ان کے خرچ کو کفایت نہیں کرتی تھی۔ منجملہ اور دلچسپیوں کے شاعری سے بھی بہت لگاؤ تھا؛ اختر تخلص تھا اور اسیر اور برق سے مشورہ کرتے تھے۔ کلکتے ہی میں ۳ر محرم ۱۳۰۵ھ / ۲۱ر ستمبر ۱۸۸۷ء کو انتقال ہوا۔ امام باڑہ سبطین آباد آخری آرام گاہ ہے۔ (تاریخ اودھ، جلد پنجم)
	۱۸۴	علی نقی۔ واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے وقت امین الدولہ وزیر اعظم اودھ تھے۔ واجد علی شاہ نے چندے انتظار کیا اور اس کے بعد انھیں الگ کر کے علی نقی خان کو وزارت اعلیٰ کا منصب عطا کر دیا۔ حالات جس طرح کے تھے ان میں کوئی شخص بھی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر وہی ہوا، جو ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ علی نقی خان کی انگریزوں سے ساز باز تھی اور واجد علی شاہ کی معزولی میں ان کا بھی ہاتھ تھا۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ان کی ایک بیٹی واجد علی شاہ سے بیاہی تھی۔ (تاریخ اودھ جلد پنجم)

صفحہ	شمار	
۲۷۸	۱۸۵	قرآن سورۃ الاعراف ۷: ۳۱۔ یعنی، خدا کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی اچھی چیزیں، کس نے حرام کی ہیں۔
	۱۸۶	مومن دہلوی کا شعر ہے، (کلیات مومن، ۱: ۷۹) البتہ صحیح پہلا مصرع یوں ہے مومن ! آ کیشِ محبت میں کہ ہے سب جائز
	۱۸۷	کلیاتِ بیدلؔ، عنصر اول: ۴۷۔ مطبوعہ کلیات کے مصرع اولیٰ میں 'یک حرف' کی جگہ 'یک نقطہ' ہے۔

ا۔ فہرستِ اعلام

۲۔ فہرستِ بلاد واماکن

۳۔فہرست آیات قرآنی وررودۂ متن

اَلرَّحمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی	(طٰہٰ ۲۰۔۵)	:	۱۴۰
اِنَّ اللّٰہَ لاَ یَغْفِرُ اَنْ یُشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰالِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ	(النساء ۴۔۴۸)	:	۱۳۹
اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ	(الفجر ۸۹:۱۴)	:	۱۴۰
بَاطِنُہٗ فِیْہِ الرَّحْمَۃُ وَ ظَاھِرُہٗ مِنْ قِبَلِہِ الْعَذَاب	(الحدید ۵۷:۱۳)	:	۱۰۵
بَلْ یَدَاہُ مَبْسُوْطَتَانِ	(المائدہ ۵۔۶۴)	:	۱۴۰
فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْھَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَایَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْض	(الرعد ۱۳:۱۷)	:	۱۴۰
فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا اطَیِّباً	(النساء ۴:۴۳)	:	۲۲۹
فَضَرَبْنَا عَلٰی اٰذَانِھِمْ فِي الْکَھْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا	(الکھف ۱۸:۱۱)	:	۱۰۳
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْق	(الاعراف ۷:۱۳)	:	۲۷۸
کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَانٍ!	(الرحمٰن ۵۵:۲۹)	:	۱۴۰
لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ	(الانعام ۶:۱۳۰)	:	۱۳۹

۴۔ فہرستِ کتب واردۂ متن

۵۔ فہرست مآخذ حواشی

آتشکدۂ آذر :	لطف علی بیگ آذر	تہران ، ۱۳۳۷ شمسی
آثار الصنادید:	سر سید احمد خان	دلی ، ۱۹۶۵ء
آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی :	مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی	دلی ، اپریل ۱۹۸۸ء
آفتاب داغ :	نواب مرزا خان داغ	لکھنؤ، ۱۹۳۲ء
آئین اکبری :	ابوالفضل (مرتبہ سر سیّد احمد خان)	دہلی، ۱۲۷۴ء
اتحاف النبلا:	نواب محمد صدیق حسن خان	
احکام عالمگیری:	حمید الدین خان (مرتبہ جادو ناتھ سرکار)	کلکتہ ، ۱۹۱۲ء
احیاء العلوم الدین :	امام محمد بن محمد الطوسی الغزالی	قاہرہ، ۱۹۳۹ء
اخبار الاخیار :	شیخ عبدالحق محدث دہلوی	دہلی، ۱۳۳۲ھ
اخبار العلماء باخبار الحکماء:	للقفطی	قاہرہ : ۱۳۲۶ھ
اذکار الابرار المشہور بہ تذکرہ الاقطاب :	حافظ نور الدین احمد	کلکتہ، ۱۳۲۸ھ
ارشاد الادیب:	معجم الادباء	
الاعلام:	خیر الدین الزرکلی (طبع دوم)	قاہرہ، ۱۲۵۴ء بعد
الاغانی:	ابوالفرج الاصفہانی (طبع دار الکتب المصریہ)	قاہرہ، ۱۳۴۵ھ بعد

الاصابہ:	ابن حجر العسقلانی	مصر، ۱۹۳۹ء
اَمثال وحِکَم :	علی اکبر دہخدا	تہران :۱۳۳۸ھ شمسی بعد
اورنگ زیب (انگریزی) :	سر جادو ناتھ سرکار	کلکتہ ، ۱۹۲۴ء
بادشاہ نامہ :	عبدالحمید لاہوری	کلکتہ ' ۱۸۶۶ء بعد
	(مرتبہ کبیرالدین احمد و عبدالرحیم)	
البدایہ والنہایہ :	ابن کثیر	قاہرہ ' ۱۳۴۸ھ
البدرالطالع بمحاسن: من بعد القرن السابع	للشوکانی	قاہرہ : ۱۳۶۶ھ
بزم ایران:	سید محمد رضا طباطبائی	لکھنؤ' ۱۹۲۴ء
بہترین اشعار :	ح یغمان	طہران' ۱۳۱۳ شمسی
تاریخ آداب اللغتہ العربیہ:	لجرجی زیدان	قاہرہ' ۱۹۱۳ء بعد
تاریخ اودھ :	محمد نجم الغنی (مطبع نول کشور)	لکھنؤ ۱۹۱۰ء بعد
تاریخ بغداد :	خطیب بغدادی	قاہرہ ، ۱۳۴۹ھ بعد
تاریخ فرشتہ :	محمد قاسم فرشتہ	بمبئی دسمبر ۱۸۳۲ء / رجب ۱۲۴۷ھ
تحفۃ العالم:	سید عبداللطیف شوستری	حیدر آباد' ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء
تذکرۃ الشعراء :	دولت شاہ سمرقندی ر (سلسلۂ اوقاف گب)	لائیڈن ' ۱۳۰۵ھ
تذکرۃ الاولیاء :	شیخ فریدالدین عطار (سلسلۂ اوقاف گب)	لائیڈن' ۱۹۰۵ء
تذکرۃ الواصلین:	محمد رضی الدین فرشوری بسمل (دوسری بار)	بدایوں' ۱۹۴۵ء
تذکرۂ بے نظیر :	سید عبدالوہاب افتخار (مرتبہ سید منظور علی)	آلہ آباد ، ۱۹۴۰ء
تذکرۂ عزیزیہ:	قاضی بشیرالدین احمد میرٹھی	میرٹھ، ۱۹۳۴ء
تذکرۂ علمائے فرنگی محل:	مولوی محمد عنایت اللہ انصاری فرنگی محل	لکھنؤ ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء
تذکرۂ علمائے ہند:	رحمان علی	لکھنؤ، ۱۹۱۴ء
ترجمان القرآن (ا):	مولانا ابوالکلام آزاد (ساہتیہ اکادمی ایڈیشن)	نئی دلی ، ۱۹۸۰ء
التمثیل والمحاضرہ :	ثعالبی	قاہرہ ۱۹۶۱ء

تورات	(کتاب مقدس)	انگلستان ، ۱۹۵۸ء
تزک جہانگیری :	نورالدین جہانگیر پادشاہ	علی گڈھ ، ۱۸۶۴ء
	(مرتبہ سر) سید احمد (خان)	
جمہرۃ اشعار العرب :	تالیف ابوبکر محمد بن ابی الخطاب القرشی	قاہرہ ، ۱۳۰۸ھ
جمہرۃ الامثال :	ابو ہلال العسکری	بمبئی ، ۱۳۰۶
جواہر سخن (۲):	مرتبہ سید مسعود حسین رضوی ادیب	الہٰ آباد، ۱۹۳۵ء
چہار مقالہ :	نظامی عروضی سمرقندی (مرتبہ ڈاکٹر محمد معین)	تہران، ۱۳۳۵ شمسی
حبیب السیر :	اخوند میر	تہران، ۱۳۳۳ شمسی
حدائق الحنفیہ:	مولوی فقیر محمد جہلمی ثم لاہوری (نولکشور)	لکھنؤ، ۱۸۸۶ء/۱۳۰۳
حلیۃ الاولیا :	ابو نعیم اصفہانی	قاہرہ ، ۱۹۳۲ء
الحماستہ :	لابی تمام	بون ، ۱۸۲۸ بعد
الحماستہ :	للبحتری (مرتبہ لوئیس شیخو)	بیروت ، ۱۹۱۰ء
الحماستہ المصریہ :	لصدرالدین علی المصری	
	(مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد) دائرۃ المعارف	حیدرآباد، ۱۹۶۴ء
حیات جلیل :	مقبول احمد صمدانی	الہ آباد، ۱۹۲۹ء
خریطۂ جواہر :	مرتبہ مظہر جانجانان مطبع مصطفائی	کان پور، ۱۲۷۱ء
خزانۂ عامرہ :	سید غلام علی آزاد بلگرامی (نولکشور)	کان پور ، ۱۸۷۱ء
خلاصہ الاثر فی اعیان :	للمحبی	قاہرہ ، ۱۳۸۴ء
القرآن الحادی العشر		
خم خانۂ جاوید (۱)	لالہ سری رام	لاہور، ۱۹۰۸ء

فہرست مآخذ حواشی

دارا شکوہ (انگریزی): ک ، ر، قانونگو — کلکتہ ، ۱۹۵۲ء

داستان نل و دمن : ابوالفیض فیضی — تہران ، ۱۳۳۵ شمسی

الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین : حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی — دہلی ، ۱۸۹۹ء

دربار اکبری : مولانا محمد حسین آزاد — لکھنؤ

دیوان ابی الطیب المتنبی : تحقیق عبدالوہاب عزام — قاہرہ ، ۱۳۶۳ھ

دیوان ابی فراس الحمدانی — بیروت ، ۱۹۵۹ء

دیوان ابن سناء الملک: تحقیق افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق — حیدرآباد ، ۱۹۵۸ء

دیوان ابی نواس: تحقیق احمد عبدالمجید الغزالی — قاہرہ ، ۱۹۵۳ء

دیوان کامل: امیر خسرو دہلوی (سعید نفسی) — تہران ، ۱۳۴۳ شمسی

دیوان اوس بن حجر: تحقیق ڈاکٹر محمد یوسف نجم — بیروت ، ۱۹۶۵ء

دیوان بابا فغانی شیرازی: فغانی شیرازی — تہران ، ۱۳۶۱ شمسی

دیوان بشار بن برد: تحقیق بدر الدین العلوی — بیروت ، ۱۹۶۵ء

دیوان بیدل: بیدل عظیم آبادی نولکشور — کانپور ، ۱۳۰۳ھ

دیوان کامل جامی: مُلّا نور الدین جامی (مرتبہ ہاشم رضی) — تہران ، ۱۳۴۱ شمسی

دیوان حالی: شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی — دلّی ، ۱۹۵۰

دیوان حسن سجزی دہلوی: امیر حسن علاء سجزی — حیدرآباد ، ۱۳۵۲

دیوان حکیم سنائی: مرتبہ مظاہر مصفا — تہران ، ۱۳۳۱ شمسی

دیوان خاقانی: مرتبہ محمد عباسی — تہران ، ۱۳۳۲ شمسی

دیوان خاقانی (۲ حصے) نولکشور — لکھنؤ ، ۱۸۹۲ء

دیوان درد: خواجہ میر درد (مجلس ترقی ادب) — لاہور ، ۱۹۶۲ء

دیوان ذوق : شیخ محمد ابراہیم ذوق (مرتبہ آزاد) — لاہور ، ۱۹۳۳ء/۱۳۵۱ھ

دیوان ذوق: شیخ محمد ابراہیم ذوق (مرتبہ ویران) — دلّی ، ۱۲۷۹ھ

دیوان سلمان ساوجی (با مقدمہ دکتر تقی تفضلی) — تہران ، ۱۳۳۲ شمسی

دیوان سعدی شیرازی (بکوشش مظاہر مصفیٰ) — تہران ، ۱۳۴۰ شمسی

دیوان غالب (اردو)	میرزا اسد اللہ خان غالب (مرتبہ مالک رام)	دلی، ۱۹۵۷ء
دیوان غنی :	مُلا محمد طاہر غنی کشمیری (مرتبہ علی جواد زیدی)	دلی ۱۹۶۴ء
دیوان غنیمت:	کنجاہی (بتصحیح غلام ربانی عزیز)	لاہور ۱۹۵۸ء
دیوان فروغی بسطامی:	بکوشش حسین نخعی	تہران ۱۳۳۲ شمسی
دیوان فیضی:	ابو الفیض فیضی	دلی، ۱۲۶۸ھ
دیوان قاآنی: میرزا حبیب	(مرتبہ محمد جعفر محجوب)	تہران، ۱۳۳۶ شمسی
دیوان کامل	خواجہ حافظ شیرازی	تہران، ۱۳۳۹ شمسی
دیوان کلیم کاشانی:	ابو طالب کلیم (بتصحیح و مقدمہ پرتو ضیائی)	تہران، ۱۳۳۶ شمسی
دیوان ملا	نور الدین ظہوری	نولکشور لکھنؤ ۱۸۹۷ء
دیوان ناسخ:	امام بخش ناسخ	نولکشور، کانپور ۱۸۸۶ء
دیوان نظیری نیشاپوری:	محمد حسین نظیری (مرتبہ مظاہر مصفا)	تہران، ۱۳۴۰ شمسی
دیوان وحشی مافقی:	مولانا کمال الدین (مرتبہ حسین نخعی)	تہران، ۱۳۳۹ شمسی
رباعیات عمر خیام:	مرتبہ دکتور فریدرخ روزن چاپ خانہ کاویانی	برلین، ۱۳۰۴ شمسی
الرسالہ:	امام ابو القاسم القشیری	قاہرہ، ۱۲۸۴ھ
روح انیس:	مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب	انڈین پریس الہ آباد
روز روشن (تذکرہ):	مولوی محمد مظفر حسین صبا	بھوپال، ۱۲۹۷ھ
ریاض العارفین:	رضا قلی خان ہدایت	تہران، ۱۳۴۴ شمسی
زبور عجم:	اقبال	لاہور، ۱۹۵۸ء
سبحتہ المرجان:	میر غلام علی آزاد بلگرامی (طبع میرزا محمد شیرازی ملک الکتاب)	بمبئی ۱۳۰۳ھ
سٹوریا ڈو موگر (انگریزی):	نکولاو منوچی	کلکتہ، ۱۹۶۶ء
سرو آزاد:	میر غلام علی آزاد بلگرامی	حیدر آباد، ۱۹۱۳ء

(مرتبہ عبداللہ خان و مولوی عبدالحق)

سفینۂ خوشگو: بندرابن خوشگو پٹنہ، ۱۹۵۹ء

(مرتبہ شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی)

سفینہ ہندی بھگوان داس ہندی پٹنہ، ۱۹۵۸ء

(مرتبہ شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی)

سمط اللآلی (۱) عبدالعزیز الیمنی قاہرہ، ۱۶۳۲ء

سہ نثر ظہوری: مُلّا نور الدین ظہوری مطبع نظامی کانپور، ۱۲۷۱ھ

سیّدہ الغناء العربی: ام کلثوم قاہرہ

السیرۃ لابن ہشام: ابن ہشام قاہرہ، ۱۳۵۶ھ

شاہنامہ: فردوسی (مرتبہ محمد دبیر سیاقی) تہران ۱۳۳۵ شمسی

شاہنامہ: فردوسی (مرتبہ سعید نفیسی) طہران، ۱۳۱۴ھ

شرح التعرف المذہب التصوف از ابو ابراہیم اسماعیل نولکشور لکھنؤ، ۱۹۱۲ء

شرح مقامات الحریری: الشریشی قاہرہ ۱۳۱۴ھ

شرح نہج البلاغہ: ابن میثم بحرینی تہران، ۱۲۴۰ھ

شرح نہج البلاغہ: ابن ابی الحدید تہران، ۱۲۷۱ھ

شروح سقط الزند: ابو العلاء المعرّی قاہرہ، ۱۹۴۷ء بعد

شعر العجم: شبلی نعمانی اعظم گڈھ، ۱۹۴۰ء بعد

الشعر والشعراء: ابن قتیبہ (تحقیق استاد احمد محمد شاکر) قاہرہ، ۱۹۵۰ء

شمع انجمن (تذکرہ): نواب محمد صدیق حسن خان بھوپال، ۱۲۹۳ء

صحیح بخاری: امام بخاری مطابع الشعب، قاہرہ، ۱۳۷۸ھ

صنم خانۂ عشق: امیر مینائی امیر المطابع حیدر آباد ۱۳۳۹ھ

ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی: حالی دہلی، ۱۳۳۲ھ

فہرست مآخذ حواشی

طبقات اکبری: نظام الدین احمد (ببلیوتھکا انڈکا) کلکتہ ۱۹۱۳ء بعد

الطبقات الکبریٰ: الشعرانی قاہرہ، ۱۲۷۶ھ

عالمگیر نامہ: محمد کاظم (مرتبہ خادم حسین و عبدالحی) کلکتہ، ۱۸۶۸ء

عجائب الآثار فی التراجم والاخبار: عبدالرحمٰن الجبرتی قاہرہ، ۱۳۲۲ھ

العقد الفرید: ابن عبدربہ (تحقیق احمد امین مصری) قاہرہ، ۱۹۴۸ء بعد

الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ: عبدالحی لکھنوی قاہرہ، ۱۳۲۴ھ

الفہرست: ابن ندیم لائپزگ، ۱۸۷۱ء

فیہ مافیہ: جلال الدین رومی (مرتبہ بدیع الزمان فروزاں فر) تہران، ۱۳۳۰ شمسی

قرآن کریم (طبع دارالکتب المصریہ) قاہرہ، ۱۳۵۲ھ

قران السعدین: امیر خسرو علی گڈھ، ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء

قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب: ابوطالب المکی قاہرہ

الکامل: للمبرد (تحقیق ڈاکٹر زکی مبارک) قاہرہ، ۱۹۳۶ء

کتاب الحیوان للجاحظ (تحقیق عبدالسلام محمد ہارون) قاہرہ، ۱۹۴۸ء بعد

کتاب تاریخ اعلام الموسیقی الشرقیہ: عبدالمنعم عرفہ مطبع عنانی: قاہرہ، ۱۹۴۷ء

کشف الظنون: حاجی خلیفہ استانبول، ۱۹۵۴ء

کشف المحجوب: الہجویری (مرتبہ پروفیسر نکلسن) لاہور، ۱۹۳۱ء لندن ۱۹۳۶ء

کلام انشاء: انشاء اللہ خان انشا الہ آباد، ۱۹۵۲ء

(مرتبہ مرزا محمد عسکری و محمد رفیع)

کلام شاد: سید علی محمد شاد عظیم آبادی جامعہ ملیہ علی گڈھ، ۱۳۴۱ء

کلمات الشعراء (تذکرہ): محمد افضل سرخوش لاہور، ۱۹۴۲ء

(تصحیح صادق علی دلاوری)

کلیات اکبر الہ آبادی کراچی، 1951ء بعد

کلیات آتش: حیدر علی آتش نولکشور لکھنؤ، ۱۹۲۹ء

کلیات بیدل (۱، ۲، ۴) میرزا عبدالقادر بیدل کابل، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲

کلیات ٹینی سن انگریزی:	لارڈ ٹینی سن	لندن ۱۹۶۳ء
کلیات جامی:	ملا نورالدین جامی	نولکشور لکھنؤ
کلیات حزین:	شیخ محمد علی حزین	نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۶ء
کلیات سعدی:	سعدی شیرازی (مرتبہ مظاہر مصفا)	تہران ۱۳۴۰ شمسی
کلیات سودا:	مرزا محمد رفیع سودا (مرتبہ عبدالباری آسی)	نولکشور لکھنؤ ۱۹۳۲ء
کلیات شاد	مرتبہ کلیم الدین احمد،	پٹنہ، ۱۹۷۵ء
کلیات شبلی اردو،	شبلی نعمانی	دارالمصنفین اعظم گڈھ ۱۹۴۰ء
کلیات شبلی فارسی:	شبلی نعمانی	دارالمصنفین اعظم گڈھ
کلیات صائب تبریزی	صائب تبریزی (مرتبہ امیری فیروزکوہی)	تہران، ۱۳۳۶ شمسی
کلیات عرفی شیرازی:	عرفی شیرازی (ترتیب غلام حسین جواہری)	ایران
کلیات فیضی	(مرتبہ اے ڈی ارشد)	لاہور، ۱۹۶۷ء
کلیات غالب:	اسداللہ خان غالب دہلوی	نولکشور لکھنؤ ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء
کلیات مومن (۲ حصہ):	حکیم مومن دہلوی (مجلس ترقی ادب)	لاہور ۱۹۶۴ء
کلیات میر:	میر تقی میر دہلوی (مرتبہ عبدالباری آسی الدنی)	نولکشور لکھنؤ ۱۹۴۰ء
کلیات ناظم:	نواب محمد یوسف علی خان ناظم رام پوری مطبع حسنی،	رام پور، ۱۲۷۸ھ
کلیات نظیر اکبر آبادی:	ولی محمد نظیر اکبر آبادی	نولکشور لکھنؤ، ۱۹۵۱ء
کلیات نعت:	مولوی محمد محسن	الناظر پریس لکھنؤ ۱۳۳۴ھ
کلیات یغمائے جندقی:	میرزا ابوالحسن یغما جندقی	تہران ۱۳۳۹ شمسی
گلزار داغ:	نواب مرزا خان داغ دہلوی	مطبع انوار محمدی لکھنؤ ۱۲۹۲ھ

فہرست مآخذ حواشی

گلستان سخن:	مرزا قادر بخش صابر	نولکشور ۱۲۷۱ھ
گلستان مسرت:	عبدالرحمٰن شاکر	دہلی، ۱۲۶۷ھ
گلشن بے خار:	نواب مصطفیٰ خان شیفتہ	نولکشور لکھنؤ، ۱۹۱۰ء

لسان المیزان: ابن حجر العسقلانی — حیدرآباد، ۱۳۳۱ھ

ماثر الآمرا: شاہنواز خان صفوی — کلکتہ، ۱۸۸۸۔۱۸۹۱ء
(مرتبہ اشرف علی و عبدالرحیم)

مآثر الکرام: میر غلام علی آزاد بلگرامی — آگرہ، ۱۹۱۰ء، ۱۳۲۸ھ
(مرتبہ عبداللہ خان)

مآثر رحیمی: ملا عبدالباقی نہاوندی — کلکتہ، ۱۹۳۰۔۱۹۳۱ء
(مرتبہ ہدایت حسین)

مآثر عالمگیری: محمد ساقی مستعد خان — کلکتہ، ۱۸۷۱ء
(مرتبہ آغا احمد علی)

مجموعہ حالات عزیزی: ظہیر الدین سید احمد ولی اللہی — دہلی، ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء

محاضرات الادباء: راغب اصفہانی — بیروت، ۱۹۶۱ء

مرأة الغیب: امیر مینائی — نولکشور کانپور، ۱۸۹۲ء

معجم البلدان: یاقوت الحموی — بیروت، ۱۹۵۵ء

معجم المولفین: عمر رضا کحالہ — دمشق، ۱۹۶۰ء

مفتاح التواریخ: طامس ولیم بیل — نولکشور کانپور، ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء

مقالات شبلی (۳) شبلی نعمانی — اعظم گڈھ، ۱۹۵۵ء
(مرتبہ سید سلیمان ندوی)

مکاتیب سنائی: حکیم سنائی — علی گڈھ، رام پور ۱۹۲۶ء
(مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد) از انتشارات دانش گاہ اسلامی،

منتخب التواریخ (۳ حصے): ملا عبدالقادر بدایونی — کلکتہ، ۱۸۶۵ء بعد
(مرتبہ مولوی احمد علی و کپتان ولیم ناسولیس)

منتخب اللباب: محمد ہاشم خافی خان — کلکتہ، ۱۸۶۹
(مرتبہ کبیر الدین احمد)

فہرست مآخذ حواشی

منتخب اللطائف (تذکرہ قلمی): مولوی رحم علی خان — تالیف، ۱۲۲۶ھ

منطق الطیر: شیخ فرید الدین عطار (مرتبہ دکتر محمد جواد) — تبریز، ۱۹۵۸ء

المنتظم فی تاریخ الملوک والامم : ابن الجوزی (دائرۃ المعارف) حیدر آباد، ۱۳۵۷ھ

مولانا ابوالکلام آزاد (انگریزی) : مرتبہ ہمایوں کبیر ایشیاء بمبئی ، ۱۹۵۹ء

میخانۂ الہام (مجموعۂ غزلیات شاد) : مرتبہ حمید عظیم آبادی پٹنہ ، ۱۹۳۸ء

النجوم الزاہرہ : ابن تغری بردی (دارالکتب المصریہ) قاہرہ ، ۱۹۲۹ء

نزہۃ الخواطر (۴ تا ۷) : مولانا عبدالحی حسنی لکھنوی حیدر آباد، ۱۹۵۵۔۱۹۵۹ء

نظام اول (انگریزی) : ڈاکٹر یوسف حسین خان کلکتہ ، ۱۹۶۳ء

نفحات الانس: مُلّا نورالدین جامی کلکتہ ، ۱۸۵۸ء

نگارستان سخن : سید نورالحسن بھوپال : ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۵ء

نہایۃ الادب الارب: النویری قاہرہ : ۱۹۲۳ء بعد

وفیات الاعیان (ا) : ابن خلکان (مرتبہ محی الدین عبدالحمید) قاہرہ، ۱۹۴۸ء بعد

یادگار داغ : نواب مرزا خان داغ (مرتبہ احسن مارہروی) لاہور ، ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ

ید بیضا (تذکرہ قلمی): میر غلام علی آزاد بلگرامی (ذخیرہ احسن، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی)

رسائل وجرائد

دبدبۂ سکندری، رام پور جلد ۴۴ شمارہ ۲۹ معارف اعظم گڈھ جلد ۵۷ شمارہ ۶، جلد ۶۶ شمارہ ۱......

ہماری زبان (ہفتہ وار) علی گڈھ، یکم جولائی ۱۹۶۶ء۔

متعدد انگریزی اور مشرقی شخصیتوں کے تراجم کے لیے انسائیکلو پیڈیا بریٹینکا، امریکی مصنفین کی قاموس انسائیکلوپیڈیا اسلام (طبع اوّل ودوم) وغیرہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اگرچہ اختصار کی غرض سے ہر جگہ حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔

ترجمانی اشعار

(۱) بادشاہوں کے حالات تو تاریخی واقعات کی شکل میں تحریر نہ کیے جا سکے البتہ معروف شاعر نظیری نے (کیفیات دل سے لبریز) جو فسانہ غم شروع کیا تو گویا ایک پوری کتاب منصۂ شہود پر آ گئی۔

(۲) مضبوط ترین پہاڑ بھی اپنے مقام سے ہٹائے جا سکتے ہیں لیکن وفا سرشت لوگوں کے دل نہ تو الفت سے خالی ہوتے ہیں اور نہ ہی وہ اپنے مقام محبت سے الگ کیے جا سکتے ہیں۔

(۳) تو کیسے کیسے لذیذ پھلوں سے بھرپور درخت ہے کہ چمن کے سبھی شباب آسا پودوں نے اپنا سب کچھ فراموش کر کے تیرے دامن سے وابستگی اختیار کر لی ہے۔

(۴) وہ انسان جو اثر لینے میں زیادہ وقت لیتا ہے وہ اپنا تعلق نبھانے میں بھی دیرپا ہوتا ہے۔

(۵) بہرام کے شکار کھیلنے کے آلات کہیں دور پھینک دو اور شراب کا جام میرے ہاتھوں میں تھماؤ، اس لیے کہ اس صحرا کی خاک چھاننا میرا کام ہے نہ کہ بہرام اور اس کی سواری کا۔

(۶) یہ جو کچھ دکھائی دے رہا ہے یہی اس کائنات کا حقیقی مقصود نہیں ہے بلکہ مجھے شراب سے ہمدست کرو کہ دنیا کے انہی جھمیلوں تک ہی معاملات حیات کی حدود بندھی ہوئی نہیں ہیں۔

(۷) ہم اہل وفا سے محبت اور اخلاق کے علاوہ کسی بھی اور نوعیت کے سوالات چھیڑنا زیبا نہیں ہے۔

(۸) (یہیں سے اصل کتاب کی ابتدا ہوتی ہے)۔ یہ سوال نہ اٹھاؤ کہ ہمارے خامۂ فرمایہ نے کیا کچھ تحریر کر ڈالا ہے بلکہ یہ تو ہمارے دل کی کیفیتوں کا غبار تھا جس نے ان شکستہ لفظوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔

(۹) فسانہ غم کو ایک مربوط صورت میں پیش کرنا مشکل کام ہے ایسا کیجیے کہ دل کے ان ریزہ ریزہ ٹکڑوں کو یونہی منتشر صورت میں رہنے دیجیے۔

خط-۱

(۱۰) اے نگاہوں سے مستور مگر میرے دل کی پنہائیوں میں خیمہ زن میرے محبوب، یقین جان کہ تو ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے ہے اور میں تجھے نیک خواہشات کی سوغاتیں بھیج رہا ہوں۔

خط-۲

(۱۱) کبھی ہاتھوں کی قوت زائل ہو جاتی ہے تو کبھی دل کی بے قراری بڑھ جاتی ہے اور کبھی میرے قدم چلنے سے عاجزی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ اے میری عمر تو کتنی تیزی کے ساتھ بیت رہی ہے، مجھے بس یہی خوف لگا ہے کہ میری زندگی کی طاقتیں میرا ساتھ چھوڑتی چلی جاتی ہیں۔

(۱۲) شوق کے بے شمار کارواں کشمیر کی وادیوں میں شب بسری کا مزہ لینے کے لیے کھنچے چلے جاتے ہیں اور وہاں عیش و مسرت کا سامان کرتے ہیں۔

(۱۳) زندگی مسلسل کوشش کرتے رہنے کا نام ہے، ہم اس لیے زندوں میں ہیں کہ آرام و راحت حاصل نہ کر سکیں۔

(۱۴) آپ کے ساتھ ہمارا تعلق نیازمندانہ کا ہے اور ہمیں اس نسبت پر فخر ہے۔ ہماری ذات سے آپ

کی شکایت دراصل آپ کی احسان سے معمور روش کا ایک حسین انداز ہے۔

(۱۵) آپ کا ذرا سا التفات بھی میرے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس مختصر عنایت کو کسی صورت بھی کم نہیں خیال کیا جا سکتا۔

خط-۳

(۱۶) ہم سے مت پوچھ کہ ہمارے دل کا افسانہ غم کیا ہے۔ یقین جان کہ ایک طویل عرصے سے ہم نے بڑی کوششوں کے ساتھ اپنی زبان کو تمہارے سامنے خاموش کیے رکھا ہے۔

(۱۷) اگرچہ ہمارے اور تمہارے درمیان لمبے فاصلے حائل ہیں لیکن تیری یادوں کے ہجوم میں جام مئے سے اپنے دل کو مطمئن کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ روحانی تعلق میں جغرافیائی دوریاں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔

(۱۸) میرے راستے کی مشکلات! بتاؤ نا میں اپنی محبوبہ سعاد تک کیسے پہنچ سکتا ہوں۔ اس تک پہنچنے کا راستہ بلند پہاڑوں اور ہلاکت خیزیوں کے خدشات سے بھرا پڑا ہے۔

(۱۹) یہ ہمارے دور کا کس قدر گھمبیر المیہ ہے کہ رسل و رسائل کے نئے نئے طریقے اپنا لیے گئے، ہیں ہم سے قبل کسی نے بھی اس مقصد (نامہ بری) کے لیے عنقا کی خدمات سے فائدہ نہ اٹھایا ہوگا۔

(۲۰) میں اس راز سے واقف ہوں کہ میرے دل کی دیوانگی بیابان کی وسعتوں میں ہی سما سکتی ہے۔

(۲۱) یار لوگوں نے جو لیلیٰ و مجنوں اور شیریں و فرہاد کے قصوں کو شہرت دے رکھی ہے یہ درحقیقت ہماری ہنگامہ خیز داستان عشق کے ایک مختصر حصے کی روداد ہے۔

(۲۲) اگرچہ ہماری نیاز مند نگاہیں تو آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں لیکن دل تیری یاد سے ہی معمور تھا۔

خط-۴

(۲۳) جان لو کہ میں نے صبح کی روشنی سے اس بات کا راز پا لیا ہے اور اس حقیقت تک پہنچ چکا ہوں کہ یہ روشن راستہ شراب خانے کا راستہ ہی ہو سکتا ہے۔

(۲۴) اے صبح کی ٹھنڈی ہوا! اللہ تیرا دامن خوشیوں سے بھر دے کہ تو نے رتجگوں کے مارے ہوئے عاشقوں کے رنج والم کم کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۲۵) کوئی بھی انسان مجھے میری آنے والی منزل کی خبر دینے کو تیار نہیں، بے شمار دشت و صحرا عبور کر چکا ہوں اور نہ معلوم ابھی کتنے باقی ہیں؟

(۲۶) زندگی کا فلسفہ مختصراً یہ ہے کہ اس کا سلسلہ ایک نیند سے دوسری نیند تک ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لیجیے کہ حیات تخیل اور فریب کے دائرے میں محصور ہے۔

جب پانی کی دو لہروں کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو ان سے بلبلہ جنم لیتا ہے گویا زندگی پانی پر ایک طلسماتی نقش کی طرح ایک ناپائیدار چیز کا نام ہے۔

(۲۷) بارش کی فطری لطافت و نزاکت میں کسی نوع کا اختلاف نہیں لیکن اس کے باوصف وہ چمن میں سرخ پھول کی بہار پیدا کر دیتی ہے جبکہ بے آباد قطعہ زمین پر فقط جھاڑیاں گھانس پھونس اُگاتی ہے۔

(۲۸) ہماری ایک سانس جو تیری یاد میں ہم لیتے ہیں، کیا تم جان سکتے ہو کہ الفاظ و معانی کے کتنے دفتر اس میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔

(۲۹) آئینے اور شراب کی چمک میں اس قدر مماثلت پیدا ہوگئی ہے کہ دل کی دنیا میں ایک ہنگامہ سے برپا ہوگیا ہے۔

(۳۰) ساقی! شراب کے ان متوالوں کو ایسی شراب کے جام بھر بھر کر پیش کیے جا، جسے کسان نے اپنے خون جگر کی حدت سے سینچا ہے۔

(۳۱) میں تم کو بتاتا ہوں کہ معنی و مفہوم سے کیسے لطف اٹھایا جاتا ہے۔ میں نے اپنی تربیت کچھ اس انداز پر کرلی ہے کہ سخن شناسی میرے مزاج کا حصہ بن گئی ہے۔

(۳۲) ہمارے مرشد کا قول ہے کہ فطرت کا قلم ہر طرح کی خطاؤں سے مبرا ہے۔ لائق تحسین ہے وہ پاکباز نظر جو خطاؤں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

(۳۳) تو منزل در منزل آگے بڑھتا جارہا ہے جبکہ میرا قدم ہر گام ڈگمگاتا ہے۔

(۳۴) زاہد آؤ اس امر کی کوشش کریں کہ کارزار ھستی کی رونقیں ماند نہ پڑ جائیں، نہ ہی تیرے زہد کے اثرات اسے متاثر کریں اور نہ مجھ گنہگار کی خطائیں اسے آلودہ کریں۔

(۳۵) سب سے ہوشیار رہو اور سبھی سے جان پہچان پیدا کرنے میں بھی لگے رہو۔

(۳۶) تیرے اندر آتشیں کیڑے اور مچھلی دونوں کی خصوصیات ہونی چاہییں کیونکہ عشق کی سلطنت میں سمندر کی سطح سلسبیل (یخ بستہ پانی کا منبع) ہوا کرتی ہے اور دریا کی گہرائی اپنے اندر حدت کے اثرات رکھتی ہے۔

(۳۷) مجھے خوشی ہوئی کہ میری توبہ نے شراب کے نرخ کم کردیئے۔

(۳۸) یہ امر (ساقی کی محفل کے آداب کے پیش نظر) خطا تصور کیا جاتا ہے تو صاف ستھری مئے اور اس کی سطح کی تلچھٹ کو جانچنے لگے۔ اس کے اچھا یا برا ہونے کا حکم لگانے کے درپے ہو جاؤ گے تو سارا معاملہ ہی خراب ہو جائے گا۔

(۳۹) قلم اپنی روایتوں کے ساتھ اس مقام تک ہی پہنچا تھا کہ اس کی نوک نے لکھنے سے جواب دے دیا۔

خط-۵

(۴۰) ہم دم مست قلندر مزاج لوگوں سے زادِ سفر کا کیا پوچھتے ہو، ہمارا قافلہ تو گھنٹی کی صدا کے بغیر ہی مسلسل سفر پر رواں دواں رہتا ہے۔

(۴۱) اے دشت اپنے آپ کو مزید وسعتوں سے آشنا کر کہ آج کی رات محبوب کی یاد میں میری آہوں کا لشکر میرے دل کے آشیانے سے باہر آنے کی جستجو کررہا ہے۔

(۴۲) جب ایک صفحہ پر تحریر پوری ہو جاتی ہے تو ورق الٹنا ضروری ٹھہرتا ہے۔

(۴۳) دنیا کا دجل و فریب بالکل عیاں ہے، رات حاملہ ہو چکی ہے اب نتیجتاً دیکھتے ہیں کہ یہ کس چیز کو جنم دے گی۔

(۴۴) آسمان ان تین امور میں سے کسی نہ کسی ایک میں جتا رہتا ہے۔ تجھے ہماری وفاؤں کی داستان سناتا رہتا ہے یا ہمیں تمہارے وصل کے خوشخبریوں سے بہرہ اندوز کرتا رہتا ہے یا پھر رقیب کی موت کی اطلاع دیتا ہے۔

(۴۵) یہ کیسی بات ہے کہ ہم ہر وقت پریشان خاطر ہی رہیں۔ اس سے بہتر تو یہی ہے خود کو شراب کے خمار میں بے خود کرلیا جائے۔

(۴۶) نیند کے دوران ہم بہت سے حسین مناظر کی سیر کر گذرتے ہیں اور یوں نیند ہمارے لیے بیداری سے

بھی زیادہ دلکشی رکھتی ہے۔

(۴۷) مسئلہ تو بہت گنجھلک صورت اختیار کر گیا تھا مگر ہم نے اس میں آسانی کی صورتیں پیدا کر لی ہیں۔

(۴۸) صبح کی ٹھنڈی ہوا (بادِ نسیم) محبوب کی معطر زلفوں کی مہک اڑا لائی اور ہمارے دلِ دیوانہ کو ایک نئے مشغلے کے حوالے کر گئی۔

(۴۹) بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ میری فرقت کی رات طویل ہے یا میرے رتجگوں نے مجھ سے سکون کی دولت چھین رکھی ہے مجھے صرف اس امر سے آگاہ کر دو کہ میری قسمت کہاں سو گئی ہے۔

(۵۰) اے پائیدار نشے کی حامل شراب کے رقیب، اسے لطیف شراب تصور کر کے نوش جان کر بالخصوص ان لمحوں میں جب عشق کی سرمستی تمہارا دماغ بوجھل کر دے۔

(۵۱) عہدِ رفتہ میں عیش و نشاط میں گذارے ہوئے لمحات ہمیں کلفتِ خمار سے آشنا کر رہے ہیں اور جمائیاں آ رہی ہیں شراب اتنی نہ تھی کہ نشے کی تکلیف کو ختم کر سکتی۔

(۵۲) کوئی بھی منزل کے نشاں سے آگاہ نہیں بس یہی کچھ معلوم ہے کہ جرس کی صدا ایک تسلسل سے سنائی دے رہی ہے۔

(۵۳) جرس مسلسل پکار رہی ہے کہ تیاری کا سامان کر لو اور اپنے محمل کو بھی کس لو۔

(۵۴) خیف کے مقام میں رہنے والے اپنے محبوب تک پہنچنے کے لیے لاتعداد مصائب سے گذرنا پڑے گا۔

(۵۵) خدا کے حضور دعا ہے کہ کوئی بھی انسان کہنگی کے سبب پائمال نہ ہو، دیکھو کل صحرا کی ریت نے ہمارے آئینہ خانہ کی جگہ سنبھال لی۔

(۵۶) کارواں تو اپنی منزل کی طرف بڑھ چکا لیکن اہل قافلہ کے نقوش قدم سے منزل کا کچھ سراغ پایا جا سکتا ہے۔

(۵۷) شراب کا گھونٹ زمین پر انڈیلو اور اس آئینے میں کارراز حیات میں مصروف لوگوں کے حالات کا عکس دیکھو، کیخسرو اور جمشید جیسے عالی مرتبت بادشاہوں کی بے شمار کہانیاں اس سے منعکس ہوتی دکھائی دیں گی۔

(۵۸) ہمارا تعلق انسانوں کی اس صنف سے ہے جو اعتدال اور بین بین کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے یا تو اوجِ ثریا تک جا پہنچتے ہیں یا پھر تحت الثریٰ کی پستیاں ان کا مقدر ٹھہرتی ہیں۔

(۵۹) اگر تمہیں اپنے سینے پر لگے داغوں کو باقی رکھنے کی تمنا ہے تو عشق کی کہنہ کتاب کی ورق گردانی کرتے رہا کر۔

(۶۰) تجھے ناؤنوش کی دنیا سے نفرت تو ہے لیکن پھر بھی شراب خانے میں ہی قیام پذیر رہا کرتے ہو۔

(۶۱) دیکھو یہ عشق و مستی کی منزلوں تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ یہاں ادھر اُدھر بھٹکتے پھرنے کی اجازت نہیں، یہ ایک ایسا جرم ہے جسے معاف نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی سزا بھگتنا ضروری ہے۔

(۶۲) ہمیں ڈھونڈنے کے لیے ادھر ادھر کی خاک چھاننے کی ضرورت نہیں بلکہ اب تو ہم ایسے مقام تک پہنچ چکے ہیں جہاں عنقاء کی بھی رسائی ناممکن۔

(۶۳) جان لے کہ ہم نے قناعت اختیار کرنے کے لیے عزلت نشینی اختیار نہیں کی بلکہ تن پروری کی روش نے دل کے نہاں خانہ میں ڈیرہ ڈال لیا ہے۔

(۶۴) لکھنے کو تو ہم پوری دنیا کی تاریخ لکھ چکے ہیں لیکن خود اپنی داستان سے زیادہ دلچسپ اور پیاری کہانی کہیں اور سے دستیاب نہ ہو پائی۔

(۶۵) یہ آخر تمہیں کیا ہو گیا کہ تم نے تقویٰ کا مصلیٰ رھن رکھ دیا مجھ میں زہد کی کثافتیں موجود تھیں، بتاؤ ناں

میں اگر ایسا نہ کرتا تو پھر کرتا تو کیا کرتا؟

(۶۶) رئیس شہر نے اپنی مسلمانی کی ملمع کاری کا رنگ دکھا کر اپنے آپ کو بچا لیا۔ اس کافر کا میں ایسا بندوبست نہ کرتا تو بتاؤ اور کیا کرتا؟

(۶۷) اگر میں مئے کے جام سے اپنے داغوں کو تازگی نہ دیتا تو بتا اور کیا کرتا؟

خط-۶

(۶۸) پھر سے دل میں خواہشیں انگڑائیاں لیتی ہیں کہ انہی جانے پہچانے راستوں پر محو سفر ہو جاؤں جن راستوں سے مجھے پہلے ہی شناسائی ہے۔

(۶۹) میں تمہیں سال بھر شراب کے نشے میں مست رہنے کی دعوت نہیں دیتا بلکہ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ کم از کم تین ماہ شراب نوشی سے لطف اندوز ہو کر اور باقی نو مہینے نیکی کی راہوں پر گامزن رہا کر۔

(۷۰) پنجرے قید میں محبوس مرغ رہائی کے لیے فریاد نہیں کرتا بلکہ اسے تو ان دنوں یہ غم ہو رہا ہے جن دنوں وہ قید نہ تھا۔

(۷۱) اس شراب کے خوگر کے لیے خدا تعالیٰ کی اطاعت کوئی مشکل بات نہ تھی لیکن بات اتنی ہے کہ صنم نہیں چاہتا کہ ایک ہی پیشانی دو طرح کے سجدوں کی عادی بن جائے۔

(۷۲) اس بستی میں شکستہ دلوں کی مسیحائی کی جاتی ہے اور دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑا جاتا ہے لیکن تو اس بات سے بے خبر ہے کہ دل کہاں کہاں سے ٹوٹا ہے۔

(۷۳) جب تو ہی ہم کو دھتکار دے تو پھر تو ہی بتا کہ وہ کونسا در جس کا ہم رخ کریں۔

(۷۴) لیلیٰ کی جدائی کے غم نے محبت کے راستے میں مجھے جس بیماری سے دوچار کر دیا ہے اس کا علاج لیلیٰ کے وصال کے علاوہ کچھ نہیں جیسے ایک عادی شرابی شراب پی کر اپنی تسکین خاطر کا سامان کیا کرتا ہے۔

(۷۵) خضر نے چشمۂ آب حیات تک پہنچنے کے لیے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ بہت دشوار ہے۔ ہماری پیاس کی شدت نے ہمیں ایک قریبی راستے کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔

(۷۶) دشت آرزو میں ہمیں جان سے کوئی خطرہ نہ تھا بلکہ تم تک پہنچنے کا یہی ایک راستہ ہے اور اسی راستے پر مشکلات جنم لیتی ہیں۔

(۷۷) ہم دم آخر تک اسے خوبی ہی تصور کرتے رہے لیکن عاشقی بھی محض ننگ و عار ہی ثابت ہوئی۔

(۷۸) یہی وہ کاغذ ہے جس پر اب سیاہی پھیل چکی ہے مطلب کی سبھی باتیں اسی میں مضمر ہیں۔

(۷۹) ہم عشق کی ترجمانی کئی طرح سے کرتے ہیں جبکہ تیرا حسن یکتائی کا حامل ہے اور ہم میں سے ہر کوئی تیرے حسن کی طرف ہی اشارہ کر رہا ہے۔

(۸۰) اگر حقیقت نگاہوں سے اوجھل رہے تو قصور در حقیقت نگاہوں کا ہی ہوتا ہے کیونکہ ہماری نگاہیں پیکر محسوس کی خوگر ہو چکی ہیں۔

(۸۱) ہمارا کارواں جرس کی صدا سے منزل کا سراغ نہیں پاتا بلکہ یہ تیرے عشق کا اعجاز ہی تو ہے جو ہمیں راستے کا نشان مہیا کرتا رہتا ہے اور تیری محبت ہی دراصل ہمارا زادِ سفر ہے۔

(۸۲) ہمارے محبوب نے ہمارے دل میں قیام کر رکھا ہے، مدعی کدھر ہے جب پھول دماغ میں خوشبوئیں بکھیر رہا ہے تو کانٹوں کا خوف کیوں کر دامن گیر ہو۔

(۸۳) دوڑنا، چلنا پھرنا، کھڑے ہوجانا، بیٹھ جانا، سوجانا اور موت کی وادی میں اتر جانا ہی زندگی کے مختلف مراحل ہیں۔
(۸۴) ایک پھول کو پانے کے لیے بے شمار کانٹوں کی تکلیف گوارا کرنی پڑتی ہے۔
(۸۵) رہروانِ عشق راستے میں تھکاوٹوں سے چور نہیں ہوا کرتے عشق اپنی ذات میں راستہ بھی ہے اور منزل بھی۔
(۸۶) اے ناصح تو اس کی خون بہا دینے والی پلکوں کی کاٹ کی حقیقت سے نا آشنا ہے۔ ذرا شاہ رگ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی پلکوں کی کاٹ کا منظر ملاحظہ کر۔
(۸۷) زاہد کی وابستگی نماز اور اور روزے سے ہے جبکہ سرمد ساغر و شراب سے نسبت رکھتا ہے۔
(۸۸) نہ تو کوئی نیا زخم ہی اپنا کام دکھاتا ہے اور نہ ہی کوئی پرانا زخم خلش دیتا ہے۔ میرے اللہ مجھے اس کی بجائے ایک اور دل دے دے کیونکہ اس پھیکی سی زندگی کا یہ انداز مجھے قطعاً گوارا نہیں۔
(۸۹) چمن زار میں ہوا شبنم پر جو داغ پیدا کر رہی ہے وہ حقیقت میں اس کی بے چینیوں کی تسکین کا سامان کر رہی ہے۔
(۹۰) میرے ساتھ اس کا تعلق کچھ اس طرح کا ہے کہ جیسے دریا کی لہر کو کنارے سے محبت ہوتی ہے، ایک لمحے وہ مجھ سے قریب ہوتا تو دوسرے لمحے وہ مجھ سے دور چلا جاتا ہے۔
(۹۱) وہ انسان کہ جس کے دل غمزدہ نے اپنے لخت جگر کو کھو دیا تھا اس نے تو اسے بالاخر پا لیا۔ مگر تم نے تو کوئی چیز کھوئی ہی نہیں تو پھر پانے کی تمنا کیسی؟
(۹۲) ہمارا حال سمندر کی موجوں جیسا ہے کہ جب وہ سکون آشنا ہوتی ہیں تو گویا ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ہم اس لیے جی رہے ہیں کہ ہم کبھی سکون کی لذت سے آشنا نہ ہو سکیں۔
(۹۳) اس کی بستی کی خود پسند مٹی نے پیشانی کے سارے سجدے اپنی جانب کھینچ لیے اور میری پیشانی میں حرم میں ادا کرنے کے لیے ایک سجدہ بھی باقی نہ چھوڑا۔
(۹۴) ہم نے اپنی زندگی کے حالات کا مرقع اپنی پیشانی پر سجا رکھا ہے۔
(۹۵) محفل میں ساقی نے شراب تو سبھی کو ایک ہی صراحی سے پیش کی تھی لیکن اس کی محفل کا رنگ ہی کچھ ایسا ہے کہ ہر شخص کی مستی کسی دوسری شراب کا شاخسانہ دکھائی دیتی ہے۔
(۹۶) تیری دنیائے دل کو کانٹوں بھری محبت کی کیا خبر؟ تیرا لباس اس قدر مختصر ہے کہ اس کے دامن میں پھول نہیں سما سکتے۔

خط۔۷

(۹۷) ہمارے پاس ایسی زبان نہیں ہے جو ستم پیشہ فلک کا شکوہ کر سکے۔ ہم نے زبان پر خامشی کی مہر لگا کر سکوت اختیار کر لیا ہے۔
(۹۸) آج کی دنیا میں اگر کوئی مہربان کسی علت سے تہی ہے تو وہ شراب خالص کی صراحی اور غزل کی ڈائری ہے۔ محتاط ہو کر اکیلے محو سفر رہو کہ یہی سلامتی کی راہ ہے۔ جام شراب کو تھام رکھو کہ بیش قدر زندگی کا نعم البدل کچھ بھی نہیں۔
(۹۹) ہم نے چالیس برس کی طویل مدت یونہی تکلیفوں اور محرومیوں میں گذار دی اور تا آں کار یہ دو سالہ شراب ہمارے درد کا درماں ٹھہری۔
(۱۰۰) کوئی بھی انسان مستقل اور دائمی طور پر کارواں کی نگہبانی کا فریضہ ادا نہیں کر سکتا، تم خود بیداری کی

کروٹ لو کہ سبھی رفقائے سفر نیند کی وادی میں کھو گئے ہیں۔

(۱۰۱) احباب کو میرے آنسوؤں کی جھڑی دیکھ کر مارے خوف کے بیدار ہو جاتا تھا لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ میری آہ وزاری کے وقت کوئی شخص بھی بیدار نہیں تھا۔

(۱۰۲) تغافل کی گہری نیند میں سب لوگ یوں گم ہوئے کہ حواس کی کارکردگی صفر ہوگئی ہے۔ اس مایوس کن ماحول میں بس میری اکیلی ذات ہی جاگ رہی تھی۔

(۱۰۳) میں گوشہ عزلت میں اپنے ہی چھیڑے ہوئے نغموں کی سرمستی میں محو ہوں اور مجھے گل وبلبل کے جوش وجذبہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

(۱۰۴) آگ کے پجاری مجھے اپنے آتش کدے میں اس لیے عزیز رکھتے ہیں میرے دل میں ایسی آگ بھڑک رہی ہے جو کبھی سرد نہیں ہوتی۔

(۱۰۵) تیرے اپنے سینے میں گرمی اور حدت نہیں اس لیے تو اہل دل کی محفل میں جانے سے دامن بچا۔ جب تیرا آتش دان آگ سے خالی ہے تو تجھے عود خریدنے کی کیا ضرورت؟

(۱۰۶) رات کو زیادہ نیند کے مزے مت لو کیونکہ حافظ آدھی رات کے ذکر وفکر اور وقت سحر کی تلاوت کی وجہ سے مقام قبولیت تک رسائی پانے میں کامیاب ہوا۔

(۱۰۷) میں اس کی نظروں کے تیر کا اس وقت سے شکار ہو چکا ہوں جب کہ مجھے محبت کی ابجد سے بھی واقفیت نہ تھی۔ میرا دل اس وقت ہر طرح کی کثافتوں سے پاک صاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نگاہوں کا تیر دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔

(۱۰۸) یہ کتنے ظلم کی بات ہے کہ تیری آرزو کی شدت تجھے سرو سمن کی سیر کے لیے جانے پر مجبور کرے۔ حالانکہ خود تیری ذات کلیوں جیسی شگفتگی رکھتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تو میرے چمنِ دل میں کھل اور اسی میں بسیرا کر۔

(۱۰۹) بھلا وہ کونسی خوبیاں ہیں جن سے ہمارا حبیب مالا مال نہیں ہے۔

(۱۱۰) میرے دل کی تنگ بستی میں اس پھول (محبوب) کا تصور کچھ یوں سرایت کر گیا ہے کہ آج رات نیند کے دروان مجھے اپنے خراٹوں کی آواز ایسے معلوم ہو رہی تھی جیسے بلبل چہک رہا ہو۔

(۱۱۱) میں نے جس کسی کے در پہ دستک دی اسے حالات وواقعات سے غافل اور لاعلم پایا۔

(۱۱۲) اے مسیح محترم، ہم کشتگان عشق کی محفل سے چلے جایئے کہ آپ کا ایک شخص کو اپنے اعجاز سے زندہ کر دینا بے شمار زندہ لوگوں کو مار ڈالنے کے ہم معنی ہے۔

(۱۱۳) آس کے چہرے کا نقاب مایوسیوں کے گرد لپٹا ہوا ہوتا ہے، سیدنا یعقوبؑ کی آنکھ کی خاک آخر الامر سرمہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

(۱۱۴) بے نیازی کی شمشیر سے جہاں تک ممکن ہو زندگی کے مراحل طے کرتا چلا جا اور اس سے پیشتر کہ آسمان تجھ پر ٹوٹ کر گر پڑے تو خود لپک کر اس کے ہم آغوش ہو جا۔

(۱۱۵) اس شراب فروش بوڑھے کو بھلائی نصیب ہو جو مجھ سے یوں گویا ہو کہ لو شراب پیو اور دل کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کرو۔

میں نے جواب دیا کہ شراب میری عزت کو خاک میں ملا دے گی۔ اس مردِ ضعیف نے کہا کہ اے شریف انسان میری بات کو تسلیم کرلے اور جو بھی ہوتا ہے اس کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھ۔ شراب کے ساغر بھرنے شروع کردے اور اس کی مستی میں جمشید اور کیقباد کا افسانہ دہراتا جا۔

خط - ۸

(۱۱۶) انہوں نے بیخ چشم کو بڑی ہمت مردانہ سے مجھ میں گوندھا ہے۔ ہمیشہ یاس و ناامیدی کے عالم میں انہوں نے میری تخم ریزی کی ہے۔

(۱۱۷) میں غموں کے پہاڑ کے نیچے پڑا لطف کے گیت کیسے گاؤں کہ انہوں نے میری استقامت کا تخمینہ لگا کر مجھے اس امتحان میں ڈالا ہے۔

(۱۱۸) میں اگر دنیائے عشق کا متوالا ہوں تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ مجھے اس کیف و مستی سے واسطہ نہ ہوتا تو کوئی دوسرا اس مرض کا شکار ہوجاتا۔

(۱۱۹) ہم نے تو حرف تک بھی زبان سے نہ نکالا تھا مگر افواہ کو یوں پر لگے کہ اس نے داستان کا رنگ اختیار کرلیا۔

(۱۲۰) ہم اگر محبت کے مریض ہیں اور دردِ دل کی دولت رکھتے ہیں تو اس میں اچنبھے کی کون سی بات تو ہے آخر زاہد بھی تو دین کا درد اپنے سینے میں لیے پھرتا ہے۔

(۱۲۱) اسی بات کو سیکھنے میں عمر دراز بیت گئی لیکن ابھی تک علم کی ابجد تک ہی رسائی ہو پائی ہے۔ کیا جانوں اس کے دیوان کو پڑھنے کی صلاحیت مجھ میں کب پیدا ہوگی؟

(۱۲۲) خمارِ شراب کی مستی سے کوئی بھی شناسا دکھائی نہیں دیتا۔ نہیں معلوم ان کم بخت شراب کے رسیاؤں نے کیسا طرزِ عمل اپنا رکھا ہے۔

(۱۲۳) ایک تو ستم خوردۂ محبوب ہے جبکہ دوسرے محبوب کے ملنے کی کوئی امید نہیں ۔

(۱۲۴) میں اس خطا کو بھی تسلیم کرتا ہوں جو اگرچہ مجھ سے سرزد نہیں ہوئی تاکہ میں اپنے محبوب کو ناوقت تکلیف سے شرمندہ کرنے کا سبب نہ بن پاؤں۔

(۱۲۵) اگر میرے لیے ہاتھ پیدا کر بھی دیا جائے تو پھاڑنے کو دامن اور گریبان کہاں سے لاؤں؟

(۱۲۶) اے صبح کی ٹھنڈی ہوا! مقام مسرت ہے کہ سیدنا سلیمانؑ کا ہدہد ملکہ سباء کے چمن زاروں سے راگ ورنگ کی نوید لے کر لوٹا ہے۔

(۱۲۷) آخرالامر وہ کشتۂ تقدیر پردے کی اوٹ سے عیاں ہوگیا۔

(۱۲۸) آغاز میں تو عشق ایک آسان بات دکھائی دیتا ہے لیکن انجام کار وہ کئی ایک مشکلات کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔

(۱۲۹) وہ کسی قدر گریہ وزاری بھی کررہا تھا اور ہچکیوں کے درمیان وہ اپنے دل کی بھڑاس بھی نکال رہا تھا۔

(۱۳۰) اسے نظریۂ جبر کے طور پر استدلالاً اختیار کرلیا گیا ہے جبکہ دوسرے کا تعلق نظریہ اختیار کو تسلیم کرنے والوں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بات امر بین بین کا رنگ اختیار کرگئی ہے۔

(۱۳۱) دنیا میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں اپنی محنت و کوشش سے کامیابی کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔

(۱۳۲) اس کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے نکمے اور تن آسان بھی ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو مزعومہ

قسمت کے سپرد کر رکھا ہوتا ہے۔

(۱۳۳) اے حافظ اگر چہ گناہوں پہ ہمیں قدرت حاصل نہ تھی لیکن پھر بھی بہتر یہی ہے کہ ادب کا قرینہ اختیار کیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ بس جرم میرا ہی ہے۔

(۱۳۴) پرندے کی عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ جب وہ جال میں پھنس جائے تو اسے صبر و برداشت کی روش اختیار کرنی چاہیے۔

(۱۳۵) میں اگر چہ توبہ تائب تو ہو گیا ہوں لیکن اپنے اس طرز عمل پہ شرمسار ہوں۔ مجھے تو کفر ہی زیبا ہے اب کبھی یہ بات میرے سامنے نہ کہنا کہ میں نے مسلمانی کا شیوہ اپنا لیا ہے۔

خط-۹

(۱۳۶) تجھے آتشیں کیڑے اور مچھلی دونوں کی خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے کیونکہ اقلیم محبت میں سمندر کی سطح سلسبیل جیسی ہوتی ہے جبکہ اس کی گہرائی حدت آمیز ہوا کرتی ہے۔

(۱۳۷) میں اگر اپنا ظاہری لبادہ اتار پھینکوں تو لوگوں پر کھل جائے گا کہ میرا کھردرا لباس سنہری کپڑا تیار کرنے والے صناعوں کے لیے ایک بیش قدر دولت ہے۔

(۱۳۸) آخر کب تلک سمندر کی آوارہ خرام موجوں کی طرح تو آوارگی کے مزے لوٹتا پھرے گا۔ بس بھنور کی طرح سمندر کے عین وسط میں اپنا ٹھکانہ بنا لے۔

(۱۳۹) اگر وہ حرم کو صنم کدہ کی شکل دینا چاہیں تو ایسا کرنے کے لیے کوئی بھی امر مانع نہیں اور ابھی ایسا کرنے کا وقت بھی باقی ہے۔

(۱۴۰) اگر دنیائے دل اطمینان کی دولت سے بہرہ ور ہو تو بے سروسامانی کا اندوہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ اگر اطمینان قلب کی پریشانیاں لاحق نہیں تو دوسری پریشانیوں کو خاطر میں لانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

(۱۴۱) زندگی کے ہنگاموں کی غرض و غایت بس یہی کچھ نہیں ہے، مجھے جام شراب سے ہم دست کرو کہ دنیا کے اسباب کا سارا دارومدار اس رند مشربی میں مضمر ہے۔

(۱۴۲) اس زخم کی تسکین اور اندمال کے لیے کیسی عجیب مسیحائی اختیار کی گئی ہے کہ آتشیں پھاہا زخم پر رکھ دیا گیا ہے۔

(۱۴۳) اگر برے حالات سے سابقہ پیش آئے تو اسے اپنے حق میں سیل رواں سمجھو اور اگر اچھی چیز نگاہوں میں سما جائے تو اسے پانی کی ایک لہر خیال کرو۔

(۱۴۴) اگر کبھی اچھا وقت تمہیں میسر ہو تو اسے اپنے لیے خوش نصیبی تصور کرو کیونکہ کوئی بھی انسان اس سے باخبر نہیں کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

(۱۴۵) ساقی نے جام مئے میں افیون کی یوں آمیزش کر دی ہے کہ دشمنوں کو نہ تو اپنے سروں کی کچھ خبر ہے نہ ہی وہ اپنی پگڑیوں سے باخبر ہیں۔

(۱۴۶) اس شراب خاص کی برداشت ہر عقل کے بس کی بات نہیں اور نہ ہی وہ حلقہ ہر کان کا آویزہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

(۱۴۷) میری دلچسپیوں کا محور و مرکز نہ دشت و بیابان ہے اور نہ ہی چمن کی کشش نے مجھ پر عالم دیوانگی طاری کر رکھی ہے بلکہ میں جدھر کا بھی رخ کرتا ہوں تماشوں کی ایک دنیا ہے جو میرے نہاں خانہ وجود سے جنم لیتی ہے۔

(۱۴۸) دل پر اگر افسردگی کی کیفیت طاری ہے تو زندگی کی ساری رونقیں اور ہاؤ ہو ہیچ ہے۔ یہی ورق جسے اب لکھ کر سیاہ کیا گیا ہے، مطلب کی بات اسی میں مضمر ہیں۔

(۱۴۹) مجھے اپنے مقتدا کی بے شمار نصیحتوں میں سے بس ایک ہی نصیحت یاد ہے کہ اس دنیا کی بقاء مے خانے کی بقا کے ساتھ وابستہ ہے۔

(۱۵۰) میں نے اسے جام مئے ہاتھوں میں تھامے مسرت وشادمانی سے سرشار دیکھا ہے اس نے اپنے بے شمار انوکھے تماشوں سے دنیا کی توجہ اپنی جانب مرکوز کر رکھی ہے۔ میں نے اس سے استفسار کیا کہ صاحب حکمت نے یہ جام جہاں نما تمہیں کب سے عطا کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ جب اس نے نقش ونگار سے مزین گنبد تعمیر کیا تھا۔

(۱۵۱) آفتاب مئے نے مشرق سے اپنے جام کو رفعت آشنا کرنا شروع کر دیا ہے۔ تو اگر اس متاع عیش سے لطف اندوز ہونے کا آرزومند ہے تو پھر نیند کی وادی سے باہر نکل آ۔

(۱۵۲) ہم نے ساغر شراب میں اپنے محبوب کا عکس جمیل ملاحظہ کیا ہے اور تم کیا جانو ہماری اس پائیدار خمار عطا کرنے والی شراب کی لذت کتنی وجد آفریں ہے۔

(۱۵۳) شراب اور ساغر کی بابت محو غور وفکر رہنے سے زیادہ بہتر بات اور کیا ہو سکتی تا کہ ہم جان سکیں کہ اس روش کے متوالوں کا انجام کیا ہوگا۔

(۱۵۴) ساقی میں ایسی تلخ شراب کا جام نوش جان کرنا چاہتا ہوں جس کی مستی کی ترنگ مجھے بے ہمت کر دے تا کہ میں کارزار حیات کے ہنگاموں سے نجات حاصل کر سکوں۔ بہرام کی کمند کو پرے پھینک دو کیونکہ اس بیاباں کی وسعتیں خود میری ذات عبور کر رہی ہے نہ کہ بہرام اور اس کا گورخر اس قضیے سے نمٹ رہا ہے۔

(۱۵۵) اگر سورج اور شمع بھی اس گھر میں اپنی روشنی لیے موجود نہیں ہیں تو آخر وہ کیا چیز ہے جس نے گھر بھر کو حشرات اور پتنگوں سے معمور کر رکھا ہے۔

(۱۵۶) میرے ہمدرد نے مجھ سے کہا کہ اندوہ والم کے سوا عشق کے پاس کون سی خوبی ہے۔ میں نے جواب دیا اے مرد فرزانہ! اس سے اچھی خوبی اور کیا ہو سکتی ہے؟

(۱۵۷) سبھی درخت پت جھڑ کی چیرہ دستیاں برداشت نہیں کر سکتے میں سرو کے حوصلے کو سلام پیش کرتا ہوں کہ اس کا وجود خود اپنی بقاء کا ضامن ہے۔

(۱۵۸) اے محبوب اگر تو مے خانے کا مہمان بن ہی گیا ہے تو پھر دیگر شرابیوں کے ساتھ تو بھی اس کی دلفریبیوں سے لطف اندوز ہو کیونکہ اگر شراب پینے سے نشے کی کیفیت طاری ہونا شروع ہو گئی تو پھر تیرے سرگرانی سے دوچار ہونے کا اندیشہ ہے۔

(۱۵۹) ایک غمزدہ دل پوری بزم کے شرکائے کار کی افسردگی کا سبب بن جاتا ہے۔

(۱۶۰) اے محبوب، تیرے چاہنے والے تیری دید سے اپنے دلوں کو سرشار کر لیا کرتے ہیں ہماری آرزو ہے کہ جب تو اپنے احباب کا چہرہ دیکھے تو اس سے تیرے دل کی دنیا بھی خوشیوں سے لبریز ہو جایا کرے۔

(۱۶۱) اس سے پہلے کوئی ذوق ثقیل کا مارا شخص اس راگ ورنگ کی محفل میں در آئے سامان طرف کو یہاں سے ہٹا دیا جائے۔

(۱۶۲) ہماری اس پر کیف محفل میں آپ کو ہر کیش کا انسان مل جائے گا خواہ وہ کافر ہو خواہ مومن، خواہ ارمنی ہو، اہل نصاریٰ میں سے ہو یا اہل یہود سے۔

(۱۶۳) اے بندہ نیک نہاد! ہماری اس بزم میں کسی نوع کا تکلف روا نہیں رکھا جاتا۔ ہاں تیری سمائی بھی اس مجلس میں ممکن ہے البتہ تیرے عمامے کی یہاں قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

(۱۶۴) چمن میں بس دو ہفتوں تک پھولوں کی بہار رہے گی، تو شراب کے نشے میں مخمور اہل دل کے اسرار سے بھی زیادہ خندہ جبینی کا مظاہرہ کر۔ بساط دنیا پر برے اور بھلے کا امتیاز تیرا طریق کار نہیں ہونا چاہیے تو چشم آئینہ کی مانند ہر اچھے اور برے پر حیرانگی کا اظہار کرتا رہا کر۔

خط-۱۰

(۱۶۵) یہ دور حاضر کا نیا طور طریق ہے کہ پیغام رسانی کے نئے نئے انداز اپنا لیے گئے ہیں۔ اس سے پہلے ہم نہیں سنا کہ کسی نے عنقا سے بھی نامہ بری کا کام لیا ہو۔

(۱۶۶) ہمارے دل کی جلتی دنیا اگر تجھ پر آشکارا نہیں ہو سکی تو کوئی بات نہیں کیا تمہاری بارگاہ میں ہماری آہ و فغاں بھی قابل شنید نہیں۔

(۱۶۷) ہمارے دل کی دنیا میں راگ و رنگ کی آرزو کچھ اس شدت سے انگڑایاں لے رہی ہے کہ ہماری طلب بے اندازہ ہے جبکہ ہم اندر سے بالکل خالی ہیں۔ بانسری کے سوراخوں سے جو کچھ بھی برآمد ہوتا ہے وہ ہماری آہ و پکار میں مزید اضافے کا سبب بن جاتا ہے۔

(۱۶۸) اس کارخانہ حیات میں جاہ و منصب کی آرزو اور مال و دولت سے نفرت کوئی معنی نہیں رکھتے۔ تو ان خواہشات سے دستبردار ہو یا نہ ہو زندگی کے دن پورے ہو کر ہی رہیں گے۔

(۱۶۹) ہم نے دیکھا کہ جیحوں سے کوہ صفا تک کوئی مونس و غمخوار نہ تھا اور مکہ معظمہ کی فضاؤں میں بھی کسی قصہ گو کی خبر نہیں ملی کہ وہ قصہ سنا رہا ہو اور سننے والے توجہ سے سن رہے ہوں۔

(۱۷۰) صراحی کی تبسم آمیزی نے ہمارے نشے کی مستی شکستہ کر دی اور باب توبہ کو بند کر دیا جبکہ ساقی کے دل کا دروازہ کھول دیا۔

(۱۷۱) تو نے میخانے میں مجھے شراب کے نشے میں لن ترانی کہتے نہیں سنا ہو گا۔ تو اس بات سے باخبر ہے کہ میں شراب چھپ چھپا کر پیا کرتا ہوں۔

(۱۷۲) وہ بے آگہی کا زمانہ میرے لیے جنت کا درجہ رکھتا تھا مگر صد حیف کہ ہم پر یہ حقیقت بڑی دیر کے بعد منکشف ہو سکی۔

(۱۷۳) تمام شہر حسینوں سے پر ہو چکا ہے۔ مگر میرے دل میں میرے محبوب کا خیال ہی سمایا ہوا ہے۔ میں اس مغرور اور سنگ دل کی ستم گری کا رونا کس کے سامنے رووں کہ ہماری طرف ذرا بھی التفات نہیں کرتا۔

(۱۷۴) اس نے یہ بات کب کہی تھی کہ اس کے درد کی دوا اپنا اثر ظاہر نہ کرے گی۔

(۱۷۵) اگر تیری تمنا ہے کہ تیری خامیاں تجھ پر واضح ہو جائیں تو کچھ دیر کے لیے گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنے باطن کی خبر لے۔

(۱۷۶) اے عشق! کعبے کو مت منہدم کر کہ گاہ گاہ کارواں سے بچھڑے ہوئے لوگ وہاں ستانے کے لیے

کچھ دیر قیام کرلیا کرتے ہیں ۔

(۱۷۷) اے غالب! ہمیں منصب شاعری خوش تو نہ آیا تھا مگر ہوا یہ کہ شعر کے خود شعر کی صورت میں ڈھل جانے کی تمنا نے شاعری کو ہمارا فن بنا دیا۔

(۱۷۸) میرے کرب والم کی حریت کے بہتان کا جلا پا (حسد) پگھل گیا۔ اس لیے کہ یہی وہ مقصود و مطلوب ہے جس پر تہمت دھرنا بھی ایک طرح کا حسد ہی ہے۔

(۱۷۹) یہ بہت بڑی خطا ہے کہ تو شراب کی صفائی اور اس کی تلچھٹ میں خط امتیاز کھینچنا شروع کر دیتا ہے۔ معاملہ اس وقت خرابی کی صورت اختیار کر لیتا ہے جب تو شراب کے اچھے یا برے ہونے میں تمیز کرنا شروع کر دے۔

(۱۸۰) قطرۂ آب دوسری آنے والی لہر کے خوف سے اپنے آپ کو صدف میں چھپا لیتا ہے۔ لوگوں سے دور رہنا اور خلوت نشینی کی روش اختیار کرنے کی وجہ بالعموم ان سے ملنے جلنے کے عمل میں شرم اور ہچکچاہٹ ہوا کرتے ہیں ۔

(۱۸۱) میں خاک نم آلودہ کی طرح اپنے میں اٹھنے کی ہمت نہیں پاتا جبکہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ میں نے شراب پی رکھی ہے اور اس کی مستی نے مجھ بے حس و حرکت بنا دیا ہے۔

(۱۸۲) اس سے ملنے کی ناامیدی نے ہی ہمارے اعتبار کی پوزیشن شکستہ کر ڈالی ہے ورنہ یہ عاجزی جسے تمہاری نظریں ملاحظہ کر رہی ہیں محبوب کی ادائے ناز کا غبار ہی تو ہے۔

(۱۸۳) یہ بوریا نشینی، یہ انداز فقر اور یہ میٹھی میٹھی نیند مجھے بھلی لگتی ہے۔ عیش و عشرت کے ایسے سامان تو تخت شاہی پر بھی میسر نہیں ہوتے۔

(۱۸۴) ہمارے تصور کے سحر کو آئینہ اپنے اندر سمانے کی تاب نہیں رکھتا یہی وجہ ہے کہ ہم اپنا عکس ایک دوسری لوح پر نقش کر رہے ہیں۔

(۱۸۵) عشق کی مستی میں فضول زندگی نہیں گذاری جا سکتی، میرا جگر اپنے اندر تیز آنچ رکھتا ہے اور میں اپنا دامان پھاڑے جا رہا ہوں۔

(۱۸۶) عشق کے ماروں نے نہ جانے کتنے ہی گریباں چاک کر دیے ہیں یہی وجہ ہے کہ جستجو کا ہاتھ دشت و بیاباں کی وسعتوں تک رسائی نہیں رکھتا۔

(۱۸۷) الفت و محبت اور خلوص کے علاوہ مجھ سے کسی بھی طرح کا استفسار بالکل نہ کرو۔

(۱۸۸) میں اپنی بے ربط آہ وزاری کو آداب کی چھلنی سے گذار لیا کرتا ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ کسی طرح کی ناگوار صدا میرے محبوب کی سماعت سے ہم آغوش ہو۔

(۱۸۹) جناب مسیح آپ ہم عشق کے کشتگان کی مجلس بے کیف سے کہیں دور تشریف لے جائیے کہ آپ کا کسی انسان کو اپنے اعجاز مسیحائی سے دوبارہ زندہ کر دینا بے شمار انسانوں کو جان سے مار دینے کے مترادف ہے۔

خط-۱۱

(۱۹۰) اے میرے دل کی بستی کے مکیں اور میری نگاہوں سے مستور میرے محبوب! یقین جان کہ تو حقیقت میں ہر وقت گویا میری نظروں کے سامنے ہے اور میں تمہیں نیک آرزوؤں کی سوغاتیں بھیج رہا ہوں۔

(۱۹۱) عمر رفتہ کے عیش وطرب جب آئینہ خیال میں درآتے ہیں تو گویا نیند کی سی کیفیت ہم پہ طاری ہو جاتی ہے۔ شراب کی مقدار اتنی نہ تھی کہ نشے کا عذاب ہم سے دور کر سکتی۔

(۱۹۲) مجھ میں بے شک لذت و کیف تو کم ہی ہیں لیکن پھر بھی میں ایک متاع بے بہا کی حیثیت رکھتا ہوں اور وہ اس لیے کہ میں چمن ہستی کا وقت سے پہلے کا ثمر ہوں۔

(۱۹۳) خدا نہ کرے کہ میری اس متاع بیش قیمت کے مقدر میں ارزاں ہونا لکھ دیا جائے۔

(۱۹۴) جو چیزیں تمہیں دیہات یا شہروں کے باسی مہیا کر سکتے ہیں ان کی میری ذات سے آرزو اور طلب کارِ بے معنی ہے۔ ہمارا کل اثاثہ دریا یا کسی کان سے حاصل شدہ ہے۔

(۱۹۵) ہماری بستی میں تو محض شکستہ دلوں کا کاروبار اور خرید و فروخت ہوتی ہے۔ تجھے خود فروشی کا بازار درکار ہے تو کہیں اور اس کی جستجو کر دیکھ۔

(۱۹۶) ہم اکیلے ہی سفر پر نکل کھڑے ہوئے اور رفقائے کار کی رفاقت کا سہارا نہ لیا۔ صد حیف کہ دشت جنوں کی طویل مسافتیں ہمیں تنہا ہی طے کرنا پڑیں۔

(۱۹۷) میں نے اپنے رفقائے کار سے دامن چھڑانے کی سعی نہیں کر رہا بلکہ دراصل کارواں کی تیزی رفتاری کے باعث میرے ہمرکاب ساتھیوں کے پاؤں چھلنی ہو گئے ہیں۔

(۱۹۸) میری سرعت رفتاری کی حدت نے راستے میں موجود کانٹوں کو جلا کر بھسم کر دیا ہے اور میرا یہ عمل اس راستے کے رہرووں کے پاؤں کے لیے راحت کا موجب بن گیا ہے۔ نہ کانٹے ہوں گے نہ پاؤں زخمی ہونے کا اندیشہ ہوگا۔

(۱۹۹) اس دھاگے کی طوالت اس امر میں مانع ہے کہ اسے انگلی کے گرد لپیٹا جا سکے۔

(۲۰۰) تو کسی کے کردار کے بارے خود اس شخص سے دریافت حالات نہ کر بلکہ اس کے ہمجولیوں سے اس کی کیفیت کردار کی بابت معلومات حاصل کر۔

(۲۰۱) حافظ کی یہ پکار محض فضول گوئی پر مبنی نہیں بلکہ یہ داستان بڑی ندرت خیز ہے اور یہ امر نہایت نرالا ہے۔

(۲۰۲) اے بلند صدائیں پیدا کرنے والے ڈھول درحقیقت تیرا باطن کھوکھلا ہے۔

(۲۰۳) جب تک تجھے خلاصہ کیدانی کی شد بد حاصل نہ ہوگی۔ اس وقت تک تجھے نماز پڑھنے کے آداب سے آگاہی کیسے ہو سکتی ہے۔

(۲۰۴) میرے ذوق جستجو نے میری طلب کی تلاطم خیزیوں کے آگے کبھی بھی بند باندھنے کی کوشش نہیں کی میں ان لمحوں کو بھی دانہ دانہ چننے میں صرف کر رہا تھا جبکہ میں خود پورے ایک خرمن کا مالک تھا۔

(۲۰۵) عوام الناس کی پیروی میں اکثر بھٹک جانے کا خطرہ ہوا کرتا ہے اس لیے میں ان راستوں کا راہی نہیں بنا کرتا جو قافلوں کی گذرگاہ بن چکے ہوں۔

(۲۰۶) تو نے ہی مجھ درد آشنا بھی کیا اور آخر الامر میرے درد کا درماں بھی تو یہی ٹھہرا۔

(۲۰۷) میں اس مستی کی حقیقت کو نہ پا سکا جو میرے اندر رونما ہوئی، نہ جانے ساقی کون بنا اور وہ یہ مئے کہاں سے لایا تھا۔

(۲۰۸) میں اس وقت سے اس کے دام محبت میں گرفتار ہوں جب کہ میں محبت کے مفہوم سے بھی ناآشنا تھا۔

(۲۰۹) گذشتہ برس جو آگ میرے گھر میں شعلہ زن ہوئی تھی یہ اسی آگ سے پیدا ہونے والے دھوئیں

کے اثرات تھے جس نے میرے پڑوسیوں کو متاثر کیا۔

(۲۱۰) تیری زلف عنبر بار اپنی خوشبوؤں سے ماحول کو معطر کرتی رہتی ہے لیکن نادان عشاق نے مصلحتاً یہ الزام چین کے آہوؤں کے سر منڈھ دیا۔

(۲۱۱) میں محبوب کی دستک پر براجماں کتا ہوں، ساری رات اس کی یاد کا طوق گلے میں پہنے اس کے در پر پڑا رہتا ہوں۔ مجھے نہ تو شکار کی خواہش ہے اور نہ ہی چوکیداری کا شوق۔ اگر خضر مجھے تلاش کرنے نکل کھڑا ہو تو یہ انتہائی حیران کن بات ہوگی کیونکہ میں چشمہ حیات کی مانند تاریکیوں میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہوں۔

(۲۱۲) میں اسے پالینے کی منزل کیسے سر کر سکتا ہوں، جبکہ میرا شوق مجھے کئی مرتبہ زمین پر پٹخ چکا ہے اور یہ درحقیقت اس لیے ہے کہ میں نے نئی نئی پرواز کرنا سیکھی ہے اور ستم یہ کہ میرا آشیانہ بلند شاخ پہ ہے۔

(۲۱۳) اگر کعبہ کی دید کی طلب میں تو بیاباں نوردی کرنا چاہتا ہے تو اگر ببول کے خار تجھ پر ملامت کے تیر پھینکیں تو تجھے افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

(۲۱۴) آئینہ خانہ ہمارے طلسم کو منعکس کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنی تصویر بنانے کے لیے ایک دوسری لوح کا انتخاب کر لیا ہے۔

(۲۱۵) یا تو اپنی طبع کا رنگ زمانے کے موافق کر لے یا پھر اپنے اندر اس قدر حوصلہ پیدا کر کہ تو ایک ہی جست میں زمانے کو پھاند کر آگے گذر جائے۔

(۲۱۶) درحقیقت یہ کام تو کافی کٹھن تھا لیکن ہم نے اس میں آسانی کے راستے نکال لیے ہیں۔

(۲۱۷) ان ظالموں نے اگر رخ یار کا در وا نہیں کیا تو عرفی کے لیے یہ مقامِ صد مسرت ہے۔ ہم نے تو ڈٹ کر اسی کی چوکھٹ پر ڈیرہ جما لیا ہے۔ اب کسی دوسرے دروازے پر دستک دینے کی حاجت ہی نہیں رہی۔

(۲۱۸) خوشی (عید) کا موقع ہے، عیش و مستی اور رقص و سرود کی ہماھمی ہے۔ ڈٹ کر شراب کے جام لنڈھا، اگر شراب پینا حرام ہے تو اس معصیت کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ اگر روزوں کی فاقہ مستی نے تجھے نحیف و نزار کر دیا ہے تو شراب کو حلال سمجھ کر پی کیونکہ ساقی نے جو کہ ہمارے لیے مقتدا کی حیثیت رکھتا ہے ہمیں اس مسئلے کا حل فراہم کر دیا ہے۔

خط-۱۲

(۲۱۹) جب ہم کسی چیز کی موجودگی کا اذعان رکھتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ وہ ضرور "ہے" تو ہمیں اس کی خبر نہیں ہوتی اور جس چیز کے نہ ہونے کی بات ہم کرتے ہیں اس کا علم بھی ہم ویسے ہی رکھتے ہیں۔

(۲۲۰) ہمارے دلِ شکستہ نے بے شمار ٹکڑوں کی صورت اختیار کر لی ہے اور ان سے آگ کا شعلہ ہویدا ہو رہا ہے یہ جو شعلۂ آنچ نے فوارے کا روپ دھار لیا ہے دراصل یہ ہماری آتش عشق کا جوش ہی ہے۔

(۲۲۱) ساغر و جام اپنے اندر جو کچھ بھی رکھتے ہیں یہ سب آتش عشق کا فراہم کردہ ہے۔

(۲۲۲) اپنے خامہ کو ہم نے مئے میں ڈبو لیا ہے تاکہ اس طرح اچھوتے اور نئے نئے مضامین حیطہ تحریر میں آسکیں۔

(۲۲۳) یہ شراب گذرے ہوئے دن کی مئے سے زیادہ تلخی اپنے اندر رکھتی ہے۔

(۲۲۴) اس سے پہلے جس ہستی نے یہ سربمہر مکتوب مجھے تحریر کیا ہے۔ اس نے اس مکتوب کے نفس مضمون پر

سخت گرہ لگا دی ہے۔

(۲۲۵) یہ نسخہ کہن اپنے آغاز اور اپنے اختتام کا ایسا ہی حال رکھتا ہے جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں۔

(۲۲۶) انتظار کرتے کرتے میں موت کی وادی تک پہنچ چکا ہوں مگر اس حجاب (پردے) کی صورت مجھ پر نہ کھل سکی اور یہاں تک رسائی کا اگر راستہ ہے بھی تو پردہ دار (محبوب) اس کا اتہ پتہ مجھے فراہم کرنے سے گریزاں ہے۔

(۲۲۷) اسرار ازل نہ تجھ پر منکشف ہو سکتے ہیں اور نہ ہی میں ان سے آشنا ہو سکتا ہوں اور اس چیتان کو نہ آپ سمجھ سکتے ہیں اور نہ میں ہی سمجھ پاؤں گا۔ اسی حقیقت نے میری اور تیری باہمی ہمکلامی میں دیوار حجاب بنا رکھی ہے۔ جونہی یہ حجاب دور ہو گا تو نہ تو اپنی ہستی کو باقی رکھ پائے گا اور نہ میں ہی۔

(۲۲۸) اس ندرتوں اور نیرنگیوں سے معمور دنیا میں عقل محو حیرت ہے کہ دیکھو تو سہی ہنگامہ تو محض ایک ہی ہے مگر پوری دنیا تماشائی بنی ہوئی ہے۔

(۲۲۹) میرے اور اس کے سنگم اور میل جول کی وہی کیفیت ہے جس طرح کہ موج کنارے سے محبت کا تعلق رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لحہ بہ لحہ فصل و وصل کے ہنگامے برپا ہوتے رہتے ہیں۔

(۲۳۰) میں نے کنارے پہنچنے کی جتنی بھی تگ و دو کی لا حاصل رہی، البتہ اس سے پریشانیوں میں ہی اضافہ ہوتا رہا لیکن تنگ آ کر جب میں نے ہاتھ پاؤں مارنے روک دیے تو عین وسط دریا ہی یوں لگا کہ میں ساحل سے ہم کنار ہو گیا ہوں۔

(۲۳۱) اس بات کے ضمن میں میری آگہی عین درست ہے اور میرا اندازہ بھی اس سے مطابقت رکھتا ہے۔

(۲۳۲) صد حیف کہ میری کمند میرے دست و بازو سے مطابقت نہیں رکھتی ورنہ ہر مقامِ رفعت سے ہمیں ایک خاص نسبت حاصل ہے۔

(۲۳۳) تجھے ندائے سروش پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اپنا تحفظ کر لے مگر نہیں معلوم تو کیونکر اس دام فریب کا شکار ہو گیا۔

(۲۳۴) یہاں کوئی بھی چیز مستور نہیں لیکن چونکہ تیری صداؤں تک میری رسائی نہیں اگرچہ پوری دنیا میں تیرے جلوے ہیں مگر تیرا مقام ابھی تجھ سے خالی ہے۔

(۲۳۵) اے وہ ہستی کہ تیرے عشق کے متوالوں کا ناوک غم قلوب عشاق کا نشانہ باندھتا ہے لوگوں کی نگاہیں تیری جانب لگی ہوئی ہیں اور تو ان کی نگاہوں کی رسائی سے باہر ہے۔

خط-۱۳

(۲۳۶) اگر رخِ حقیقت حجاب کی زد میں دکھائی دیتا ہے تو یہ دراصل ہماری صورت پرست نگاہوں کی خطا ہے۔

(۲۳۷) اس بات کی وضاحت کرنا کہ ہر ذرہ عین ذات ہے ایک امر محال ہے لیکن اس کے باوصف اس کی جانب اشارہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کہاں ہے؟

(۲۳۸) میرے اعمال بد پر تو اگر مجھے بدلہ دیے بغیر نہیں چھوڑتا تو پھر آخر تو ہی اس راز سے پردہ اٹھا کہ مجھ میں اور تجھ میں امتیاز کی صورت کیا ہو؟

(۲۳۹) زبان پہ سکوت کا پہرہ بٹھاؤ اور چشم حقیقت کو وا کر لو، اس لیے کہ جناب موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کو جو منع کیا گیا تھا یہ تادیب کی طرف اشارہ ہی تو تھا۔

(۲۴۰) صد حیف کہ میرے ظرف میں اتنی وسعت نہیں جس قدر تیرے جمال کی رفعت ہے اور یہی وجہ ہے

کہ تیری دید نہ ہو پانے پر مجھے کوئی شکوہ بھی نہیں ہے۔

(۲۴۱) تو حجاب میں بھی ہے اور ہر جگہ عیاں بھی ہے، تیری ہستی نے ہر کسی کو رفاقت کا شرف بھی بخش رکھا ہے پھر بھی ہر کسی کے حصے میں تیرے وصال کی دولت نہیں آنے پاتی۔

(۲۴۲) تیرے بے مثال حسن و جمال نے میرے دل کی دنیا خاکستر کر رکھی ہے ورنہ تیری بارگاہ میں آئینہ دل کی شکستگی ایک ہنر کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۲۴۳) ارباب عقل کو کسی بات سے آگاہ کرنے کے لیے اشارہ ہی کافی ہوا کرتا ہے اور میں نے ایک بار تو یہ اشارہ کر دیا ہے اب لگتا ہے کہ دوبارہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔

(۲۴۴) احباب ذرا مجھے اس راز سے واقف کرو کہ اس بزم میں کس ہستی کی جلوہ گری عام ہو رہی ہے۔

(۲۴۵) تو دید کے قرینوں سے عاری ہے (یعنی تو بصیرت کی آنکھ سے نہیں دیکھتا) ورنہ یہاں یہ صورتحال ہے کہ یہ انداز تغافل ہی سب کچھ دیکھنے کو موجود ہے اور تو سکوت کی زبان سے بھی آشنا نہیں لگتا ورنہ یہاں سکوت ہی میں کلام کی جھلک پائی جاتی ہے۔

(۲۴۶) لوگ اپنے ہمدم کا نشان ڈھونڈنے کی جستجو تو کرتے ہیں مگر نہیں پا سکتے حالانکہ یہاں اس نے کئی نشان چھوڑ رکھے ہیں۔

خط-۱۵

(۲۴۷) ہماری سماعت سے ایک بھی نعرۂ رندانہ ہمکنار نہیں ہو پاتا، بربادی ہو اس مقام کے لیے جہاں کوئی میکدہ نہ ہو۔

(۲۴۸) یہ امر کس قدر عجیب و غریب ہے کہ لوگ ایک حبشی (سیاہ آدمی) کو کافور (سفید) کے نام سے پکارتے ہیں۔

(۲۴۹) ارباب عقل نے نیک و بد کے لیے جو مقیاس (پیمانے) قائم رکھے ہیں ہم ان سے موافقت پیدا کرنے سے تنگ آ چکے ہیں۔

(۲۵۰) کوئی بھی نصیب العین بہ حسن خوبی پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا، جب ایک صفحہ مکمل ہو جاتا ہے تو ورق الٹ دیا جاتا ہے۔

(۲۵۱) میں امید رکھتا ہوں کہ مجھے تنگ ظرفی کا مورد الزام نہیں ٹھہرایا جائے گا اس لیے کہ یہاں تو مے نوشی شرفاء کا روزانہ کا معمول ہے۔

(۲۵۲) عوام الناس کو اقتدا کے لیے چن لینا انسان کے لیے ضلالت کا موجب ٹھہرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم اس راستے کا انتخاب ہی نہیں کرتے جسے کارواں نے اپنا راستہ بنا لیا ہو۔

(۲۵۳) تیری نگاہوں میں محض شجر طوبیٰ ہی بس گیا ہے جبکہ ہمیں محبوب کی بلند قامتی زیادہ عزیز ہے۔ درحقیت ہر انسان کی سوچ اس کے ظرف کے بقدر ہوتی ہے۔

(۲۵۴) ہم ایسے سلامتی طبع کے حامل لوگ ہیں کہ روزانہ لوگوں سے جھگڑنا ہماری فطرت کے منافی ہے۔

(۲۵۵) آج تک کوئی انسان ایسا نہیں نظر پڑا جو راہ وفا میں یقین کامل کے ساتھ محرم اسرار بن سکا ہو بلکہ ہر کوئی اپنی اپنی فہم کے مطابق محض ظن و تخمین کے گھوڑے ہی دوڑاتا رہتا ہے (یعنی اس راستے کا کوئی بھی راہرو یقین کامل کی دولت سے بہرہ یاب نہیں ہو پایا)۔

(۲۵۶) جب وہ حقیقت کا ادراک نہ کر سکے تو ترنگ میں آ کر قصہ گوئی شروع کر دی۔

(۲۵۷) کفر کی روش اگر کعبہ سے ہی ظاہر ہونے لگے تو پھر آپ ہی بتائیں کہ اسلام کو کہاں ڈھونڈا جائے۔

(۲۵۸) لوگوں کی بدذوقی ملاحظہ کیجیے کہ گائے کو تو خدا کا مقام دے رکھا ہے لیکن سیدنا نوح علیہ السلام کی رسالت کا اقرار کرنا انہیں دشوار ہو گیا۔

(۲۵۹) عوام الناس کے افکار و نظریات کی تردید ہی درحقیقت (حقائق کی) تصدیق کی ایک شکل ہے۔ تو اپنی ذات سے آگہی حاصل کر کہ یہی خدا تعالیٰ کی توفیق کا ماحصل ہے۔ عام لوگوں کی پیروی سے تو حقیقت کی دنیا سے دور جا پڑے گا۔ اہل تحقیق کے نزدیک عوام الناس کی اختیار کردہ روش کو ترک کرنا ضروری ہے۔

(۲۶۰) صد حیف میں اپنے دکھوں کا درماں کہاں تلاش کروں، طبیب طرح طرح کی احتیاطیں اور پرہیز اختیار کرنے کو کہتا ہے مگر دل کی بے صبری پکار پکار کر مٹھاس طلب کرتی ہے۔

(۲۶۱) ذوق کے اختلاف نے لوگوں کی پسند بھی ایک جیسی نہیں رہنے دی۔

(۲۶۲) اگر تو وادی عشق کے اسرار و رموز کا نکتہ شناس ہے تو پھر اس داستان الفت کو مزے لے لے کر سنا کر۔

(۲۶۳) رہرو الفت کے لیے ادھیڑ بن کی حالت میں ہونا اور شش و پنج کی کیفیتوں سے دوچار رہنا ایک طرح کا نقص ہے۔ میں اپنی روشِ کفر پہ نادم ہوں کہ تادم ایں اس میں ایمان کی بو باس باقی ہے۔

(۲۶۴) کفر میرے دل میں اس قدر رچ بس گیا ہے کہ میں اسے نہ جانے کتنی بار دیدارِ کعبہ کرا چکا ہوں مگر واپسی پر اسے برہمن ہی پایا۔

(۲۶۵) دیکھو تو سہی وہ کوتاہ نظر کس قدر مختصر بات کرنے کا سلیقہ رکھتا ہے۔

(۲۶۶) غالبؔ کا دل اس کے اس رویے سے بہت مسرت حاصل کیا کرتا ہے کہ وہ مئے ناب میں گلاب بھی ملا لیا کرتا ہے۔

(۲۶۷) اگر محرم اسرار کی یہ حالت ہے تو پھر نا واقفان حال سے کیا شکایت کی جا سکتی ہے۔

(۲۶۸) اس فساد نے کہاں سے جنم لیا ہے میں اس کی حقیقت سے خوب شناسا ہوں۔

(۲۶۹) یہ امر بڑا اذیت ناک ہوگا اگر امروز کے بعد کسی فردا کا انتظار کرنا پڑا۔

(۲۷۰) یہ داستان اپنے اندر بڑی طوالت رکھتی ہے اور اسے اختصار کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں۔

(۲۷۱) جس دکان سے بھی عمدہ اشیاء میسر آ سکیں اس دکان کو اچھا کہنا ہی زیبا ہے۔

(۲۷۲) تو اپنے درد دل کا یقینی مداوا کسی ایسی چیز میں پا سکتا ہے جو چین کی صراحی اور حلب کے شیشے میں دستیاب ہوتی ہے۔

(۲۷۳) صاف ستھری مئے دیار فرنگ سے ہی میسر آتی ہے اور محبوب تاتار سے مل پاتے ہیں۔ ہم بایزید بسطامی سے واقف نہیں اور نہ ہی بغداد کے محلِ وقوع کی ہمیں خبر ہے۔

(۲۷۴) صبح کی ٹھنڈی ہوا کے اسرار سے جو انسان بھی آگاہی رکھتا ہے اسے خوب معلوم ہے کہ پت جھڑ کا موسم آ جانے پر بھی یاسمین کے پھولوں میں مہک باقی رہتی ہے۔

(۲۷۵) پیمانہ ساقی میں کچھ وقت کے لیے مئے ناب کی چمک پر نظر جما کر تو دیکھو ایسے معلوم ہوگا جیسے پانی کو آگ سے باہم آمیز کر دیا گیا ہو۔

(۲۷۶) یہ عام قسم کی شراب نہیں ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ آفتاب کی کرنوں کی پانی میں آمیزش کر دی گئی ہے۔

(۲۷۷) اے حافظ تو دنیا کی اور کون کون سی نعمتوں کا طالب ہے، شراب تیری رسائی میں ہے اور محبوب کی شوخیاں اور ناز نخرے اٹھانے کا موقع بھی میسر ہے۔

(۲۷۸) تیرا جام جب تلک مئے سے لبالب بھرا ہوا ہے تجھے بغیر توقف کے اسے پیتے رہنا چاہیے۔

(۲۷۹) خشک مزاج زاہدوں کو شراب کی پیشکش کرنا بے معنی ہے اس لیے کہ یہ کھاری آب زم زم نوش جان کرنے کے خوگر ہیں انھیں بھلا اس جوہر ناب کی قدر و قیمت کیا معلوم؟

(۲۸۰) خدا کرے کہ تجھے لمبی عمر نصیب ہو یہ تیری مختصر سی گفتگو بھی غنیمت ہے۔

(۲۸۱) اے زاہد، تو ہم کو میسر اس خوشہ رز کو حقارت کی نظر سے مت دیکھ، تجھے کیا خبر کہ ہم ایک پیمانے کا نقصان کیے بیٹھے ہیں۔

(۲۸۲) ایک طرف تو تجھے ایک مسلمان کے خشک لبوں کی تشنگی دور کرنے کا یارا نہیں جبکہ دوسری جانب ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ تو نے عیسائی بچوں کی تسکین کے لیے مئے ناب کی سبیل قائم کر رکھی ہے۔

(۲۸۳) آرزوؤں کے یہ نقوش کتنے ناپائیدار ثابت ہوئے ملاحظہ تو کرو۔

(۲۸۴) تجھے شراب کی تلچھٹ یا شراب خالص سے کیا کام؟ تیرا کام تو بس پیتے چلے جانا ہے۔ ہمارے اس ساقی کے ہاتھوں سے جو کچھ بھی میسر آئے وہ اس کی عین مہربانی ہے۔

(۲۸۵) یہ بات اپنی جگہ درست سہی کہ ہم رنگ اور مہک سے عاری ہیں مگر اس میں تو کچھ شبہ نہیں کہ ہم اس کے چمن کی ہی گھاس ہیں۔

(۲۸۶) اس شبستان میں میرے نہاں خانہ دماغ سے اگر ندامت کی مستی ختم نہ ہوگئی ہوتی تو ایک معمولی اشارے سے بھی میں ساغر شراب کو اس آن بان سے تھام لیتا کہ (بادشاہ) جمشید نے بھی اس انداز سے کبھی جام نہ تھاما ہوگا۔ میں اپنی اس مختصر سی مملکت میں کسی کو بھی اپنا ہمسر خیال کرنے کا روادار نہیں ،میرے اعتبار کی ترازو کی یہی خوبی ہے کہ وہ ایک ذرے کی کمی بھی برداشت نہیں کرتی۔

(۲۸۷) ایسا شخص دنیائے عشق کے اسرار و رموز سے کیسے واقف ہوسکتا ہے جسے اپنی پوری زندگی میں ایک مرتبہ بھی (محبوب کی چوکھٹ پر) سر پھوڑنے کی نوبت نہ آئی ہو۔

(۲۸۸) فرہاد اپنے ذوق کی تسکین کی خاطر جان کی بازی ہار گیا مگر اس کے اس عمل میں آخر کونسی خوبی ہے۔ اپنے اسی تیشے سے اگر وہ مندر پر ضرب لگاتا تو کچھ بات بھی بن جاتی۔

(۲۸۹) اگر میرے ہاتھ میں اٹھنے کی سکت پیدا بھی ہو جائے تو میں گریباں کہاں سے لاسکوں گا۔

(۲۹۰) داستان الفت بہت مختصر ہے لیکن عجیب بات ہے کہ کوئی بھی انسان اس مختصر کہانی کے انجام تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

خط-۱۶

(۲۹۱) صبح کا سماں ہے اور بہمن کے بادلوں سے اولے برس رہے ہیں۔ صبح کی شراب کو خوب تیار کر اور ایک سیر (وزن) کا ساغر میرے ہاتھوں میں تھما دے۔ بوقتِ سحر اگر شراب کی مستی کے باعث تیرا سر بوجھل ہو جائے تو پھر بہتری اسی میں ہے کہ اس جبینِ خمار کو شکستہ کر دیا جائے۔

اے شراب پلانے والے! ذرا ہوش کے ناخن لے کہ رنج والم ہماری تلاش میں ہیں۔ اے مطرب تو اپنے ان سروں کا دھیان رکھ جو تو الاپ رہا ہے۔ ساقی تجھے خدائے بے نیاز کی قسم شراب کا جام ہمیں پیش کر کہ مطرب کے ترانوں سے "ھوالغنی" کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔

(۲۹۲) بدخشانی اور شیرازی دونوں ایک ہی نسبت رکھتے ہیں۔

(۲۹۳) اے پھول میں تیری اس خوبی پہ خوش ہوں کہ تو اپنے اندر کسی کی خوشبو بسائے ہوئے ہے۔

(۲۹۴) ارباب دانش نے نیکی اور بدی کے جو پیمانے اپنا رکھے ہیں انہیں دیکھ کر ہم خدا لگتی کہتے ہیں کہ ہم ان سے عاجز آ گئے ہیں۔

(۲۹۵) اس عید کی مانند جو موسم بہار میں اپنی جلوہ گری دکھا کر چلی جاتی ہے۔

(۲۹۶) یہ مقام جو مجھے حاصل ہے اس کے سامنے دنیا و آخرت دونوں کوئی معنی نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ یہ مقام میں کسی بھی قیمت پر دینے کو تیار نہیں ہوں اگرچہ بہت سے لوگ اسے حاصل کرنے کے لیے میرے در پے ہیں۔

(۲۹۷) تیرا اپنا سینہ حدّت آشنا نہیں ہے اس لیے تو اہل دل کی محفل میں جانے کی کوشش نہ کر، تیرا آتشدان جب آگ سے تہی ہے تو تجھے عود خریدنے کی کچھ ضرورت نہیں۔

(۲۹۸) محبت کے اس ایک بول کی خاطر حالانکہ وہ بھی سچائی سے خالی تھا شکایات کے بے شمار دفتر دھوڈالے۔

(۲۹۹) تو آگ کے حشرے (جگنو) کی صفات بھی اپنے اندر پیدا کر اور مچھلی کے اوصاف کا حامل بھی بن کیونکہ الفت کی سلطنت میں ساگر کی سطح سلسبیل (آب یخ بستہ کا چشمہ) جبکہ اس کی گہرائی آگ کی مانند ہوا کرتی ہے۔

(۳۰۰) اف میرے خدایا لبنان کی پہاڑیوں کو سر کرنا کس قدر دشوار کام تھا اور وہ بھی زمستان کے سردی میں جبکہ وہاں کا گرمی کا موسم بھی سرما کی مانند کافی ٹھنڈا ہوتا ہے۔

(۳۰۱) دمشق ایک بار اتنے بڑے قحط کی زد میں آیا ہے کہ لوگوں کو راہ ورسم عاشقی بھول گئی۔

(۳۰۲) میں تیری نوازشوں کے اس دلربا انداز پر نثار جاؤں کہ وہ بہار کا لبادہ اوڑھے شراب کے خوگروں سے معذرت خواہانہ انداز اپناتے ہوئے آن موجود ہوئی۔

(۳۰۳) وہ مجھے داغ مفارقت دے رہا ہے اور میں آنسو بہا رہا ہوں کیونکہ اب شراب کے تھوڑے سے جام اور چند روز کی بہار باقی ہے۔

(۳۰۴) اے وہ انسان جو یہ صدا لگا رہا ہے کہ میں نے اپنی جان کے بدلے یہ جام شراب کیوں خرید کیا ہے۔ اس راز سے تو ساقی ہی پردہ اٹھا سکتا ہے کہ اس نے یہ جنس اس قدر سستی کیسے کر دی ہے؟

(۳۰۵) خزینہ اسرار کا صدف تو اب بھی وہی پہلے والا ہی ہے۔ الفت کی ڈبیا پر جو مہر اور علامت پہلے تھی اب بھی وہی ہے۔ اے حافظ لہو کی برکھا برسانے والی آنکھ کی داستان پھر چھیڑ کیونکہ اس چشمے میں جو پانی پہلے ہوا کرتا تھا ویسا ہی پانی ہم اب بھی دیکھتے ہیں۔

خط-۱۷

(۳۰۶) میں نے اس سے پوچھا کہ آخری میری خطا کیا ہے وہ جواباً گویا ہوئی کہ تو تو سراپا معصیت ہے۔ اس کے بعد تجھ پر مزید گناہ کا گمان کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

(۳۰۷) کسی چیز کو پانے کی خاطر میں جرات، پاکیزگی محتاط روش اور فیاضی کے اطوار اپنا سکتا ہوں۔

(۳۰۸) مجھے معلوم ہے کہ تو آہ وزاری نہیں کرے گا کیوں کہ تو تحمل اور ثابت قدمی کا خوگر ہے البتہ کوچۂ الفت میں تیرے لیے کرنے یا نہ کرنے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

(۳۰۹) اے زمانے بے شک تیری حیثیت میرے غلام کی ہے اور اسی باعث میں خود کو تیرا آقا خیال کرتا ہوں میں اپنی اس خاک پیائی پر مسرت محسوس نہیں کر رہا بلکہ میں اتنا دم خم رکھتا ہوں کہ افق پر بھی اپنے مقام سے مطمئن نہ ہو سکوں گا۔

(۳۱۰) ان گذشتہ تیس برسوں میں میں نے بہت ہی محنت و ریاضت کی ہے اور فارسی کلام کی وساطت سے عجم کو زمانے بھر میں مشہور کر دیا ہے۔

(۳۱۱) میری حیثیت آج ایک شاعر کی نہیں بلکہ مجھے دانشور کا مقام حاصل ہے۔ مجھے حادث وقدیم کے جملہ اسرار و رموز سے آگہی عطا کی گئی ہے۔ میرا ہر موئے بدن سننے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہے اور میرے سکوت کے ہر رنگ میں بے شمار آوازیں پائی جاتی ہیں۔ میرے ساغر میں یہ جو شراب آپ دیکھ رہے ہیں یہ دراصل لہو کی بوندیں ہیں جو میرے حیطۂ دماغ سے ٹپک رہی ہیں۔
میرے دل کے گرداب میں بے شمار آنکھیں لگی ہوئی ہیں کہ یہ لہر صدف کو ساحل سے ہم کنار کر دے۔ میں نے آئینہ دل کو پگھلا دیا ہے تا کہ اہل بزم کے ہاتھوں میں آئینہ دے سکوں۔ میں ایسا باکمال ہوں کہ میری سحر کاری شعلوں سے حرف تراشنے کا فن اپنے اندر رکھتی ہے۔ یہ سحر کاری کس قدر بلا خیز ہے کہ صبح سے ستارے گر رہے ہیں اور مجھ پہ حروف کی بارش ہو رہی ہے۔ میں نے ان تاروں سے جو نغمہ بھی الاپا ہے درحقیقت وہ ایسا ناقوس ہے جو زنار میں پوشیدہ ہے۔ یہ پھول کہ چمن بھی جس پر نثار ہونے کا متمنی ہے یہ بہار نے مجھ سے یادگار کے طور پر حاصل کیا ہے۔

(۳۱۲) خودی دراصل ایک ایسے آئینے کی حیثیت رکھتی ہے کہ جسے اظہار کی صورت دینا امر محال ہے۔

(۳۱۳) آئینے میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ ہمارے طلسم خیال کو اپنے اندر جذب کر سکے اس لیے ہم اپنا عکس ایک دوسری لوح پر منعکس کر رہے ہیں۔

(۳۱۴) میں نے اپنے بڑھے ہوئے دردِ اشتیاق کے باعث بس ایک ہی پکار بلند کی تھی جس کی بازگشت اب چاروں طرف سے سنائی دے رہی ہے۔

(۳۱۵) زمانے نے میرے اشعار اور قصیدے دور دور تک پہنچا دیے ہیں جونہی میری زبان سے ایک شعر کا ورود ہوتا ہے دنیا والے نغمہ سرائی شروع کر دیتے ہیں۔

(۳۱۶) ہمارے دلِ شکستہ نے بے شمار ٹکڑوں کی صورت اختیار کر لی ہے اور ان ٹکڑوں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں یہ جو فوارہ مچل رہا ہے یہ حقیقت میں ہمارے عشق کی آگ جوش پہ آئی ہوئی ہے۔

خط-۱۸

(۳۱۷) ہمارے نزدیک پوری دنیا عنقا کے مترادف ہے۔ جب سے ہم نے اس امر کا خیال باندھا ہے تب کہیں جا کر اشیاء کی حقیقت کا ایک باب رقم ہو سکا ہے۔

(۳۱۸) تو اس بات سے آگاہ کر دے کہ ایک گروہ اس مقام سے ایک گوہر حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

(۳۱۹) فیاض لوگوں اور اہلِ سخاوت کے برتنوں میں زمین بھی حصہ دار ہوتی ہے۔

(۳۲۰) جب تو جام شراب لنڈھانے لگے تو ایک جرعۂ شراب زمین پر بھی انڈیل دیا کر کیونکہ وہ معصیت جو لوگوں کے لیے فائدہ مند ہو اس کو روبہ عمل لانے کے لیے کسی اندیشے کو خاطر میں نہیں لانا چاہیے۔

(۳۲۱) تو ناز نخرے اپنا کر منزل مقصود تک رسائی نہیں پا سکے گا تاہم اس منزل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ تو اپنا سر نگوں کر دے۔

اگر تیرے ناز و ادا دکھانے سے وہ تجھ سے ترش رو ہوں یا بے التفاتی اپنائیں تو ادھر کا رخ ہی نہ کر، اس لیے کہ وہ تجھے نیاز مندانہ انداز میں بلانے پر بالآخر اپنے آپ کو مجبور پائیں گے اور وہی وقت تیرے ناز دکھانے کا ہوگا۔

(۳۲۲) اس آہوئے دشت کے ساتھ میرا عجیب معاملہ ہے کہ وہ ہر لمحے مجھ سے دور دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۳۲۳) اے بداندیشو یہ ظلم و ستم تم کب تلک انجام دیتے رہو گے۔

(۳۲۴) اے رفقائے کار اگر آپ کوئی معرکہ سر کرنا ہی چاہتے ہیں تو ادھر آؤ کہ یہاں سب کے لیے معرکہ آرائی کا اذن عام ہے۔

(۳۲۵) عمدگی کا احساس تو اگرچہ اس سے بھی عیاں ہے لیکن اس سے بھی بہتر ہونے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔

(۳۲۶) دعوت طعام پر مدعو نہ کیے جانے والے لوگ اتنی زیادہ تعداد میں اکٹھے ہو گئے کہ بلائے گئے مہمانوں کے لیے جگہ کی کمی کا مسئلہ درپیش آ گیا۔

(۳۲۷) دور کے باسیوں کو اچھے لفظوں میں یاد کرنا ہی دراصل قرینہ شجاعت ہے ورنہ تو یہی دیکھا گیا ہے کہ درختوں کا پھل ان کے قدموں میں ہی آ کر گرا کرتا ہے۔

(۳۲۸) اس محفل میں ہر ذوق کے لوگوں کے لیے ان کی تسکین کے اسباب میسر ہیں، ارباب معنی کے لیے معطر فضائیں موجود ہیں اور اصحاب صورت کے لیے رنگوں کی جلوہ گری ہے۔

(۳۲۹) مشکلات کا سینہ چیر کر بھی سنگِ اسود (سیاہ پتھر) لعل کی صورت نہیں اختیار کر سکتا ہے۔ جس کی اصلیت میں نقص موجود ہو اس کے لیے اچھا خمیر بے کار ہے۔

(۳۳۰) اس مشتِ خاک (انسان) کا جوہر ایک خصوصی خمیر سے وجود پذیر ہوا ہے جبکہ تم نے برتن گروں کی مٹی سے ایسی توقعات وابستہ کر رکھی ہے۔

(۳۳۱) اس ساغر مئے کو بصد احترام ہاتھ لگاؤ کہ اس کی تشکیل میں جمشید، بہمن، اور کیقباد جیسے ارباب سلطنت کی کھوپڑیاں استعمال ہوئی ہیں۔

(۳۳۲) یہاں ہر خار کی آبیاری ہمارے خونِ جگر سے ہوئی ہے اور ہم نے صحرا کے اس چمنستان کی باغبانی کے لیے ایک خاص طریق کار وضع کر رکھا ہے۔

(۳۳۳) اس گلستان میں پھول جب عدم سے وجود پذیر ہو گیا تو بنفشے کا پھول اس کے قدموں میں سجدہ ریز ہو گیا ہے۔ زردشت کے مذہبی اصولوں کو اب اس چمن پر منطبق کرو۔ اس پر مستزاد یہ کہ لالے کے پھول نے آتش نمرود کی شدت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔

چاند چہرہ رکھنے والے محبوب کے ہاتھ میں اعجاز مسیحائی آ گیا ہے۔ شراب کے جام پہ جام لنڈھا اور عاد و ثمود کی عبرت ناک داستان کی کچھ پرواہ نہ کرو۔

(۳۳۴) محبوب کا دامنِ وصل ہماری دسترس سے ماورا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم اس کو پانے کے لیے اپنے قدموں کو شکستگی سے دوچار کر کے اس کے دامن سے لپٹ گئے ہیں۔

(۳۳۵) یہ مت پوچھ کہ ہر چٹکتی اور مسکراتی ہوئی کلی شیرینی کی کن لذتوں سے ہمکنار ہوتی ہے، اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے گویا گلوں کی مسکراہٹوں نے سحر کے دودھ میں مٹھاس کی آمیزش کردی ہو۔

(۳۳۶) ایک طرف تمام عنادلِ چمن سرور و مستی کے مزے لے رہے ہیں جبکہ دوسری جانب بے چارہ باغبان احساس تنہائی کی تلخیوں سے دوچار ہے۔

(۳۳۷) پھولوں کی ایک ڈالی کو دیکھتے ہی میری طبیعت پر بے چینیاں اور اضطراب عود کر آئے ہیں میں سوچتا ہوں کہ کاش میرے ہاتھ میں اسی قدر لبالب بھرا ہوا ساغر شراب ہوتا۔

(۳۳۸) یوں محسوس ہوتا ہے کہ دشت و بیاباں کی وسعتیں میری ہتھیلی میں سماگئی ہیں اور اس نے سرخ شراب کو اپنے قبضے میں کر رکھا ہے، خوشا نصیب وہ ہتھیلی جس کے حصے میں شراب کے ایسے ہی جام مسلسل آتے رہیں۔

(۳۳۹) اس سے پہلے کہ ہر منظر کا خوب خوب نظارہ کر لیتا آنکھوں کی بینائی جواب دے گئی۔ زبان سے نطق کی صلاحیت اس وقت چھن گئی جبکہ ابھی کہنے کو بہت سی باتیں باقی تھیں۔

(۳۴۰) جیسے مچھلی کا جسم اپنی ساخت کے اعتبار سے داغ داغ ہوتا ہے۔ ایسے ہی اپنے کفن کے لیے داغوں سے بھر پور لباس میرے وجود کو میسر آ سکا اور میں نے بالآخر اسے ہی غنیمت خیال کرتے ہوئے زیب تن کر لیا ہے۔

(۳۴۱) میرے نہاں خانہ دل میں بلبلے کی سی زندگی کے سوا کسی اور خواہش کا گذر نہیں، بلبلے کو اپنے زندگی کے لیے جو لباس میسر ہوا وہی اس کے لیے کفن کا کام بھی دے گیا۔

(۳۴۲) یہ دنیا ایسی دنیا ہے کہ اسے بار دیگر دیکھنے کی تمنا فضول ہے جو انسان اس عالم آب و گل سے ایک دفعہ چلا گیا اس نے دوبارہ پلٹ کر زمانے کی طرف نگاہ نہیں کی۔

(۳۴۳) دنیا میں ہماری شہرت کا ڈنکا چار سو بج رہا ہے حالانکہ ہماری جیب سکوں سے خالی ہے۔ یعنی خوبیوں سے تہی دست ہونے کے باوجود چار دانگ عالم میں ہمارا شہرہ ہے۔

(۳۴۴) جب نسیم صبح کے جھونکے پھولوں کی خوشبو ہر سو بکھیر دیں گے تو اس کہن سال زمانے کا شباب ایک بات پھر سے لوٹ آئے گا۔

(۳۴۵) عنادل کے چہچہے اور بلبلوں کے زمزمے ایک بار پھر تیرے عشق کی داستان دہرا رہے ہیں وہ لوگ جنہیں کار الفت سے مسرت وانبساط حاصل نہیں ہو پا رہی ان کی زندگی رائیگاں جا رہی ہے۔

(۳۴۶) طائرانِ خوش نوا کے چہچہے بلند ہونا شروع ہو گئے، ہمیں خبر دو کہ شراب کی بلخ کہاں ہوگی۔ عندلیب بے اختیار پکار اٹھی کہ پھول کا نقاب کن (ظالم) ہاتھوں کی چیرہ دستی سے تار تار ہوا ہے۔

(۳۴۷) شراب اور سامانِ طرب (سارنگی وغیرہ) لے کر بھی جنگل کی راہ لے کیونکہ ایک پرندے کی چہک نے خوبصورت سروں والے ساز کی یاد دلا دی ہے۔

(۳۴۸) ہما کو خبردار کر دو کہ اپنی عظمت کا پرتو ان مقامات پر نہ پڑنے دے جہاں طوطی کا مرتبہ گدھ سے بھی کم تر ہے۔

(۳۴۹) اے پھول عندلیب کی نغمہ سنجی تجھے کیسے بھلی لگے گی جبکہ تیرے گوش ہائے دانش، سُر سے عاری پرندوں کی چہک سے لذت اٹھانے کے خوگر ہو گئے ہیں۔

(۳۵۰) ہندوستان کے سبھی پرندے اس پارسی قند سے جو بنگال کو مسلسل جا رہی ہے شکر خوری کے دلدادہ ہو جائیں گے۔

(۳۵۱) کل ایک عندلیبِ خوش نوا سَرو کے درخت کی ڈال پر بیٹھ کر فارسی زبان میں مقامات معنوی کے اسرار و رموز

بیان کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ ادھر کان دھرو کہ کیسے ایک پھول نے سیدنا موسیٰ کو آگ کی جھلک دکھادی ہے تا کہ تجھ پر درخت سے کچھ اسرار حقیقت منکشف ہو سکیں۔ گلستان کے بھی طائران ہم قافیہ ہو کر نغمہ سرا ہیں اور بذلہ گوئی میں منہمک ہیں تا کہ خواجہ فارسی غزلوں کے ساتھ ساتھ شراب خوری سے بھی لطف اندوز ہو۔

(۳۵۲) نسیم صبح! تجھے مبارک ہو کہ شراب فروش بابا آ گیا ہے اور نشاط و مستی اور پینے پلانے کا سماں پھر عود کر آیا ہے۔ فضاؤں میں اعجاز مسیحائی کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں، درختوں پر شادابی لوٹ آئی ہے، ہوا خوشبوؤں کو پھیلانے میں مصروف ہے اور پرندے نے بلند آہنگی سے چہچہانا شروع کر دیا ہے، بہار کی سرمستی ہوا نے لالے کی سرخی کو اس قدر شوخ کر دیا ہے غنچے پسینے سے شرابور ہو گئے ہیں اور گلوں پہ عہد شباب پلٹ آیا ہے۔

(۳۵۳) میرا ساتھ دو ہم مل کر گلوں کی برکھا برسائیں اور شراب کو جام میں انڈیلیں، فلک کی چھت میں شگاف ڈال دیں اور اساس نو پر عمارت تشکیل دیں۔
اے گانے بجانے کے رسیا اگر تو ایک عمدہ ساز اپنے ساتھ رکھتا ہے تو کوئی حسین راگ الاپنا شروع کر کہ ہم ہنگام شوق سے غزل خوانی کر سکیں اور ناچتے ہوئے (تیرے فن کی) داد دیں۔

(۳۵۴) ہزار ہا کاروان شوق وادی کشمیر میں شب بسری کرنے کو دوڑے چلے جاتے ہیں اور وہاں عیش و سرمستی کی متاع سے حظ اٹھاتے ہیں۔

(۳۵۵) اور جس بات نے مجھے غمگین کیا وہ یہ ہے کہ جب میں سو رہا تھا اور میٹھی نیند کے مزے لے رہا تھا، تو اچانک ایک خوش آواز پرندے نے درختوں کی جھنڈ میں ترانہ سنجی شروع کر دی۔ اس کے رونے کی آواز اپنے ترنم کی خوبی میں اپنی مثال آپ تھی اگر اس کے رونے سے پہلے میں نے سُعدیٰ کے عشق میں چند آنسو بہا دیئے ہوتے تو میرے حصے میں شرمندگی نہ آتی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میں ایسا نہ کر سکا اور یہ اس پرندے کا رونا تھا جس سے میرے اندر بھی گریہ زاری کا جوش امنڈ آیا۔ پس مجھے شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑھتا ہے کہ بلاشبہ یہاں فضیلت اسی کے لیے ہوئی، جس نے پہلا قدم اٹھایا۔

خط-۱۹

(۳۵۶) دوسری داستانیں تو تو سن ہی چکا ہے اب ہمارا بھی قصہ شوق سن لے۔

(۳۵۷) اب اور کوئی صورت اس کے علاوہ نہیں رہی کہ میں ہتھیار بند ہو کر میدان کارزار میں کود پڑوں اور افراسیاب سے مقابلہ کروں۔

(۳۵۸) تیری کوہ قامتی نے میری دنیائے دل میں ڈیرہ جمالیا ہے تو ذرا میری کوتاہ دستی اور پھیلے ہوئے دامن کا حال ملاحظہ کر۔

(۳۵۹) میں شمشیر بکف ہو کر اس خاکدان ارضی کو میکدے کی صورت دینے کی کوشش کر رہا ہوں اور اپنے نیزے کی مدد سے فضا کو سرکنڈوں کے جنگل میں تبدیل کر رہا ہوں۔

(۳۶۰) ایک ہی زقند لگا کر میں نے ایسے بلند ترین مقام تک رسائی حاصل کر لی ہے اور اس قدر قوت حاصل کر لی ہے کہ میں غرور و تمکنت سے تنی ہوئی گردنوں کے گھمنڈ کا پندار خاک میں ملا سکتا ہوں۔

(۳۶۱) میں ہمت خداداد سے کام لے کر دشمنوں کی فوج سے ان تمام علاقوں کو واگذار کرانے کا عزم رکھتا ہوں

اور اپنے مخالفین کی مملکت کو جلا کر بھسم کرنے کی آرزو بھی میرے دل میں انگڑائیاں لیتی رہتی ہے۔

(۳۶۲) خدائے حکیم وقدیر کی مشیت اگر چاہے تو نقصان پہنچانے والوں سے بھی خیر اور بھلائی کے امور صادر کروا سکتی ہے۔

(۳۶۳) اگر نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مڈبھیڑ ناگزیر لگ رہی ہے تو ہم اس شعلے کو مزید بھڑکانے کی بجائے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور شر و فساد برپا کرنے سے دامن بچا لیتے ہیں۔

(۳۶۴) کارگاہ حیات میں عشق اس سے پہلے بھی بہت سے کارنامے دکھا چکا ہے اور آئندہ بھی اپنی اس روش پر گامزن رہے گا۔

(۳۶۵) ہمتوں کی پستی اور عزائم کی شکست مجھے اس مقام تک لے آئی ہے کہ چڑیا کو بھی پھانسنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں حالانکہ مجھے اپنی بلند ہمتی کا وہ زمانہ بھی یاد ہے جب میں سیمرغ کو بھی پکڑ لیا کرتا تھا تو اُسے آزاد کرنے سے بھی مجھے کوئی امر مانع نہیں ہوتا تھا۔

(۳۶۶) شاہراہ الفت پر بہشت اور اس کی حوریں زاہدِ خدامست پر اپنا پرتو منعکس کر رہی ہیں۔ عشق کی ترنگ نے رفتہ رفتہ آشنائی فراہم کرنی شروع کر دی ہے۔

(۳۶۷) تیرے حسن سلوک اور تیری محبت والفت کی فراوانی مجھ سے کسی طور پوشیدہ نہیں ہے۔ تیرے لطف و کرم کی بہتات بیان کی حدوں سے باہر ہے۔

(۳۶۸) میرے ندیم! بتا تو سہی اس نگری پہ کس کی جلوہ گری کا سحر ہے کہ اس نگری سے باہر نکلنے پر دل کی دنیا تیار نہیں ہوتی۔

(۳۶۹) میرے محبوب! مجھے یقین ہے کہ دنیا تیری وفاؤں کی داستان پر ضرور اعتماد کرے گی کیونکہ تیرے جھوٹ پر بھی سچی بات کا گمان ہوتا ہے۔

(۳۷۰) میں چھپ چھپ کر اسے دیکھنے کی جستجو میں مصروف تھا کہ اس کی نگاہوں نے میری اس تگ ودو کو بھانپ لیا اور میں ندامت کے احساس سے معمور ہو گیا۔

(۳۷۱) تیرے ناز نخرے اٹھانا میرے لیے سعادت کی بات ہے، میں اپنی نیازمندیوں اور وفاؤں میں کمی نہ آنے دوں گا۔ تیری نازنینوں جیسی البیلی چال اور میری ذات سے تیری پیہم بے التفاتی کے باوجود بھی میں تجھے اندازِ دلبرانہ سے دیکھتا رہوں گا۔

(۳۷۲) وصل کی مٹھاس اور جدائی کی تلخی کا اپنا اپنا انداز ہے تو بار بار وصل کی دولت سے مالا مال کر اور پھر مجھے جدائیوں کے تلخ لمحات کے سپرد بھی کرتا رہ۔

(۳۷۳) اب جبکہ ہم نے رندوں کی محفل میں قدم رکھ لیا ہے تو اب ہمیں اس سے کچھ سروکار نہیں کہ محفل کیا کیا رنگ جمائے گی اور یہاں کون کون سی سرمستیاں ہوں گی۔

(۳۷۴) شجاعت اور پسپائی کے ڈانڈے آپس میں ملے ہوئے ہیں، ان کے مابین بس تھوڑا سا فاصلہ ہے۔

(۳۷۵) محبت کا نغمہ الاپتے رہو کہ یقیناً یہ نغمۂ محبت محبوب کی محبت کو اپنی جانب مائل کر ہی لے گا۔ اس دنیا میں بہت سے انسان ایک دوسرے سے فاصلوں پر بسنے کے باوجود دلوں کی دنیا کے قریب رہا کرتے ہیں۔

(۳۷۶) زمانہ میری مداح سرائی کا شہرہ کرنے کے لیے اپنے آپ مجبور پاتا ہے۔ جونہی شعر کی لے میری زبان سے بلند ہوتی ہے زمانے والے میری لے میں اپنی لے ملا کر نغمہ سنجی کرنے لگتے ہیں۔

(۳۷۷) میں دل وجان کی ساری صلاحیتوں کے ساتھ تیری یاد میں محو ہوں جبکہ میں اپنی نگاہوں کو تیری ذات پر مرتکز نہیں کرتا تا کہ دنیا والوں پر یہ راز نہ کھل سکے کہ تو میرا محبوب ہے۔

(۳۷۸) محبت اور دلربائی کا مرحلہ ابھی اپنے عروج تک نہیں پہنچا اور نہ ہی ابھی زور آزمائی کا موقعہ آیا ہے۔

(۳۷۹) مدرسے سے بھاگے ہوئے طالب علم بھی اگر نغمۂ الفت کی شیرینی اور صدائے محبت کی مٹھاس سے آشنا ہو جائیں تو انہیں سکول سے ناغہ کرنا کبھی گوارا نہ ہو۔

خط-۲۰

(۳۸۰) دل چاہتا ہے کہ کوئی ایسی مقدس رات بھی آئے جس کے جلو میں ماہتاب کی طباشیریں کرنیں اپنی ضیا پاشیاں بکھیر رہی ہوں تو ان پر کیف لمحوں میں میں اپنے دل کی داستان تم سے کہہ سناؤں۔

(۳۸۱) دیکھ تو سہی تیری مفارقت کے غم میں میرے اشکوں نے مسلسل بہہ بہہ کر ساگر کی صورت اپنالی ہے۔ اب تُو میری آنکھوں کی ناؤ میں سوار ہو کر اس دریائے محبت کی جی بھر کی سیر کر لے۔

(۳۸۲) تجھے میرے محبوب ہونے کا مرتبہ حاصل ہے۔ اس لیے اگر تو میری مژگاں پر اور میرے سر پر بھی آن بیٹھے گا تو میں تیرے ناز وادا اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا۔

(۳۸۳) مجھے اس کے تیر مژگاں کا گھائل سمجھو، اس بے رحم محبوب نے چپکے سے میرے جگر پر اس قدر کاری وار کیا ہے کہ میری آنکھ اس کی اس ضرب کاری کا ادراک کرنے سے قاصر رہی۔

(۳۸۴) یہ جو بظاہر کمزور دکھائی دیتے ہیں ان کے ظلم وجور کی داستانیں تو ملاحظہ کرو۔

(۳۸۵) تیری ذات عزیزوں اور رشتہ داروں کی نظر میں قابل وقعت ہے یہ بات کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے کہ بے شمار قبیلے ایک ہی شخصیت کے حسن وجمال کے گیت گائیں۔

(۳۸۶) یہ ایسی نگاہ ہے جسے دید کا قرینہ اور دیکھنے کا بہترین انداز عطا ہوا ہے۔

(۳۸۷) نفسِ سوال بے قرار ہے کہ کچھ پوچھا جائے۔ اس کے لیے تم زبان کو جنبش مت دو کہ سوال صرف اشاروں ہی اشاروں میں پوچھا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے زبان کو کام میں لانے کی ضرورت نہیں۔

(۳۸۸) تیرے ترکش سے نکلے ہوئے ہر تیر نے میرے وجود پر ایسا کاری وار کیا ہے کہ اس کے بعد دل مزید زخم کھانے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔

(۳۸۹) تو بھی اس بات سے آگاہ ہے کہ میری اس بات کا کیا جواب ہونا چاہیے۔

(۳۹۰) میں نے زخم کھانے کے لیے اپنے آپ کو اس ستم گر کی نوک مژگاں پہ ڈال دیا، کیونکہ میرے دل کو جس قسم کے زخم کی آرزو ہے وہ میرے محبوب کا خنجر مجھے نہ لگا سکا۔

(۳۹۱) اس کا ترجمہ سابقہ شعر والا ہی ہے بس مژگاں کی بجائے لفظ منقار استعمال ہوا ہے۔

(۳۹۲) غالب کے استخوان وجود پر ہمانے کچھ اس طور پر ٹھونگیں لگائی ہیں کہ ایک عرصے کے بعد مجھے نیزوں کی انی سے زخمی ہونے کا انداز یاد آ گیا۔

(۳۹۳) وعظ ونصیحت کی غرض سے ایک بونے قد کا واعظ جامع مسجد میں وارد ہوا ہے۔ ایسے لگتا تھا گویا اس نے برف کا لباس پہن رکھا ہو۔ وہ بڑے نرالے انداز میں اپنی آنکھوں کو گھما رہا تھا کہ چھوٹے بڑے سب اسے سلام کرنے کی کوشش کریں۔ جیسے رسیوں پر کرتب دکھانے والا رسیوں پر اپنا توزان برقرار

رکھتے ہوئے مٹک مٹک کر چلتا ہے۔ سامعین ابھی تک درود و سلام سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ واعظ مذکور اچھل کر منبر وعظ پر براجمان ہو گیا۔

(۳۹۴) جب کوئی شخص حقیقت کا ادراک کر لیتا ہے تو پھر وہ عالمِ بے خبری میں چلا جاتا ہے کہ اسے خود اپنی ہی ذات کا ہوش نہیں رہتا۔

(۳۹۵) میری زباں سے صدائے کرب اس لیے بلند ہو گئی تھی کہ تو جاگ جائے ورنہ منزل عشق تو لوگ بغیر آہ و زاری کے بھی سر کیے دیتے ہیں۔

(۳۹۶) اگر تجھے دید کا شعور ہو تو اس مے خانے میں عالم بے خبری ہی میں سب کچھ دکھائی دینے لگتا ہے۔ تجھے زبان خامشی کا ادراک نہیں ورنہ یہاں سکوت ہی سے گفتگو کا انداز ٹپک رہا ہوتا ہے۔

(۳۹۷) وہ لباس اس کی قامت پر ایسے فٹ آ گیا تھا کہ گویا لباس کو جسم پر ہی سی دیا گیا ہو۔

(۳۹۸) مستی کے عالم میں، میرا محبوب اور میں باہم دست و گریباں ہو گئے۔

(۳۹۹) پریشانی نے تو واقعتاً گھیر لیا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ جلد ہی اس سے نجات بھی مل گئی۔

(۴۰۰) میں وصلِ یار سے کیسے بہرہ یاب ہو سکتا ہوں، میرے شوق کی پرواز نے بار ہا مجھے زمین پر پٹخ دیا اس لیے کہ میں نے ابھی ابھی پرواز کرنا سیکھی ہے اور میرا آشیانہ بھی انتہائی بلند مقام پر واقع ہے۔

(۴۰۱) عشق کی مستی کا عالم ملاحظہ کرو اس دشت بے کنار میں ایک بھی قدم اٹھا نہ پائے تھے کہ مرحلہ عشق کی انتہا تک پہنچ گئے۔

(۴۰۲) شاعر اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ اے کلیم تو رب کریم کی عطا کردہ توفیق و عنایت کے لیے کب تلک شکوہ سنج رہے گا۔ تجھے اپنی کج روی پر خود ہی احساسِ ندامت ہونا چاہیے کہ جب تک تو خود ہی منزل کی جانب گامزن نہیں ہو گا تو رہنما کا اس میں کیا قصور ہے؟

(۴۰۳) تو پرواز کے لیے اپنے آپ کو تیار کر اور طوبیٰ کے درخت پر چہچہانے کی کوشش کر مگر تیری قسمت پر حیف کہ تو پابند قفس ہے۔

(۴۰۴) بجلی کے ایک کوندے سارے راستے کو منور کر دیا اور یوں رہروانِ عشق اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں جبکہ ہم ایسے دیوانے شمع اور چراغ کی روشنی کے انتظار میں وقت عزیز ضائع کر دیتے ہیں۔

(۴۰۵) میں تجھ کیسے باور کراؤں کہ کل میخانے میں عالم سرمستی و مدہوشی میں نے فرشتۂ غیب کی زبان سے کیسی کیسی حیرت افزا اور مسرور کن خبریں سنیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ اے مقام سدرہ تک اڑان رکھنے والے طائر بلند پرواز تیرا ٹھکانہ رنج و الم بھری اس دنیا سے پرے ہے۔ تجھے پردۂ غیب سے ندا دی جا رہی ہے کہ نہ جانے تو کیونکر اس مصیبت کا شکار ہوا۔

خط-۲۱

(۴۰۶) میرے محبوب تیری فرقت اور دوری کے خوف نے مجھے جلا کر خاکستر کر دیا ہے بالآخر فلکِ پیر کی گردش نے مجھے اس بے رحمی کا خوگر بنا دیا ہے۔

(۴۰۷) میری سوچ اور میرے خیال کی رسائی آسمان کی رفعتوں تک ہے جبکہ میرے دل کی دنیا محبوب کے قدموں پر نثار ہے، میں طرز تکلم اپناؤں تو کیسے کہ دماغ اور زبان کے مابین ایک لمبی مسافت حائل ہے۔

(۴۰۸) بے شمار دشت وصحرا عبور کر لیے اور نہ جانے کتنے ہی دشت و بیاباں ابھی راستے میں آنے والے ہیں جن سے عہدہ براہونا ابھی باقی ہے۔

(۴۰۹) ہم نے لاکھ کوشش کر کے اپنے آپ کو اس قابل بنایا ہے کہ آپ کے سامنے لبوں پر مہر سکوت لگائے رکھیں تا کہ تیری محفل کی آب وتاب باقی رہے۔

(۴۱۰) جب تلک مجھے میں قوت موجود ہے میں اپنا گریباں چاک کرتا رہوں گا۔ مجھے اس امر پر کسی نوع کی ندامت محسوس نہیں ہوتی کہ میری حالت رندانہ کے باعث میرا موٹا اور مضبوط لباس بھی خود میرے ہی ہاتھوں تار تار ہو گیا ہے۔

(۴۱۱) میرے حاجت روا! مجھے اس کے متبادل کوئی اور دل عطا کر کہ یہ غم واندوہ کی صورتحال اب میری برداشت سے باہر ہے۔

(۴۱۲) بس جس بات کا تجھے اندیشہ تھا وہ آخرالامر رونما ہو کر ہی رہی۔

(۴۱۳) راہ وفا کی ہر چیز ہم پر عیاں ہے لیکن ان رہزنوں کا کیا علاج کہ جو دل کی آرزوئیں محبوب تک پہنچنے سے پہلے ہی اچک لیتے ہیں۔

(۴۱۴) میرے رفیق نے جب دیکھا کہ قبروں کو دیکھ کر میرے آنسو بہنے لگتے ہیں تو اس نے مجھے ملامت کی۔اس نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ اس ایک قبر کی وجہ سے جو ایک خاص مقام پر واقع ہے تو ہر قبر کو دیکھ کر رونے لگتا ہے؟ میں نے کہا، بات یہ ہے کہ ایک غم کا منظر دوسرے غم کی یاد تازہ کر دیا کرتا ہے، لہٰذا مجھے رونے دے، میرے لیے تو یہ تمام قبریں مالک کی قبریں بن گئی ہیں!

خط-۲۲

(۴۱۵) نامہ بر کی وساطت سے میں نے جو پیغام تجھے بھیجے تھے ان کو ورطہ تحریر میں لانے میں ہی ایک لمبا عرصہ بیت گیا لیکن اس کے باوجود میں اپنے دل کا ٹھیک حال تجھ پر منکشف نہ کر سکا۔

(۴۱۶) زمستاں کے یخ بستہ شب وروز بیت گئے مگر دلِ درد آشنا کی کیفیت ویسی کی ویسی باقی ہے۔گرمیوں کے شدید رات دن بھی گذر گئے لیکن غمزدہ دل کی حالت ویسی ہی برقرار ہے۔المختصر زمانے کے سرد گرم آئے اور چلے گئے لیکن مریض دل کو شفا نہ مل سکی، اس کے غم کی کیفیتیں ہنوز برقرار ہیں۔

(۴۱۷) جس طرح مچھلی کا سراپا ہی داغ داغ ہوتا ہے بعینہ میرے پاس بھی داغہائے دل کے سوا کوئی ملبوس نہ تھا۔بس اسی اسی داغ وجود کو ہی اپنا کفن قرار دے لیا۔

(۴۱۸) مایوسی اور ناامیدی انسان سے نعمتوں کی خواہش چھین لیتی ہے جیسے ایک شاخ بریدہ (کٹی ہوئی ٹہنی) کو بہاروں سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔

(۴۱۹) اس چمن کی رونق حیات بس ایک تنگ سے دل کا منظر پیش کر رہی ہے۔عجب سی خواہشیں انگڑائی لیتی ہیں کہ دل کی کلی چٹک جائے اور دل کی دنیا کھل اٹھے۔

(۴۲۰) گردش ایام نے مسرت وشادمانی کے چمن کو کچھ ایسے انداز پر لٹا دیا ہے کہ پھولوں کے دستے ہمارے دامن میں آ آ کر گر رہے ہیں۔

(۴۲۱) اس چمنستان کائنات میں بہار اور خزاں دونوں سنگ سنگ رواں دواں ہیں۔ایک طرف دست زمانہ

ساغرے سے ہمکنار ہے جبکہ دوسرے جانب دوشِ چمن نے جنازے اٹھا رکھے ہیں۔

خط-۲۳

(۴۲۲) زمانہ تین حالتوں پر مشتمل ہے وہ کل جو گذر گیا، لمحہ موجود اور وہ کل جو ابھی آنے والا ہے۔یعنی زمانہ ماضی، حال اور مستقبل کا نام ہے۔چاند بھی تنہا ہی ہے، وہ غائب کے پردوں میں مستور ہوتا ہے تو پھر ایک نئے نور کی نوید لے کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتا ہے۔

(۴۲۳) رسوائی حیات انتہائی مختصر دورانیے کی حامل ہے۔اے کلیم ہم تجھے کیسے باور کرائیں کہ یہ مختصر عرصہ بھی ہم نے کیسے کیسے کرب سہہ کر گذارا ہے۔

(۴۲۴) ہمیں دیدار و وصال محبوب کی دولت کیونکر میسر آسکتی ہے۔کیونکہ ہمارا عرصہ حیات دو ایام پر مشتمل ہے ایک کو جدائی کا دن کہہ لیں جبکہ دوسرے کو وصال یار پر قدغن کا دن قرار دے لیں۔

(۴۲۵) شور روغل بپا ہونے پر ہم خواب عدم سے عالم بیداری میں داخل ہوئے۔عالم بیداری میں جو دیکھا کہ ابھی فتنہ اپنے شباب پر ہے تو ہم پھر لمبی تان کر سو گئے۔

(۴۲۶) گلستان کی رنگینیوں میں بادِ صبا جو شبنم کے وجود کو داغ داغ کر رہی ہے تو در حقیقت وہ اسے بے حدو کنار مصائب و آلام سے نجات کا مژدہ سنا رہی ہے۔

خط-۲۴

(۴۲۷) نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اہل نظر نے بے التفاتی کی روش اپنالی ہے اور وہ اپنے دل میں بے شمار شکوے رکھنے کے باوجود اپنے لبوں پر مہر سکوت لگائے بیٹھے ہیں۔

میں محبت کی یہ ساری داستانیں مزے لے لے کر لوگوں کے سامنے بیان کروں گا کیونکہ سفینہ دل میں مستور رکھنے سے تمناؤں کی دیگ اندر ہی اندر جوش مار رہی ہے۔

(۴۲۸) عشق اپنے اظہار کے لیے زبان اور صدا کا محتاج نہیں جذبِ دل اور ترنگِ عشق میں دف اور بانسری کی صدا پھوٹتی دکھائی دے رہی تھی۔

(۴۲۹) مطرب مقام آشنا نے یہ کیسی روش اختیار کی کہ غزل کے عین وسط میں محبوب کی صدا کو نمایاں کرنے لگا ہے۔

(۴۳۰) شاید اس کے نشتر سے کاٹنے کا قرینہ چھن گیا ہے یا پھر میرے زخم سے ہی تکلیف سہنے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔

(۴۳۱) سرائے خاص کے درِ خلوت کے داروغہ کو پیغام دے دو کہ فلاں شخص ہماری خاک درگاہ کے عزلت نشینوں میں سے ایک ہے۔

(۴۳۲) کہاں پیر چنگی سے نسبت ارادت اور کہاں اللہ کی ذات سے تقرب کا دعویٰ۔قدرت خداوندی کے کرشموں پہ قربان جائیں کہ اس کی ذات کے بعید عجیب وغریب اور انوکھے ہیں۔

(۴۳۳) لوگ مختلف پیشوں سے وابستہ ہیں جبکہ میرا پیشہ عشق ہے۔امید رکھتا ہوں کہ میرا یہ نادرۂ روزگار پیشہ دیگر پیشوں کی طرح محرومی کا سبب نہیں ٹھہرے گا۔

(۴۳۴) جب تلک مجھ میں زندگی کا دم خم باقی ہے میں اپنا گریباں پھاڑتا رہوں گا۔مجھے اپنے موٹے لباس کے تار تار ہونے پر کچھ بھی احساس ندامت نہیں ہے۔

(۴۳۵) تیرا اپنا سینہ آتشِ عشق سے تہی ہے تو رندوں کی محفل میں مت جا۔ جب تیرے آتشکدہ الفت میں آگ ہی نہیں ہے تو عود کو خرید کر آخر کہاں جلائے گا۔

(۴۳۶) دنیا کی مختصر سی زندگی میں پیش آمدہ محرومیوں کا علاج ایک حسین چہرے کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔ یہ نسخہ اہل دنیا نے سیدنا مسیح علیہ السلام کی بیاض سے حاصل کیا ہے۔

(۴۳۷) میں اگرچہ در میکدہ کا ایک ناتوں سوالی ہوں مگر عالم مستی میں تو میری شان ملاحظہ کیا کہ کس طرح دنیا ئے فلک پر نازاں ہوتا ہوں اور ستارے پر حکمرانی کیا کرتا ہوں۔

(۴۳۸) لوگ اس راز کو کیسے جانیں کہ میں اپنے زخم زخم وجود کو اپنی رگ جان کے تار پر مارتا رہتا ہوں اور کوئی کیا جانے کہ میں اپنے ہاتھوں سے کیا کام سرانجام دے رہا ہوں۔

(۴۳۹) میری صداؤں کو سن کر یہ مت خیال کر کہ میں نے اپنے آپ ہی یہ نغمہ سرائی شروع کر دی ہے بلکہ اپنے گوشِ ہوش کو میری صداؤں کے قریب لا، تا کہ یہ راز کھل سکے کہ در حقیقت میرے اندر سے کوئی دوسرا بول رہا ہے۔

(۴۴۰) تو بھی اس راز سے آگاہ ہے کہ آخر اس بات کا کونسا جواب ہو سکتا ہے۔

(۴۴۱) ساغر و جام کے ہمدوش ہر شب ہم محفل نجوم و کواکب کی ہمنشینی کے مزے لیتے ہیں۔

(۴۴۲) تیری زندگی کا وہ حصہ جو شغلِ مے نوشی کے بغیر بسر ہوا ہے وہ واقعتاً بڑا بیش قیمت ہے۔ اب میرا ساتھ دو کہ اس کی قضا کر لیں۔

(۴۴۳) یہ خوش نوا مغنّی کس دیس سے وارد ہوا ہے کہ جس نے ساز ''عراق'' سے ''حجاز'' کی لے پیدا کر لی ہے۔

(۴۴۴) اے مطرب تو جس راستے کا مسافر ہے اسی پر گامزن رہنے کی کوشش کر۔

(۴۴۵) محبت ایک ایسی نتیجہ خیز نعمت ہے کہ یہ برگ و بار لائے بغیر نہیں رہتی بعض لوگ فاصلوں پر رہنے کے باوجود دلوں کی دنیا کے قریب ہوتے ہیں۔

(۴۴۶) تو نے اپنے ہاتھوں پر مہندی سجائی تو میں نے ان خوشنما ہاتھوں کو دیکھ کر رنگینی بیان کا آغاز کر دیا ہے۔

(۴۴۷) آواز کی اپنی دلکش تاثیر ہوا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات کان آنکھوں سے بھی پہلے مبتلائے غم الفت ہو جاتے ہیں۔

(۴۴۸) ارباب وفا کے لیے صلائے عام ہے کہ اگر وہ کچھ کرنے کا عزم رکھتے ہیں تو کر گزریں۔

(۴۴۹) اس رنگارنگی اور بوقلمونی کی دنیا میں عقل حیران و ششدر ہے کہ ہنگامہ تو محض ایک ہے جبکہ ساری دنیا تماشائی ہے

(۴۵۰) دیکھو تو سہی ''باربد'' اور ''دستاں'' کی صدائیں دھیمی پڑ گئی ہیں۔

(۴۵۱) نغمہ ''سازگری'' نے عراق کی سروں سے ہم آہنگ ہو کر ایک دل کش اور عجیب و غریب کیفیت پیدا کر دی ہے۔

(۴۵۲) اپنی مہربان طبیعت کے پیش نظر ہماری تمنا ہے کہ تو ہمارے مسکنوں پر اپنا جمال بکھیر دیا کر کہ مفلس و نادار لوگوں کے گھروں میں چراغ نہیں ہوا کرتے۔

(۴۵۳) ہم سے قطع تعلق مت کیجیو کیونکہ ہمارا وجود آپ کی ذات سے وابستہ ہے۔ تمہیں کیا خبر کہ تمہارا ایک دل کا توڑنا ہزار ہا انسانوں کو قتل کرنے کے برابر ہے۔

(۴۵۴) نہیں معلوم کہ اس حسین پھول کا رنگ کس قدر پیارا اور خوشبو کتنی دلکش ہے کہ چمن کے پرندے ہر وقت اسی کی داستان سناتے رہتے ہیں۔ میخواروں کی مے نوشی کی طلب تو مقام تسکین تک پہنچ چکی ہے مگر ابھی تک ساقی کی مینا میں شراب باقی ہے۔

(۴۵۵) جب تیرے ساز کا گیت رنگ سکوت اختیار کرتا ہے تو ایک راز کی بات دکھائی دینے لگتی ہے اور یہ راز میں تجھ پر کھولوں گا۔

تیرے زخمے کی تاروں سے راگ ورنگ کی جتنی بھی تانیں پھوٹتی ہیں وہ طنبورے سے ہم آغوش ہو ہو کر باہر آتی ہیں۔

(۴۵۶) الفت کا دم بھرنے والوں کو گرفتار محبت بنانے کے لیے ایسا دلکش جال پھینکا کہ مرحلہ شناسائی سے بہت پہلے دوست پر نگاہ التفات ڈال دی۔

(۴۵۷) اس سروقد نازنیں محبوب نے میری عمر بھر کی پارسائی ملیامیٹ کر کے رکھ دی۔

(۴۵۸) جب شراب پلانے کے کام پر تجھ جیسا حسین مامور ہو تو فرشتہ بھی اپنے آپ کو آمادۂ مے خوری پائے گا خواہ شیخ شہر کو اس بات کا یقین نہ ہی آئے۔

(۴۵۹) جب تلک تیرے حسین سراپے پہ مخمور اور مد بھری آنکھیں موجود ہیں تب تلک میری مستی اور ترنگ کے لیے جام شراب کی قطعاً حاجت نہیں۔

(۴۶۰) اس سراپا ناز نے ابھی بہت سے لوگوں کے دل کی دنیا غارت اور دولت ایمان کو برباد کرنا ہے اس لیے ابھی ان دو کافر ادا آنکھوں کو رموز دین سے آشنا نہ کرو۔

(۴۶۱) اس کی بدمستی اور مدہوشی نے اس کے عشق کا راز فاش کر دیا کہ انہوں نے بہت سے نیک نام لوگوں کو شراب کا خوگر بنا رکھا ہے۔

(۴۶۲) ستم گری کا آخر یہ کون سا انداز ہے، راہ وفا کے طالبوں کو اتنی تکالیف سے نہیں گذارا جاتا کہ وہ ان صبر آزما لمحوں کے عادی ہو جائیں۔

(۴۶۳) اے راہ الفت کی تیز دھار تلوار تو کن ہاتھوں کے کاٹنے پر آمادہ ہے۔ انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ تو ملامت گرانِ زلیخا کی زبانیں کاٹ دے۔

(۴۶۴) ہماری ہمت ملاحظہ ہو کہ ہم نے خود ہی آگے بڑھ کر اپنی تربت کا ایک گوشہ اپنے لیے منتخب کر لیا ہے تا کہ ہماری ہڈیاں دوسروں کے کاندھوں کا احسان لینے پر مجبور نہ ہوں۔

(۴۶۵) اپنے گھر میں رو پیٹ کر دل کی بھڑاس نکالنے سے اطمینان نہیں ہوتا دل چاہتا ہے کہ بیابانوں میں نکل کر جی بھر کر آہ وفغاں کی جائے۔

(۴۶۶) دیکھنے میں کار الفت بظاہر کتنی آسان لگتی تھی لیکن درحقیقت کار عشق کس قدر مشکل ہے، صد حیف یہ راز ہم پر نہ کھل سکا۔ جدائی اور مفارقت کتنی تلخ اور کٹھن ہوا کرتی ہے مگر محبوب نے اسے کس قدر عجلت اور آسانی سے اپنا لیا ہے۔

(۴۶۷) میرے محبوب! اس بات کے انتظار میں کہ کسی دن تیرا ذوق شکار تجھے جنگل میں لے آئے گا، آہوانِ دشت وصحرا نے اپنے اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ لیے ہیں۔

(۴۶۸) جب تجھے محمل بھاری اور بوجھل محسوس ہونے لگے تو حدی خوانی کی لے کو مزید تیز کر دیا کر۔

(۴۶۹) تو سوئے مشرق گامزن ہو گیا اور میں نے مغرب کی راہ لی۔ مشرق و مغرب کے مسافروں کے مابین بُعد تو ہوا ہی کرتا ہے۔

(۴۷۰) ناپسندیدگی اور ناخواشگواری کی بات اگر چہ ایک ہی کیوں نہ ہو وہ دل پہ بوجھ بن جاتی ہے۔ جبکہ دل پسند اور خوشگوار باتیں بے شک ہزاروں کی تعداد میں ہوں تو پھر بھی کم دکھائی دیتی ہیں۔

(۴۷۱) پوری دُنیا میں کوئی آنکھ بھی ایسی نہیں جس نے تیرے حسن کے جلووں سے ضیاء نہ پائی ہو اور ساری نگاہیں اپنی بینائی کے لیے تیری خاک دِر کی احسان مند ہیں۔

(۴۷۲) سربستہ راز سے پردہ اٹھانا مصلحت کے تقاضوں کے منافی ہے ورنہ رندوں کی اس بزم سے کوئی بھی راز کی بات پوشیدہ نہیں ہے۔

(۴۷۳) اے نظروں سے اوجھل مگر میرے قلب کی گہرائیوں میں جاگزیں میرے محبوب یقین کر کہ میں ہر وقت تمہیں اپنی نگاہوں کے سامنے پاتا ہوں اور تجھے نیک تمناؤں کے نذرانے بھیج رہا ہوں۔

(۴۷۴) میرا وہ محبوب تو گلمرگ کے حسین نظاروں میں پوری طرح کھو گیا ہے جس کا تصور ہی میرے مرجھائے ہوئے دل میں مسرت کی کلیاں کھلائے رکھتا ہے۔ اے صبح کی ٹھنڈی ہوا! ان کے حضور اگر تجھے باریابی کا شرف مل پائے تو غایت ادب سے درخواست کر دینا کہ (فراق کی سختی) سے میرا جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ اگر وہ سوال کریں کہ کیا ان کی نام کوئی الفت کا سندیسہ بھی ہے تو میری جانب سے نہایت مودبانہ طور پر سر جھکا کر کہنا کہ ہاں "ہے"۔ نعمت! وطن سے دور رہنے والوں کی یاد ہی اصل میں ہمت و جرأت کا کام ہے۔ ویسے تو ہر درخت اپنا پھل اپنے پاس پھینک دیا کرتا ہے۔

ہماری دیگر کتب

کتاب	مصنف	قیمت
اُم الکتاب (تفسیر سورہ فاتحہ)	مولانا ابوالکلام آزاد	150روپے
غبار خاطر	مولانا ابوالکلام آزاد	200روپے
تذکرہ	مولانا ابوالکلام آزاد	200روپے
قرآن کا قانون عروج وزوال	مولانا ابوالکلام آزاد	90روپے
قول فیصل	مولانا ابوالکلام آزاد	90روپے
خطبات آزاد	مولانا ابوالکلام آزاد	200روپے
ارکان اسلام	مولانا ابوالکلام آزاد	160روپے
مسلمان عورت	مولانا ابوالکلام آزاد	90روپے
حقیقت الصلوٰۃ	مولانا ابوالکلام آزاد	60روپے
ولادت نبوی ﷺ	مولانا ابوالکلام آزاد	60روپے
مسئلہ خلافت	مولانا ابوالکلام آزاد	100روپے
صدائے حق	مولانا ابوالکلام آزاد	60روپے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابوالکلام آزاد	70روپے
رسول اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کے آخری لمحات	مولانا ابوالکلام آزاد	60روپے
آزادی ہند	مولانا ابوالکلام آزاد	250روپے
افسانہ ہجر ووصال	مولانا ابوالکلام آزاد	40روپے
مولانا ابوالکلام آزاد نے پاکستان کے بارے میں کیا کہا	مرتبہ ڈاکٹر احمد حسین کمال	60روپے
فیضان آزاد	مرتبہ جاوید اختر بھٹی	80روپے
مقام دعوت	مولانا ابوالکلام آزاد	80روپے
اسلام میں آزادی کا تصور (الحریت فی الاسلام)	مولانا ابوالکلام آزاد	60روپے
افکار آزاد	منصف خان سحاب	